1
جلد اول

کلیات
خواجہ احمد عباس

کلیات خواجہ احمد عباس

(جلد اول)

افسانے

مرتب

ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2017
تعداد	:	550
قیمت	:	-/270 روپے
قیمت سیٹ	:	-/1935 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1965

Kulliyat-e-khwaja Ahmad abbas (Vol. I)

Compiler: Prof.Irteza Karim

ISBN No :978-93-87510-23-4

Set ISBN: 978-81-934243-9-1

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033

اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM_Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

خواجہ احمد عباس اردو کے اہم اور منفرد ادیب رہے ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے اور مضامین بھی۔ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے فلمیں لکھیں، ڈائریکٹ بھی کیں، کئی اسکرپٹ بھی لکھے علاوہ ازیں مضامین، سفرنامے اور سوانح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر ادیبوں میں ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راقم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کلیات آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی، دوسری اور تیسری جلد خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ان کے افسانوی مجموعے 'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول'، 'میں کون ہوں'، 'کہتے ہیں جس کو عشق'، 'گیہوں اور گلاب'، 'دیا جلے ساری رات'، 'نئی دھرتی نئے آسمان'، 'نیلی ساڑی' اور 'سونے چاندی کے بت' کے افسانے شامل ہیں۔

'سونے چاندی کے بت' خواجہ احمد عباس کا دسواں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل نو کہانیاں دس خاکے اور چھ شخصی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری جلد میں صرف نو کہانیوں کو ہی

شامل کیا گیا ہے۔ خاکے اور مضامین کو آٹھویں جلد میں شریک کیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ انتالیس کہانیاں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں شریک نہیں ہیں اور پہلی بار کتابی شکل میں سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ جیسے اس انتخاب میں ایک کہانی ''اچھن کا عاشق'' بھی شامل ہے۔ جو ہندی میں ''شوہنیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے کئی افسانوں کے عنوان بدل کر ہندی میں بھی شائع کرایا ہے۔ اس ضمن میں ''کولڈ ویو/سرد لہر'' مایا نگری/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، ہاتھ کا میل/بھکارن، اسپرش/لمس، چمتکار/معجزہ۔ بعض کہانیاں مثلاً ''ہاتھ کا میل'' اور ''بھکارن'' متن کے اعتبار سے بھی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ متن کی یہ تبدیلی آیا خواجہ احمد عباس نے کی ہے یا اردو سے ہندی ترجمہ کرتے وقت یہ آزادی مترجم نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی ''ہاتھ کا میل/بھکارن'' اپنے دو مختلف متون کے ساتھ یہاں شریک کر لی گئی ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے اختلاف متن کا اندازہ ہو سکے۔ نیز تحقیق کے طالب علموں کو اس سے کچھ رہنمائی حاصل ہو سکے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد ان کے ناولوں پر محیط ہے: چار دل چار راہیں، شیشے کی دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، انقلاب، دو بوند پانی، فاصلہ، تین پہیے، ساحل اور سمندر، چار یار۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ناول ''چار یار'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اب اس شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول 'جو ایک اور پریم کہانی'، 'ساحل اور سمندر'، 'بیلو مس مالتی' جیسے مختلف عنوان سے بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول بھی پہلی بار اس کلیات میں شامل ہوا ہے۔ ایک جاسوسی ناول جس کی پہلی قسط طبی دنیا دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کلیات میں شریک ہے۔ اس کی وضاحت بھی مقدمے میں کر دی گئی ہے۔

ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے جس میں: مسولینی فاشیت اور جنگ حبش، مولانا محمد علی، خروش چیف کیا چاہتا ہے؟ فلمیں کیسے بنتی ہیں؟ جیسی تحریریں شامل ہیں۔ خواجہ احمد

عباس کے چین، جاپان اور دوسرے ممالک کے سفر کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس سفرنامہ کچھ اس اسلوب میں لکھتے ہیں کہ قاری بھی ان کا شریک سفر ہو جاتا ہے۔

آٹھویں جلد میں ان کے ڈرامے 'زبیدہ'، 'اناس' اور 'ایٹم بم' وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ڈراموں کی اشاعت اور اسٹیج ہونے کی خبر بھی اس زمانے کے رسائل اور جرائد میں نظر آتی ہے۔ مگر تحقیق کے طالب علم کو اس کی دستیابی میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ مثلاً ڈراما 'یہ امرت ہے' یا 'پرچم' تک رسائی نہ ہو سکی۔ 'لال گلاب کی واپسی'، بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اس شکل میں پہلی بار سامنے آرہا ہے۔ ان ڈراموں کے مضامین بھی متنوع رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے لے کر ادبی شخصیات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو بھی اس کلیات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

میں یہاں قومی اردو کونسل کے جملہ ممبران اور اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی سبیل پیدا کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال جو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اس کلیات بلکہ ضخیم کلیات کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ہر چند کہ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا کہ یہ کلیات قومی کونسل سے شائع ہو لیکن ان کا یہ اصرار کہ آپ صرف قومی کونسل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں بلکہ آپ کی بنیادی حیثیت اردو کے ایک محقق اور تنقید نگار کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کا سب سے زیادہ حق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے طفیل کلیات خواجہ احمد عباس کی یہ آٹھ جلدیں آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہیں۔

اگر اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جا سکے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

○ پیش لفظ iii

○ اعتذار xi

افسانے

پہلا افسانہ 'ابابیل' جون 1936، رسالہ 'جامعہ' نئی دہلی

1-ایک لڑکی

1- فیصلہ 3

2- ایک لڑکی 17

3- سرکشی 30

4- ناگن 41

5- پہلا پتھر 52

6- ابابیل 61

7- تین عورتیں 65

8- داروغا صاحب 70

9- معمار 78

10- رادھا 84

2- پاؤں میں پھول

تعارف: کرشن چندر 97
11- پاؤں میں پھول 102
12- چڑھاؤ اُتار 123
13- بارہ گھنٹے 148
14- ایک پائلی چاول 159
15- ماں 168
16- آزادی کا دن 178
17- میں اور وہ 195
18- موت کی شکست 204

3- زعفران کے پھول

19- زعفران کے پھول 231
20- اجنتا 244
21- اندھیرا اور اجالا 271

4- میں کون ہوں

22- چڑیا چڑے کی کہانی 349
23- دھوئیں کی زنجیر 358
24- جاگتے رہو 373
25- رفیق 382
26- میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی 399

-27	میرے بچے	406
-28	میری موت	416
-29	ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام	429
-30	انتقام	439
-31	شاعر کی آواز	448
-32	میں کون ہوں؟	460

5- کہتے ہیں جس کو عشق

-33	کہتے ہیں جس کو عشق ہے......	473
-34	شکر اللہ کا	502
-35	مسوری 1952	521

اعتذار

خواجہ احمد عباس اپنے موضوعات، اسلوب اور آہنگ کے باوصف اردو کے منفرد فکشن نگار (افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار) ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ان کے فکشن کے سرمایے کے تجزیے کے لئے اردو فکشن کی تنقید کو نئے محاورے کی ضرورت پیش آئے گی کیوں کہ ان کا ''سرمایۂ فکشن'' اپنے معاصرین کے فکشن سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔

خواجہ احمد عباس کو اس بات کا احساس تھا کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

چنانچہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے مفتیان اردو ادب یا اپنے نکتہ چینوں کی رائے انہوں نے بار بار نقل کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

> ''ادیب اور نقاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے، ادب کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں: اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔

آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے...اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلٹز میں ''آخری صفحہ'' (Last Page) اور ''آزاد قلم'' لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے، جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوان اردو دہلی، دسمبر 1987ء، ص:66)

خواجہ احمد عباس کی تحریریں اور تخلیقات، عوامی ادب کا بہترین اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ عوامی ادب، ممکن ہے ادب عالیہ کا حصہ کبھی نہ بنے لیکن ادب عالیہ کو حیات بخشنے، اسے اعتبار اور اعتماد بخشنے میں اس کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ عوامی ادب نہ ہو تو ادب عالیہ کے سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ کمال یہ ہے کہ عوامی ادب اگر لامحدود ہوتا ہے تو ادب عالیہ کے قارئین بہت محدود بلکہ مخصوص ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی سماج کی تبدیلی اور تعمیر میں بہت کم ہوتا ہے۔

میر نے کہا بھی ہے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

خواجہ احمد عباس بھی عوام سے ہو کر خواص تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں، جتنا لکھا ہے ان کو پڑھنے کے لئے وقت

درکار ہے۔ پھر یہ لکھنا اگر محض قلم سے لکھنا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کیے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین، تبصرے، کالم، خاکے کے علاوہ سیلولائڈ، گویا قلم سے کام نہ بنا، یا مطمئن نہ ہوئے تو ''فلم'' کا سہارا لیا۔ غالب کو تو صرف غزل ہی سے شکایت تھی۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر خواجہ احمد عباس کاغذ اور قلم پر بھی قناعت نہ کر سکے اور سماج کی تنگی دامانی کے علاج کے لئے ''اظہار کے مختلف پیرائے'' کا سہارا لیا۔ خواجہ احمد عباس کی ادبی فتوحات کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر اجمالاً تو کیا مفصل گفتگو بھی ممکن نہیں ہے۔ تادم تحریر خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی قلمی اور فلمی خدمات کا ایماندارانہ جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں تشنہ ہیں۔

●

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نوجوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی۔ لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویۂ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔ انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

''1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔'' یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ

دیا۔ اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔"

(غبارِ کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے ادھر اُدھر سے حذف کر کے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an Island" سے بھی رجوع کرسکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جاسکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کی پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر اقبال کے اس شعر:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دوران تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کار آموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

Let me record here that three months period in the
'National Call' really made ma into a journalist

(I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کرلیا تھا۔ قلم سے فلم تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور ایک

نقطے پر مکمل کیا۔ اگر چہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات، ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جاسکتا ہے۔ 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو اس کے آخری صفحے پر شائع کالم 'آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم و بیش 40 برسوں تک 'آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے بہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من و عن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہوسکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر۔ بلٹز کے لیے 'آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔ راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے

زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے
کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔"

(خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، ص 230)

یہاں مجھے صرف ایک اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج اگر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا۔ خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم پہلو 'آزاد قلم' کا یہ تھا کہ اس کے صفحے کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو، ہیروئین یا ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاعِ نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جو اب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔"

(بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:

"رقصِ حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔"

(بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملّی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند

عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جاسکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مر سکتی ہے؟''

(بلٹز10 مئی1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہر الحق''

(بلٹز24 مئی1980)

''حیدرآباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟

کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز،27 مارچ1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ!''

(بلٹز،17 فروری1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟

(بلٹز، 21 فروری1963)

''رہتا ہے دل وطن میں!''

(بلٹز،8 فروری1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ

(بلٹز، 11 مارچ1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم''

(بلٹز،14 مارچ1964)

ایسے کئی مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا 1964 کے

ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

"آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، میری

سلمہ، سوشی، جولیٹ، پدمنی

لیلیٰ، لیلا، للی

موہنی، محمودہ، مارگریٹ

ملوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں...

دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔

دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیڑی بنانے والیاں، بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے پر بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک انقلابی سرخ پھریرا۔ ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے۔

"مہنگائی کا خاتمہ کرو!

کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو

چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ،

کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ—

شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ"

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے

تیور کیا تھے؟ ان کی نگاہ کتنی دوررس تھی؟ وہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظرنامے پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے؟ دراصل خواجہ احمد عباس اپنے انھیں موضوعات اور اسلوب کے اسی بے باکانہ انداز کی بنیاد پر صحافت اور ادب کی تاریخ میں ایک الگ عنوان کے تحت یاد کیے جاتے رہیں گے۔

افسانہ

خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ 'ابابیل' تھا، (اس افسانے کی سنہ اشاعت کے سلسلے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ راقم السطور نے اسی لیے رسالہ جامعہ کے مشمولات کا عکسی صفحہ پہلی جلد میں شامل کردیا ہے تاکہ کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔) گویا یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ تادم تحریر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کل کتنے افسانے لکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً سواسو کہانیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد دس ہی ہے۔ بقیہ افسانوی مجموعے انہیں دس مجموعوں کی بنیاد پر اردو کے پبلشرز اپنے اپنے طور پر تیار کرتے رہے اور بازار میں لاتے رہے، جنہیں جعلی ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی بعض افسانے اشاعت مکرر کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ میں کہانیوں کے علاوہ خاکے، مضامین اور دیگر نوعیت کی تحریریں بھی شریک کردی گئی ہیں۔ اس سے ہمارے ناقدین کو مغالطہ بھی ہوا ہے کہ وہ ان کے بعض مضامین کو افسانہ تصور کرتے ہوئے افسانے کے زمرے میں شریک کرلیتے ہیں۔ رام لعل نے اپنی کتاب ''خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے'' میں ''آئینہ خانہ میں'' کو افسانے کے زمرے میں شامل کردیا ہے۔ یہی سہو پروفیسر صغریٰ مہدی کی مرتبہ کتاب ''اگر مجھ سے ملنا ہے'' (خواجہ احمد عباس کے افسانے) میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ افسانہ نہیں بلکہ مضمون ہے۔ 'آئینہ خانہ میں' ادبی تحریر کا ایسا سلسلہ ہے۔ جس کے تحت ماہنامہ ''افکار'' کراچی میں کرشن چندر، بیدی، اور دوسرے قلم کاروں نے اپنی شخصیت اور فکر وفن پر خود روشنی ڈالی تھی۔ خواجہ احمد عباس کا یہ سوانحی مضمون افکار (دسمبر 1963ء) میں شائع ہوا تھا۔

ان کے بعض افسانوں کو عنوانات بدل بدل کر بھی شائع کیا گیا ہے۔ الف لیلیٰ 1956/ الف لیلیٰ 1980، الف لیلیٰ 1952، سوری 1952/ سوری 1953، پنجرہ/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، آج کے

لیلیٰ مجنوں ربیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، اجنتا راجنتا کی اُور، کیپٹن سلمٰی ربھوپال کی کیپٹن سلمٰی، ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام ربچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام، رفیق رمیجر رفیق مارا گیا وغیرہ وغیرہ۔ان کے علاوہ ایسے کچھ افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے بلکہ اردو رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

اردو کی طرح ہندی والوں نے بھی خواجہ احمد عباس کی تحریروں پر بڑا ظلم کیا ہے۔جس پبلشر نے جیسے مناسب سمجھا، ان کی کہانیوں اور ناولوں کو شائع کیا اور اپنی تجارت کو فروغ دیا۔اس کی وجہ یہ تھی اور ہے کہ خواجہ احمد عباس کی تحریریں اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کی بنیاد پر عوام میں خوب مقبول ہیں اور تھیں۔اردو کی کہانیوں کا اگر سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو خواجہ احمد عباس کی کہانیاں ان میں جگہ بنالیں گی۔ان کے افسانوں کے انفراد پر آئندہ سطور میں گفتگو ہوگی۔سردست ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تفصیل حاضر ہے۔

پہلا افسانہ '**ابابیل**' رسالہ: جامعہ، جلد 26، شمارہ 6 جون 1936

ایک: پہلا افسانوی مجموعہ: **ایک لڑکی** (1942)

مشمولات: (1) فیصلہ (2) ایک لڑکی (3) سرکشی (4) ناگن (5) پہلا پتھر (6) ابابیل (7) تین عورتیں (8) داروغا اور لڑکی (9) معمار (10) رادھا۔

دو: **پاؤں میں پھول** (1948)

مشمولات: (1) پاؤں میں پھول (2) چڑھاؤ اتار (3) بارہ گھنٹے (4) ایک پائلی چاول (5) ماں (6) آزادی کا دن (7) میں اور وہ (8) موت کی شکست۔

نوٹ: تعارف کے طور پر کرشن چندر کی تحریر شامل ہے۔

تین: **زعفران کے پھول**: (مارچ۔1948) کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی

مشمولات: (1) زعفران کے پھول (2) اجنتا (3) اندھیرا اور اجالا۔

چار: **میں کون ہوں**، (1949)، نو ہند پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی۔

مشمولات: (1) چڑیا چڑے کی کہانی (2) دھوئیں کی زنجیر (3) جاگتے رہو (4) رفیق

(5) میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی (6) میرے بچے (7) میری موت (8) ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام (9) انتقام (10) شاعر کی آواز (11) میں کون ہوں؟

نوٹ: کہانی کی کہانی کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے۔

پانچ: کہتے ہیں جس کو عشق، (1953)، پروین بک ڈپو، الہ آباد۔

مشمولات: (1) کہتے ہیں جس کو عشق (2) شکر اللہ کا (3) مسوری 1952

چھ: گیہوں اور گلاب، (1955)، ایشیا پبلشرز، دلی۔

مشمولات: (1) گیہوں اور گلاب (2) میرا بیٹا میرا دشمن (3) آسمانی تلوار (4) لال پیلا (5) نئی برسات (6) معجزہ (7) مونتاژ۔

سات: دیا جلے ساری رات، (1959)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی۔

مشمولات: (1) دیا جلے ساری رات (2) روپے آنے پائی (3) چراغ تلے اندھیرا (4) بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام (5) کچی کچی (6) تین تصویریں (7) ڈیڈ لیٹر (8) الف لیلیٰ 1956۔

نوٹ: اس مجموعے میں کرشن چندر کی یہ تحریر بھی شامل ہے: کرشن چندر اور احمد عباس کا آپس کا مقدمہ۔

آٹھ: نئی دھرتی نئے انسان، (1977)، مکتبہ جامعہ، دہلی۔

مشمولات: (1) نیا شوالہ (2) ہنومان جی کا ہاتھ (3) سبز موٹر کار (4) ٹڈی (5) بھولی (6) نئی جنگ (7) تین بھنگی (8) پانی کی پھانسی (9) تیسرا دریا (10) سونے کی چار چوڑیاں (11) یہ بھی تاج محل (12) ٹیری لین کی پتلون (13) چٹان اور سپنا (14) خزانہ (15) دو ہاتھ (16) ایک لڑکی۔ سات دیوانے۔

نوٹ: اس مجموعے میں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے ایک تحریر شامل ہے۔

نو: نیلی ساڑی، دسمبر (1982)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

مشمولات: (1) ایک کہانی کا سوال ہے (2) تین مائیں ایک بچہ (3) سردی گرمی (4) بھوک (5) فین (6) نیا انتقام (7) نیلی ساری۔

دس: سونے چاندی کے بت، (1986)، کلاسیک انٹرنیشنل، بمبئی۔

اس کتاب میں فلمی شخصیات پر دس خاکے اور چھ ایسے مضامین شامل ہیں جن کا تعلق فلمی دنیا سے ہے ان کے علاوہ درج ذیل نو کہانیاں شریک کتاب ہیں۔

(1) ماں کا دل (2) فلمی تکون (3) پرنیتا کماری کے پان (4) دو پرچھائیاں (5) کایا کلپ (6) اچھن کا عاشق (7) رین مشین (8) ایک لڑکی تین چہرے (9) ایکٹریس۔

ان کے علاوہ جو افسانوی مجموعے ہیں انہیں مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کا BY PRODUCT کہا جانا چاہئے۔ اِلّا یہ کہ کسی نے کسی رسالے میں شائع شدہ کوئی افسانہ شریک کر دیا ہو۔ چند مجموعے جو درج ذیل عنوانات سے شائع ہوئے ہیں:

(1) پیرس کی ایک شام (2) بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں (3) چراغ تلے (4) اداس دیواریں (5) پھول اور دوسری کہانیاں (6) اندھیرا اجالا (7) اگر مجھ سے ملنا ہے (مرتبہ: صغریٰ مہدی) (8) خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے (مرتبہ: رام لال)

خواجہ احمد عباس کو میں ''اسکرین پلے فکشن نگار'' تصور کرتا ہوں۔ اپنے خیال کو تقویت بخشنے اور آپ کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کی ہی تحریر حاضر ہے۔

> امر، جو کنٹرکٹر کا کلرک تھا، روپے کی گنتی کر رہا تھا۔ پھر گوپال کے اوور ٹائم کے روپے دیتے ہوئے، ذرا تعجب ظاہر کرتے ہوئے بولا، 'ارے بھائی، تم اتنی سخت محنت کیوں کرتے ہو؟'
>
> ''امر بھیا، ساری محنت میں اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے غریبوں جیسی زندگی گزارنا اچھا نہیں لگتا۔ آج میں نے اُوورٹائم اس لیے کیا ہے کہ 'سیلر بوائے' بار اور نائٹ کلب میں پینے کا مزا لینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ حساب کتاب کا رجسٹر پھینکو اور مزے اڑاؤ۔ میں کہتا ہوں تم ایک بار بھی روزی کو دیکھ لوگے تو تمھارے جیسا دھرماتما بھی پھسل پڑے گا۔''

اس سلسلے میں ایک دو مثالیں اور بھی ان کے ہی ناول/افسانے سے پیش کی جاسکتی ہیں:

"......آؤ میں تمہاری قمیض کو سی دوں گی۔ روزی ناچ گانے کے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے سوئی دھاگا اٹھاتی ہے اور گوپال کی پھٹی ہوئی قمیض کو سینے لگتی ہے......"

یہاں کہانی جس اسلوب میں بڑھائی جارہی ہے وہ واضح طور پر "اسکرین پلے" سے قربت رکھتا ہے۔

ناول

(1) چار دل چار راہیں (2) شیشے کی دیواریں (3) بمبئی رات کی بانہوں میں (4) اندھیرا اجالا (5) انقلاب (6) دو بوند پانی (7) فاصلہ (8) تین پیسے (9) ساحل اور سمندر (10) چار یار۔

تاریخی ترتیب سے "چار دل چار راہیں" جسے کتابستان الہ آباد نے 1959 میں شائع کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ناول "انقلاب" جو بوجوہ نیا سنسار بمبئی سے 1975 میں شائع ہوا۔ ناول کے سلسلے سے اسے پہلی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنے کئی مضامین میں اردو میں اس کے تاخیر سے چھپنے کی وجہ بتائی ہے۔ آجکل اپریل 1985 کے شمارے میں "من کہ......" کے تحت انہوں نے لکھا ہے:

"سب سے مشہور ناول اردو میں "انقلاب" تھا، جس کو پندرہ برس کے بعد جب اس کا روسی ایڈیشن 'سن آف انڈیا' (فرزند ہند) کے نام سے 90000 کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا، تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجرا کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، ایڈیٹر، شاعر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ امید تھی کہ کچھ تو ان میں سے کچھ "اچھا یا برا اس کے بارے میں لکھیں گے، مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا۔ میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔

ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔''

میں خواجہ احمد عباس کی تحریروں کی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس درمیان ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط کا ایک مضمون ''جوالا مکھی'': خواجہ احمد عباس کا گم شدہ ناول''ایوان اردو' دہلی کے فروری 2015 کے شمارے میں منظر عام پر آیا۔ جس سے ایک نئی حقیقت سامنے آئی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ خواجہ احمد عباس کی پہلی کہانی اگر 1936 میں شائع ہوئی تو ان کی ناول نگاری کا سفر بھی اسی سال شروع ہوتا ہے۔ میں یہاں مذکورہ مضمون کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں تاکہ صورت حال سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہوا جا سکے۔ یحیٰ نشیط لکھتے ہیں:

میرے پیش نظر اس وقت ''طبی دنیا' دہلی کا ستمبر 1963ء کا ایک شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 11 سے 61 تک خواجہ احمد عباس کے ناول کی پہلی قسط طبی دنیا کے مدیر نے اپنی رائے کے ساتھ شائع کی ہے۔ مدیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

''ایک پراسرار ناول جو''طبی دنیا''میں ہر ماہ قسط وار شائع ہوگا۔

''ہم اپنے نوجوان عزیز خواجہ احمد عباس کے شکر گزار اور دعا گو ہیں کہ''طبی دنیا''میں ادبی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ہمیں اپنا یہ پہلا شاہکار بھیجا۔ عزیز موصوف ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مغربی علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ملازمت کی پابندیوں کے حوالے نہیں کیا، جس میں ان کے لیے زندگی کی کامیابیوں کا ایسا میدان تھا، جو ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے شاید کسی ایک ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کے خداداد ادبی ذوق اور شوق مطالعہ اور قابل قدر جذبۂ ایثار نے ان کے سامنے جو راہ خدمت پیش کی، انھوں نے اسے اختیار کرلیا۔ آسمانِ صحافت پر یہ ایک نئی صبح کا ظہور ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو لوگ دیکھیں گے کہ مولانا حالیؔ کے مطلع خاندان سے ان کے بعد ایک اور روشن تارہ نکلا ہے!''

اس اداریے کے بعد مدیر نے ''جوالا مکھی'' کا پہلا باب شائع کیا ہے۔ عنوان باب کی جلی سرخیوں کے ساتھ جزوی سرخیوں کو بھی مدیر نے قدرے روشن

کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں، جتنی بھی فلمیں بنائی ہیں، جتنے اسکرپٹ اور جتنے ناول لکھے ہیں، ان تمام سے مختلف یہ تخلیق ہے۔ پتہ نہیں کیوں، پھر اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ''طبی دنیا'' ایک غیر ادبی جریدہ ہے۔ محققین بھلا ادب کا میدان چھوڑ کر طبی جریدے کی ورق گردانی کیوں کرنے لگیں۔ اسی سردلوحی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی اولین کوشش سے آج ہم بے خبر ہیں۔

میں نے اپنی بساط بھر کوشش کرلی ہے کہ اس رسالے کے باقی ماندہ شماروں کو بھی حاصل کروں، اس دوران مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دو ماہ ٹھہرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا تھا اور میں نے اس ضمن میں کوشش بھی کی مگر طبی دنیا کے وہ قدیم شمارے مجھے دستیاب نہ ہوسکے۔''

اس کے بعد انہوں نے اس جاسوسی ناول کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اور پہلی قسط بھی۔ جو اس کلیات میں ناول کے باب میں شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''یہ ناول خواجہ احمد عباس کی ابتدائی کاوش ہے اس لیے اس میں وہ پختگی اور فن کی کہنگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس میں ان کا مبتدیانہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ان کی اس اولین تخلیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شروع ہی سے ترقی پسند افکار پنپنے لگے تھے۔ ان کے اس ناول کی تخلیق اس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے قیام سے قبل 1932 میں چند نوجوانوں نے ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کردیا تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے انہی افسانوں سے متاثر ہوکر یہ ناول لکھا ہو اور ''انگارے'' کی مناسبت سے اپنے ناول کا نام ''جوالا مکھی'' رکھا۔ اس ناول کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے خیالات اور جذبات میں اشتراکیت کا اثر نمایاں ہے۔ مالداروں اور

غریبوں کے درمیان دولت کی خلیج کی وجہ سے بڑھتے ہوئے فاصلوں کا ادراک خواجہ احمد عباس کو شروع ہی سے تھا۔ اس افتراق کو ختم کرنے کا وہ انقلابی نعرہ ابھی ہندوستان میں لگایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے انقلاب کی زیریں لہریں ہی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔

اس ناول کی پہلی قسط ستمبر 1936ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ہوئے اس اجلاس کے بعد سے گویا اس انجمن کو تحریک ملی، پھر بھیونڈی اور ممبئی میں اس کے جلسے ہوتے گئے اور ادب میں ایک مضبوط تحریک کے طور پر وہ کام کرنے لگی۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، علی سردار جعفری، عزیز احمد، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی وغیرہ فعال ادیبوں کے دم سے اس انجمن کی خوب ترقی ہوئی، مگر ''جوالا مکھی'' لکھتے وقت خواجہ احمد عباس اکیلے تھے، ان کا کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہمسر۔ یہی ایک ناول تھا جس میں اشتراکیت کی مدھم سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ''جوالا مکھی'' کی کلیدی اور بنیادی اہمیت کو اردو ادب میں تسلیم کیے بغیر مفر نہیں۔

ان تمام خصوصیات کے سبب خواجہ احمد عباس کے ناول ''جوالا مکھی'' کو اردو کا پہلا ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے گمشدہ ابواب کی بازیافت کے لیے کوشش کی جائے اور اسے مکمل صورت میں سامنے لانے کے جتن کیے جائیں۔''

راقم نے بھی اس ناول کے حوالے سے تحقیق کی لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ چونکہ طبی دنیا کے شمارے کسی بھی لائبریری میں دستیاب نہ ہو سکے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ''طبی دنیا'' کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہو۔ ممکن ہے خواجہ احمد عباس نے ناول کی شروعات کی ہو لیکن وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ ایسا ان کی کئی کتابوں کے ساتھ ہوا ہے کہ اعلانات تو کیے گئے مگر اس عنوان سے ان کی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً ''یہ امرت ہے''، ''پرچم'' یا ''چار دانوں کی کہانی''۔ آخری الذکر کی آخری قسط بھی دستیاب نہیں ہو سکی۔

خواجہ احمد کے ناولوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ اندھیرا اجالا، شیشے کی دیواریں، دو بوند پانی، چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں، سات ہندوستانی، ایک پرانا خواب اور دنیا بھر کا کچرا، فاصلہ وغیرہ۔ یہاں حتمی طور پر ان ناولوں کی سنہ اشاعت نہیں دی جاسکتی۔ چونکہ زیادہ تر ناولوں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اصلاً یہ ناول فلم کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ ادبی شان نہیں ملتی، جو ادبی ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے ان ناولوں پر ہماری تنقید مہر بہ لب نظر آتی ہے۔ آخر ان میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری یا ناول کے فن کے باب میں کتنے آنچ کی کسر رہ گئی ہے؟ اس پر بات تو ہونی ہی چاہئے تھی تاکہ ان کی فنی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا مگر ہمارے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے انقلاب کا ذکر مندرجہ بالا سطر میں دانستہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ ناول ان ناولوں سے مختلف ہے اور یہاں فنی اعتبار سے خواجہ احمد عباس زیادہ بامراد بھی رہے ہیں۔ اگرچہ انقلاب کے حوالے سے بھی ہمارے ناقدین نے بخل سے کام لیا ہے۔

ڈرامے

خواجہ احمد عباس کا تعلق IPTA سے بہت گہرا رہا ہے اور انہوں نے اس کے لئے کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کئے۔ مثلاً: (1) زبیدہ (2) اناس اور ایٹم بم (3) یہ امرت ہے (دستیاب نہیں ہوسکا) (4) بارہ بج کر پانچ منٹ (5) لال گلاب کی واپسی (6) پرچم۔ (دستیاب نہیں ہوسکا)

ان ڈراموں کے موضوعات مختلف بھی ہیں اور متنوع بھی۔ لیکن ایک عام روح جو ان تمام ڈراموں میں جاری ہے، وہ انسان دوستی، رواداری اور عصری منظرنامے کی ہے۔ ڈراما ''بارہ بج کر پانچ منٹ'' کا موضوع بالکل آج کا موضوع ہے، یعنی صحافت جو سیاست، سماج اور ملک کا مقدر بدل سکتی تھی اس نے بھی تجارت کی شکل لے لی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان ڈراموں کو کامیاب کوشش کہا جائے گا۔

صحافتی تحریریں

اوپر ذکر آچکا ہے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ خواجہ احمد عباس کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت

سے ہوا۔ اسی لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ صحافتی مضامین لکھے بلکہ درج ذیل صحافتی نوعیت کی کتابیں بھی لکھیں جن کے نام یہ ہیں: (1) سولینی فاشیت اور جنگِ حبش (2) مولانا محمد علی (3) خروش چیف کیا چاہتا ہے؟ (4) فلمیں کیسے بنتی ہیں؟

فلم اسکرپٹ اور کہانیاں

(1) میرا نام جوکر (2) سات ہندوستانی (3) دھرتی کا لال (4) بابی (5) شہر اور سپنا (6) آسمان محل (7) ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی (8) راہی (9) آوارہ (10) شری 420 (11) خون کا رشتہ۔

سفر نامہ: (1) مسافر کی ڈائری (2) سرخ زمین اور پانچ ستارے

تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی اُردو میں مندرجہ بالا کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی تقریباً باون (52) تصانیف ہیں (ان میں بعض کتابیں اُردو کہانیوں کا ترجمہ ہیں)۔ اس تعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو کتابیں کم ہو جائیں لیکن کم و بیش خواجہ احمد عباس اسی کتابوں کے مصنف کہے جاسکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہندی میں براہِ راست نہیں لکھتے تھے، ان کی جو کتابیں ہندی میں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر اُردو یا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کتاب ہندی میں ''آدھا انسان'' کے نام سے ملتی ہے جسے نیلابھ پرکاشن، الہ آباد نے 1953 میں ناول کے نام سے شائع کیا ہے جب کہ یہ ناول نہیں ہے بلکہ خواجہ احمد عباس کا مشہور افسانہ ''مسوری 1952'' ہے جو ان کے طویل افسانوں پر مشتمل مجموعے ''کہتے ہیں جس کو عشق'' میں شریک اشاعت ہے لیکن نام مختلف ہونے کی بنا پر لوگ اسے بھی الگ کتاب شمار کرتے ہیں۔ میں نے خواجہ احمد عباس کے حوالے سے تحقیق وتلاش کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ان کی زیادہ تر تخلیقات کو یکجا طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی تمام تحریروں کو پالیا ہے۔ ممکن ہے کل ان کی کوئی اور تحریر سامنے آجائے لیکن سر دست میری تحقیق کا حاصل یہی ہے۔

امید ہے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والوں کو میری یہ

کوشش پسند آئے۔ اتنا بڑا کام جو آپ کے سامنے ہے ظاہری بات ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا تھا جب تک ہمیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری اور ادارۂ ادبیات حیدرآباد سے مدد نہ ملی ہوتی۔ جو افراد اور احباب اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ان کا فرداً فرداً نام لینا مشکل تو ہے مگر ضروری بھی۔ اس میں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کچھ ناموں کا ذکر نہ ہو سکے۔ لیکن پھر بھی فوری طور پر جناب ابوذر ہاشمی کلکتہ، جناب یحییٰ نشیط، جناب صفدر امام قادری، ڈاکٹر زاہد الحق، محترمہ زویا زیدی، جناب مہر ندیم الٰہی، جناب عطا خورشید، محترمہ نوشین عثمانی، پاکستان کے ہمارے دوست جناب رفاقت علی شاہد وغیرہم کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو مناسب بات نہ ہوگی۔

میں خصوصی طور پر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا سراپا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کلیات خواجہ احمد عباس کی اشاعت کے حقوق راقم کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کیے۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا تعلق خواجہ احمد عباس کے خانوادے سے ہے انہوں نے خواجہ احمد عباس میموریل ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے اور وہ خود بھی ادب کی بہت اچھی پارکھ رہی ہیں۔ نیز آپ سماجی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے نہ صرف بہت فعال ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً جلسوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کا بھی انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ وہ پلاننگ کمیشن آف انڈیا کی بہت فعال ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اوپن یونی ورسٹی حیدرآباد کی چانسلر بھی رہ چکی ہیں۔ میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اجازت کے بغیر اتنا اہم کام شائع نہیں ہوسکتا تھا۔

مجھے یقین ہے اس کام میں کمیاں ہوں گی مگر یہ بھی توقع ہے کہ اس کام کو دوسرے لوگ بہتر طریقے سے کرسکیں گے۔

مجھ سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب میں نے قدم رکھا یہ خاک داں ویراں تھا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

ایک لڑکی

پہلا افسانوی مجموعہ جو مکتبۂ اردو لاہور سے اکتوبر 1942 میں شائع ہوا۔

ایک لڑکی

کے نام!

کوئی پوچھے اگر وہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

(مجاز)

فیصلہ

بمبئی کی گجراتی اور مرہٹی چیخ پکار کے ہنگامہ میں شمالی ہند کے دو چار اُردو داں نوجوانوں کا کسی موقعہ پر اکٹھا ہونا ایک دلچسپ حادثہ ہوتا ہے۔ باقاعدہ تعارف کی رسم بھی غیر ضروری سمجھی جاتی ہے اور بے تکلف گفتگو فوراً چھڑ جاتی ہے۔ کل شام کا واقعہ ہے کہ ہم تین دوست ورلی کے مقام پر سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے گپ کر رہے تھے۔ مسئلہ زیر بحث "محبت" تھا۔ میں حسب معمول عشق کو ایک دماغی بیماری سے تشبیہ دے رہا تھا۔ مجھے عاشقوں سے ایسی ہی ہمدردی ہے جیسی پاگل خانہ کے رہنے والوں سے اور گو ممکن ہے کہ میں بھی کبھی اس مرض کا شکار ہوں۔ جیسے یہ ممکن ہے کہ مجھے نمونیہ ہو جائے یا میں پاگل ہو جاؤں۔ میرا یہ عقیدہ کہ عشق دماغی خرابی کی علامت ہے کبھی کمزور نہ ہوگا۔ میرے اس نظریہ کی تردید میرے شاعر دوست سعید کمالی کر رہے تھے جو عشق کو زندگی کے خواب کی تعبیر اور کائنات کے نظام کی بنیاد سمجھتے تھے اور موتی لال (جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے) مجھے پریم کی ریت اور پریم کے راستوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مگر وہ کمالی کے شاعرانہ تخیل کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ موتی لال شادی کو محبت کی معراج سمجھتا تھا اس کے خیال کے مطابق قانوناً میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوئے بغیر انسانی محبت مکمل نہیں

ہو سکتی۔ کمالی زور شور سے موتی لال کی مخالفت کر رہے تھے۔ غالب اقبال اور عمر خیام، نظامی، کیٹس، شیلے کے اشعار اپنے نظریہ کے ثبوت میں پیش کر رہے تھے۔ ''محبت گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ شادی بیاہ سماج کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں اور عشق ان کی قید سے آزاد ہے۔ عشق کو سماجی رسم ورواج کا پابند بنانا روح کو بیڑیاں پہنانا ہے۔'' کمالی پورے جلال کے ساتھ اپنے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں زور شور سے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ ''دیکھو یہ لہریں بھی میری تائید کر رہی ہیں۔'' کمالی نے کہا۔ اسی وقت ایک غیر معمولی جسامت کی لہر آئی اور اتنے زور سے ساحل کی دیوار سے ٹکرائی کہ پانی کی ایک بوچھار نے ہمیں بھگو دیا اور اپنا مقام چھوڑ کر ہم دوسری جگہ بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

ساحل تقریباً سنسان تھا۔ دو چار موٹریں دور، دور کھڑی تھیں۔ جن میں شہر کے سیٹھ ہوا کھانے آئے تھے۔ ان کے علاوہ صرف ایک آدمی اور نظر آیا۔ وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ۔ ننگے سر۔ بال سمندر کی تند ہوا سے پریشان۔ ''یہ تو کوئی اپنی طرف کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔'' موتی لال نے کہا اور جب نووارد قریب سے گذرا تو کمالی نے اُس کو ''معاف کیجیے گا'' کہہ کر ٹھہرا لیا۔ کمالی کو بغیر جان پہچان ملاقات بڑھانے کا ملکہ ہے۔'' آپ تو ہماری طرف کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی خاص جلدی نہ ہو تو تشریف رکھیے۔ یہ میرے دوست موتی لال ہیں اور یہ............'' ہمارا تعارف پورا کرتے ہی کمالی نے پوچھا۔'' اور آپ کی تعریف؟'' نووارد نے جو کوئی تیس برس کا نوجوان تھا اپنا نام حامد بتایا اور کہا کہ وہ بمبئی کی سیر کی خاطر آیا تھا۔ اس کی شکل صورت معمولی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب افسردگی تھی گویا وہ دنیا کی ٹریجڈی کی تہہ کو پا گیا ہو۔ دوسرے لحاظ سے وہ معمولی حیثیت کا پڑھا لکھا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔

کمالی نے ہماری بحث کا خلاصہ حامد کو سُنایا جو اب بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔'' آپ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرما دیجیے۔''

نووارد ایک خشک اور کھسیانی سی ہنسی ہنسا اور ساتھ ہی ایک سیکنڈ کے لیے کچھ گھبرا سا

گیا۔ گویا کسی نے اس کا کوئی اہم راز بھرے مجمع میں بیان کر دیا ہو، مگر بہت جلد ہی اُس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا اور ایک نیا سگریٹ جلا کر کش لیتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تینوں صاحبان ٹھیک کہتے ہیں۔"

ہم تینوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ تینوں مختلف عقیدے کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں؟

"اور شاید آپ سب غلطی پر بھی ہیں۔" حامد نے سمندر کی طرف نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو کوئی ظریف فلاسفر معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ حامد ہم لوگوں سے مذاق کر رہا ہے۔

"معاف کیجیے گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ کچھ معمہ سا ہو گیا مگر حقیقت یہی ہے کہ میں آپ سب سے اتفاق بھی کر سکتا ہوں اور اختلاف بھی۔ مثلاً آپ کا کہنا صحیح ہے کہ محبت ایک دماغی بیماری ہے۔ مگر ایسی بیماری جس سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ شاعروں نے محبت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ دقیانوسی شاعروں نے محبت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ نفسیاتی، جسمانی اور سماجی حقیقتوں کو نظر انداز کرتا ہے مگر آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ کسی مرض کا بہترین علاج اِس کی ہجو کرنا ہے۔ محبت کے موجودہ نظریہ کی ذمہ داری ہمارے سماجی حالات پر ہے۔ جس سماج میں ہزار میں سے ایک شادی بھی فریقین کی مرضی سے نہ ہوتی ہو۔ اور جہاں شہری عورتوں کی ایک بڑی تعداد پردے میں رہتی ہو۔ وہاں شاعر اگر خیالی معشوقوں سے محبت نہ کریں تو اور کس سے کریں اور آپ" اس نے کمالی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ سچ کہتے ہیں کہ محبت کو شادی بیاہ کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ اور میرا نظریہ تو یہ ہے کہ انسانی ارتقاء کی مکمل ترین منزل میں ہم سب قسم کے قوانین سے آزاد ہوں گے مگر موجودہ سماجی حالات میں موتی لال صاحب کا خیال صحیح ہے کہ شادی ہی محبت کو اصلیت کے معنی پہنا سکتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں ان کے والدین اپنی اولاد کو ان کی مرضی کے خلاف شادیوں میں جکڑ دیتے ہیں۔ آزاد محبت کے خواب بیکاری کا مشغلہ نہیں تو کیا ہے؟ عشق و محبت پر بیکار خیالی محبت کرنے کے بجائے اگر آپ ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی پسند پر شادی کرنے کا حق دلانے کے لیے جہاد کریں تو ہزاروں زندگیوں کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔"

اب ہمیں حامد کی گفتگو میں دلچسپی ہو چکی تھی۔ میں نے کہا۔'' آپ بات بہت معقول کہہ رہے ہیں۔ اور شاید آپ اس نتیجہ پر اپنے ذاتی تجربہ سے پہنچے ہیں اگر کوئی ہرج نہ ہو تو کیا آپ ہمیں بھی اپنے راز میں شریک کر سکتے ہیں۔''

حامد کے چہرے پر پھر وہی گھبراہٹ کے آثار پائے گئے۔ گویا باتوں باتوں میں کسی نے اس کے پوشیدہ دلی جذبات پر سے پردہ ہٹا دیا ہو۔'' جی نہیں اس نے اپنی گھبراہٹ کو دور کرتے ہوئے جواب دیا۔

'' مجھے تو عشق و محبت کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے البتہ میرے ایک عزیز دوست پر چند واقعات ایسے ضرور گذرے ہیں جو شاید اس مسئلے پر روشنی ڈال سکیں کیوں کہ تقریباً یہی واقعات ہر متوسط درجہ کے ہندوستانی مسلمان گھرانے میں پیش آتے رہتے ہیں اور شاید کسی حد تک یہی صورت حال ہندو گھرانوں میں بھی عام ہے۔''

ہمارے اصرار پر حامد نے اپنے دوست کا قصہ بیان کرنا شروع کیا اس کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ ہم فوراً ہی سمجھ گئے کہ اپنا عزیز دوست وہ خود ہے۔

میرا دوست (حامد نے بیان کیا) میرا ہی ہم نام بھی تھا دہلی کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرحوم والد پنجاب میں تحصیلدار تھے اور رشوت لینے میں کبھی بخل نہ کیا تھا۔ کافی جائیداد چھوڑی تھی جس کی آمدنی سے حامد اور اس کی ماں فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے باپ اپنے زمانہ کے لحاظ سے خاصے تعلیم یافتہ تھے اور چونکہ سرکاری نمک کھایا تھا اس لیے اپنے لڑکے کو بھی انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تا کہ کوئی اچھی سرکاری نوکری مل سکے۔ غرض حامد مشن کالج میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل لے کر آیا تھا۔ تاریخ، فلسفہ، معاشیات اور لٹریچر کی تعلیم نے اس کے خیالات میں فراست اور پختگی پیدا کر دی تھی وہ فطرتاً خاموش پسند اور سنجیدہ نوجوان تھا کالج کے دوسرے لڑکوں کی جنسی دلچسپیوں سے دور رہتا تھا۔ اس کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جہاں پردہ شد و مد سے کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں، خالہ یا رشتہ کی بہنیں کبھی باہر جاتی تھیں تو برقعہ پہننے پر بھی تانگہ پر چادر

بندھوائی جاتی تھی۔ اس کے مطالعہ اور تجربہ نے پردہ کے نقصانات کو اس پر واضح کر دیا تھا۔ لیکن بچپن سے ماں باپ کی اطاعت کا ایسا سبق پڑھایا گیا تھا کہ کبھی یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اپنے خیالات کا اظہار خود اپنے گھر میں کر سکے۔ غرض وہ ایسی دنیا میں رہتا تھا جہاں غیر عورتوں کا جن میں وہ رومانی دلچسپی لے سکے نام بھی نہ تھا۔ اس کی کلاس میں دو چار لڑکیاں پڑھتی تھیں لیکن ان سے بات کرنے کی اس کو کبھی ہمت نہ ہوئی تھی ان کے علاوہ سوائے سینما کے روپہلی پردے اور بازار یا سڑک پر کسی بے پردہ عورت کی ایک جھلک دیکھ لینے کے وہ دوسری صنف سے بالکل ناآشنا تھا۔

پہلی لڑکی جس سے اُس کی ملاقات ہوئی بلقیس تھی۔ وہ اِس کے کالج کے ایک آزاد خیال پروفیسر عبدالرحیم کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور ایف۔ اے میں تعلیم حاصل کرتی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم انگریزی ادب پڑھاتے تھے اور چونکہ حامد اپنے کلاس میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا اس میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ اس دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم اِس قسم کے آزاد خیال لوگوں میں سے تھے جو اپنی بیویوں کو اس لیے پردہ سے باہر نکالتے ہیں کہ انگریزی اور فیشن ایبل سوسائٹی میں گھل مل سکیں اور بیٹیوں کو اس لیے پردہ نہیں کراتے تاکہ کسی آئی سی ایس سے شادی ہو جائے۔ پردہ توڑنے کے سماجی اور انسانی فوائد ان کے پیش نظر نہ تھے۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ان کی بیوی ان کے ہمراہ کلب جا سکے اور ان کی بیٹی کی شادی کسی آئی۔ سی۔ ایس یا اسی قسم کے دوسرے اعلیٰ سرکاری عہدہ دار سے ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حامد میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں ضرور شامل ہوگا۔ اور قوی اُمید تھی کہ کامیاب بھی ضرور ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر انھوں نے ایک دن حامد کو اپنے ہاں چائے پر بلایا۔ پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ابھی تیار نہ ہوئے تھے۔ بلقیس نے مہمان کا استقبال کیا۔ یہ حامد کے لیے پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی لڑکی سے دوبدو بات کی ہو۔ اس لیے قدرتی طور پر گھبرا رہا تھا مگر بلقیس نے جو اٹھارہ برس کی عمر میں نہایت تیز اور ہوشیار تھی اس کو بہت جلد باتوں میں لگا لیا۔ گفتگو کے دوران میں نظر بچا کر حامد بلقیس کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔

اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔شلوار، قمیض اور گلابی دوپٹہ میں کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔اس کے سیاہ گھونگریالے بال اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں بلقیس کی خصوصیات تھیں۔ ان آنکھوں میں حامد کے لیے خاص دلکشی تھی۔اس نے اتنی خوب صورت آنکھیں فقط ایک مرتبہ شکار میں ایک ہرن کی دیکھی تھیں۔ جب تک بلقیس اس سے باتیں کرتی رہی اور اس کے بعد جب پروفیسر اور ان کی بیوی بھی شامل ہوگئے حامد کی نگاہیں بار بار بلقیس کی طرف اٹھتی رہیں جب حامد اور پروفیسر عبدالرحیم نے ایک ادبی مسئلہ پر بحث چھیڑی دی تو بلقیس کی والدہ جن کی علمی قابلیت واجبی ہی واجبی تھی اُٹھ کر چلی گئیں لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔گفتگو کے دوران میں حامد نے اس کی طرف نگاہ کی تو اس انداز میں وہ اور بھی بھلی معلوم ہوئی۔اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں پر سہارا دیے خاموش بیٹھی تھی۔حامد کو فوراً خیال ہوا کہ اس طرح وہ ایک موتیا کی کلی سے کس قدر مشابہ تھی۔چائے پینے کے بعد حامد رخصت ہوا تو بلقیس نے اُمید ظاہر کی کہ وہ آئندہ بھی کبھی کبھی ملتا رہے گا۔

اس رات کو حسبِ معمول جب حامد کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھا تو اس کے دماغ میں شام کی یاد تازہ تھی۔بار بار کتاب کے صفحے پر الفاظ سمٹ کر دو ہرن جیسی خوب صورت آنکھیں بن جاتے اور پھر وہی الفاظ پھیل کر ایک مسکراتا ہوا معصوم چہرہ بن جاتے جو موتیا کی کلی سے مشابہ تھا۔اس رات حامد کی پڑھائی نہ ہوسکی۔بلقیس سے اس ملاقات نے حامد کی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا کردیا۔اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دنیا کی تنہائی اور اندھیرے میں کسی رفیق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ جتنے لڑکے اس کے دوست تھے اُن کی صحبت میں اس کو اب وحشت ہونے لگی۔ وہ بھدے اور بھونڈے مذاق کرتے تھے۔اس کی قدرتی جھینپ اور سادہ لوحی پر ہنستے اور معاشرتی مسائل پر اس کے سنجیدہ خیالات کو حماقت خیال کرتے تھے۔ان کے نزدیک طالب علم کی زندگی کا مقصد کرکٹ کھیلنا، اچھے کپڑے پہننا اور دنیا کی ہر لڑکی کے متعلق بھی ناشائستہ انداز میں رائے زنی کرنا تھا۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حامد کی آمدورفت پروفیسر عبدالرحیم کے ہاں ہے تو انھوں نے اس کے اور بلقیس کے متعلق بھی پست مذاق کرنا شروع کیا جو حامد کو سخت ناگوار گذرا۔ اس کو معلوم تھا کہ مذاق کی تہہ میں حسد ہے کہ بلقیس ان لوگوں کے بجائے، حامد جیسے سیدھے اور کم

رو شخص میں کیوں دلچسپی لیتی ہے لیکن پھر بھی لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ نے اِس کو دل میں اپنے اور بلقیس کے تعلقات کی جانچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلقیس سے ملتے اس کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا اس عرصہ میں اِن کو ایک دوسرے میں کافی دلچسپی ہو چکی تھی۔ گو بلقیس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ ان میں سے کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ برخلاف اِس کے وہ حامد کا خاص خیال رکھتی تھی۔ حامد کو سیاسیات اور سماجی مسائل سے خاص شغف تھا۔ اس کی خاطر بلقیس نے بھی، جو اب تک کالج کی دوسری لڑکیوں کی طرح ملکی سیاست سے نابلد تھی، ان مسائل میں دلچسپی لینی شروع کی۔ حامد کے مشورہ سے سنجیدہ لٹریچر کا مطالعہ کیا اور دل ہی دل میں حامد کی شکر گزار ہوئی کہ اس نے ایسی زبردست اور دلچسپ دُنیا کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا ہے۔

حامد کے دل میں بلقیس کی شخصیت آہستہ آہستہ گھر کرتی گئی۔ گو اگر اِس سے کوئی کہتا کہ اس کو بلقیس سے محبت ہے تو وہ فوراً اس کی تردید کر دیتا لیکن یہ واقعہ تھا کہ اس سے ملنے کی خاطر وہ دنیا کے بڑے سے بڑے کام کو ملتوی کر دیتا۔ وہ بلقیس سے اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتا۔ اپنی اُمیدیں، ارادے، اُمنگیں سناتا اور جس ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ بلقیس اِس کی باتیں سنتی وہ اس کو کہیں اور نہ نصیب ہو سکتی تھیں۔ مگر کیا اس کو بلقیس سے محبت تھی؟ یہ وہ سوال تھا جو اکثر اس کو پریشان کرتا تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ حامد ٹینس ٹورنامنٹ جیتا تو بلقیس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور بلقیس امتحان میں اول آئی تو حامد نے محسوس کیا گویا یہ خود اُس کی کامیابی تھی۔ کیا اسی کا نام محبت ہے؟ اِس کا حامد فیصلہ نہ کر سکا۔'' وہ عشق کے عام لیلیٰ مجنوں والے مفہوم کا قائل نہ تھا۔ اِس کو یقین تھا کہ اگر بلقیس کو اس سے ملنے کی ممانعت کر دی گئی تو قیسِ نجد کی طرح وہ مارا مارا نہ پھرے گا۔ مگر پھر بھی اگر بلقیس سے ملے اِس کو ایک ہفتہ ہو جاتا تو وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا۔ کبھی کبھی اِس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیا وہ بلقیس سے شادی کر کے اِس کو تمام عمر کے لیے اپنی رفیق بنا سکے گا۔ مگر اپنے خاندانی حالات اِس کی نظر کے سامنے تھے اور یہ نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اِس کے گھر والے ایک بے پردہ لڑکی کو بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں۔ اِسی اُلجھن میں وہ دل کو یوں بھی سمجھاتا کہ شاید بلقیس کے دل میں اِس کے لیے دوستی کے علاوہ کوئی دوسرا

جذبہ ہی نہیں ہے۔ اور آخر اِس میں ایسی کون سی خوبی تھی جس کے لیے بلقیس اس سے محبت کرے؟ ایسی حالت میں اِس سے شادی کرنے کا خیال بھی دل میں لانا بے کار تھا۔

اِسی زمانہ میں ایک ایسا واقعہ ہوا۔ جس نے حامد کے دلی سوالات کا جواب دے دیا۔ مگر ساتھ ہی اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

ہوا یہ کہ حامد ملیریا میں مبتلا ہو کر بیمار پڑا۔ لاپرواہی کی بدولت ملیریا ٹائیفائیڈ میں تبدیل ہو گیا۔ دو ہفتہ تک نہ کالج ہی جا سکا اور نہ بلقیس ہی سے مل سکا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ پرچہ لکھ کر بھیج دے۔ مگر ماں کے خوف سے خاموش رہا۔ اس کو معلوم تھا اِس کی ماں بے پردہ لڑکیوں کے خلاف ہے اور اگر اِس کو معلوم ہو گیا کہ اِس کے لڑکے کی دوستی بلقیس کے ساتھ ہے تو وہ از حد خفا ہو گی اور ممکن ہے کہ آئندہ ملاقات کو حکماً بند کرے۔ اس معاملہ میں حامد اپنی ماں سے بحث نہ کر سکتا تھا۔ صدیوں سے اُس کے خاندان کی عورتوں کو یہی تعلیم دی گئی تھی کہ پردہ مذہب دایمان کا جزد ہے اور شرافت کی نشانی ہے۔ دو ایک بار اس نے اپنی دبی زبان سے پردہ کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر ہر دفعہ اِس کی ماں نے اِس قدر سختی کے ساتھ ڈانٹا کہ اب ہمت نہ پڑتی تھی کہ بے پردگی کی حمایت میں ایک لفظ بھی نکال سکے۔ جب اِس کو بخار آئے آٹھ دن ہو گئے اور بلقیس کو کالج میں معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے تو اُس سے نہ رہا گیا اور اپنے باپ سے اجازت لے کر وہ حامد کو دیکھنے اُس کے گھر پہنچی۔ بلقیس کو آتے دیکھ کر حامد حیران رہ گیا۔ اُس کو یہ نہ معلوم تھا کہ وہ لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ کیے بغیر اِس سے ملنے کی خاطر تنِ تنہا چلی آئے گی۔ اِس دن اِس کا بخار ہلکا تھا۔ اپنی صحت کا یقین دلا کر بلقیس کو جلدی ہی رخصت کر دیا۔ لیکن اِس وقت پہلی بار معلوم ہوا کہ اِس کو بلقیس سے اور بلقیس کو اِس سے محبت ہے۔

بلقیس گھر سے نکلی تھی کہ گھر کی ماما گلابو نے حامد کی اماں سے ہنس کر کہا۔

''لو بہو خود ہی گھر دیکھ گئی۔ مبارک ہو۔''

اس کا یہ کہنا ہی تھا کہ حامد کی اماں (جو اب تک دوسرے کمرے میں بیٹھی تھیں گویا بے پردہ لڑکی کی شکل دیکھنا بھی ان کو ناگوار تھا) اس پر برس پڑیں۔ خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی ہو۔ نوج یہ فرنگن میری بہو بنے۔ نہ لحاظ نہ شرم میرے گھر میں ایسی لڑکیوں کا گذر نہ ہو گا۔''

حامد کو آج اندازہ ہوا کہ باوجود اپنی اور تمام خوبیوں کے اس کی ماں پردے کے معاملہ میں کس قدر متعصب ہے۔ یہ اس کو ہمیشہ سے معلوم تھا کہ وہ پردہ کی سخت حامی ہے اور بے پردگی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لیے اس نے بلقیس سے اپنی دوستی کو گھر والوں سے چھپایا تھا۔ اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس کا تعصب اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ وہ ایک شریف اور معصوم لڑکی کی مخالف فقط اس بنا پر ہو جائے گی کہ وہ متوسط درجے کے رواج کے مطابق برقعہ نہیں پہنتی۔ یہ تو انتہائی بے انصافی اور صریح ظلم تھا۔ حامد کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت ماں سے بحث کرے۔ اس کو قائل کرے کہ پردہ نہ مذہب کا جزو ہے نہ عصمت کا محافظ بلکہ ایک بیکار رواج ہے جس کی بدولت لاکھوں عورتیں دق۔ اختلاج قلب اور دوسرے مہلک امراض میں مبتلا ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ بلقیس کی خوبیوں، اس کے اخلاق، اس کی انسانی ہمدردی، اس کے ایثار۔ اس کی اخلاقی جرأت کا ذکر کرے اور اپنی ماں کو اِس لڑکی کی عزت کرنے پر مجبور کرے لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بے کار ہوگا۔ اس کی ماں اپنی عمر کے لحاظ سے اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔ عقلمند اور دانا خاتون تھی تمام محلّہ والوں سے اِس کا برتاؤ ایسا تھا کہ سب اِس کی عزت کرتے تھے۔ غریبوں کی پرورش، ضرورت مندوں کی امداد کے لیے وہ کبھی دریغ نہ کرتی تھی۔ ہر ایک سے خواہ وہ گھر کی مہترانی ہی کیوں نہ ہو خندہ پیشانی سے پیش آتی۔ کسی کا دکھ اِس سے دیکھا نہ جاتا تھا اور اگر وہ کسی کو سکھ پہنچا سکتی تو کبھی اپنی تکلیف کا خیال نہ کرتی۔ روپیہ پیسہ محنت ہمدردی جس طرح بھی ممکن ہوتا دوسروں کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتی۔ اِس کی زبان سے کسی کے لیے آج تک کوئی بُرا لفظ نہ نکلا تھا لیکن تنگ نظر مذہبی تعلیم اور رواج کی غلامی نے اِس کو اور اِس قسم کی دوسری عورتوں کو پردے کے معاملے میں اول درجہ کا متعصب بنا دیا تھا۔

اِن کی حالت اِس چینی قیدی کی مانند تھی جس کو چالیس سال تک اندھیری کوٹھری میں قید رکھنے کے بعد جب رہا کیا گیا تو سورج کی روشنی سے اِس کی آنکھیں اِس قدر چکا چوند ہو گئیں کہ اِس نے گڑگڑا کر درخواست کی اِس کو پھر اِسی کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ اس کو اپنی ماں کے خلاف کوئی غصہ نہ تھا۔ ایسے قیدی پر کیا غصہ کیا جائے جو اپنی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے محبت کرے اور اِن کو اپنے لیے باعث آسائش سمجھے لیکن حامد کے دل میں بے پناہ غصہ تھا، اِس رواج

اور اِن رسوم کے خلاف جو اِس جہالت اور ظلم کے لیے ذمہ دار تھیں۔ گھنٹوں وہ بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح اس کا ملک اس پردہ کی لعنت سے پاک کیا جاسکتا ہے لیکن پھر جب اِس نے اپنے اور بلقیس کے آئندہ تعلقات کے مسئلہ پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہوا کہ وہ اپنی ماں کو ناراض نہیں کرسکتا۔ وہ ضعیف تھی، بیمار تھی اور اس کو اپنے لڑکے سے از حد محبت تھی۔ اِس نے اپنی زندگی میں کوئی سکھ نہ پایا تھا۔ رواج کے مطابق شوہر سے اکثر علیحدہ رہی۔ اس لیے کبھی زوجیت کے خوشگوار تعلقات پیدا نہ ہوسکے۔ کئی اولادیں نادانی اور جہالت کے باعث بچپن ہی میں مرگئیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اِس کا کوئی تھا تو حامد تھا۔ وہ حامد کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی ماں کے موجودہ رویہ کے ہوتے ہوئے بلقیس سے تعلقات قائم رکھنا اور اس سے شادی کرنا اس لڑکی کے ساتھ بھی بے انصافی تھی۔ حامد کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنی عزیز ترین دوست کو ایسے گھر کی بہو بنائے جہاں اِس کی عزت نہ کی جاتی ہو۔ لیکن کیا انصاف کی رد سے وہ بلقیس کی محبت کو اپنی ماں کی محبت پر قربان کر کے اس طرح ٹھکرا سکتا تھا۔ جس لڑکی نے اس جیسے غیر دلچسپ خشک اور کم رو انسان کے لیے اتنا کچھ کیا ہو۔ اِس کی زندگی میں پہلی بار دوسری جنس کی رفاقت کے لطیف عنصر کو داخل کیا ہو۔ اس کی خاطر درجنوں شکیل، حسین، اور امیر لڑکوں کی پرواہ نہ کی ہو............ کیا اس کے ساتھ ایسا سلوک جائز تھا۔ تمام رات اِسی ادھیڑ بُن میں لگا رہا۔ ماں کی محبت یا بلقیس کی محبت؟ ان میں سے ایک کو بھی وہ قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ صبح ہوتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کی ان دو محبوب ترین ہستیوں کی محبت پر اپنی غیرت اور اپنی شخصیت قربان کردے گا۔

بخار سے صحت یاب ہونے پر جب حامد کالج واپس آیا تو بلقیس نے اس کے برتاؤ میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ اس نے اب پروفیسر عبدالرحیم کے گھر جانا بند کردیا۔ کبھی بلقیس ملتی تھی تو بدتمیزی سے منہ موڑ کر کسی اور سے باتیں کرنے لگتا، دوسری لڑکیوں میں زبردستی گھس کر بیٹھتا اور عام لڑکوں کی طرح بھدے مذاق کرتا۔ وہ حامد جو کبھی پارسائی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اب باقاعدہ شرابیوں میں شمار ہونے لگا۔ آوارہ لڑکوں کے ساتھ گانے والیوں کے کوٹھوں پر جانا شروع کردیا۔ سال کے اخیر تک حامد کی آوارگی کا سکہ جم گیا۔ امتحان میں ذلت کے ساتھ فیل ہوا۔ مگر

حامد نے دل میں ایسا محسوس کیا گویا اس نے دنیا کے سب سے بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب بلقیس کو اس سے محبت کی بجائے نفرت ہوگئی تھی۔ اس عرصہ میں حامد اور بلقیس کے تعلقات کا رنگ یکا یک بدل جانے پر کالج کے حلقوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ افترا پردازوں، حاسدوں اور بلقیس کے ناکام عاشقوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ بعض تو یہ بھی کہتے تھے کہ حامد کی سابقہ پارسائی فقط ایک دکھاوا تھی تا کہ بلقیس پر اپنا اثر جما سکے اور ''مطلب نکل جانے کے بعد'' وہ اپنی اصلیت پر واپس آ گیا تھا۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ بلقیس بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک آئی۔ سی۔ ایس شوہر کی تلاش میں تھی۔ حامد جیسے لائق طالب علم سے اُس کو اُمید تھی کہ وہ ضرور سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوگا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ حامد سرے سے سرکاری ملازمت ہی کے خلاف ہے تو اس نے ایسے بے کار آدمی کو دھتا بتائی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بلقیس کا کالج آنا مشکل ہو گیا اس نے اپنا نام کٹا لیا۔ حامد کی طرف سے نا اُمید ہو کر جس کو وہ خلوص اور وفاداری کا پتلا سمجھتی تھی۔ بلقیس مردوں کی ذات سے ہمیشہ کے لیے بدگمان ہوگئی تھی اب کسی دوسرے سے محبت کرنا اس کے لیے ناممکن تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد سنا گیا کہ ''زبان خلق'' کے حملوں سے بچنے کے لیے اور اپنے باپ کے اصرار پر اس نے ایک فوجی لفٹنٹ سے شادی کرنا منظور کر لیا۔

اِتنا کہہ کر حامد رُک گیا اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ قصہ سنا کر اِس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

''اِس کے بعد؟'' موتی لال نے خاموشی کو توڑا۔

اِس کے بعد، حامد نے کہنا شروع کیا'' اِس ٹریجڈی کا آخری باب شروع ہوا جس وقت لفٹنٹ سے بلقیس کی شادی ہوئی وہ اول درجہ کا شرابی اور دو مہلک پوشیدہ بیماریوں میں مبتلا تھا ایک سال ہوا.......... اس کی آواز مشکل سے نکلتی تھی اور وہ زمین کی طرف مجرمانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی قتل کا اقبال کر رہا ہو؟ ......ایک سال ہوا وہ دونوں ان مرضوں کا شکار ہوئے۔ حامد کی ماں نے اِس کی شادی ایک رشتہ دار لڑکی سے کر دی جو دائم المریض تھی اور جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ ازدواج کا بوجھ نہ سنبھال سکے گی مگر خاندانی لال بجھکڑوں نے ڈاکٹروں

کی رائے کو ہذیان سمجھا اور اُلٹا فتویٰ دے دیا کہ شادی تو ایسی اکسیر ہے جس سے تمام مرض دور ہو جاتے ہیں۔ حامد جو دل میں اس شادی کے از حد خلاف تھا ماں کے ارادے کے مقابلے میں اپنی آواز اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اِس کے علاوہ بلقیس سے قطع تعلق کے بعد اِس نے طے کر لیا تھا کہ اس کی ماں اگر کسی اندھی، کانی، لنگڑی، لولی لڑکی سے بھی اس کی شادی طے کرے گی تو وہ اس کو بھی منظور کر لے گا۔ اِس کی حالت عجیب تھی۔ اِس نے رواج پرست سماج سے ہار مانی تھی۔ جو چیز اِس کے لیے بلقیس کے چھٹ جانے سے بھی کہیں زیادہ ناقابل برداشت تھی وہ یہ احساسِ شکست تھا۔ سماج اس کو ایک بے پناہ سمندر معلوم ہوتا تھا جس کی خوفناک موجوں میں ہر انسان کی انفرادی شخصیت اور ہر انقلابی ذہنیت کے لیے موت کا سامان ہے۔ وہ اِن جوان مردوں میں سے نہیں تھا جو اپنی ہمت کے سہارے سماج کے ساگر کو پار کر کے اپنے خیالات کی بنیادوں پر نئی دنیا بساتے ہیں۔ وہ فطرتاً کمزور تھا۔ دنیا کے بزدلوں کی طرح اس نے چند تھپیڑوں سے پریشان ہو کر چپو پھینک دیے۔ اب اس کی کشتی بھنور میں تھی اور اِس کے ساتھ دوسروں کی کشتیاں بھی۔

''سکینہ جس کو اپنی شادی طے کرنے میں کوئی دخل نہ تھا۔ جب حامد کی بیوی بن کر آئی تو اِس نے شریف لڑکیوں کی طرح شوہر کی ہر طرح خدمت کرنے کی کوشش کی۔ مگر جس کے دل کا شیشہ ایک بار ٹوٹ جائے وہ پھر نہیں جُو سکتا۔ حامد نے اپنی بیوی سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ بیچاری بیمار ہمیشہ سے تھی چھ ماہ بعد اِسی غم میں گھل کر مر گئی۔ حامد کی ماں بھی کچھ عرصہ بعد چل بسی۔ اکثر پردہ دار عورتوں کی طرح اِس کو دِق کا مرض مدت سے تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد وہ فقط اِس اُمید پر زندہ تھی کہ حامد کا سہرا دیکھے۔ بیٹے کی آوارگی کو اِس نے ناکتخدائی کی بدعنوانیوں پر محمول کیا۔ اور جتنی جلدی ممکن ہو سکا اِس کی شادی سکینہ کے ساتھ کر دی۔ لیکن اِس کو کیا معلوم تھا کہ حامد کو جو مرض لاحق تھا اِس کا علاج اِتنا آسان نہ تھا۔ جب شادی کے بعد بھی اِس نے دیکھا کہ حامد کی حالت بہتر نہ ہوئی تو اِس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی ایسا ہونہار لڑکا جس سے اِس کو اور تمام خاندان والوں کو بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں یوں دیکھتے دیکھتے تباہ ہوا جا رہا تھا ایک بار فیل ہونے کے بعد کالج سے اِس نے ہمیشہ کے لیے نام کٹا لیا تھا۔ باوجود رشتہ داروں کے اصرار کے اِس نے سرکاری نوکری کے لیے کوشش کرنے سے انکار کر دیا۔ شراب نوشی اور کوٹھوں پر جانا

جو اِس نے بلقیس کا دل اپنی طرف سے پھیرنے کے لیے شروع کیا تھا اِس کی مستقل عادت بن چکا تھا۔ ماں نے لاکھ کوشش کی، سمجھایا ڈانٹا لیکن حامد کی حالت نہ سنبھلی۔ بیٹے کی طرف سے مایوسی نے بڑھیا کا دل توڑ دیا اور وہ بیچاری بغیر یہ جانے کہ اپنے بیٹے کی زبوں کی حالت کی ذمہ دار وہ خود تھی اِس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئی۔ مگر اِس کی موت نے حامد کے دل میں یہ خوفناک سوال پیدا کر دیا کہ کیا وہ خود اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار تھا؟ کیا اِس نے ایک بے پردہ بہو کے صدمہ سے بچا کر اس کو اِس سے بھی بڑا صدمہ اپنی آوارگی سے نہ پہنچایا تھا۔ جو قربانی اِس نے اپنی ماں کی محبت کی خاطر کی تھی اب بے کار نظر آنے لگی۔ اِس کو یہ بھی شبہ ہوا کہ بلقیس سے قطع تعلق اس نے ماں کی خاطر سے نہیں شاید سماج کے خوف سے کیا تھا اور ساتھ ہی اِس کو اِس خیال نے بھی ستایا کہ ممکن ہے بلقیس اور اپنی بیوی کی موت کے لیے وہ خود ہی ذمہ دار ہو۔ اگر اس نے پرلے درجہ کی کمزوری دکھانے کی بجائے ہمت سے کام لیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اِن تینوں میں سے ایک کی جان بھی ضائع نہ ہوتی — اسی خیال نے اِس کو تقریباً پاگل بنا دیا۔

رات اور دن اِس کا ضمیر اِس کو الزام دیتا تھا۔ وہ اتنا پریشان ہو گیا کہ رہی سہی جائیداد بیچ کر آوارہ گردی کو نکل گیا کہ شاید سفر سے دل کو سکون حاصل ہو۔ دہلی سے کلکتہ، کلتہ سے مدراس، مدراس سے بمبئی لیکن اس بھیانک خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ہم لوگ حامد کی کہانی بڑے غور سے سن رہے تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے اور جب اس نے تھک کر بولنا بند کیا، تو اس کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ پسینہ میں شرابور وہ اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے شکاری کتوں سے گھر کر ہرن موت کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جب ہماری گفتگو شروع ہوئی تھی تو ہمیں یہ خیال بالکل نہ تھا کہ ایک اجنبی پہلی ملاقات میں اپنی زندگی کی داستان سنا ڈالے گا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنی کہانی سنانے کے لیے اس قدر بیتاب تھا کہ ذرا سے بہانے پر اس نے تین غیر متعارف شخصوں کو شروع سے اخیر تک تمام تفصیلات سنا ڈالیں۔

''تو کیا وہ کسی فیصلہ پر پہنچ سکا؟'' کمالی نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔

'ہاں' حامد نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ جیسے عدالت میں فیصلہ سنایا جاتا ہے۔'' اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مجرم تھا۔''

اور یہ کہتے ہی وہ اُٹھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ جب تک ہم میں سے کوئی آواز دے سکے وہ کافی دور نکل گیا۔

کمالی نے کہنا شروع کیا۔ ''عشق جو کائنات کی بنیاد اور رمزِ حیات کی اصلیت ہے سماج کے وقتی حالات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا............''

لیکن وہ دفعتاً رُک گیا۔ اس وقت شاید خود اس کو بھی ان شاعرانہ الفاظ کے کھوکھلے اور لغو ہونے کا احساس تھا۔

اِس عرصہ میں حامد دور ایک نقطہ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ محیطِ کائنات میں ایک بے حقیقت نقطہ۔ چند ہی لحہ میں وہ نقطہ بھی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ پھر ساحل پر وہی سناٹا تھا اور سورج ایک خونیں سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

O

ایک لڑکی

(اس کہانی میں کوئی کیریکٹر قطعی فرضی نہیں ہے)

(1)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی تاریخ میں 2037 یادگار رہے گا کیونکہ اِس سال ہندوستانی مسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں سرکاری طور پر مخلوط تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ قصہ بھی عجیب ہے کہ کس طرح یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد اس سنسنی خیز تبدیلی کے لیے قانوناً مجبور کیے گئے۔ ننانوے سال پہلے ہندوستان کے مشہور قوم پرست جرنلسٹ اور سماجی کارکن سلیم الزماں صحافی نے مسلم یونی ورسٹی ممبرانِ کورٹ و اِگزیکٹیو کونسل کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس میں ان بزرگانِ قوم پر قومی امانت کے خلاف ناجائز مصرف کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔

سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ مسلم کے نام سے جتنا روپیہ جمع کیا گیا تھا وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے تھا، نہ کہ فقط مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لیے اور حکومت نے جب یونی ورسٹی کا چارٹر منظور کیا تھا تو اس میں بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ یونی ورسٹی تمام مسلمانوں کی تعلیم کے لیے قائم کی جاتی ہے یہ کہیں تخصیص نہ کی گئی تھی کہ مسلمانوں سے مراد فقط مسلمان مرد ہیں۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں سلیم الزماں صحافی نے مشہور زبان دانوں کا فیصلہ پیش کیا تھا کہ لفظ 'مسلمان' عورتوں

اور مردوں دونوں کے لیے یکساں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اُس نے مقتدر علماء دین سے بھی ایک فتویٰ حاصل کیا تھا۔ جس میں انھوں نے متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ گو اکثر مسلمان مردوں پر کسی نہ کسی مولوی نے کبھی نہ کبھی کفر کا فتویٰ لگایا ہے لیکن عورتوں کو ایک جماعت کی حیثیت سے اس وقت تک اسلام سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ اتنے عرصے تک یونی ورسٹی کے دروازے لڑکیوں کے لیے بند رکھ کر ممبرانِ کورٹ و اگزیکیٹو کونسل قومی روپے کے ناجائز استعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ مقدمہ جب یکم اپریل 1938 کو پہلی بار علی گڑھ کے کلکٹری عدالت میں پیش ہوا تو تمام ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ مسٹر جناح کی مسلم لیگ، ہز ہائی نس آغا خاں کی مسلم کانفرنس، مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی، مولوی مظہر الدین کی جمیعۃ العلماء صدر یار جنگ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر خالص اسلامی انجمنوں نے تیرہ ہزار دو سو ستاون جلسے کیے جن سب میں کل تعداد حاضرین کی تیرہ ہزار ایک سو پچاس نفوس تھی۔ اِس کے علاوہ سلیم الزماں صحافی پر ستائیس مفتیوں نے کفر کے فتوےٰ لگائے اور سترہ اخباروں نے اِس پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے روپیہ لے کر کھا گیا ہے۔ مسٹر جناح سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے چودہ نکات میں ایک پندرہویں نکتے کو اور شامل کرلیں کہ ازل سے لے کر ابد تک مسلم یونی ورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی جاری نہ کی جائے گی۔

سیٹھ اللہ دیا کی صدارت میں مسٹر محمد علی جناح نے بھنڈی بازار، بمبئی کے مسلمانوں کو خالص انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ گو میں 'ایک علماء' نہیں ہوں مگر سلیم الزماں صحافی کی ہندو پرست حرکت کی سخت مذمت کرتا ہوں۔" آپ نے یہ بھی فرمایا مسلمان کی حیثیت سے وہ مسلم یونی ورسٹی میں مخلوط تعلیم کے اجراء کے سخت خلاف ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنی صاحبزادی کو کبھی علی گڑھ بھیجنے کا خیال بھی نہ کیا اور یورپ کے مخلوط اداروں میں تعلیم دلوائی۔ آخر میں آپ نے پانچ ہزار روپے روز پر اپنی قانونی خدمات پہ مقدمے لڑنے کے لیے مسلم یونی ورسٹی کو پیش کیں۔ جس پر بھنڈی بازار کے مسلمانوں نے 'اللہ اکبر' کے نعرے بلند کیے کیونکہ انگریزی سے ناواقف ہونے کے باعث وہ سمجھتے تھے کہ مسٹر جناح نے بے کار بے روزگار

مسلمانوں کو فاقے سے بچانے کے لیے پانچ ہزار روپے چندے کا اعلان کیا ہے۔ اس جلسے کے بعد مسٹر جناح نے ایک بیان شائع کیا کہ جب تک کانگریس اپنے گرگوں سے ایسے مقدمے دائر کراتی رہے گی وہ کانگریسی لیڈروں سے فرقہ وارانہ مصالحت کی گفتگو نہ کریں گے اور یہ بھی کہا کہ بھنڈی بازار کے جلسے نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلم عوام بھی اس رائے میں مسٹر جناح کے ہم خیال ہیں۔ اس بیان کی تائید سر ابوالبقاء اور سر امین خاں نے کی۔ جنھوں نے کہا کہ نہرو رپورٹ کے بعد یہ مقدمہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر کانگریس کا دوسرا حملہ ہے۔

یہ تھی زبردست ابتداء اس مقدمے کی جو ننانوے برس تک مختلف عدالتوں میں چلتا رہا اور اس عرصہ میں تیرہ مرتبہ پریوی کونسل میں پیش ہوا۔ سلیم الزماں صحافی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے رحیم الزماں صحافی نے اس مقدمے کو جاری رکھا اور اس کے بعد اُس کے لڑکے کلیم الزماں صحافی نے۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں کئی انقلابات ہوئے اور حکومتیں تبدیل ہوئیں لیکن مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا۔ 205 میں جب کلیم الزماں صحافی کا انتقال ہوا تو یہ مقدمہ ورثے میں اُس کی اکلوتی بیٹی صحافی کو ملا۔ اگلے ہی سال جب تیسری سوراج حکومت قائم ہوئی تو اس نے فوراً طے کر دیا کہ مسلم یونی ورسٹی کے افسران کو لڑکیوں کا داخلہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر انھوں نے اپنا یہی طرزِ عمل جاری رکھا تو حکومت یونی ورسٹی کی عمارتیں ضبط کر کے وہاں ایک چڑیا گھر قائم کر دے گی۔

اِس فیصلہ پر مسلم یونی ورسٹی کے طالب علموں کی یونین نے مبارک باد کا ریزولیشن پاس کیا۔ ہارون ناصری کی تجویز اور حامد عباسی کی تائید پر بجٹ میں دو سو روپے خواتین طالب علموں کے بیٹھنے کے لیے مخملی صوفوں کے واسطے منظور کیے لیکن ایک سال تک وہ مخملی صوفے بے کار پڑے رہے کیونکہ کوئی لڑکی داخل نہ ہوئی علماء نے فتویٰ دے دیا تھا کہ مخلوط تعلیم حرام ہے اور مشکل یہ تھی کہ قدامت پسند گھرانوں نے ان فتووں کے ڈر سے اپنی لڑکیاں نہ بھیجیں اور جو آزاد خیال لڑکیاں تھیں وہ علی گڑھ جیسی فرقہ پرور اور پرانے خیال کی یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کے خلاف تھیں۔ آخر کار کو وہ بھی اس دقیانوسی تعلیم کے خلاف تھی جو علی گڑھ میں دی جاتی تھی، اگلے سال خود سلمیٰ صحافی کو واردھا کی قومی یونی ورسٹی چھوڑ کر علی گڑھ میں داخلہ لینا پڑا تا کہ اپنے صنف کا حق قائم کرے۔

جس وقت سلمیٰ صحافی کے داخلہ کا فارم یونی ورسٹی کے پرو وائس چانسلر مولوی ابوالعلم کے پاس پہنچا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور دوڑے ہوئے وائس چانسلر شیخ رحیم الدین کے پاس گئے۔ وہ دونوں مخلوط تعلیم کے سخت خلاف تھے لیکن سلمیٰ صحافی کا داخلہ کرنے سے انکار کرنا حکومت کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔ ''اس کمبخت لڑکی کو داخل کرنا ہی پڑے گا۔'' مولوی ابوالعلم بولے ''لیکن طالب علم لڑکیوں کے لیے کچھ ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے گھبرا کر وہ یونی ورسٹی میں داخلے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔'' اگلے روز یونی ورسٹی کی ایگزیکٹیو کونسل کا جلسہ منعقد ہوا تا کہ صورتِ حال پر غور کیا جائے۔ نواب طاؤس یار جنگ اچکانی نے تجویز پیش کی کہ طالب علم لڑکیوں کے لیے ایک خاص بورڈنگ ہاؤس تعمیر کیا جائے جس کی دیواریں دو سو بیس گز اونچی ہوں اور اس بورڈنگ سے لے کر لکچر کے کمروں تک ایک سرنگ بنائی جائے جس کے ذریعہ سلمیٰ صحافی لکچر سننے جایا کرے۔ اس کے علاوہ ہر لکچر روم میں چاروں طرف سے ایک بند کوٹھری بنائی جائے جس میں سرنگ کا راستہ نکلتا ہو اور اس کوٹھری میں بجائے دروازے یا کھڑکی کے چار باریک سوراخ ہوں جن میں سے پروفیسر کی آواز پہنچ سکے۔ اس تجویز کی زبردست موافقت مولانا لقمان نے کی اور بالاتفاق رائے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالصدیق رشیدی نے تجویز پیش کی کہ جس طرح طالب علم لڑکوں کے لیے سیاہ بند گلے کا کوٹ اور اٹھارہویں صدی کی ترکی کی ٹوپی پہننا لازمی تھا۔ اسی طرح طالب علم لڑکیوں کے لیے کالا برقعہ پہننا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی۔ اب خداوندانِ یونی ورسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اُن کو یقین تھا کہ سلمیٰ صحافی کبھی یونی ورسٹی میں داخلہ نہ لے گی۔

سلمیٰ کو جب ان قوانین کا علم ہوا تو وہ بڑی گھبرائی لیکن کچھ سوچ کر اُس نے محکمۂ تعلیم و حفظانِ صحت کو ایک خط لکھا اور ان قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیرِ تعلیم نے ڈانٹ کر وائس چانسلر کو ایک خط لکھا کہ ایسے قوانین بنا کر حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر آئندہ سخت سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ محکمۂ حفظانِ صحت کے ایک انسپکٹر نے یونی ورسٹی کا معائنہ کرتے ہوئے لڑکیوں کے بورڈنگ اور سرنگ دونوں کو خلافِ قانون قرار دے کر مسمار کرا دیا۔ ایگزیکٹیو کونسل کا ایک جلسہ فوراً صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے منعقد کیا گیا۔ مولوی ابوالعلم

نے فرمایا کہ مسلم یونی ورسٹی کا مسلک ہمیشہ حکومت کی اطاعت رہا ہے اِس لیے اُن کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سلمیٰ صحافی کو بے پردہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دیں۔ وائس چانسلر نے بھی کہا کہ بحالت مجبوری ان کو ایسا ہی کرنا ہوگا باقی آٹھ ممبران کونسل نے کہا ’جیسا آپ کا حکم سرکار‘‘ اور جلسہ برخاست ہوگیا۔

(2)

مسلم یونی ورسٹی کی تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب کبھی نہ ہوا تھا جتنا ایک لڑکی سلمیٰ صحافی کے داخل ہونے پر ہوا۔ وہ شہر کی مزدور لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی تھی جو بیسویں صدی کے ایک نواب مضمحل اللہ کے شاندار محل میں قائم کیا گیا تھا جب صبح کو وہ کالج جاتی تو ہر شخص کی نظر اُس کی طرف اُٹھتی۔ وہ حسین نہ تھی لیکن نوجوان عورت علی گڑھ میں ہمیشہ سے ایک نایاب شے رہی ہے۔ یہ پہلی بار تھا کہ یونی ورسٹی کے چند ہزار طالب علموں نے ایک لڑکی کو طالب علم کی حیثیت سے دیکھا۔ سلمیٰ نے بیسویں صدی کے علی گڑھ کے متعلق عجیب وغریب قصے سنے تھے کہ اس زمانہ میں اگر اسٹیشن پر سے کسی ریل میں کوئی حسین لڑکی گزرتی تھی تو تمام یونی ورسٹی میں ہنگامہ برپا ہوجاتا تھا۔

پہلے پہل سلمیٰ کو اس قدر عالمگیر توجہ کا مرکز بننا برا معلوم ہوا لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اِس کی عادی ہوگئی۔ سب سے بڑا انقلاب اِس کی کلاس یعنی ایل۔ ایل۔ بی پریولیس (PREVIOS) میں ہوا تھا۔ ایک سو اکیاون طالب علموں میں وہ اکیلی لڑکی تھی۔ اِن سب کی توجہ کی وہ واحد مرکز تھی۔ جب سے اِس نے داخلہ لیا تھا ان تمام لڑکوں میں بین تبدیلی نظر آتی تھی جو تیسرے دن داڑھی مونڈتے تھے، وہ اب روز شیو کرنے لگے جو ہمیشہ میلے کپڑے پہن کر آتے تھے وہ اب صاف کپڑے پہن کر آنے لگے۔ جن کے کوٹوں پر برسوں سے برش نہ ہوا تھا اُن کے کوٹ اب چمکنے لگے۔ جن کے بالوں میں ہفتوں کبھی کنگھا نہ ہوتا تھا، انھوں نے کلاس میں آتے وقت بھی جیب میں شیشہ کنگھا رکھنا شروع کردیا۔ سب سے بڑا کمال یہ ہوا کہ تقریباً تمام طالب علم اب لکچر کے وقت حاضر رہنے لگے۔ ورنہ ایل۔ ایل۔ بی پریولیس میں کبھی 25 فیصدی سے زیادہ لڑکے حاضر نہ ہوتے تھے۔ باقی سب دوستوں سے پراکسی (PROXY) بلوا کر کام چلاتے تھے۔

جس دن سے سلمیٰ صحافی نے داخلہ لیا تھا۔ لکچر روم بھرا رہنے لگا۔ فائنل کلاس کے طلبا بھی کسی نہ کسی بہانے سے آ کر بیٹھنے لگے۔ پروفیسر کی زندگی میں بھی سلمیٰ صحافی کی موجودگی نے کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ بھی اچھے کپڑے پہن کر آنے لگے، جن کے کوٹ پر ہمیشہ چاک کی سفیدی پڑی رہتی تھی، وہ کلاس میں آنے سے قبل نہایت احتیاط سے کوٹ پر برش کرنے لگے۔ اسٹاف روم میں ایک آئینہ، کنگھا، کپڑوں اور بالوں کے برش رکھے گئے۔

کلاس کے تمام لڑکوں میں سلیم اور انور سلمیٰ میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دونوں یونی ورسٹی کے با اثر اور مشہور طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ سلیم ٹینس کلب کا سکریٹری اور بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ سوئمنگ باتھ میں مچھلی کی طرح تیرتا تھا اور یو۔ ٹی۔ سی کا سارجنٹ تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک قابل رشک صحت اور سانچے میں ڈھلے جسم کا مالک تھا۔ اُس کو اپنے مردانہ حسن پر کافی ناز بھی تھا اور جب اُس نے سلمیٰ صحافی میں دلچسپی لینی شروع کی تو سوائے انور کے، اُس کی رقابت مول لینے کی کسی نے ہمت نہ کی۔

انور اتنا حسین نہ تھا جتنا سلیم۔ وہ کھلاڑی بھی نہ تھا مگر پڑھنے لکھنے میں وہ سب سے تیز تھا، اُس نے اول درجہ میں انگریزی ادب کا ایم۔ اے کیا تھا۔ یونین کا بہترین مقرر اور میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اُس کے افسانے اور نظمیں ملک کے اکثر قدامت پسند رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ سلمیٰ صحافی میں دلچسپی لیتا تھا اور کلاس میں جب ممکن ہوتا کوئی ادبی یا قانونی بحث چھیڑ کر اُس سے بات کرنے کا موقعہ نکال لیتا۔ انور اور سلیم قدامت پسند خاندانوں کے لڑکے تھے۔ ان کے لیے عورت ایک نامعلوم جنس تھی اس لیے وہ بیسویں صدی کے شاعر مزاج طالب علموں کی طرح ہر اُس لڑکی میں جس سے کسی طرح اُن کی ملاقات ہو جائے اسی قدر دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کے کلاس میں ایک لڑکا احسان اللہ پڑھتا تھا جس کی بد قسمتی سے سات بہنیں تھیں، یہ سب لڑکیاں دہلی کی قومی یونی ورسٹی میں پڑھتی تھیں لیکن چھٹیوں میں اکثر علی گڑھ اپنے بھائی سے ملنے آیا کرتی تھیں، اس لیے کلاس کے تقریباً تمام لڑکے احسان اللہ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر موقعہ پر اُس کی آؤ بھگت ہوتی اور نوجوان پروفیسر بھی اُس کا خیال رکھتے۔ سلیم اور انور نے خاص طور پر احسان میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سلیم اُس کو روز ٹینس کھیلنے بلاتا اور کلب کی فیس اُس کے

بجائے خود دے دیتا۔ انور اصرار کرتا کہ احسان اُس کے ساتھ مل کر امتحان کے لیے پڑھے۔ دونوں اُس کی دعوتیں بھی خوب کرتے۔ شروع شروع میں تو احسان ان سب عنایات کو دوستی پر محمول کرتا رہا۔ لیکن عرصہ کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں اِس سے زیادہ اُس کی بہنوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ جس دن اِس کی بہنیں دہلی سے آتیں، سلیم وانور اُس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے اور اُس کی بہنوں کی خاطر و مدارات میں ضرورت سے زیادہ انہماک دکھاتے حالانکہ وہ سب مل کر ان دونوں کو بیوقوف بناتی تھیں۔ احسان ہمیشہ سے منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ ایک دن جب اُس کو انور اور سلیم کی حرکتوں سے سخت کوفت ہوئی تو اُس نے اپنی بہنوں کے سامنے ہی اِن سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''دیکھیے صاحب! اس وقت آپ دونوں بھی موجود ہیں اور میری بہنیں بھی، آپ کو ان میں سے جس سے دلچسپی ہو صاف کہہ دیجیے، اُن کی مرضی ہو تو وہ آپ سے دوستی کریں۔ مگر مہربانی کر کے میری جان چھوڑ دیجیے۔ اُس دن سے انور اور سلیم اور احسان اللہ کے تعلق کا خاتمہ ہو گیا اور اُن کو کسی نئے شکار کی تلاش ہوئی۔ جب سلمیٰ صحافی نے داخلہ لیا تو دونوں نے علیحدہ علیحدہ کوشش شروع کی کہ اس سے دوستی بڑھائی جائے۔

ایک صبح خالی گھنٹہ میں سلمیٰ برآمدے میں اکیلی کھڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر لڑکوں کا ایک گروہ کھڑا اُس کی طرف گھور رہا تھا۔ سلمیٰ کو اس قسم کی حرکتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور ہنسی بھی، غصہ اس لیے کہ خواہ مخواہ اس کو کوئی کیوں اس طرح گھورے اور ہنسی اس بات پر کہ علی گڑھ کے یہ تعلیم یافتہ لڑکے اس قدر دقیانوسی تھے، اکیسویں صدی میں بھی ایسی حماقتیں کرتے تھے۔ اُس کو اپنے ڈیسک میں اکثر گمنام عاشقانہ خطوط ملتے تھے ایک بار تو ایک نامعلوم عاشق صاحب نے ایک قیمتی فاؤنٹین پین اسی طرح تحفہ دیا تھا۔ روزانہ ڈیسک کے اوپر گلاب کے پھول رکھے ملتے لیکن ان سب مجنوں صفت حضرات میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کھلم کھلا اِس سے بات بھی کرسکیں۔ سلمیٰ کھڑی اِن سب باتوں پر غور کر رہی تھی کہ سلیم صاحب اپنا بہترین سوٹ پہنے بالوں میں دھڑیوں تیل لگائے اور فلم اسٹاروں جیسی مونچھیں بنائے ہوئے نازل ہوئے۔

'مس سلمیٰ صحافی' اُس نے بیسویں صدی کے انداز میں اس قدر جھک کر کہا کہ سلمیٰ کو ہنسی آ گئی۔ '' آپ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟............ ہاں............ وہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی کھیل

کیوں نہیں کھیلتیں؟ دیکھیے آپ کی رنگت زرد ہوتی جارہی ہے۔ وہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ

ALL WORK AND NO PLAY

MAKES JACK A DULLBOY

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وردھا میں ٹینس کی بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتی تھیں تو آپ ہمارے سویمنگ باتھ کلب میں آج شام کو ٹینس کھیلنے آیے نا؟۔'' وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو سلمیٰ نے کہا۔'' شکریہ میں اب تک تو اس لیے کھیلنے نہ آئی تھی کہ شاید وائس چانسلر صاحب لڑکوں کے اخلاق خراب کرنے کے جرم میں مجھے یونی ورسٹی سے نکال دیں۔''

سلیم اپنے آپ کو آزاد خیال اور ترقی پسند سمجھتا تھا۔'' ارے آپ بھی کیا کہتی ہیں، کس کی مجال ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال دے۔ ہم سب یونی ورسٹی چھوڑ دیں گے، آپ شاید مجھ سے واقف نہیں ہیں، پچھلے سال ٹکڑوں میں میٹھا کم ہونے پر میں نے ایک مہینہ تک ڈائننگ ہال کا اسٹرائیک کرادیا تھا۔ آپ بے فکر ہوکر آج ہی سے کھیلنے آیے۔

سلمیٰ نے اپنی جان چھڑانے کے لیے وعدہ کرلیا اور کہا کہ وہ اسی مقام پر شام کے پانچ بجے ملے گی اور پھر دونوں اکٹھے سویمنگ باتھ لان ٹینس کھیلنے جائیں گے۔

سلیم اُس سے رخصت ہوکر خوش خوش اپنے کمرے کی طرف چلا۔ راستہ میں سوچتا جارہا تھا کہ ''DOUBLES'' میں سلمیٰ کو اپنے ساتھ کھلائے گا تاکہ پارٹنر، پارٹنر پکار کر پہلے ہی بے تکلفی بڑھالے۔ وہ ہوسٹل کے دروازے میں داخل ہورہا تھا کہ بغل میں کتابیں دبائے انور آتا ہوا ملا۔

'' کہاں جارہے ہو؟ گھنٹہ تو خالی ہے۔'' اس نے کہا

''اوہ میں تو ایسے ہی جارہا ہوں۔'' انور نے جواب دیا'' ذرا لائبریری سے چند کتابیں لانی ہیں۔''

مگر ہوسٹل سے نکلتے ہی، بجائے لائبریری کے انور نے لکچر روم کا رُخ کیا سلمیٰ اب تک برآمدہ میں کھڑی تھی۔ قدم بڑھاتے ہوئے اِس کے پاس پہنچ کر اِس عاشق جانباز نے بھی تنہائی میں گفتگو کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً تقریر شروع کردی۔

''مس سلمیٰ صحافی۔ آداب عرض ہے۔ گستاخی معاف کیجیے گا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کورس کی کتابوں کے علاوہ عام لٹریچر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ آپ کو

لائبریری میں بھی کبھی آتے نہیں دیکھا۔ اس طرح لاپرواہی سے تو آپ کی واقفیت عامہ صفر ہو کر رہ جائے گی۔''

سلمیٰ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔'' تازہ کتابیں تو میرے پاس برابر آتی رہتی ہیں مگر میرا خیال تھا کہ یونی ورسٹی لائبریری میں شاید میرے کام کی کتابیں نہ ملیں میں نے سنا ہے کہ یہاں اشتراکی لٹریچر کی ممانعت ہے۔''

''اوہو آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔'' انور نے جلدی سے کہا۔'' اب تو جب سے قومی حکومت قائم ہوئی ہے ہمارے وائس چانسلر صاحب نے حکم دیا ہے کہ لائبریری میں انقلابی کتابوں پر سے ممانعت اٹھالی جائے.......... ہاں تو آپ میرے ساتھ لائبریری تشریف لے چلیے گھنٹہ بھی خالی ہے۔''

''معاف کیجیے گا۔ اِس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے لیکن اگر آپ شام کو پانچ بجے مجھے اِسی جگہ ملیں تو ہم اکٹھے لائبریری چلے چلیں گے۔''

انور نے سوچا یہ بھی اچھا رہے گا۔ شام کو جب سب کھیل کے لیے چلے جاتے ہیں، لائبریری تقریباً سنسان معلوم ہوتی ہے سلمیٰ صحافی سے اکیلے میں خوب باتیں ہو سکیں گی۔

(3)

انور خوش خوش، 'آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا' گاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سلیم کو 'پریم نگر میں بناؤں گا گھر میں' گاتا ہوا پایا۔ اِن کے کمرے کا تیسرا شریک آزاد حسبِ معمول پلنگ پر لیٹا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ جاسوسی ناول پڑھنا اور سونا یہ آزاد کے محبوب مشغلے تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو کسی شعبہ حیات میں بھی امتیاز نہیں حاصل کر سکتے۔ نہ وہ پڑھائی میں ہوشیار تھا اور نہ اُس نے میگزین میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ ملنا جلنا بھی وہ کم تھا اور اپنے کمرے کے رفیقوں سے بھی وہ بوقت ضرورت ہی بات کرتا تھا۔ وہ خوب صورت بھی نہ تھا، چہرے پر موٹر سائیکل سے گرنے کے کئی نشانات تھے۔ سانولا رنگ تھا، معمولی قد، خشک اور سخت بال جن میں شاید دن میں ایک بار بھی کنگھا نہ ہوتا تھا۔ غرض اس میں کوئی ایسی صفت نہ تھی کہ وہ طالب علموں یا صنف نازک

میں مقبول ہوسکتا اور نہ وہ لڑکیوں میں غیر ضروری دلچسپی کا اظہار ہی کرتا تھا۔ انور اور سلیم کے رومانی مشغلوں کو وہ غیر متعلق دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ نہ وہ اس کو اپنے رازوں میں شریک کرتے اور نہ وہ اس کی کوشش کرتا۔ آج سلیم اور انور کی غیر معمولی بشاشت سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو پھر رومانی کیڑے نے کاٹا ہے مگر اُس نے سوائے علیک سلیک کے کوئی بات نہ کی اور اپنا جاسوسی ناول پڑھتا رہا۔

تم اتنے خوش کیوں نظر آتے ہو۔'' انور نے سلیم کے گانے سے تنگ آکر کہا۔

''تمھیں کیوں بتاؤں۔'' سلیم نے بگڑ کر جواب دیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ تمھیں آج کون سا خزانہ پڑا پا گیا ہے کہ خوشی سے پھٹے جا رہے ہو۔''

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ انور اور سلیم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس میں کپڑے تلاش کر رہے تھے۔

''ارے چھدو! ارے چھدو!'' انور نے نوکر کو پکارا۔ ''وہ درزی میرا سوٹ لایا یا نہیں؟''

''اور وہ میرا ہیلیر رجس کی آستین کھولنے کے لیے دیا تھا۔ وہ آیا یا نہیں؟'' انور نے سوال کیا۔

جب معلوم ہوا کہ درزی حسب معمول وعدے کے مطابق کپڑے نہیں لایا تو دونوں نے مل کر اس کو برا بھلا کہا۔ اس کے بعد آزاد کا ٹرنک ٹٹولا گیا کہ شاید اس میں کچھ پہننے کے قابل کپڑے نکلیں مگر وہاں کیا ملتا۔ وہ تو جاڑے کا موسم ایک گرے پتلون اور گرمی سفید قمیض اور خاکی نیکر پہن کر گذار دیتا تھا۔

کھانا کھا کر سلیم نے سائیکل سنبھالی تو انور نے پوچھا: ''اس لوگری میں کہاں چلے؟''

''تمھیں کیوں بتاؤں کہ درزی کے یہاں جا رہا ہوں۔'' سلیم نے کہا اور سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا اُس کے چند منٹ بعد انور نے آزاد کی سائیکل سنبھالی۔

''میں نے کہا، شاعر صاحب'' آزاد نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا ''کسی کی تیرِ نظر سے میری سائیکل میں پنکچر نہ کرلائیے گا —''

درزی کے یہاں سے کپڑے لے کر چلے تو انور کو خیال ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ نیا جوتا بھی ہونا چاہیے۔ اور سلیم کو یاد آیا کہ اُس کا ٹینس کا جوتا ذرا پرانا ہو چکا ہے۔ جوتوں والے کے برابر میں ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان تھی۔ انور نے ایک نئی ٹائی بھی خرید ڈالی۔ سلیم نے ایک

ریشمی مفلر لیا۔ انور نے نئے بلیڈوں کا پیکٹ لیا تو سلیم کو یاد آیا کہ اُس کی FACE CREAM ختم ہو گئی ہے سلیم نے ریشمی رومال خریدا تو انور نے سینٹ کی شیشی۔ غرض تین بجے کے قریب دونوں دوست لدے پھندے واپس کمرے پہنچے۔ آزاد سو رہا تھا مگر دیر تک نہ سو سکا اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ بھونچال آ گیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو انور اور سلیم کمرے کے واحد آئینہ میں بیک وقت داڑھی مونڈنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں اور خوب گالم گلوج اور چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ اسی جھگڑے میں انور نے اپنا گال کاٹ لیا اور آزاد نے اُٹھ کر خون روکنے کے لیے پھٹکری لگا دی تو اتنے زور سے چلایا کہ آس پاس کے کمرے والے سمجھے کوئی قتل ہو گیا ہے۔

غرض بڑی مشکل سے دونوں دوست تقریباً ساڑھے چار بجے سج دھج کر تیار ہوئے بالوں میں ANZORA ڈالا گیا۔ مانگ پٹی کی گئی۔ چہرے پر کولڈ کریم کی مالش ہوئی مگر حالت قابل رحم تھی۔ اتنی سخت گرمی کے باوجود انور نے کلف دیا ہوا سخت کالر لگایا تھا جس نے اس کی گردن کو طوق کی طرح جکڑ دیا تھا اس پر غضب یہ کیا کہ نہ صرف کوٹ بلکہ واسکٹ بھی، سلیم نے بھی اپنی شان جمانے کے لیے یونی ورسٹی کے رنگوں کا اونی بلیزر پہنا تھا غرض دونوں کا پسینہ کے مارے برا حال تھا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' انور نے سلیم سے پوچھا۔

''تم کوئی ٹھیکہ دار ہو، سلیم نے کٹ کر جواب دیا'' اور دیکھتے نہیں ہو کہ ٹینس کھیلنے جا رہا ہوں۔ تم بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟''

انور نے میز پر سے دو کتابیں اُٹھا کر بغل میں دباتے ہوئے جواب دیا۔ ''دیکھتے نہیں ہو لائبریری جا رہا ہوں۔''

خدا خدا کر کے پونے پانچ بجے یہ دونوں روانہ ہوئے تو آزاد کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس نے تکیہ کے نیچے سے اپنا جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

(4)

یونی ورسٹی کلاک ٹاور نے چھ بجائے تو انور نے سلیم سے کہا'' بس بھائی اب چلو انتظار کی حد ہو گئی۔ اس لڑکی نے آج ہم دونوں کو بیوقوف بنا دیا۔''

دونوں دوست ایک گھنٹہ تک ٹہلتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ایک ہی مقام پر دیکھ کر تعجب ضرور ہوا تھا اور آپس میں فقرے بازی ہوئی لیکن کچھ عرصے کے بعد دونوں نے قبول دیا کہ اصل مقصد ان کے آنے کا کیا تھا۔ جب چھ بج گئے اور سلمیٰ صحافی نہ آئی تو انہوں نے اُس کو برا بھلا کہنے کے بعد طے کیا کہ اب کہیں ٹہلنے چلا جائے۔

سوئمنگ باتھ رستوران میں شربت پینے کے بعد انھوں نے بااتفاق رائے کھیتوں کا رُخ کیا، ریلوے لائن کو پار کر کے پگڈنڈی پگڈنڈی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کچھ فاصلہ پر دو سائیکلیں پڑی دیکھیں، ان دونوں سائیکلوں کو وہ پہچانتے تھے فوراً جھک گئے اور کھیت کی آڑ لے کر اِدھر اُدھر ہوشیاری سے نگاہ کی تو برابر کے کنوئیں کی منڈیر پر آزاد اور سلمیٰ صحافی کو بیٹھا ہوا پایا۔ انور نے سلیم کی طرف دیکھا اور سلیم نے انور کی طرف۔ اِس ایک نگاہ میں تعجب، غصہ اور انتقام کی خواہش، تمام جذبات موجود تھے۔ غرض صورت حال پر مفصل تبصرہ تھا۔ آزاد اور سلمیٰ باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر سنا تو انور اور سلیم دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے کیونکہ ذکر خیر اُن ہی کا تھا۔

''کاش تم اُن کو دیکھتے۔ انور نے مفلر باندھ کر اس پر گرم کوٹ پہنا اور سلیم نے نہ صرف سخت کالر لگایا بلکہ واسکٹ بھی پہنی، پسینہ کا یہ حال تھا کہ خدا کی پناہ۔'' اور دونوں نے اتنے زور سے ہنسنا شروع کیا کہ انور اور سلیم سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ الٹے قدم واپس لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ خاموش چلتے رہے پھر دونوں بیک وقت بولے۔

''بدلہ لیں گے''

'بدنام کریں گے''

کچھ دور واپس گئے تھے کہ اُن کا ایک کلاس فیلو فضل الدین مل گیا یہ بھی یونی ورسٹی کے عاشق مزاجوں میں سے تھے مگر حال ہی میں شہر کے اسکول کی اپنے سے عمر میں دس برس بڑی ایک دیسی عیسائی ہیڈ مسٹرس کے عشق میں زک اٹھا چکے تھے اس لیے فی الحال عورتوں کی قوم سے بغض رکھتے تھے۔ انور اور سلیم نے نہایت رازدارانہ طریقہ پر فضل الدین کو آزاد اور سلمیٰ کے پکڑے جانے کا 'واقعہ' سنایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا، بھائی کسی سے کہنا مت۔ کسی کو بدنام کرنے سے ہمیں کیا فائدہ؟

''ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ 'واقعہ' یونی ورسٹی کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

(5)

اور پھر وہ دن آیا جب مسلم یونی ورسٹی میں ایک لڑکی بھی نہ رہی، زبان خلق سے تنگ آ کر سلمیٰ اور آزاد دونوں نے نام کٹا لیا۔ سلمیٰ واردھا واپس چلی گئی اور آزاد اپنے جاسوسی ناولوں کا پلندہ اُٹھا اپنے وطن چلا گیا۔

مسلم یونی ورسٹی گزٹ نے بوڑو گاؤں کے زمیندار کی سالگرہ کی خوشی میں ایک کالم سیاہ کرنے کے بعد چند لائنیں اس واقعہ پر بھی لکھیں اور لکھا ''یہ خوشی کی بات ہے کہ مس سلمیٰ صحافی کے جانے کے بعد یونی ورسٹی ایک خطرناک عنصر سے پاک ہوگئی۔''

حامد عباس کی تجویز اور ناصر ہارونی کی تائید پر یونین نے سلمیٰ صحافی کی جرأت کو سراہتے ہوئے ریزولیوشن پاس کیا۔ ایک دوسرے ریزولیوشن سے یہ طے پایا کہ جو مخملی صوفے لڑکیوں کے لیے بنوائے گئے تھے اُن کو فروخت کر کے اس کے روپے سے سلمیٰ صحافی کا ایک مجسمہ یونین ہال کے سامنے لان میں نصب کیا جائے تا کہ اُس زمانے کی یادگار رہے جب یونی ورسٹی میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔

حکومت کے قوانین کی رو سے طالب علموں کی انجمن خود مختار جماعت تھی اس لیے یونی ورسٹی ایگزیکیٹو کونسل اس ریزولیوشن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی اور بہت جلد مجسمہ نصب کر دیا گیا اُسی سال یونی ورسٹی کے بجٹ میں ایگزیکیٹو کونسل نے دس روپے کی رقم طالب علموں کے اخلاق کی حفاظت کی تدابیر کے لیے منظور کی۔ اس رقم سے ایک برقعہ سلوایا گیا اور سلمیٰ صحافی کے مجسمہ کو اڑھا دیا گیا۔

اور مدت تک یہ برقعہ سلمیٰ صحافی کے مجسمہ پر ڈھکا رہا اور ہوا میں پھڑ پھڑا کر قریب سے گذرنے والوں کو عبرت دلاتا رہا۔ مگر 2047 میں جس سال ہندوستان میں پہلی بار اشتراکی حکومت قائم ہوئی ایک خوفناک زلزلہ آیا جس میں بنارس اور علی گڑھ یونی ورسٹی کی تمام عمارتیں تباہ ہوگئیں مگر سلمیٰ صحافی کا مجسمہ اسی طرح قائم رہا۔ زلزلہ کے ساتھ ہی ایک زبردست آندھی چلی جو اس تاریخی برقعے کو اڑا کر لے گئی۔

○

سرکشی

(1)

دسمبر کا مہینہ بمبئی میں عجیب چہل پہل کا ہوتا ہے۔ سمندر کی قربت کی وجہ سے شمالی ہند جیسی سردی تو نہیں مگر موسم کافی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ سیاحوں کی کثرت ہوتی ہے، تجارت فروغ پر ہوتی ہے تفریح گاہوں پر ہجوم ہوتا ہے غرض شہر کی نبض تیز ہو جاتی ہے اور ہر شخص اپنے جسم میں نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

گل بانو...... نوجوان، لمبے سیاہ بالوں والی گل بانو............ بھی اپنے جسم میں ایک نئی زندگی اور اپنی روح میں ایک نئی تڑپ محسوس کر رہی تھی۔ اٹھارہ سالہ گل بانو زندگی کے اس دور سے گذر رہی تھی، جب دل میں اُمنگیں اور دماغ میں منصوبے ہوتے ہیں۔ خود زندگی ہی ایک بہت دلچسپ بہت رنگین کھیل ہوتی ہے۔ جب آنکھوں میں چمک ہوتی ہے اور چال میں والہانہ پن۔ جب حوصلوں سے سر اونچا ہوتا ہے اور دنیا کی ہر طاقت اپنے سامنے ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ جب دل میں دنیا بدل دینے کی ہمت ہوتی ہے اور حصول مقصد میں جان فروشی کی آرزو۔ گل بانو دو سال سے میڈیکل کالج میں تعلیم پا رہی تھی۔ یہ اس کا تیسرا سال تھا اور دو سال میں وہ باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر ہو جائے گی۔ یہ خیال اُس کے لیے کس قدر خوشگوار تھا، پھر وہ گھر کی قید سے آزاد

ایک خود مختار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گی۔ اس نے اپنی زندگی کے لیے ایک باقاعدہ پروگرام بنا رکھا تھا۔ اِس کا ارادہ تھا کہ اپنا مطب مزدوروں کے محلّے میں کھولے گی تا کہ اِن بدنصیب عورتوں اور بچوں کا علاج کر سکے جو سرمایہ داری کی بدولت تنگ اور اندھیرے مکانوں میں رہتے ہیں اور جن کی آمدنی اتنی محدود ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اور دوا کا خرچ تو کجا پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسر نہیں آتا۔ اِس کو روپیہ پیدا کرنے کا شوق نہ تھا۔ اِس کے باپ نے جو پچیس برس تک ایک سیٹھ کے کارخانے کا منیجر رہا تھا، کافی روپیہ پیدا کیا تھا مگر گل بانو کو بچپن ہی سے اس اقتصادی نظام سے سخت نفرت تھی، جس کی خدمت سے اِس کے باپ نے دولت کمائی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو مزدوروں پر ظلم کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس نے گڑگڑاتی ہوئی عورتیں اور سسکتے ہوئے بچے دیکھے تھے۔ اس نے کارخانے کے مالک سیٹھ سلمانی کا مالابار ہل پر عالی شان محل دیکھا تھا اور کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی اندھیری اور بدبودار 'چالیں' بھی، جہاں چھوٹے چھوٹے کمروں میں دو دو خاندان زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اس نظام کو بدلنا چاہتی تھی جو ایسا ظلم روا رکھتا ہے اور اُس کا ارادہ تھا کہ ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی کام بھی کرے گی۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ ہر گھر میں جا سکے گی اور اس طرح وہ اِن مزدوروں اور ان کی عورتوں کے بجھے ہوئے دلوں اور دماغوں کو روشن کرے گی۔ اُن کو ان کے حقوق سے آگاہ کرے گی اور اِس جنگ کے لیے تیار کرے گی جو ایک دن نیا اور بہتر نظام قائم کرنے کے لیے کی جانے والی ہے۔ اس کے یہ خیالات اگر ایک طرف اس کے مشاہدہ کا نتیجہ تھے جو اس کو اپنے باپ کے کارخانے اور میڈیکل کالج کے اسپتال میں حاصل ہوا تھا تو دوسری طرف وہ اشتراکی تحریک کی ہنگامہ خیز کارروائیوں اور پرجوش انقلابی لٹریچر سے بھی متاثر ہوئی تھی اُس نے مزدوروں کو سرخ جھنڈے لیے ہوئے جلوسوں میں دیکھا تھا، اشتراکی لیڈروں کی تقریریں سنی تھیں۔ اشتراکیت پر چند ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ اُس عمر کے لوگوں کا رجحان کدھر ہے۔ نئے خیالات کی اس رو میں ہر ایک دل تڑپ رکھنے والا تھا۔ زمانے کا تقاضہ اور اس کے اپنے دماغ کا یہی فیصلہ تھا کہ وہ اسی تحریک کا ساتھ دے۔ مانا کہ اکثر کھاتے پیتے سفید پوش اشتراکیوں کی طرح عوام کی بہبودی میں اس کی دلچسپی کسی قدر ہمدردانہ اور

'مشفقانہ' تھی اور اس ہمدردی کا اظہار بھی فی الحال الفاظ ہی تک محدود تھا۔ مگر باوجود ان ناگزیر کمزوریوں کے جو اس کو پچھلی نسلوں سے ورثہ میں ملی تھیں، اس میں سماجی حقائق سمجھنے کی صلاحیت تھی اور خدمت خلق کا جذبہ —

کالج میں، گھر پر، راستہ میں وہ یہی منصوبہ بنایا کرتی۔ مگر اپنی اس خیالی دنیا میں وہ اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک رفیق اور دوست کی حیثیت سے اس کا شوہر بھی ہوتا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج اور خوددار جوان تھا۔ جو اس کی خانگی، فنی اور سیاسی زندگی میں برابر کا شریک تھا لیکن وہ کون تھا، اس کا نام کیا تھا؟ یہ گل بانو کو بھی معلوم نہ تھا۔ باقی تمام منصوبوں کی طرح یہ خیالی شوہر بھی فقط اس کے دل ودماغ میں مکین تھا۔ ظاہری دنیا میں اس کی ابھی کوئی اصلیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر گل بانو خیالی شریکِ زندگی کے متعلق اتنا سوچتی کہ یہ محسوس ہونے لگتا کہ گویا وہ واقعی کوئی اصلیت رکھتا ہے۔

ایک دن وہ ایسے ہی خوشگوار خیالات میں مست کالج کے دروازے سے نکل کر ٹرام کی طرف جارہی تھی کہ موتی لال نے آواز دی۔

موتی لال گل بانو کا ہم جماعت تھا۔ وہ ایک محنتی اور خاموشی پسند طالب علم تھا اور لڑکوں کی طرح وہ لڑکیوں کے پیچھے مارا مارانہ پھرتا۔ کلاس کی لڑکیوں میں اُس کی ملاقات فقط گل بانو سے تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ عمل جراحی کے کمرے میں ان کو ایک ہی میز پر کام کرنا پڑتا تھا۔ گو ہفتہ میں کئی بار ان دونوں کا اس طرح ساتھ ہوتا تھا مگر سوائے رسمی سلام کلام یا کام سے متعلق گفتگو کے کبھی اور بات نہ کرتا دراصل وہ فطرتاً بہت کم گو اور حساس واقع ہوا تھا۔ اس کو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا تھا کہ اگر اس نے گل بانو سے بات کرنے میں ابتدا کی اور اس نے جھڑک دیا تو سخت خفت ہوگی۔ مگر آج کے زندگی بخش موسم نے اس کے دل میں بھی جرأت پیدا کردی تھی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ آج وہ گل بانو کو اپنے ساتھ سینما دیکھنے کی دعوت ضرور دے گا۔ خواہ وہ انکار ہی کیوں نہ کردے۔

''آپ کہاں جارہی ہیں'' اس نے سلسلہ کلام شروع کیا

گل بانو کو موتی لال سے کافی دلچسپی تھی وہ مدت سے جانتی تھی کہ وہ اِس سے ملاقات

بڑھانا چاہتا ہے مگر جھینپتا ہے۔ دراصل وہ اِس انتظار ہی میں تھی کہ موتی لال اس کی طرف اپنی توجہ کا اظہار کرے۔ دوسری لڑکیوں کی طرح گل بانو کے دل میں بھی خواہش تھی کہ کوئی معقول نوجوان اس سے دلچسپی لے، اس کو اپنا ہمراز بنائے اور اس کا ہمراز بنے۔ کلاس کے کتنے لڑکے گل بانو کی نظرِ التفات کے اُمیدوار رہتے تھے لیکن وہ سب چھچھورے اور بدتمیز قسم کے تھے اور گل بانو جیسی طبیعت کی لڑکی کے لیے ان میں دل چسپی لینا ناممکن تھا۔ موتی لال ان سب سے مختلف تھا۔ اِس کا شرمیلا پن، صنفِ نازک کی موجودگی میں گھبراہٹ۔ یہ اُس کی وہ خصوصیات تھیں جو گل بانو کے لیے ایک عجیب کشش رکھتی تھیں۔ آج جب موتی لال نے خود گفتگو میں پیش قدمی کی تو اِس کی مراد بر آئی۔

''گھر جا رہی ہوں اور کہاں جا سکتی ہوں'' اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ایسی جلدی کیا ہے؟ قریب ہی سینما میں پال مونی کا فلم ''لوئی پاسٹیور'' ہو رہا ہے۔ اگر ہرج نہ ہو تو چلیے دیکھ لیں۔''

گل بانو نے جواب دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔ اس کو میڈیکل کالج میں داخل ہوئے دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا مگر اب تک وہ اکیلی کسی لڑکے کے ساتھ سینما نہ گئی تھی۔ وجہ یہ تھی، گو اِس کا گھرانہ پردہ کی بندشوں سے آزاد تھا مگر اس کے والدین سوائے کالج کے کہیں اور گل بانو کو تنہا جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اگر آج وہ موتی لال کے ساتھ سینما چلی گئی تو یقین تھا کہ گھر پر بری طرح ڈانٹ پڑے گی۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ اِس کا دل سینما جانے کو بری طرح چاہ رہا تھا۔ تین مہینے سے اس نے کوئی فلم نہ دیکھا تھا کیونکہ اس کا بڑا بھائی جس کے ساتھ کبھی کبھی وہ سینما جایا کرتی تھی، احمد آباد گیا ہوا تھا۔ پال مونی اِس کا محبوب فلم اسٹار تھا اور اس کے فلم ''لوئی پاسٹیور'' کی تعریف اس نے ہر ایک سے سنی تھی۔ یہ فلم اٹھارہویں صدی کے مشہور فرانسیسی ڈاکٹر ''لوئی پاسٹیور'' کے حالات زندگی پر مبنی تھی جس نے باوجود قدامت پسند طبیعتوں کی سخت مخالفت کے، انجکشن کے ذریعہ ایک نئے طریقۂ علاج کی بنیاد ڈالی تھی۔ گل بانو نے ''لوئی پاسٹیور'' کا نام اپنی درسی کتابوں میں پڑھا تھا اور اس کے لازوال طبّی کارناموں کی وہ زبردست معترف تھی۔

میڈیکل کالج کا تقریباً ہر طالب علم اس فلم کو دیکھ چکا تھا۔ شاید فقط ایک گل بانو ہی رہ گئی تھی۔

''مگر آپ تو یہ فلم دیکھ چکے ہیں نا؟'' اُس نے موتی لال سے سوال کیا۔

''جی ہاں، مگر آپ نے تو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ میں خود اس فلم کو دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

گل بانو کے دل میں والدین کے خوف اور فلم دیکھنے کے شوق میں کشاکش ہو رہی تھی مگر والدین کی ڈانٹ تو بعد میں پڑے گی فی الحال تو اس خوشگوار موسم کے کئی گھنٹے ایک دلچسپ رفیق کی صحبت میں گذارنے اور بلند پایہ فلم دیکھنے کی خواہش تھی۔

دسمبر کی اس سہ پہر میں باغیانہ خیالات کو بھڑکانے کی ایک عجیب طاقت تھی۔ ماں باپ کے خوف پر موتی لال کا اصرار غالب آ گیا۔

گل بانو نے کہا: 'بہت اچھا چلیے'۔

(2)

وہ شام گل بانو کی زندگی کی دلچسپ ترین شام تھی۔ باوجود اپنی فطری کم گوئی کے، موتی لال ابتدائی جھجک نکل جانے کے بعد، نہایت بامذاق اور دلچسپ باتیں کرنے والا ثابت ہوا۔ سنیما کے شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ دونوں نے ایک رستوراں میں چائے پی۔ گفتگو کا سلسلہ سنیما شروع ہونے تک جاری رہا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر ان دونوں نے تبادلۂ خیالات نہ کیا ہو۔ سیاست، سماجی رسوم، معاشیات موجودہ طبی رجحانات، ادبی مسائل، موتی لال کی عام واقفیت حیرت انگیز تھی اور گل بانو بھی دنیا کے مسائل کے متعلق اتنا ضرور جانتی تھی کہ اُن پر گفتگو کر سکے اکثر باتوں پر ان کو اتفاق تھا۔ موتی لال بھی ڈاکٹری تعلیم کو روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ سمجھتا تھا۔ مگر اس کے خیالات میں زیادہ پختگی تھی۔ اُس نے دنیا کا نشیب و فراز دیکھا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے اِس کو شروع ہی سے اپنے اوپر بھروسہ کرنا پڑا تھا۔ ایک رشتہ کے چچا اور وظائف کی مدد سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ افلاس کی تکلیف و حقیقت سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ گل بانو کی طرح اس کی اشتراکیت غریبوں سے 'ہمدردی' پر نہیں بلکہ خود اپنی مفلسی کے تجربات پر مبنی تھی۔ جب اس نے اپنے اور گل بانو کے لیے نو نو آنے کے ٹکٹ خریدے تو گل بانو (جو ہمیشہ اونچے درجے میں جانے کی عادی تھی) یہ سمجھی کہ یہ بھی کوئی

اشترا کی اصول ہے کہ فضول خرچی نہ کی جائے۔ کہنے لگی 'یہ بہت ٹھیک ہے بھلا بے کار پیسہ خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟ ہزاروں غریب بیچارے تو چار آنے والا ٹکٹ بھی نہیں خرید سکتے۔'' موتی لال مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ گل بانو کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کی جیب میں یہ ٹکٹ خریدنے کے بعد فقط چار آنے باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے دو آنے ٹرام کے کرایے میں خرچ ہو گئے۔ جب وہ سنیما ختم ہونے پر گل بانو کو اس کے مکان چھوڑنے گیا۔

نو بج رہے تھے جب گل بانو مکان میں داخل ہوئی۔ شام بھر وہ اس قدر خوش رہی تھی کہ اس کو اب تک یہ خیال نہ آیا تھا کہ اس کی اتنی رات گئے واپسی پر گھر میں ایک طوفان بپا ہوگا۔ ماں باپ دونوں گول کمرے میں بپھرے ہوئے بیٹھے تھے، جاتے ہی ماں نے للکارا۔

''اری او کلوا دھر آ'' اور پھر طنزیہ لہجہ میں ''اب تک کہاں تھیں میم صاحب؟''

گل بانو نے کبھی اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولا تھا۔ معاف کیجیے گا اماں آپ کو اور ابا کو کھانے پر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں ایک دوست کے ساتھ سنیما دیکھنے چلی گئی تھی۔''

''کس دوست کے ساتھ؟'' اس کے باپ نے بگڑ کر سوال کیا۔

''موتی لال کے ساتھ میرا ہم جماعت ہے۔''

اس جواب سے تو گویا گل بانو کے ماں باپ کے مزاج کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ باپ کو جتنی گالیاں اور ماں کو جتنے کوسنے یاد تھے وہ موتی کی تعریف میں صرف ہو گئے۔

ماں نے آنسو بہا کر کہا۔ ''میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکی کو کالج میں مت داخل کرو۔ آخر کو وہی ہوا نا جس کا کھٹکا تھا...........''

'' آخر کیا ہوا؟ گل بانو جواب تک دم سادھے کھڑی تھی، تنگ آ کر بولی'' مجھے بھی تو اپنا جرم معلوم ہو۔''

''جرم پوچھتی ہے۔'' باپ نے گرج کر کہا'' ایک کافر بچے کے ساتھ پھر وتم اور ہم سے پوچھو کہ جرم کیا ہے؟ آوارہ کہیں کی۔''

گل بانو کو بچپن سے والدین کی اطاعت کا سبق پڑھایا گیا تھا اِس کو اپنے ماں باپ سے محبت بھی بہت تھی اور اُن کا ادب بھی کرتی تھی مگر اس کا جذبہ خودداری فنا نہ ہوا تھا۔ اپنی عصمت کی

یہ تحقیر سن کر اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ادب اور لحاظ، محبت اور اطاعت کے تمام جذبات ایک لمحہ کے لیے مفقود ہو گئے۔ اس وقت وہ کسی کی اولاد نہیں تھی۔ وہ ایک عورت تھی جس کے پاک دامن پر ایک ناروا دھبہ لگایا گیا تھا۔ غصہ سے اُس کی آواز کانپ گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے مگر نسوانی وقار نے اس کی گردن نہ جھکنے دی۔ سر اونچا کر کے بولی۔ "گستاخی معاف کیجیے ابا۔ میں یہ الفاظ نہیں سن سکتی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ چاہیں تو آپ میری گردن اُڑا دیں مگر میری آبرو پر بٹہ لگانے کا اختیار آپ کو بھی نہیں ہے۔"

اس کے باپ کو کبھی یہ گمان نہ تھا کہ بیٹی ایسا جواب دے گی۔ ایسی گستاخی، یہ جرأت۔ اس کی تو فوراً سزا دینی چاہیے۔ ماں بھی چلا کر بولی۔

"لو سن لو صاحبزادی صاحبہ کی باتیں۔ آج ٹر ٹر جواب دے رہی ہے۔ کل ہم پر ہاتھ اُٹھائے گی۔" اب تو اِس کے باپ کی آتش غضب اور بھی بھڑک اُٹھی۔ چلا کر کہا۔ "بھلی خیر ہے تو نکل جا یہاں سے، اسی دم، میرے گھر میں آوارہ لڑکی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

یہ سن کر گل بانو سناٹے میں آ گئی۔ اب تک اس کو خیال تھا کہ زبانی ڈانٹ ڈپٹ پر بات ٹل جائے گی۔ مگر جب گھر چھوڑنے کا حکم سنا تو وہ کئی سیکنڈ اسی سوچ میں کھڑی رہی کہ کیا کرے۔ ان حالات میں گھر میں رہنا ناممکن نظر آتا تھا۔ مگر گھر چھوڑے تو جائے کہاں؟ اسی کش مکش میں تھی کہ باپ کے الفاظ پھر کان میں گونجے "میرے گھر میں آوارہ لڑکی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔" اس نے بغیر ایک لفظ کہے ساڑی کا پلو سر پر ڈالا اور خاموشی سے دروازے کے باہر نکل گئی۔ چند منٹ تک کمرہ میں سناٹا چھایا رہا۔ گل بانو باہر دہلیز کے برابر کئی منٹ تک کھڑی رہی، اس اُمید میں کہ دوبارہ سوچنے پر اُس کے والدین پھر اندر بلالیں گے مگر وہ دونوں اسی خیال میں تھے کہ گل بانو اُن سے معافی مانگ لے گی اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرے گی۔ مگر وہ بھی ان کی اولاد تھی۔ دونوں طرف ضد برقرار رہی۔

گل بانو کے گھر کا قاعدہ تھا کہ دس بجے رات کو صدر دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ جب گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو گل بانو کی ماں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ "بند کر دو۔" وہاں سے حکم ملا۔ گل بانو نے حسرت بھری نگاہوں سے مڑ کر دیکھا چٹخنی چڑھانے کی آواز آئی اور والدین کے گھر کا دروازہ اُس کے لیے ہمیشہ کے واسطے بند ہو گیا۔

(3)

پانچ مہینے گذر گئے اس عرصہ میں گل بانو کی زندگی میں ایک انقلاب ہو چکا تھا۔ وہ اب ایک دولت مند گھرانے کی خوش پوش اور بے فکر لڑکی نہیں بلکہ۔۔اسپتال میں ایک نرس تھی۔ گھر سے نکالے جانے پر اُس نے کالج سے نام کٹا لیا تھا کیونکہ بغیر والدین کی مدد کے وہ فیس اور کتابوں کے اخراجات برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میڈیکل کالج میں تین سال تعلیم پانے کی وجہ سے اس کو نرس کا کام ملنے میں آسانی ہوئی۔ اس کو چالیس روپے ماہوار ملتے تھے جس میں سے پچیس کھانے اور کمرے کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح گذارا کرتی تھی۔ اب اس کو عمر میں پہلی مرتبہ مفلسی کا تجربہ ہوا تھا۔ اسپتال کا کام سخت اور تنخواہ کم۔ پانچ ہی مہینے میں گل بانو کو معلوم ہو گیا کہ سماج سے بغاوت آسان کام نہیں ہے مگر اس کی فطری ضد اور خودداری اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ مالی امداد کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ ہر ہفتے خیریت کا ایک پوسٹ کارڈ ماں کے نام بھیج دیتی تھی مگر کبھی خرچ کے لیے روپیہ نہ طلب کیا۔ ایک دفعہ محبت سے مجبور ہو کر ماں نے کچھ روپیہ بھیجا بھی تو گل بانو نے واپس کر دیا۔ دراصل اس کے دل میں اب بھی اپنے ماں باپ کے لیے اتنی ہی محبت تھی، کوئی غصہ یا نفرت کا جذبہ اُن کے خلاف نہ تھا۔۔ کہ وہ دونوں اپنے ماحول اور تربیت اور سماجی نظریہ سے مجبور ہیں۔ جو کچھ ظلم انھوں نے اس پر کیا، اس میں ان کا نہیں بلکہ اس سماجی نظام کا قصور تھا جو ایسے حالات روا رکھتا ہے اس لیے اس کے دل میں اگر بے پناہ غصہ تھا تو سماج کے خلاف اور اس کے ان قوانین کے خلاف جو ایک عورت کے ساتھ لونڈی یا غلاموں کا سلوک کرتے ہیں۔

اس عرصہ میں موتی لال کے ساتھ اُس کے تعلقات عجیب طرح کے تھے جیسے ہی موتی کو معلوم ہوا کہ گل بانو اس کی وجہ سے گھر سے نکال دی گئی ہے وہ دوڑا ہوا اُس کے پاس آیا تھا۔ اِس کو واقعی افسوس تھا کہ اِس کی خاطر اس غریب لڑکی پر اتنا سنگین الزام لگایا گیا لیکن اب کیا چارہ تھا۔ اُس کو گل بانو سے محبت تھی اور اس مصیبت میں ہمدردی بھی۔ یہ بھی اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ گل بانو بھی اس میں کافی دلچسپی رکھتی ہے۔ اُس نے یہ بھی جلد دیکھ لیا کہ میڈیکل کالج کے شوقین مزاج لڑکے اور اسپتال کے نوجوان ڈاکٹر گل بانو کی بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے

ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ مگر موتی لال اس صورت حال کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اِس کے لیے ایک ہی طرز عمل ممکن تھا۔ اس نے شادی کی تجویز پیش کر دی۔

مگر گل بانو پر اس تجویز کا الٹا اثر ہوا۔ وہ موتی لال کو بے حد پسند کرتی تھی شاید چاہتی بھی تھی لیکن اس کو یقین نہ تھا کہ آیا اس نے شادی کی تجویز محبت کی خاطر کی ہے یا فقط ہمدردی کے لیے، اس کو یہ شبہ ستاتا تھا کہ شاید اِس کی موجودہ مصیبت سے متاثر ہو کر موتی ازدواجی تعلقات پیدا کر کے اس کی خبر گیری کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے، یہ اس کو منظور نہ تھا۔

غرض اُس نے شادی سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس وقت تک وہ موتی کی تجویز منظور نہیں کرے گی جب تک اس کو یہ یقین نہ ہو جائے گا کہ اس تجویز کی محرک ہمدردی اور فیاضی نہیں بلکہ محبت ہے۔ موتی نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن گل بانو اپنے فیصلہ پر قائم رہی۔ دونوں کی دوستی پھر بھی برقرار رہی۔ ہر روز شام کو دونوں ساتھ ٹہلنے جاتے تھے لوگ چہ میگوئیاں ضرور کرتے، مگر ان کو کسی کے کہنے سننے کی کب پرواہ تھی۔

(4)

ایک روز شام کو جب موتی حسب معمول چار بجے کے قریب گل بانو کے کمرے پر پہنچا تو میز پر ایک پرچہ پڑا پایا۔

''موتی۔ میرے بھائی صاحب کا خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ والدہ سخت بیمار ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتی ہیں، اس لیے میں گھر جا رہی ہوں، اگر اُن کی طبیعت سنبھل گئی تو شام کو واپس آجاؤں گی۔ چھ بجے تک انتظار کرنا۔ ''گل''

چھ بجنے میں چند منٹ تھے جب گل بانو واپس آئی۔ کمرے میں خاصا اندھیرا تھا، چہرہ نظر نہیں آتا تھا مگر موتی لال نے اس کے انداز میں ایک عجیب افسردگی پائی۔ کمرے میں خاموشی سے داخل ہو کر گل بانو نے بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کی۔ اب موتی نے دیکھا کہ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں بلا کچھ کہے سنے وہ کرسی پر بیٹھ گئی باوجود ضبط کے ایک آنسو آنکھ سے ٹپک پڑا۔

''کیا ہوا خیریت تو ہے؟ تمھاری والدہ کا مزاج کیسا ہے؟'' موتی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اچھی ہیں''

''تو پھر؟ تم کیوں رو رہی ہوگل؟ کیا مجھے بھی نہ بتاؤ گی؟''

گل بانو نے کوئی جواب نہ دیا فقط ہاتھ کی ایک جنبش سے ساڑی کا آنچل سر سے گرا دیا۔ موتی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ ریشمی سیاہ لمبے بال اب اِس کے سر کی زینت نہ تھے، اِن کے بجائے کٹے ہوئے بالوں کے بے ترتیب اور خون آلود گچھے ایک وحشت ناک منظر پیش کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کسی بے درد نے کند قینچی سے یہ ظلم کیا ہے۔

''کس نے؟'' موتی کی زبان سے یہ سوال بھی مشکل سے نکلا۔

''بھائی نے آنکھیں جھکا کر گل بانو نے جواب دیا۔ تم سے دوستی کرنے کا انعام ہے۔''

''تو اب اس کا بدلہ بھی لوں گا۔'' موتی غصہ سے کانپ رہا تھا۔ ''اس جلاد کو، اِس ظالم کو سزا بھگتنی پڑے گی۔ مار ہی ڈالوں گا۔''

''میرے بھائی کو؟''

لا جواب ہو کر موتی لال بیٹھ گیا۔ گل بانو کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان پایا گویا بدترین غم و تکلیف سے گزر کر وہ ابدی سکون کا راز پا گئی ہو۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسکرا دی۔

اب گل بانو نے پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح اِس کے بھائی کو احمد آباد سے واپسی پر تمام واقعات معلوم ہوئے اور یہ سن کر کہ اِس کی بہن نے ایک ہندو کی خاطر گھر چھوڑ دیا تھا، وہ غصہ سے دیوانہ ہو گیا۔ اسی جنون میں اس نے بہن کو دھوکے سے گھر بلا کر اس کے بال کاٹ ڈالے۔ یہ قصہ سناتے وقت اس کی آواز میں غصہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ محبت کرنے والی بہن نے بھائی کی اس سفاکی کو بھی معاف کر دیا تھا۔

کچھ دیر کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ پھر گل بانو بولی۔ ''موتی تمھیں یاد ہے کہ تم نے اکثر مجھ سے شادی کرنے کو کہا ہے۔ کہو اب بھی تیار ہو؟''

''گل مجھ سے پوچھتی ہو، گویا اس واقعہ سے میرے جذبات بدل سکتے ہیں۔ میرے دل میں اِس وقت تمہاری محبت اور عزت پہلے سے بھی ہزار گنی ہے۔''

''اچھا تو ابھی رجسٹرار کے یہاں چلو ہم سول میرج قانون کے مطابق شادی کریں گے۔''

''گُل!'' اِس خوشی کے لمحہ میں موتی کی زبان سے فقط ایک ہی لفظ نکل سکا۔ دونوں باہر جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ شام کے چھ بجے کے بعد کوئی سرکاری دفتر نہیں کھلا ہوتا۔

کمرے سے باہر نکلنے لگے تو موتی گُل بانو کے سر کی طرف دیکھ کر جھجکا، سَر جو بدستور کھلا تھا۔

''گُل'' اُس نے کہا اور سر کی طرف اشارہ کیا کہ آنچل ڈال لے۔

اوہ۔ یہ؟'' گُل بانو نے ہنس کر کہا'' اِس کو کیسے چھپا سکتی ہوں یہ تو میری آزادی کا اعلان ہے۔''

اِس وقت اُس کی آنکھوں میں وہ سرکشی تھی جس نے بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت اُلٹ دیے ہیں اور سنگین ترین رواجوں کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔

O

ناگن

مہینے میں ایک آدھ مبارک دن ایسا ہوتا ہے۔ جب بلا ارادہ صبح سویرے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور جب کبھی بھی ایسا سانحہ درپیش آتا ہے تو بندہ سیر کو ضرور جاتا ہے۔ ٹانگوں کو زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ رانی کا باغ مکان کے برابر ہی ہے۔ سیدھا وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ باغ پر بہار ہوتی ہے۔ مالی پھولوں کو پانی دیتے ہوتے ہیں۔ تالاب میں مرغابیاں کنول کے پھولوں کے درمیان تیرتی ہوتی ہیں۔ کوئل کی کوک کے ساتھ شیر کے دہاڑنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ بندروں کے پنجرے کے سامنے بعض لوگ کھڑے ہوئے اپنے آباواجداد کو یاد کرتے ہوتے ہیں۔ رانی کے باغ میں بھانت بھانت کے جانور اور انسان ملتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن وہاں میں نے آج تک کسی کو اقبال مرحوم کے اشعار گاتے ہوئے کبھی نہ سنا تھا۔ اس صبح کو میرے کان میں آواز آئی۔

میں جو ہوئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

تو مجھ کو پہلے تو تعجب ہوا اور پھر غصہ آیا کہ یہ شخص آخر کیوں شعر کو غلط پڑھ کر مرحوم شاعر کی روح کو تکلیف دے رہا ہے۔ آواز کی سمت گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ باغ کے ایک کونے میں ایک شخص تنہا بینچ پر بیٹھا مزے لے لے کر یہی مصرع دہرا رہا ہے

میں جو روئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

گانے والے کی وضع قطع کافی دلچسپ تھی۔ حسین تو نہیں مگر بدصورت بھی نہ تھا۔ عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ داڑھی مونچھ منڈی ہوئی۔ دہرا بدن، صحت بہت اچھی اور چہرے پر خون کی سرخی جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بمبئی میں ایرانی ہوٹلوں کا کھانا کھانے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے ایک افسانہ نگار کی متجسس نگاہ اس پر ڈالی اور دماغ میں اس کا پورا حلیہ محفوظ کرلیا۔ شکل وصورت کے مطالعہ کے بعد اُس کے لباس پر نظر کی تو دیکھا کہ ایک قیمتی کپڑے کے سوٹ میں ملبوس ہے۔ مگر کوٹ اور پتلون کی ساخت صاف بتا رہی تھی کہ گاؤں نہیں تو کسی قصبے کے درزی کے ہاتھوں کی سلائی ہے۔ باوجود سخت گرمی ہونے کے واسکٹ بھی زیبِ تن تھی۔ جس کی جیب میں سے ایک چاندی کی موٹی گھڑی کی زنجیر نمودار تھی۔ سر پر ذرا پرانی وضع کا ہیٹ تھا اور قریب ہی چھڑی، چھتری اور برساتی رکھی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ حفظ ماتقدم کے خیال سے یہ سب سامان ساتھ لیا گیا تھا۔ ابھی میں دل میں یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ یہ شخص یوپی یا پنجاب کے کسی چھوٹے سے قصبے کا رئیس ہے جو بمبئی کی سیر کو آیا ہے کہ ان حضرت نے پھر ع

میں جو روئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بینچ پر جا کر بیٹھ گیا اور جیسے ہی وہ سانس لینے کے لیے رکا کہ میں نے 'معاف کیجیے' کہہ کر دخل در معقولات شروع کر دیا۔ ''معاف کیجیے۔ مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آپ یہ مصرع غلط پڑھ رہے ہیں، اصل میں اقبال مرحوم نے لکھا تھا

''کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا''

میں سمجھتا تھا کہ یہ شخص مجھ کو ڈانٹ دے گا کہ تم کون ہو یہ اعتراض کرنے والے مگر اُس نے ملائمت سے جواب دیا۔ ''شکریہ، مگر مجھے تو اسی طرح یاد ہے'' اور پھر مسکرا کر ''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں غلط مصرع پڑھ رہا ہوں۔''

''میرا مکان قریب ہی ہے۔ آپ وہاں چلیے تو میں آپ کو 'بانگ درا' میں دکھا سکتا ہوں۔''

اُمید کے خلاف وہ فوراً ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ راستے میں باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اردو، انگریزی ادب سے بخوبی واقف ہے۔ میں نے پوچھا آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے تو اُس نے بلا تکلف جواب دیا۔ ''واقعہ یہ ہے کہ میں نے کسی کالج یا یونی ورسٹی میں نہیں

پڑھا۔ میری والدہ مجھے دور بھیجتے ہوئے گھبراتی تھیں۔ انھوں نے گھر پر استاد رکھ کر ملیح آباد ہی میں تعلیم دلوائی اور پھر طفلانہ سادگی کے ساتھ' آپ نے ملیح آباد کا نام سنا ہوگا؟ وہاں کا سفیدا آم مشہور ہے۔

میں نے کہا: بدقسمت ہے وہ شخص جس نے ملیح آباد کے سفیدآم نہیں کھائے اور میں تو خود کو خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔

''اے حضرت آپ میرے باغ کے سفیدی آم کھائیں تو سفیدے کو بھول جائیں۔ تمام ہندوستان میں صرف میں نے سفیدے میں فجری کی قلم لگا کر سفیدی آم نکالے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو میں اگلی فصل میں دو چار ٹوکرے بھیجوں گا پھر آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سفیدی میں آپ کو فجری کی خوشبو اور نزاکت اور سفیدے کا مزا ملے گا۔''

اس کی باتوں میں عجیب بے تکلفی اور بھولا پن تھا۔ بمبئی جیسے تجارتی شہر میں جہاں ہر شخص چاپلوسی سے دوسروں کا روپیہ اینٹھنا جانتا ہے ایسے آدمی کم ملتے ہیں۔

''تو آپ آموں کی کاشت کرتے ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ جب سے زرعی پیداوار کی قیمتیں اتنی گھٹ گئی ہیں کھیتی میں کوئی منافع نہیں رہا۔ ہاں دو چار آموں کے باغ ہیں جن سے کچھ گذارے کی صورت ہو جاتی ہے۔''

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم مکان پہنچ گئے۔ میں نے اپنے غلام سے چائے بنانے کو کہا اور کتابوں کی الماری میں سے ''بانگ درا'' نکال کر اپنے دعویٰ کی تصدیق کر دی کہ اصل مصرع ''کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا'' ہے یہ دیکھ کر وہ کھسیانا سا ہو گیا اور کہنے لگا معاف کیجیے گا میری جہالت کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔''

میں نے موضوع بدلنے کے لیے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ چائے آنے پر ہم دونوں آرام سے بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔

وہ اس قدر صاف گو واقع ہوا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اس کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ اس کا نام شکور تھا۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ گھر کی جائیداد کافی تھی۔ اس لیے معاش کی فکر نہ تھی خاندان میں دو ہی فرد تھے وہ اور اُس کی والدہ، جن کو بیٹے سے اس قدر

محبت تھی کہ آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ اس لیے اسکول یا کالج میں بھی پڑھنے نہ بھیجا بلکہ گاؤں ہی میں گھر پر استاد رکھ کر بیٹے کو مکمل تعلیم دلائی۔ یہی وجہ تھی کہ گوشکور کا مطالعہ وسیع تھا اور علم واقفیت بھی کافی تھی مگر اس پر وہ ظاہری رنگ و روغن نہ تھا جو کالج میں چڑھتا ہے پہلی دفعہ اس کی والدہ نے اتنے لمبے سفر کی اجازت دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ بمبئی جیسے مصروف اور تیز رو شہر میں آکر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

"آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟" اُس نے پوچھا اور الماریوں کے قریب جا کر غور سے کتابوں کے نام پڑھنے شروع کر دیے۔ ایک الماری کے اوپر کے خانے میں میرا ناول "ناگن" بھی رکھا تھا اس نے جلد وہاں سے نکال کر کہا "خوب ناول ہے کیا آپ کو بھی پسند ہے؟"

"کوئی خاص خوبی تو مجھے نہیں نظر آتی۔" میں نے تکلفاً کہا۔

"تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کیوں نہیں پسند آیا؟"

"اس لیے کہ یہ خود میرا لکھا ہوا ہے۔"

یہ سن کر اس نے از حد مسرت کا اظہار کیا۔ "اخاہ تو سلیم صحافی کے نام سے آپ ہی ناول اور کہانی لکھتے ہیں آپ سے ملنے کا تو بڑا اشتیاق تھا۔"

سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ہر ماہ مختلف کتب فروشوں سے تمام نئی مطبوعات اور رسائل وغیرہ منگا کر پڑھتا رہتا ہے۔ ادبی رسائل وغیرہ میں "ناگن" کا کافی چرچا رہا تھا اور پہلے ہی سال ہاتھوں ہاتھ دو ایڈیشن فروخت ہو چکے تھے اس لیے کچھ تعجب نہ تھا کہ اس کے پاس بھی یہ ناول پہنچ گیا ہو۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا گویا کوئی سوال کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ پھر بولا "آپ سے اس ناول کے متعلق ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"شوق سے" میں نے یقین دلایا۔

"کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس میں آپ نے "ناگن" یا اوشا رانی کا کریکٹر جو پیش کیا ہے وہ ہندوستان ٹاکیز کی اسٹار زرینہ کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔"

مجھے اقرار کرنا پڑا۔ دراصل "ناگن" تو یہ تھا زرینہ کی زندگی کا۔ جس میں میں نے ایک

کامیاب اور چالاک فلم ایکٹرس کے کردار کو پیش کیا تھا۔

زرینہ اُن عورتوں میں سے تھی جن کی زندگی کا مقصد ایک ناگن کی طرح اپنے حسن سے لوگوں کو فریفتہ کر کے ان کو ڈسنا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ سچی محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتی تھی مگر وہ حسین تھی۔ از حد حسین۔ وہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گر جانتی تھی۔ پروانوں کی طرح لوگ اس کے گرد رہتے تھے۔ لیکن اُس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کے عشاق کی بھیڑ بھاڑ کبھی کم نہ ہوتی تھی۔ جو اس کے جال میں ایک دفعہ پھنس گیا وہ کبھی نہ نکل سکا۔ اس ناگن کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہ تھا۔ یہی سب میں نے اپنے ناول میں لکھا اور میرے دوستوں کی رائے تھی کہ وہ ایک کامیاب فلمی تصویر تھی جس میں زرینہ کے تمام خدوخال نمایاں تھے۔ کمال تو یہ تھا کہ خود زرینہ کو اقرار تھا۔ جس دن ''ناگن'' شائع ہو کر پہلی بار بازار میں آئی اُس سے اگلے ہی دن اُس نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا۔'' آپ کے ناول پر مبارک باد دیتی ہوں مگر ایک چھوٹی سی غلطی آپ نے کی ہے۔ میرا پسندیدہ رنگ فیروزی نہیں بلکہ آسمانی ہے۔'' میرا خیال تھا کہ میرا ناول پڑھ کر وہ از حد خفا ہوگی۔ ہر شخص سے میری شکایت کرے گی۔ ممکن ہے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے لیکن مذاقِ سلیم کے اس اظہار سے مجھے سخت تعجب ہوا۔

''تو آپ مس زرینہ کو ذاتی طور پر جانتے بھی ہوں گے؟'' شکور نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔'' اخبار نویس اور فلمی ناقد کی حیثیت سے اکثر فلمی ستاروں سے ملنا ہوتا ہے۔ زرینہ میں اور جتنی برائیاں ہوں ملنے جلنے میں وہ بہت بااخلاق اور ملنسار واقع ہوئی ہے۔''

'' آپ دل میں سوچیں گے کہ یہ شخص میرے اخلاق سے فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن کیا آپ مس زرینہ سے میرا تعارف کرا سکتے ہیں؟''

میں نے جواب دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔

فلمی حسینوں کا عشق شمالی ہند کے بہت سے نوجوانوں کو بمبئی کھینچ لاتا ہے اور ان میں سے اکثر حضرات مجھ سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ اُن کی ملاقات کسی فلم اسٹار سے کرادوں۔ مگر میں نے اِس قسم کی ذمہ داری سے ہمیشہ پہلو تہی اختیار کی تھی۔ شکور اتنا سیدھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا کہ اِس کو بیوقوف بنانا زرینہ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ میں نے سوچا کہ اس خطرے

سے اس کو آگاہ کر دوں۔

"دیکھیے۔ آپ شاید ان فلم اسٹار عورتوں سے واقف نہیں ہیں۔ ان سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ خصوصاً آپ جیسے شریف آدمی کے لیے....." میں نے جملہ ختم نہ کیا تھا کہ وہ ہنسنے لگا۔ بچوں کی طرح کھلکھلا کر۔ "آپ ڈریے مت۔ میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں جتنا شاید آپ مجھے سمجھتے ہیں۔"

اب تو میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ اتوار کو جب زرینہ کے نئے فلم، "پریم پجارن" کا افتتاح ہوگا تو میں شکور کو ساتھ لے جاؤں گا اور موقع ملنے پر اس کا تعارف کرا دوں گا۔"

(2)

بمبئی کی فلمی اور صحافی زندگی میں کسی اچھے فلم کا افتتاح ایک دلچسپ موقع ہوتا ہے۔ اسٹوڈیو کے مالک سیٹھ صاحب پھولے نہیں سماتے۔ گھڑی گھڑی ٹکٹ گھر کی طرف جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ "ٹکٹ ختم ہو گئے" کا بورڈ ابھی لگا ہے یا نہیں۔ فلم کے ہیرو صاحب سر میں معمول سے زیادہ تیل ڈال کر، ایک نیا شوخ رنگ کا سوٹ اور "چیختے" ہوئے رنگ کی ٹائی زیب تن کیے ہوئے اور ہالی ووڈ کے کسی فلم اسٹار کی وضع کی مونچھیں بنائے ہوئے بڑی شان سے ٹہل رہے ہیں کہ تماشائیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہنے کا موقع ملے "وہ دیکھو ماسٹر — کو۔ اس فلم کا ہیرو یہی ہے۔ یار کتنا خوش قسمت انسان ہے زرینہ کے ساتھ ایکٹنگ کرتا ہے۔

فلمی خواتین بھی آج بہترین لباس میں موجود ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جن ایکٹرسوں نے فلم میں نہایت معمولی کردار کیا ہے۔ وہ سب سے بھڑکدار ساڑی پہنے ہیں۔ چہرے پر پاؤڈر اور سرخی لگائے ہیں تاکہ شاید کسی کو یہ دھوکا ہو جائے کہ ہیروئین یہی ہیں۔ اِن بھڑکدار رنگین تتلیوں کے رد عمل کے لیے اخبار نویس اور تنقید نگار بھی موجود ہیں۔ لباس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بیچارے شکل سے فاقہ زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر چھوٹے موٹے رسالوں کے ایڈیٹر اسٹوڈیو کے مالک صاحب کی دربارداری کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ خوشامد سے اشتہار حاصل کر لیں گے۔

زرینہ حسبِ معمول ہلکے فیروزی رنگ کی معمولی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ یہ اُس کی چالاکی تھی کہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتی تاکہ لوگوں پر اپنی معصومیت کا سکہ جما سکے۔ اس کے گرد ہمیشہ کی

طرح پروانوں کا جمگھٹ تھا۔ ایکٹر، اخبار نویس، نوجوان تاجر، رئیسوں کے لڑکے سب اُس کے دربار میں موجود تھے۔ میں اور شکور ایک کونے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ زرینہ نے دور سے دیکھا اور ہماری طرف خود بڑھی۔ میں نے اس کو "پریم پجارن" کی تکمیل پر مبارکباد دی اور یہ موقع مناسب دیکھ کر فوراً شکور کا تعارف کرادیا۔ "یہ میرے دوست عبدالشکور ہیں۔ آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔"

"اچھا آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں۔ جہاں کے آم مشہور ہیں۔ بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔ مگر یہ تو بتایئے کہ......" اتنے عرصے میں کسی دوست نے مجھے اشارہ کیا تو میں اُدھر چلا گیا۔ اُس سے باتیں کر کے لوٹا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے شکور اور زرینہ کو بدستور آموں کے متعلق گفتگو میں مصروف پایا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "سچ پوچھئے تو جو شخص آم کی قدر نہیں کرسکتا وہ ہندوستانی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہمارا قومی پھل ہے تو آم ہی ہے۔"

اتنے میں تماشہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی اور سب لوگ سینما ہال کی طرف بڑھے۔ زرینہ نے شکور کو اپنے ہمراہ بیٹھنے کی دعوت دی۔ جس پر بہت سی حاسدانہ نظروں نے اُس کو گھور کر دیکھا۔ مجھ کو تعجب ضرور ہوا۔ مگر میں سمجھ گیا کہ یہ معلوم کر کے کہ شکور گھر کا رئیس ہے زرینہ اس کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ میں اُن سے اگلی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔

روشنیاں گل ہوگئیں۔ پردہ پر زرینہ کا نام جب آیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ فلم شروع ہوگیا۔ معمولی قسم کا فلم تھا۔ وہی پرانی کہانی جو "دیوداس" کے بعد سے نوے فی صدی ہندوستانی فلموں میں ہوتی ہے۔ ایک ٹھا لڑکا ایک تھی لڑکی دونوں میں پریم تھا۔ والدین دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے مختلف مصیبتیں پڑیں۔ درجن بھر گانے گائے گئے۔ عین اس موقعہ پر جب لڑکے کے والدین اپنی رضامندی دینے پر تیار ہوئے تھے وہ ایک گانا گاتا ہوا رخصت بہ ملک عدم ہوا لڑکی اُس کی یاد میں سنیاسی ہوگئی۔ کہانی جیسی بھی ہو زرینہ کی اداکاری معمول سے زیادہ کامیاب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے آرٹ کا تمام نچوڑ اس فلم میں پیش کر دیا ہے۔ "پریم پجارن" بلاشک اُس کا بہترین فلم تھا مگر میں تماشہ سے محظوظ نہ ہوسکا کیونکہ تمام عرصہ شکور اور زرینہ باتیں کرتے رہے وہ دلچسپ باتیں کرنے میں کمال رکھتی

تھی۔ لیکن اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اُس کو کبھی نہ سنا تھا۔ شکور اس کو اپنے باغ، اپنے کھیت، اپنے گاؤں کے خالات سنا تا رہا۔ لکھنؤ کے قابلِ دید مقامات گنائے۔ زرینہ نے اپنے بچپن کے واقعات دہرائے فلم اسٹاروں کی طرح نہیں کہ ''بچپن سے میں محسوس کرتی تھی کہ میری روح اداکاری ہی کے ذریعہ ظاہر ہوسکتی ہے۔'' بلکہ بچوں کی طرح ''ارے میں بھی لڑکپن میں بڑی شریر تھی ہمسائے میں آم کا درخت تھا جب سب سوجاتے تھے تو چپکے سے اُٹھ کر کچی کچی کیریاں چرالاتی تھی جس کی کبھی چٹنی بنتی کبھی اچار—''

تماشہ ختم ہوا تو میں اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ کیا نفسیات کا مکمل ماہر بھی عورت اور اُس کی نسوانی گہرائیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ رخصت ہوتے وقت زرینہ نے شکور کو دوبارہ ملنے کی دعوت دی اور مجھ سے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے شکور صاحب سے ملاقات کرائی۔''

(3)

عجیب اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے بعد شکور یا زرینہ سے کئی مہینے ملاقات نہ ہوسکی۔ شکور میرے مکان پر ایک بار آیا مگر میں باہر تھا پھر میں چند ماہ کے لیے دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گیا۔ جب میں واپس بمبئی پہنچا تو مکان پر ڈاک کا ایک انبار تھا۔ میں نے پہلے چند فلمی رسالے کھول کر دیکھنے شروع کیے تاکہ تازہ ترین فلمی خبریں پڑھوں۔ ''فلم نامہ'' کے پہلے ہی صفحے پر کیا دیکھتا ہوں کہ زرینہ اور شکور کی اکٹھی تصویر جس کے نیچے لکھا تھا۔ ہندوستان کی مایۂ ناز اداکار زرینہ اور اُن کے شوہر عبدالشکور یہ دیکھ کر مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ سخت دغا کی گئی ہے اور واقعہ بھی یہ تھا، شکور کے ساتھ شادی کر کے زرینہ نے پوری اُس تصویر کو غلط ثابت کر دیا جو میں نے ''ناگن'' میں پیش کی تھی۔ میرے دماغ میں دور دور بھی یہ گمان نہ گذرا تھا کہ وہ شکور جیسے سیدھے اور غیر دلچسپ انسان کے ساتھ شادی کرے گی۔ اُس نے بڑے بڑے رئیسوں، تاجروں، ادیبوں اور شاعروں کو ٹھکرا دیا تھا اگر وہ کسی کلرک، کسی نائب تحصیلدار، کسی فاقہ زدہ اخبار نویس سے بھی شادی کر لیتی تب بھی مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا۔ زرینہ حسین فسوں کار چالاک زرینہ......اور شکور بیچارہ سیدھا سادا دیہاتی شکور! دونوں تصویریں گویا میری پریشانی اور استعجاب پر مسکرا رہی تھیں۔

خط کھول کر پڑھنے شروع کیے۔ کتب فروشوں کے بل۔ درزی کا بل، مالک مکان کا بل، بجلی کا بل، رسالوں کے اڈیٹروں کے تقاضے کہ مضمون یا افسانہ بھیجو، اُن شادیوں کے رقعے جو کئی مہینے ہوئے ہو چکی تھیں، پرانے دعوت نامے اور اُن ہی میں ایک خط شکور اور زرینہ دونوں کی طرف سے۔ صرف چند سطریں تھیں۔ ہم دونوں بہت مشکور ہوں گے اگر آپ چند روز کے لیے ملیح آباد آ کر ہمارے ساتھ ٹھہریں، سفیدی آم آپ کے منتظر ہیں۔ مخلص شکور اور زرینہ۔

میں نے طے کر لیا کہ میں اس راز کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ملیح آباد ضرور جاؤں گا۔ دوسرے اخبار پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ زرینہ نے اسٹوڈیو کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ 'پریم پجارن' اس کا آخری فلم تھا۔

اگلے مہینے کسی کام سے لکھنؤ جانا ہوا تو میں تار سے اطلاع دے کر ملیح آباد پہنچ گیا۔ شکور اور زرینہ دونوں اسٹیشن پر لینے آئے۔ زرینہ اب ایک سادے غرارے اور دوپٹہ قمیض میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی تھی۔ غازہ کی نہیں بلکہ صحت کی علامت۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر از حد خوش ہوئے۔ گھر لے جا کر اتنی خاطر کی اور اتنے آم کھلائے کہ میں دو چار ہی دن میں پریشان سا ہو گیا۔ ان دونوں کی زندگی قابلِ رشک تھی۔ شکور ہر صبح کو اپنے باغ اور کھیتوں کی نگرانی کرنے کے لیے جاتا۔ زرینہ گھر کا کاروبار دیکھتی۔ کبھی کبھی وہ باغ میں پہنچ جاتی اور پھر دونوں ساتھ ساتھ واپس آتے۔ باغ اور کھیتوں سے ملا کر کوئی بہت آمدنی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اُن کو اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ ایک سابق فلم اسٹار کو اس دیہاتی ماحول میں دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا تھا۔ مگر زرینہ کے طرزِ عمل سے یہ بالکل نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں نو وارد ہے بلکہ ایسا ظاہر ہوتا تھا گویا اُس کی تمام عمر یہیں کٹی ہے۔

جب مجھے یہاں رہتے ایک ہفتہ ہو گیا۔ تو میں نے بااصرار اُن دونوں سے واپسی کی اجازت حاصل کی۔ جس شام کو میں روانہ ہونے والا تھا، دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر میں نے ہمت کر کے سوال کر ہی ڈالا جو مجھے اتنے عرصے سے پریشان کیے ہوئے تھا۔

''ایسا سوال کرنا بدتہذیبی تو ضرور ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اُمید ہے معاف کیا جاؤں گا، مگر پھر بھی پوچھنا پڑتا ہے کہ...........'' کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح سے

فقرہ پورا کروں۔

شکور نے مسکرا کر زرینہ کی طرف دیکھا اور وہ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں نا کہ ایک ناگن گھریلو بلی کیسے بن گئی۔''

میں نے گردن کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

''اگر آپ ایک سابق فلم اسٹار کا یقین کر سکتے ہیں تو میں کہوں گی کہ وہ ناگن دراصل ہمیشہ گھریلو بلی ہی تھی۔ ناگن کا روپ اس لیے تھا کہ فلمی دنیا میں معصوم خرخر کرتی ہوئی بلیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اِس رو پہلی نظر فریب ماحول میں دھوکا ہی اصلیت ہے اور سوانگ روز مرہ کا دستور۔ اگر میں ظاہرا ابھی ایک سیدھی سادی دیہاتن رہتی تو کامیابی کا دروازہ میرے لیے ہمیشہ بند رہتا۔ اس کے علاوہ معاف کیجیے گا آپ کے ہم پیشہ حضرات نے فلم ایکٹرسوں کو اس قدر بدنام کیا ہے کہ اگر میں تصنع سے کام نہ لیتی اور سادہ برتاؤ رکھتی تب مجھے اور بھی زیادہ عیار اور چالباز سمجھا جاتا۔''

تو میں نے جو کچھ اپنے ناول ''ناگن'' میں لکھا تھا وہ............

''وہ بالکل غلط تھا۔'' شکور بیچ میں بول پڑا اور پھر مسکراتے ہوئے۔ ''وہ تو میں ناول پڑھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ بغیر ملے اپنی بیگم صاحبہ کے کردار کو اتنا پہچانتے تھے؟''

میں زرینہ کو تو نہ جانتا تھا مگر ہندوستانی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا۔ آپ نے ناگن کا کیریکٹر جو پیش کیا تھا وہ ناممکن الوجود تھا۔ انسان خواہ فلم اسٹار ہو یا مولوی، اُس میں انسانیت کا جوہر مفقود نہیں ہوتا۔ ناگن کے ظاہری روپ کو تو آپ نے ضرور دکھایا مگر آپ یہ نہ معلوم کر سکے اس کا دل آخر عورت کا دل تھا۔ آپ کا ناول غلط نہیں تھا مگر وہ ایک ایسی تصویر کی طرح تھا جو بذاتِ خود صحیح ہو مگر اُلٹی لٹکا دی گئی ہو۔

میں چند لمحے کے لیے خاموش بیٹھا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری نظر سے ایک پردہ ہٹ گیا ہے۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ناگن کے کردار پیش کرنے میں میں کتنی غلطی پر تھا۔ موضوع بدلنے کے لیے میں نے زرینہ سے سوال کیا۔ ''تو کیا آپ نے فلمی دُنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا؟''

''جی ہاں۔'' اُس نے جواب دیا۔'' مگر اس لیے نہیں کہ یہ برا کام ہے یا مخرب الاخلاق ہے۔ ہر پیشہ برا ہوسکتا ہے اگر اُس میں برے لوگ لیے جائیں گے مگر ہر اداکار کو اپنی کامیابی کے معیار پر پہنچ کر اپنی زندگی ختم کر دینا چاہیے۔ ورنہ ایک دن خود اسٹوڈیو والے اس سے استعفےٰ طلب کریں گے۔''

اتنے میں زنان خانے سے ایک نحیف آواز آئی۔''زرینہ بیٹی یہ پان لے جاؤ۔''

''میری والدہ!'' شکور نے کہا، جب زرینہ اٹھ کر گئی۔'' آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ زرینہ نے چند ہی روز میں اتنی قدامت پسند خاتون کو بھی خدمت سے اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔''

اس شام کو میں رُخصت ہو کر لکھنؤ واپس آیا اور وہاں سے بمبئی کے لیے ٹرین بدلی۔ اسٹیشن پر ایک کتب فروش لڑکا اور ناول کے ساتھ'' ناگن'' بھی بیچ رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔''صاحب یہ ناول لیجیے۔ بہترین ناول ہے۔ بس دو جلدیں رہ گئی ہیں''

میں نے دونوں جلدیں خرید لیں اور جب ٹرین روانہ ہوگئی تو ان کو درجے سے باہر پھینک دیا۔

یہی وجہ ہے کہ باوجود پہلے ایڈیشنوں کی اتنی مقبولیت کے'' ناگن'' کا تیسرا ایڈیشن شائع نہ ہوا اور نہ ہوگا۔

O

پہلا پتھر

"اس گنہگار عورت پر پہلا پتھر وہ چلائے جس نے خود کبھی گناہ نہ کیا ہو (حضرت عیسیٰ)

(1)

رام گڑھ کلب میں ٹینس ہو چکی تھی اور ممبر جن میں شہر کے معزز خواتین اور حضرات شامل تھے۔ برقی روشنی سے منور ڈرائنگ روم میں ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں آ رہے تھے۔ چند نے تاش سے شوق کرنا شروع کیا، ایک گنجے پروفیسر نے اپنی توجہ ریڈیو کی طرف مبذول کی اور باقی سب آرام سے صوفوں پر لیٹ کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھلا اور مسز اسمتھ، شہر کی لیڈی ڈاکٹر داخل ہوئیں۔

"ہیلو ڈاکٹر صاحبہ" مسز سنگھ نے پوچھا۔ "کہاں ہیں؟ ٹینس پر تو آپ کا انتظار ہی رہا۔"

مسز اسمتھ اب تک ہانپ رہی تھیں۔ کچھ تو اپنے قدرتی موٹاپے کی وجہ سے وہ تھوڑا سا چل کر بھی تھک جاتی تھیں اور کچھ اُن کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک نہایت اہم خبر کی حامل ہیں۔ جس کے گراں بوجھ نے ان کی تکان میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مسز اسمتھ اس فیاض طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں جو ہمیشہ اپنے راز میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ اپنے پیشہ کی اہمیت

جتانے میں بھی اُن کو خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔ کیا بتاؤں یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ گھڑی بھر کی فرصت نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے فراغت پا کر آئی ہوں۔" اور پھر اپنے قریب بیٹھی ہوئی خاتون کی طرف مخاطب ہو کر۔ "تم نے کچھ اور بھی سنا؟"

یہ سوال انہوں نے ایسی آواز میں کیا کہ سب نے سن لیا۔ مسز اسمتھ اپنی دشنام طرازی کے لیے مشہور تھیں اور اپنے کام کے سلسلہ میں اکثر لوگوں کے متعلق "دلچسپ واقعات" ان کے علم میں آتے تھے۔ جن کو کلب میں بیان کرنا وہ اپنا فرض اولین سمجھتی تھیں۔ گنجے پروفیسر نے ریڈیو بند کر دیا۔ تاش کھیلنے والوں نے بازی فی الحال ملتوی کر دی۔ مردوں نے اپنی اپنی ٹائیوں کو درست کیا اور عورتوں نے اپنی ساڑیوں پر سے شکنوں کو دور کیا اور سب ہمہ تن گوش ہو کر مسز اسمتھ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اپنے پیشے کے اصول کے مطابق، مجھے یہ بیان تو کرنا نہیں چاہیے مگر کلب کے ممبر کی حیثیت سے مجھے لازم ہے کہ آپ کو اس واقعہ سے مطلع کروں کیونکہ ایسے واقعات سے کلب کی بدنامی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ مسز ٹامس کو کلب سے نکال دیا جائے۔"

مسز اسمتھ دلچسپی میں اضافہ کرنے اور اپنا گلا صاف کرنے کے لیے ٹھہر گئیں۔ ایولن ٹامس میونسپل اسکول میں ایک نوجوان معلمہ تھی اور ایک مہینہ ہوا کلب میں بعض ممبران کی سفارش پر داخل کی گئی تھی۔ اس کے داخلہ ہی پر کافی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں کیونکہ وہ ایک کم تنخواہ معلمہ تھی۔ اُس کے خاوند کو جو کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اکثر خواتین کا خیال تھا کہ اس کا کلب میں ممبر کی حیثیت سے داخلہ اُن کی ہتک تھی۔ بھلا کہاں فوق البھڑک ساڑیاں پہننے اور موٹر میں پھرنے والیاں، کہاں وہ ساٹھ روپے کی استانی مگر اُن کی خفگی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ باوجود ان کے شاندار کپڑوں اور غازہ اور سرخی کے استعمال کے ایولن ٹامس سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔

"ہاں تو کیا ہوا مسز اسمتھ؟ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کمبخت کو داخل نہ کیا جائے۔" ایک خاتون نے کہا۔ یہ بوڑھے اور گنجے پروفیسر اندرسین کی نوجوان بیوی موہنا تھیں۔ تعلیم تو معمولی ہوئی تھی، مگر رام گڑھ کی سوسائٹی کی تتلیوں سے بڑھیا ساڑیاں پہننا اور فرانسیسی سامان زیبائش کا

استعمال سیکھ لیا تھا۔ انگریزی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھیں مگر بالکل فرانسیسی انداز میں جیسے کہ کوئی خاص پیرس کی حسینہ انگریزی بولنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

مسز اسمتھ نے آرام لے کر پھر سلسلہ بیان شروع کیا۔ ''کیا بتاؤں مجھے تو سناتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ مگر کلب کی بہبودی کے خیال سے آپ کو اطلاع بھی دینی ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ کو شاید یاد ہوگا ایولن کی شادی چھ مہینہ ہوئے ہوئی تھی۔ اور آج اُس کے بچہ پیدا ہوا ہے۔''

''کیا؟''

''ہاں؟''

''واقعی؟''

''لاحول ولاقوۃ''

''توبہ۔ توبہ۔''

ایک دم چاروں طرف سے یہ آوازیں بلند ہوئیں اور مسز اسمتھ آرام سے صوفے پر لیٹ کر لوگوں کے چہروں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

''میں تجویز کرتی ہوں کہ ایولن ٹامس کو فوراً نکال دیا جائے۔ ایسی عورت کا ممبر رہنا کلب کی ذلت ہے۔''

تجویز پیش کی مسز اندرسین نے، موافقت ایک نوجوان انجینئر رام لال نے کی اور بالاتفاق فوراً پاس ہوگئی۔

الگ صوفوں پر اسی واقعہ کے متعلق آہستہ آہستہ گفتگو شروع ہوگئی۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ مسز اسمتھ کی خبر نے کلب کی فضا میں ایک بے لطفی پیدا کر دی تھی پروفیسر فلسفیانہ انداز میں ریڈیو کے ساتھ کھیل رہا تھا، کچھ لوگ اخباروں کی تصویروں پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

رام لال انجینئر نے مسز اندرسین کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جس کا جواب ایک خفیف سی مسکراہٹ سے پا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا!

''اچھا اب میں تو اجازت چاہتا ہوں۔'' اُس نے اوورکوٹ پہنتے ہوئے کہا اور پروفیسر کی طرف مخاطب ہو کر ''پروفیسر صاحب چلیے آپ کو کار میں پہنچاتا جاؤں۔''

''ہیں؟ نہیں۔ شکریہ میں تو دس بجے ریڈیو پر خبریں سن کر جاؤں گا۔'' پروفیسر نے بیدار ہو کر کہا۔ مگر ہاں مہربانی فرما کر موہنا کو پہنچاتے جایے۔ وہ جانا چاہتی ہوگی۔ جانے سے قبل موہنا نے پھر ایولن ٹامس کے متعلق کلب کے سکریٹری مسٹر اختر حسین سے کہا۔ ''اچھا تو اختر صاحب آپ آج ہی ایولن ٹامس کو اطلاع دے دیجیے کہ اس کو کلب کی ممبری سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ہم ایسی آوارہ عورتوں کو نہیں رکھ سکتے۔''

''کیوں موہنا۔'' رام لال نے ایک ہاتھ سے موٹر چلاتے ہوئے اور دوسرے کو موہنا کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر پروفیسر کو معلوم ہو جائے تو کیا ہو۔'' موہنا نے اس کا جواب ایک پیار بھری چپت سے دینا مناسب سمجھا۔

(2)

''آج منشی برق اب تک نہیں آئے۔'' رات کا ایک بجا تو لکشمی طوائف نے اپنے استاد جی سے پوچھا۔

پوپلے استاد جی نے جواب دیا۔ ''تعجب ہے۔ ایسی دیر تو اُن کو ہوتی نہیں ہے کبھی۔ وہ تو بارہ کے بعد ہی آجاتے ہیں۔ اچھا تو اَب میں تو چلا، آئیں گے بھی تو اب گانا کیا سنیں گے'' یہ کہہ کر وہ تو چلتے بنے۔

''میں بھی اب جا کر سو جاتی ہوں۔ لکشمی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''اب کب تک اُن کا انتظار کروں۔''

''جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں چند منٹ اور ٹھہر جاؤ۔'' بوڑھی جہاندیدہ نائکہ بولی۔

وقت کاٹنے کے لیے لکشمی نے ہارمونیم بجانا شروع کر دیا۔ لکشمی خوب صورت نہ تھی۔ عمر بھی 35 سے کم نہ تھی۔ گناہ کی زندگی سے چہرے پر ایک پھٹکاری برسنے لگی تھی۔ مگر پاؤڈر و غازہ کی مدد سے بجلی کی سرخ روشنی میں جب بیٹھتی تو کوئی نہ کوئی گاہک پھنس ہی جاتا تھا۔ گانا اچھا جانتی تھی اس لیے ناچ مجرے سے بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ منشی برق اُس کے پرانے چاہنے والوں میں تھے اور اپنی عاشقی کو پندرہ برس سے نباہے جا رہے تھے۔ وہ شہر کے ایک ہفتہ وار اخبار ''خناس'' کے ایڈیٹر تھے، جس کی پالیسی ''سرکار کی وفاداری، اسلام کی اخلاقی و مذہبی روایات کو

قائم رکھنا اور نئی روشنی کی تباہی سے قوم کو بچانا" تھی شہر کے پرانے خیال کے طبقے میں اُن کی کافی عزت کی جاتی تھی۔ ضلع کے دربار میں اُن کو کرسی ملتی تھی۔ اکثر اوقاف کے متولیوں میں تھے۔ اس لیے کم از کم ظاہرداری کا تقاضہ تھا کہ دن دہاڑے طوائف کے مکان پر چڑھتے نظر نہ آئیں۔ اُن کے آنے کا مقررہ وقت بارہ بجے تھا۔

اب ڈیڑھ بج گیا تھا۔ نائکہ نے بھی اب لکشمی سے کہا۔" بس اب جا کر سو رہو، منشی جی کو کوئی کام ہو گیا ہوگا۔ لکشمی ہارمونیم بند کر کے اُٹھنے ہی والی تھی کہ زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی اور منشی برق ہانپتے کانپتے داخل ہوئے۔

پچاس سے اوپر عمر، پشاخہ داڑھی، اس میں گھٹیا خضاب سے قوس قزح کے رنگ، سر پر پٹھے، ان میں سیروں تیل پڑا ہوا، سر پر چوگوشہ مخمل کی ٹوپی، ریشمی شیروانی، سلیم شاہی جوتا، منشی برق اچھے خاصے چڑی کے غلام معلوم ہوتے تھے۔

سانس قابو میں آیا تو بولے۔'ارے لکشمی بیٹھو۔ کھڑی کیوں ہو۔" نائکہ سے پان کی فرمائش کی اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔'ارے بھئی معاف کرنا۔ مجھے آج ذرا ضروری کام ہو گیا تھا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔"

لکشمی تجربہ کار طوائف تھی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر بولی۔

"جی ہاں۔" آپ کو ہمیشہ کام ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اتنی رات گئے بھلا کیا کام تھا۔ کسی اور کوٹھے پر گئے ہوں گے۔"

منشی برق نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔" ارے ہاں! اس عمر میں ضرور کہیں اور جاؤں گا۔! بھلا پندرہ برس سے جب سے ہماری تمہاری ملاقات ہے کبھی سنا ہے کہ میں کہیں اور گیا۔"

"اچھا تو پھر بتاؤ کہاں گئے تھے؟ لکشمی نے اصرار کیا۔

منشی جی نے پہلو بدلا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرا، ٹوپی اُتار کر رکھی اور جواب دیا۔" ارے لو تمہیں نہیں تو کسے بتاؤں گا۔ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ پہلے ایک پان اپنے ہاتھ سے کھلاؤ تو شروع کروں۔"

لکشمی نے پان دیا اور منشی صاحب نے اپنے زرد پائیریا زدہ دانتوں میں دبایا۔

''بات یہ ہوئی۔'' انھوں نے کہنا شروع کیا۔'' کہ آج اپنے اخبار کے لیے بہت بڑھیا مواد ہاتھ آیا ہے۔ کلب کے خانساماں سے معلوم ہوا۔ وہاں بھی اسی کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ عیسائی چھوکری مسز ٹامس ہے نا، اسکول میں پڑھاتی ہے، اس کے متعلق۔ ایک ہفتہ ہوا اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور منشی جی نے آنکھ مار کے کہا۔'' شہر کے گرجا کے پادری کا رجسٹر کہتا ہے کہ شادی صرف پانچ مہینے ہوئے، ہوئی تھی۔ کیوں کیسی رہی؟ تو میں اُسی کے متعلق تحقیقات کر رہا تھا۔ پادری سے ملا، اُس کا رجسٹر دیکھا اسکول کے ملازمین سے پوچھا، لیڈی ڈاکٹر سے ملا۔ تب جا کر یہ مواد دستیاب ہوا ہے۔ پرسوں پرچہ نکلنے کا دن ہے۔ سوچا کہ مضمون بھی لکھ لوں۔ سنو گی؟ جیب ہی میں ہے......

لکشمی اور اُس نائکہ دونوں نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ منشی جی نے جیب سے کچھ کاغذ نکالے، ایک دقیانوسی عینک ناک پر رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اخبار ''خناس'' کی پالیسی کے مطابق ہم ہمیشہ بے پردگی فیشن اور عورتوں کی تعلیم کے مضر اثرات کو عوام پر ظاہر کرتے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اکثر بے پردہ طبقہ کی بدمعاشیوں اور بداعمالیوں کی مثالیں بھی ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں تاکہ مسلمانوں پر بے پردگی اور تعلیم نسواں کے خطرات عیاں ہو جائیں چند ماہ کا عرصہ ہوا ہم نے مخلوط کلب کی رنگ رلیوں کا ذکر کیا تھا۔ مگر آج ہمارے علم میں اس سے بھی زیادہ سنگین واقعہ آیا ہے جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ عورتوں کو بے پردہ رکھنے اور اُن کو آزادی دینے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ شہر کے گرلز اسکول میں ایک نوخیز عیسائی استانی ہیں۔ مسز ٹامس جن کی خانہ آبادی شہر کے گرجا میں پانچ ماہ ہوئے ہوئی تھی۔ اور آج تہذیب جدید کی برکت سے اُن کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے!.........''

لکشمی اور اُس کی نائکہ نے ایک قہقہہ مارا اور منشی جی نے فاتحانہ انداز سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا مضمون جاری رکھا۔

''کیا اس واقعہ کے بعد بھی شہر کے شریف مسلمان اپنی لڑکیوں کو گرلز اسکول میں پڑھنے کے لیے بھیجیں گے۔ جہاں اُستانیاں ایسی ہوں گی وہاں کی لڑکیوں کا کیا حال ہوگا؟ ہم گرلز اسکول کی منیجنگ کمیٹی اور خصوصاً اُس کے صدر رائے بہادر موہن لال سے سوال کرتے ہیں کہ اُن

کو اس واقعہ کا علم ہے؟..........''

(3)

رائے بہادر موہن لال نے تیسری بار ''خناس'' کے مضمون کو پڑھا اور میز پر رکھ دیا۔

رائے بہادر موہن لال دس لاکھ روپیہ نقد، تین کوٹھیوں، چار باغات اور ایک توند کے مالک تھے۔ عزت، شہرت اور دولت ان کی لونڈیاں ہیں رائے بہادر موہن لال نے اپنی دولت اپنے دو بھتیجوں کی جائیداد غصب کر کے اور سٹہ کے ذریعے حاصل کی تھی۔ لیکن اب تو اُن کا شمار شہر کی معزز ہستیوں میں ہوتا تھا۔ آنریری مجسٹریٹ، میونسپلٹی کے صدر'' ہندو دھرم سیوک سنگھ کے سکریٹری اور پچھلے سال سے جب انھوں نے دس ہزار نقد چندہ دیا تھا۔ رام گڑھ گرلز اسکول کی منیجنگ کمیٹی کے بھی صدر۔ رائے بہادر صاحب نے اپنی چکنی توند پر ہاتھ پھیرا جو چکن کے کرتے میں سے چمک رہی تھی۔ ایک ڈکار لی۔ اور چوتھی بار پڑھنے کے لیے 'خناس' اُٹھایا ہی تھا کہ ان کے لنگوٹیا یار خان بہادر چھٹن میاں صاحب داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ''خناس'' کا پرچہ تھا۔ خان بہادر چھٹن خاں ایک خاندانی رئیس تھے ان کے دادا کے ہاں چھ ہاتھی اور چھ طوائفیں تھیں۔ ان کے والد کے پاس ایک گھوڑا اور فقط ایک ہی خانہ زاد تھی۔ چھٹن خاں کو ہمیشہ افسوس رہا کہ اجناس کی گرانی کے سبب وہ کبھی ایک طوائف گھر پر نہ رکھ سکے۔

''ارے یار یہ کیا لکھا ہے؟ خان بہادر صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا۔

''میں نے خود بھی پڑھا ہے۔ سخت بدنامی کی بات ہے۔ اسکول کی ناک کٹ گئی۔ رائے بہادر نے جواب دیا۔

''ارے جناب تمام شہر میں چرچا ہے لوگ کہتے ہیں ہم اپنی لڑکیوں کو ایسے اسکول میں نہیں بھیجیں گے۔ خان بہادر صاحب بولے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟

''ارادہ کیا بھئی۔ اب منیجنگ کمیٹی کے سامنے معاملہ رکھنا پڑے گا۔ رائے بہادر صاحب نے فرمایا۔

''مگر ایسی عورت کو تو آپ کو ایک منٹ اسکول میں نہ رکھنا چاہیے۔ خان بہادر صاحب نے کہا۔ ''ورنہ اپنا اسکول خالی ہوا سمجھیے'' ''آخر آپ کو بھی تو بہ حیثیت صدر منیجنگ کمیٹی کچھ اختیارات ہیں۔''

''تو کیا فوراً نکال دوں۔''

''اور کیا۔ اگر اپنے اسکول کی خیریت چاہتے ہیں''

''مگر اس سے پوچھ تو لیا جائے۔''

''ارے میاں اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ نکال باہر کرو سالی کو۔''

رائے بہادر میاں کو بھی اپنے اسکول کی نیک نامی کی بہت فکر رہتی تھی کیونکہ اس کی بدنامی سے اُن کی بدنامی ہوئی تھی۔ اس لیے انھوں نے وہیں کاغذ قلم منگا کر مسز ٹامس کی برخواستگی کا حکم لکھ اُس کے گھر بھجوا دیا۔

جب خط لے کر نوکر روانہ ہو گیا تو رائے بہادر صاحب نے افسوس بھرے انداز میں کہا'' کمبخت اگر اس قماش کی تھی تو آخر ہم لوگوں نے کیا قصور کیا تھا کہ محروم رہے۔''

(4)

''ارے بس ہنسی بند کرو۔''

ایولن کو غصہ آ رہا تھا اور اُس کے خاوند کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

میری نوکری چلی گئی اور تم ہو کہ ہنسے جا رہے ہو۔ اُس نے اس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔

''یہ شہر کم بخت اس قابل نہیں ہے کہ تم یہاں رہو۔'' ٹامس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا اب میں اپنی ایولن کو یہاں چھوڑوں گا ہی نہیں۔

''تو تمھارے پچاس روپے پر کیسے دونوں گزارہ کریں گے؟ اور ان لوگوں کو دیکھو کہ مجھے بلا کر پوچھا تک نہیں۔ اس ذلیل چیتھڑے 'خناس' کے لکھنے پر مجھے نکال دیا۔ میں کل ہی اپنی پہلی شادی کا سرٹی فیکیٹ لے جا کر رائے بہادر کو دکھاؤں گی۔''

''وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اس سے ملنے جاؤ۔ تمھاری پاک بازی کا انحصار رائے بہادر موہن لال کی رائے پر نہیں ہے۔ نہ رام گڑھ کلب کی ممبری پر۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس جگہ کی فکر ہی نہ کرو۔ اور کل صبح ہی میرے ساتھ دہلی چلو۔ بھلا رام گڑھ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ رہی ہماری شادی تو وہ ہمارا فعل ہے ہم خواہ دس دفعہ شادی کریں۔ کہو تو دہلی میں تیسری دفعہ گرجا میں

جا کر نکاح پڑھائیں۔"

"مگر ایولن! یاد ہے جو مزہ اس خفیہ شادی میں آیا تھا کس طرح تم گھر سے چھپ کر آئی تھیں اور گرجا میں جب پادری بائبل پڑھ رہا تھا اور تم کانپ رہی تھیں......

"یہ سب تو ہے لیکن میں کہتی ہوں۔ دہلی جیسے شہر میں ہم کیسے تمہاری تنخواہ پر گذارہ کریں گے۔"

ٹامس نے ایک اور قہقہہ لگایا "ارے میری منی، میں نے تجھے ابھی یہ تو بتایا ہی نہیں۔ مجھے اپنے دفتر کی ہیڈ کلرکی مل گئی ہے اب سو روپے تنخواہ ملے گی سو روپے......"

"افوہ۔ سچ بتاؤ۔" ایولن نے خوشی سے ٹامس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو۔ اور ابھی پوری بات تو سنو کوئن الزبتھ ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹرس سے میں ملا تھا۔ اُس نے کہا ہے کہ اُس کے ہاں ایک استانی کی جگہ خالی ہے یقین ہے تمھیں وہ لے لے گی۔"

"ارے سچ!" ایولن خوشی کے مارے سرخ ہوگئی۔ "اب تو کل ہی اِس منحوس شہر سے بھاگ چلو۔"

ہاں ٹامس نے جواب دیا۔ مگر کچھ اور بھی یاد ہے آج ہماری پہلی شادی کی سالگرہ ہے اس کا تو جشن منانا چاہیے۔

اس رات محلّہ والوں کا سونا حرام ہوگیا۔ گراموفون پر گانے کے ریکارڈ ٹامس اور ایولن کے قہقہے اور اُن کے بچے کے رونے نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔

○

MUSLIM

بسلسلہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۶	جون سنہ ۱۹۳۶ء	جلد ۲۶

فہرست مضامین

۱	آہ انصاری	جناب محمد مجیب صاحب، رکن مصنفین جامعہ	۴۰۵
۲	شمالی ہندوستان کے دیہات کی زبان ..	جناب ... صاحب فرید آبادی ...	۴۵۱
۳	[illegible]	جناب ... حسین صاحب ...	۵۰۳
۴	[illegible]	[illegible]	۵۱۶
۵	دنیا میں ذخیرۂ غذا	جناب محمد حنیف صاحب ...	۵۲۶
۶	اردو رسم خط میں ایک تبدیلی کا مشورہ ..	ع. ق. ...	۵۳۵
۷	ادب اور سماج	از ...	۵۳۹
۸	تنقید و تبصرہ	ع. ح. م. م	۵۴۸
۹	نظام الملک آصف جاہ	م. م	۵۶۲
۱۰	... .	جناب ... صاحب ...	۵۸۳
۱۱	ارشادات ثاقب	جناب ثاقب صاحب کانپوری	۵۸۶

محمد مجیب ... بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ ... میں چھپوا کر شائع کیا

ابابیل

اس کا نام تو رحیم تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لہار کے بچے نے اس کے بیل کی دم میں کانٹے باندھ دیے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ مرا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی، تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو کہہ دیا۔ ''ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے۔'' بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تھانے میں رپورٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں

جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدّو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا۔ ''کیوں بے 'نتھو' تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کرے گا اور ابے چھدّو تیری بھی شامت آئی ہے کیا۔'' اور پھر ان غریبوں کی شامت ہی آجاتی۔ سوت کی رسّی کی مار سے دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو اُلٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اُس کی بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہوگئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تھا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اُس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''ہلاس پور کی طرف جاؤ ذرا انور کو لیتے آنا۔'' بس پھر کیا تھا آگ بگولا ہوگیا۔ ''میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لیے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چکی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لیے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلاف معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولہے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پیے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دوہ کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اُس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا۔ ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

"اری، آنکھ پھوڑے گی۔" اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا اور گھڑونچی پر سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اُس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں اب کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آ جاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان ؟ بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آ رہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کبڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے وہ کہتا ہی رہا۔ "ارے میں

کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں۔" آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکا تا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔

اندر آکر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیے۔ "ارے او بندو۔ ارے او نورو" پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہوجائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اُس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اُٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو زیلدار اور کئی کسان شام کو اس جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ "ارے بندو۔ ارے نورو کہاں مر گئے۔ آج تمھیں کون کھانا دے گا۔" چند ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"بے چارہ پاگل ہوگیا ہے۔" کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا۔ "صبح کو شفاخانہ والوں کو پتہ دے دیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

O

تین عورتیں

تین عورتیں ایک ریلوے لائن کے کنارے چلی جارہی تھیں۔ کس مقام پر؟ کس ریلوے لائن کے کنارے؟ ان کا مذہب کیا تھا؟ ان کی ذات کیا تھی؟ یہ سب تفصیل غیر ضروری ہے۔

تین عورتیں!

ایک نوجوان سندری تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے سینہ میں اُبھار۔ اُس کی چال میں والہانہ پن۔

ایک ماں تھی۔ اُس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ لال لال بوٹی سا سات دن کا بچہ۔ بار بار ماں اپنے لال کی طرف محبت بھری نگاہ سے دیکھتی تھی اور اُس کو بھینچ کر کلیجے سے لگالیتی تھی گویا کسی آنے والے خطرے سے بچا رہی ہے۔

ایک بھکارن تھی۔ اس کی ساڑی کا رنگ کسی زمانے میں سفید رہا ہوگا۔ اب مٹی اور پسینہ سے اتنی میلی ہوگئی تھی، جیسے مدتوں کیچڑ میں پڑی رہی ہو۔ اس کی ساڑی کسی زمانے میں ساڑھے پانچ گز کی ہوگی۔ اب تو پلّو پھٹتے پھٹتے وہ مشکل سے تین گز کی رہ گئی تھی اور تن ڈھانکنے کے لیے بھی کافی نہ تھی۔ اس کے بال گرد سے اَٹے ہوئے تھے اور نکیلے پتھروں نے اس کے پاؤں زخمی کر دیے تھے۔

تین عورتیں ایک ریلوے لائن کے کنارے چلی جا رہی تھیں۔

تین عورتیں!

دور جہاں ریلوے لائن کی دونوں چمکتی ہوئی پٹریاں ایک لمبی لکیر بن کر آسمان میں گم ہوگئی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کالا نقطہ نظر آیا۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ریلوے انجن کی سیٹی کی دھیمی آواز آئی۔

سیٹی کی آواز سنتے ہی بھکارن چونکی ہوگئی۔ وحشت اور پریشانی کے بجائے اس کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک نظر آئی۔ ایک سیکنڈ وہ ٹکٹکی لگائے سامنے آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ جہاں چھوٹا سا کالا نقطہ نظر آ رہا تھا پھر وہ جلدی سے ایک پٹری پھلانگ کر دونوں پٹریوں کے درمیان چلنے لگی۔

نوجوان سندری اور بچے کی ماں اپنی ساتھن کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک دیکھ کر پریشان ہوگئیں، جیسے ہی بھکارن چھلانگ مار کر پٹریوں کے درمیان آئی اس کے ساتھ ہی یہ دونوں بھی آگئیں۔

''آخر تیرا ارادہ کیا ہے؟ ماں نے بھکارن سے پوچھا۔ مگر اس کے لہجے سے معلوم ہوتا کہ یہ سوال غیر ضروری ہے۔

''تو خوب جانتی ہے۔'' بھکارن نے لاپرواہی سے جواب دیا اور برابر سامنے آسمان کی طرف نظر جمائے دیکھتی رہی۔ اب وہ چھوٹا سا کالا نقطہ اتنا چھوٹا نہ رہا تھا۔

''کیا پاگل ہوگئی ہے تو؟'' نوجوان سندری نے ایسے لہجے میں کہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دفعتاً اس کو ایک بہت بڑے خطرے کا احساس ہوا ہے۔

بھکارن بڑے بڑے قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ اور دوسری دونوں عورتوں کو اتنا تیز چلنا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس کا ساتھ دیے جا رہی تھیں۔

''پاگل! اور میں؟'' بھکارن قہقہہ مار کر اس بری طرح سے ہنسی کہ نوجوان سندری اور ماں دونوں ڈر گئیں۔ ''پاگل میں ہوں یا تم جو اب تک زندگی سے انصاف کی آس لگائے بیٹھی ہوئی ہو؟ آخر ہمارے زندہ رہنے کی کوئی وجہ ہی کیا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہوگی''

نوجوان سندری اتنی آسانی سے بازی ہارنے والی نہ تھی۔ ''مگر سوچو تو میری جوانی کا تو خیال کرو۔ عورت عمر میں ایک بار ہی تو جوان ہوتی ہے۔ جب بھی زندگی کا لطف نہ اٹھایا تو......''

''جوانی!'' بھکارن نے حیرت سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔'' جوانی! وہی جوانی جس کی قیمت چار آنے ہے۔ وہی جوانی جس کو ایک خودغرض مرد نے اپنی میٹھی باتوں سے لوٹ کر تمھیں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا! وہی جوانی جس کو تم ہر روز بازار میں بیچنے پر مجبور ہو! ہر پولیس کے سپاہی کے ساتھ! ہر ریل کے بابو کے ہاتھ! ہر آوارہ شرابی کے ہاتھ جو چونی تمھارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے! آخ تھو ہے ایسی جوانی پر۔''

اب ماں کی باری تھی۔ اس نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور گویا اس کا سہارا پا کر بھکارن سے بحث کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ ''مگر میرا بچہ۔ آخر اس غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کو موت کے حوالے کر دوں۔ اس کی خاطر تو مجھے زندہ رہنا ہی ہوگا خواہ کتنی ہی مصیبت کیوں نہ جھیلنی پڑے۔'' اور پھر بے اختیار بچے کو چھاتی سے لگا کر۔ ''میرا بچہ!''

''میرا بچہ!'' بھکارن کی آواز میں اس قدر طنز اور حقارت تھی کہ ماں بے زبان ہوگئی۔ ''ارے یہ گوشت کا لوتھڑا جس کو تو گلے سے چمٹائے پھرتی ہے۔ یہ دنیا کی بے انصافی سماج کے ظلم کا جیتا جاگتا اشتہار، تیری تباہی اور بربادی کا ذمہ دار، آخر یہ بڑا ہو کر کیا کرے گا۔ لاٹ صاحب بنے گا یا لکھ پتی! اس ملک میں بھک منگوں کی کمی نہیں ہے! آخر کیوں نہ پھینک دیا اس کو اس کے باپ کے دروازے پر۔ پالتا وہ بزدل کمینہ اپنے گناہ کی یادگار کو۔''

ماں جلدی سے بولی۔ نہیں نہیں۔ اُن کو کچھ مت کہو۔'' اس ایک لفظ ''اُن'' میں عجیب پریم، عجیب لگاوٹ کی چاشنی تھی۔ اور اُس کو زبان سے نکالتے وقت ماں کی نگاہ نویلی دلہن کی طرح شرم سے جھک گئی۔ ''ان کو کچھ مت کہو۔ وہ اپنے ماں باپ کے خیال سے مجبور تھے۔''

بھکارن غصے کے مارے آپے سے باہر ہوگئی۔ چھوٹا سا کالا نقطہ اب کافی بڑا ہو گیا تھا اور ہر لحہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ ریل کی گڑگڑاہٹ سے بھی بلند اس کی آواز سنائی دی۔ ''ماں باپ کے خیال سے یا جائیداد کے خیال سے! اور تمھارے ماں باپ کی ماتا کہاں گئی تھی جب انھوں نے مہاوٹوں کی کالی رات میں تمھیں گھر سے نکال دیا اس ڈر سے کہ تمہاری حالت ظاہر ہونے پر سماج کیا کہے گا۔''

یہ کہہ کر بھکارن سامنے آنے والی ریل کی طرف بے تحاشا لپکی اور نوجوان سندری اور ماں دونوں اس کو روکنے کے لیے ساتھ ساتھ دوڑیں۔

ایک کالے دیو کی طرح ریل کا انجن پچاس میل کی رفتار سے چلا آرہا تھا۔ ایک ڈراؤنی سیٹی کی آواز گونجی مگر بھکارن ذرا نہ جھجکی۔

انجن کے پہیے اس کی طرف لپک رہے تھے۔

ریل کے ایک درجے میں دو بڑی توند والے بیوپاری لاکھوں کی لین دین کا سودا کر رہے تھے۔ ان کے سامنے شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اور وہ گلاس پر گلاس چڑھا رہے تھے۔ نشہ میں دھت! اور دنیا کے دکھوں سے بے خبر۔ تیسرے درجے میں بھیڑ بکریوں کی طرح غریب اور کسان اور مزدور بھرے ہوئے تھے۔ ایک اندھا فقیر تنبورہ ہاتھ میں لیے ان کو بھجن سنا رہا تھا۔ یہ سب بھی نشہ میں دھت اور خود اپنے دکھوں سے بے خبر! ایک پگلا کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ ''رام رام ست ہے۔ دھت تیرے کی! رام رام ست ہے۔ دھت تیرے کی!''

انجن کی سیٹی خوفناک طریقے سے کئی بار گونجی۔ اس کی گونج میں خطرے کا اعلان تھا۔

''رُک جاؤ۔ رُک جاؤ۔'' نوجوان سندری اور ماں نے آخری بار کوشش کرتے ہوئے بھکارن سے التجا کی۔

میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر تمھیں جان پیاری ہے تو تم ہٹ جاؤ۔ بھکارن نے اُن کو جھڑک دیا۔

''مگر تم جان دے دوگی تو ہم کب زندہ رہ سکتے ہیں؟'' ان دونوں نے جواب دیا۔

انجن کی بھیانک سیٹی ایک بار پھر گونجی۔ بالکل قریب۔

نوجوان سندری بھاگتے بھاگتے بے دم ہوگئی تھی مگر اس نے لپک کر بھکارن کا دامن پکڑ لیا اور اُس کو خطرے کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ماں نے ایک ہاتھ سے اپنے گود کے بچے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے بھکارن کو ریل کی پٹری سے دھکا دے کر ہٹانا چاہا۔

مگر ان کی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ انجن اب اتنا قریب آ گیا تھا کہ بھکارن ڈرائیور کا وحشت زدہ چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر نوجوان سندری اور بچے کی ماں سے اپنا

دامن چھڑالیا۔

دفعتاً ریل کے ٹھہر جانے کے جھٹکے سے بیوپاریوں کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ان کی شراب کی بوتلیں اور گلاس جھن جھن کر کے فرش پر آ رہے۔ تیسرے درجے میں اندھے فقیر کے ہاتھ سے تنبورہ گر گیا اور بھجن گانا بھول گیا۔ ایک لمحے کے لیے اِس جھٹکے نے غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کا نشہ اُتار دیا۔ مسافر اپنے اپنے درجوں سے اُتر آئے اور انجن کی طرف چلے۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''

''کوئی ریل کے نیچے آ گیا ہے۔''

''ارے یہ تو کوئی بھکارن ہے۔''

''مگر سندر اور نوجوان۔''

''اور بیچاری کا بچہ بھی تو مر گیا۔''

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کون مر گیا۔''

''ایک عورت ریل کے نیچے آ گئی ہے۔''

پگلا جو اب تک خاموش کھڑا تھا چیخ کر بولا۔ ''ارے پگلو۔ ایک عورت نہیں تین عورتیں تین۔'' اور پھر بڑبڑانے لگا۔ ''رام رام ست ہے! دھت تیرے کی!''

○

داروغا صاحب

'داروغا صاحب!' ایک کانسٹبل نے ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے؟''

حضور اس آزاد کے بچّے نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تک تو اس نے اپنے ساتھیوں کے نام بتائے نہیں ہیں۔ کہیے تو ایک مرتبہ اور کوشش کر کے دیکھیں۔

''ہاں ایک آدھ گھنٹے میں حاضر کرو۔''

کانسٹبل سلام کر کے چلا گیا۔ داروغا صاحب نے پانوں کی ڈبیا کھولی۔ ایک پان کھایا اور سوچ میں پڑ گئے۔ ایک ہفتہ سے اس آزاد نے اُن کا آرام حرام کر رکھا تھا۔ رات دن یہی فکر رہتی تھی کہ کس طرح اُس سے اُس کے ساتھیوں کے نام کا اقبال کرایا جائے۔ مگر تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پہلے معمولی طرح سے پوچھا۔ پھر معافی اور انعام کا لالچ دلایا، اس پر بھی اُس کی زبان نہ کھلی تو تھوڑی بہت مرمت کی گئی۔ آخر میں تنگ آ کر اور سختی کی۔ جوتوں سے پٹوایا۔ کال کوٹھری میں بند کیا۔ اُلٹا لٹکوایا۔ مگر وہاں ایک نہیں کے علاوہ دوسرا جواب نہ تھا۔ داروغا صاحب اپنے رعب اور دبدبہ کے لیے تمام صوبے میں مشہور تھے۔ ملزموں کی زبان کھلوانے کی اُن کو وہ ترکیبیں یاد تھیں کہ دور دور کے تھانیدار اُن سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ سخت سے سخت مجرم اُن

کے نام سے کانپتا تھا۔ مگر یہ آزاد عجب سخت جان تھا۔ جب اُس پر تمام مجرب نسخے بیکار ثابت ہوئے تو داروغا صاحب نے اپنے ترکش کا آخری تیر استعمال کیا جو اُس کی طرح کمزور اور تعلیم یافتہ سیاسی قیدیوں کے لیے خاص طور سے ایجاد کیا گیا تھا۔ چند دس نمبر کے بدمعاشوں کو بلوا کر اُن کو کچھ خفیہ ہدایات اور ایک ایک بوتل ٹھرّے کی دی گئی اور جب اُن پر خوب نشہ چڑھ گیا تو اُن کو بھی آزاد کے ساتھ بند کر دیا۔ رات بھر میں انھوں نے آزاد کو مار کر ادھ مرا کر دیا۔ مگر ہر گھنٹے کے بعد جب پہرے دار نے پوچھا۔ کیوں؟ اب بھی اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتائے گا۔ تو یہی جواب ملا کہ ''مرنے سے پہلے تو نہیں۔''

آزاد کی اس ضد کو کیسے توڑا جائے؟ رات دن یہ سوال داروغا صاحب کے دماغ میں گردش کرتا تھا۔ دیکھنے میں کمبخت دبلا پتلا کمزور سا نوجوان تھا۔ مگر اُس کے خلاف الزام اتنا سنگین تھا اور اُس کے ساتھیوں کے نام اس قدر ضروری تھے کہ داروغا صاحب کی سخت بدنامی ہوتی اگر اُس سے اقبال نہ کرایا جاتا۔ کئی مہینے سے اُس کے خلاف رپورٹیں آرہی تھیں کہ یہ اور اُس کے ساتھی کسانوں میں بغاوت پھیلا رہے ہیں۔ باوجود یونی ورسٹی کے ایک گریجویٹ ہونے کے آزاد نے ایک گاؤں میں رہنا پسند کیا تھا۔ جل پور جہاں وہ رہتا تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مشکل سے ایک ہزار کی آبادی ہوگی۔ فقط آزاد ہی ایک پڑھا لکھا آدمی وہاں رہتا تھا۔ اُس نے جاتے ہی گاؤں میں ایک اسکول کھول دیا۔ دن میں بچوں کو اور رات کو بڑی عمر کے کسانوں کو پڑھاتا۔ شروع شروع میں گاؤں والے اُس سے خائف رہے لیکن جلد ہی اُس نے اپنے اخلاق اور خدمت سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ کسی کو خط لکھوانے یا پڑھوانے کی ضرورت ہوتی تو آزاد کے پاس آتا۔ کسی کو چوٹ لگ جاتی تو آزاد اپنے دواؤں کے بکس سمیت مدد کو پہنچ جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس نے کتابی تعلیم کے علاوہ گاؤں والوں کو صفائی، صحت، ورزش کی بھی تعلیم دینی شروع کی۔ یہاں تک تو اُس کے کام پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ گو پولیس کے رجسٹر میں اُس کا نام مشتبہ سیاسی کارکنوں کی فہرست میں پہلے ہی شامل تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اُس کے خلاف شکایات آنے لگیں۔ گاؤں کے مہاجن رام لال کو اُس سے شروع ہی سے بغض تھا۔ اس لیے کہ وہ کسانوں کو قرضہ لینے کے خلاف ترغیب دیتا تھا۔ اور اگر کسی کو قرضہ لینا ہوتا تو وہ اُس کے مہاجن کے گھر

تک جاتا اور اپنے سامنے باقاعدہ رسید وغیرہ لکھواتا۔ اس سے پہلے اَن پڑھ کسان ہمیشہ مہاجن کی لکھی ہوئی رسید پر آنکھ بند کر کے انگوٹھے کا نشان کر دیتے تھے اور اپنی قسطوں کی رسید طلب کرنے کا تو اُن کو کبھی خیال نہ آیا تھا لیکن آزاد نے اُن کو مہاجن کے سب ہتھکنڈوں سے واقف کر دیا تھا۔ جس سے اُس کی آمدنی پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔

بشیر خاں پٹواری، بھی آزاد سے کوئی خوش نہ تھا۔ جب سے اُس نے گاؤں کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا تھا کسانوں سے انتقالِ اراضی، لگان، آبیانہ (پانی کا محصول) وغیرہ کے سلسلے میں رشوت لینا مشکل ہو گیا تھا۔ آج تک اس قسم کی آمدنی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا اور گاؤں والے بھی اس کو خوش رکھنے ہی میں اپنی خیریت سمجھتے تھے۔ لیکن اب......تو وہ اُس سے ایک نئے اور عجیب انداز میں بات کرتے تھے۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ بدھوا کسان سے جب اُس کے لگان کی ادائیگی کے سلسلے میں نذرانہ طلب کیا تو وہ بولا۔ ''پٹواری جی اب وہ دن گئے۔ تمھیں سرکار سے ہماری کھدمت (خدمت) کی تنکھواہ (تنخواہ) ملتی ہے۔ نجرانہ (نذرانہ) کہیں واسطے چاہیے۔'' بعد میں معلوم ہوا کہ اس گستاخانہ گفتگو سے ایک گھنٹہ پہلے ہی آزاد نے بدھوا سے بہت دیر باتیں کی تھیں!

پنڈت شیو پرشاد بھی جو گاؤں کے مندر کا مہنت تھا آزاد کی موجودگی سے خوش نہ تھا۔ اُس کو شکایت تھی کہ یہ نوجوان اچھوتوں کو سماج سے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ مہتروں کا ایک خاندان تھا جو ہمیشہ سے گاؤں کی صفائی کا کام کرتا آتا تھا۔ آزاد کے کہنے سے ان مہتروں نے مہنت، پٹواری مہاجن وغیرہ کے گھر صاف کرنے کے معاوضے میں جھوٹا کھانا لینے سے انکار کر دیا اور اُس وقت تک کام نہ کیا جب تک اپنی ماہوار تنخواہ منظور نہ کرالی۔ اس کے علاوہ آزاد نے گاؤں والوں کو سمجھا بجھا کر، ان مہتروں کے بچوں کو بھی اپنے اسکول میں داخل کر لیا تھا۔ جہاں وہ باقی تمام لڑکے لڑکیوں کے ساتھ پڑھتے تھے اور جب ان مہتروں نے مہنت سے مطالبہ کیا کہ اگر اُس کے دعوے کے موافق وہ بھی ہندو جاتی میں ہیں تو اُن کو بھی مندر میں پوجا کی اجازت ہو، تب تو شیو پرشاد جی مہاراج کے غصے کی انتہا نہ رہی۔

مولا بخش جو گاؤں کی اکیلی مسجد کا جاہل ملا تھا اور مہنت کی ہمیشہ مخالفت رہتی تھی۔ دونوں

گاؤں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنا الوسیدھا کیا کرتے تھے۔ مولا بخش اگر اپنی بیٹی کی شادی کے لیے مسجد کی مرمت کے نام سے روپیہ جمع کرتا تو شیو پرشاد فوراً ہندوؤں کو غیرت دلاتا کہ اُن کا مندر کیوں نہ زیادہ شاندار بنایا جائے تا کہ اُن کے چندے سے پنڈتانی کے لیے ایک زیور اور بن سکے۔ مگر آزاد کے معاملے میں یہ دونوں متفق تھے کہ اُس کا گاؤں میں رہنا اُن کے مفاد کے خلاف ہے۔ مولا بخش کہتا تھا کہ آزاد کسانوں اور اُن کے بچوں کو انگریزی پڑھا کر کافر بنا دے گا۔ یہ بھی اُس کو کب گوارا تھا کہ مسلمان بچے، ہندو بچّو ں کے ساتھ تعلیم پائیں اور لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق تو اُس کا مستقل فیصلہ تھا کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر وہ عاشقوں سے خط و کتابت کیا کریں گی اور جغرافیہ سیکھ کر اُن کو گھر سے نکل بھاگنے کے راستے معلوم ہو جائیں گے۔

تحصیل دار صاحب اور اُن کا عملہ تو آزاد کی جل پور میں موجودگی کو نہایت ہی خطرناک سمجھتے تھے۔ اُن کا بس چلتا تو اُس کو ایک دن بھی تحصیل کی حدود میں نہ رہنے دیتے۔ غضب خدا کا جب دسمبر میں نائب تحصیل دار دورے پر گیا تو گاؤں والوں نے اُس کے کیمپ کے لیے مفت رسد پہنچانے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ صاحب کو جو انڈا، مرغی گھی، ترکاری چاہیے پیسے نقد دے کر لے جاؤ! تحصیل دار صاحب جب دسمبر میں خود دورے پر گئے اور جل پور میں کیمپ کیا تو اُن کی ہتک اس سے بھی زیادہ ہوئی جب اُن کی موٹر گاؤں میں پہنچی تو سوائے کھیا، پٹواری، مہاجن۔ رام لال، پنڈت شیو پرشاد اور مولوی مولا بخش کے کسی ایک گاؤں والے نے اُن کا استقبال نہ کیا۔ اس سے پہلے جب اُن کی موٹر آتی تھی تو گاؤں بھر کے ننگے غلیظ اور فاقہ زدہ بچے اُن کی موٹر کو گھیر لیتے تھے۔ مرد ادب سے فاصلہ پر قطار لگا کر سلام کرتے اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں سے جھانک کر 'تسیلدار' (تحصیل دار) اور اُن کے 'موٹو کاٹ' (موٹر کار) کی زیارت کرتیں۔ تحصیل دار صاحب شان سے اترتے، گردن کے خفیف اشارے سے اپنی رعایا کے سلام کا جواب دیتے۔ دو چار خیرات کے پیسے بچوں کے جھنڈ میں پھینکتے اور اُن کا رشوت کے مال سے تیار شدہ فربہ جسم اُن کے شاندار سفید خیمہ میں غائب ہو جاتا لیکن اس سال تحصیل دار کو نہایت تعجب اور اُس سے زیادہ غصہ ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کی موٹر کی آواز نے گاؤں

میں کوئی خاص ہل چل نہ پیدا کی۔ کسان اپنے کام میں مصروف تھے، عورتیں یا تو کھیتوں پر روٹی لے کر گئی ہوئی تھیں یا اپنے اپنے گھروں میں چرخہ کاتتے یا روئی اوٹنے میں مصروف تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں آزاد کے اسکول میں پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ غرض تحصیل دار صاحب نے گاؤں میں بیکاری کی کمی اور خودداری کے اس مظاہرہ کو اپنی سخت ہتک محسوس کیا اور جب اسی شام کو پٹواری، مہاجن، پنڈت اور مولوی جیسی گاؤں کی چار مختار ہستیوں نے متفقہ آزاد کی شکایت کی اور اس کے سنگین جرائم کی طویل فہرست پیش کی تو کیا وجہ تھی کہ آزاد کا کام بلا رکاوٹ جاری رہنے دیا جاتا۔

چند روز بعد اطلاع ملی کہ کسانوں کے سرغنوں کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس میں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے لگان ادا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ پولس نے کافی نگرانی رکھی اور تفتیش کی مگر اس کانفرنس کے اصل وقت کے اطلاع نہ ملی۔ کئی دن کی کوشش کے بعد ایک رات کو مخبر نے رپورٹ کی کہ اس وقت آزاد کے مکان پر کسانوں کے سب سرغنے جمع ہیں اور کانفرنس ہو رہی ہے۔ پولیس نے چھاپہ مارا۔ مگر کسی طرح سے وقت سے کچھ ہی پہلے آزاد کے ساتھیوں کو اس دھاوے کی اطلاع مل گئی اور وہ رات کی تاریکی میں خاموشی سے نکل گئے۔ جب داروغا صاحب اپنے جوانوں کو لے کر پہنچے تو سوائے آزاد کے مکان میں کوئی نہ تھا۔ دانت پیس کر رہ گئے۔ تلاشی کی تو البتہ کافی کارآمد کاغذات ملے۔ لگان ادا کرنے کی تحریک کے متعلق مکمل تجاویز موجود تھیں۔ جن کو پڑھ کر حکومت آسانی سے اس تحریک کو شروع ہونے سے پہلے ہی کچل سکتی تھی۔ لیکن تحریک کے سرغنوں کے ناموں کی فہرست نہ مل سکی۔ جس کے بغیر آزاد پر سازش کا جرم عائد کرنا ناممکن تھا۔ داروغا صاحب نے اچھی طرح سے ایک ایک کو ناٹٹول مارا لیکن کوئی ایسا کاغذ نہ ملا جس سے باقی ماندہ شورش پسندوں کو پکڑا جا سکے۔ ملتا بھی کہاں سے جس اہم کاغذ کی اُن کو تلاش تھی وہ تو آزاد اُن کی آہٹ سنتے ہی کھا چکا تھا۔

افسرانِ بالا کے ایما پر داروغا صاحب نے آزاد کو گرفتار کر لیا اور اُس کی زبان کھلوانے کے لیے اپنی تمام مشہور ترکیبوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان مجرب نسخوں کے بیکار ثابت ہونے نے انھیں پریشان کر رکھا تھا۔

اب کون سی ترکیب کروں؟ یہی سوچتے سوچتے داروغا صاحب اونگھ گئے۔ آج گھر میں

بیوی نے کافی مرغن کھانا پکایا تھا۔اس پر گرمی کا موسم دوپہر کا وقت۔ایک سپاہی پنکھا کھینچ رہا تھا۔ خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔نیند آہی گئی۔

کچھ آہٹ ہوئی تو داروغا صاحب نے آنکھیں کھولیں۔کمرہ کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے خاصا اندھیرا تھا۔کچھ نیند کا نشہ بھی سوار تھا۔دھندلا دھندلا سا نظر آتا تھا۔مگر داروغا صاحب پہچان گئے کہ جس کا انتظار وہ کر رہے تھے آزاد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور سپاہی رسی پکڑے ساتھ تھا۔اُس کے ذہین چہرے پر پچھلے سات دن کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا اثر نمودار تھا مگر وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔آزاد کی مستقل مزاجی اور ضد سے زیادہ جو چیز داروغا صاحب کو پریشان کرتی اور غصہ دلاتی تھی وہ اُس کی مستقل مسکراہٹ تھی۔یہ مسکراہٹ جس میں اعتمادِ نفس کے ساتھ داروغا صاحب کی حرکتوں پر اظہار حقارت بھی تھا،تلوار سے زیادہ گھاؤ لگانے والی، آگ سے زیادہ جھلسانے والی تھی۔آزاد کو مسکراتے دیکھ کر داروغا صاحب کے مزاج کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔سپاہی سے چیخ کر کہا۔

''دیکھتا کیا ہے۔مار اس کو جب تک یہ اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتائے۔''

سپاہی نے سوت کی رسی کو جو اس کے ہاتھ میں تھی دہرا کر کے کوڑا سا بنایا اور ایک قدم پیچھے ہٹا،تاکہ آزاد کی پیٹھ پر پورے زور سے مار پڑ سکے۔

آزاد برابر مسکرا رہا تھا اور اُس کی نظر داروغا صاحب پر گڑی ہوئی تھی بجائے خوف کے داروغا صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ اُن کو حقارت اور رحم سے دیکھ رہا ہے۔

سپاہی نے رسّی کے کوڑے کو آزمائشی طور پر ہلایا، اپنے ہاتھ اور آزاد کی کمر کے درمیان فاصلے کا اندازہ کیا اور پوری طاقت سے وار کیا۔

داروغا صاحب کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔معلوم ہوتا تھا کہ کوڑا گویا اُن کی ہی کمر پر پڑا۔

آزاد کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

سپاہی سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہا۔دھڑا۔دھڑ۔دھڑا دھڑ۔وہ آزاد کی کمر پر برابر کوڑے چلا رہا تھا۔

داروغا صاحب تکلیف سے چیخ رہے تھے۔گو بظاہر سپاہی آزاد کی کمر پر وار کر رہا تھا مگر ہر

وار کی چوٹ اُن کی کمر پر پڑتی تھی۔

اور آزاد برابر مسکرا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ داروغا صاحب کی تکلیف پر ہنس رہا ہے۔

سپاہی نے یہ دیکھ کر کہ آزاد پر اس کی مار کا کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا ہے اور زیادہ طاقت سے چلانا شروع کیا۔

داروغا صاحب تکلیف سے چیختے رہے۔ اُن کی کمر کوڑوں کی مسلسل بوچھاڑ سے پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔

سپاہی نے ایک اور بھرپور ہاتھ آزاد کی کمر پر چلایا تو داروغا صاحب سے بالکل برداشت نہ ہو سکا۔ معلوم ہوتا تھا اگر ایک بھی اور کوڑا اُن کی کمر پر پڑا تو اُن کی جان جائے گی۔

بس بس! داروغا صاحب بے تحاشہ چیخے۔ ''بند کرو۔ بند کرو۔''

یہ کہہ کر انھوں نے کرسی سے اُٹھنا چاہا تو آنکھ کھل گئی۔

کمرہ خالی تھا۔ تو کیا میں نے خواب دیکھا ہے؟ انھوں نے سوچا لیکن اُن کا تمام جسم پسینہ سے شرابور تھا۔ اور کمر............ اور کمر میں چوٹ کی تکلیف سے سخت درد ہو رہا تھا۔

پریشان ہو کر داروغا صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اُن کی چھوٹی لڑکی کھڑی اُن کی کمر تھپک رہی تھی۔ باپ کی گھبراہٹ دیکھ کر بچی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

برآمدے میں قدموں کی آہٹ ہوئی اور سپاہی آزاد سمیت داخل ہوا وہ کمبخت اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''کیا حکم ہے، حضور؟'' سپاہی نے پوچھا۔

داروغا صاحب نے ایک ہاتھ سے اپنی کمر کو ٹٹولا دوسرے سے پسینہ صاف کیا تاکہ پریشانی ظاہر نہ ہو مگر آواز قابو میں نہ تھی۔

''ک......ک...... کیا ہے؟ ک......ک...... کون ہے؟'' صوبے کا سب سے بارعب داروغا ایک مجرم کے سامنے ہکلا رہا تھا۔ ہاں...... یہ آزاد صاحب...... ان...... ان...... ان کو رہا کردو۔ سازش کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

آزاد داروغا صاحب کی پریشانی دیکھ کر مسکرایا گویا وہ اس کی اصل وجہ سے واقف تھا۔

سپاہی نے خیال کیا کہ داروغا صاحب کے دماغ پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے مگر حکم کی تعمیل میں ہتھکڑی کھول دی اور آزاد کے ہمراہ باہر چلا گیا۔

داروغا صاحب نے اپنی بچی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُن کی کمر پھر تھپک رہی تھی۔ گویا ان کو ایک اچھے کام کی شاباش دے رہی ہو۔

اُس دن سے داروغا صاحب کے رعب کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اُن کا شمار صوبے کے سب سے زیادہ ناکارہ پولیس افسروں میں ہوتا ہے۔

O

معمار

بندو معمار خوش تھا۔ آج اُس کا اکلوتا بیٹا ابراہیم اپنی بیوی یعنی بندو کی بہو، کو مکلاوہ کر کے گھر لے آئے گا۔ آج سے اُس کے اندھیرے گھر میں بہو کے آنے سے چاندنا ہو جائے گا۔ شاید اُس کے قدموں کی برکت سے بندو کی قسمت بھی جاگ اُٹھے۔ اور کیا پتہ بندو کو روزگار پھر نصیب ہو جائے۔

بندو معمار آج خوش تھا۔ پورے پانچ سال بعد اس کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک نظر آئی تھی۔ آج تو اُسے حقے کے دھوئیں میں بھی نیا لطف حاصل ہو رہا تھا۔ اپنے ٹین کے جھونپڑے کے سامنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھا وہ بھولی بھالی بھٹیاری کے محل کے پیچھے سورج کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ لال لال، گلابی گلابی، نیلے نیلے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ جیسے اُس کی بہو کا چھپ دار دوپٹہ جو آج ہی وہ رنگریز کے ہاں سے رنگوا کر لایا تھا۔ دوپٹہ گھٹیا موٹے ململ کا تھا، سوسی کا پاجامہ، جاپانی نقلی ریشم کا کرتا، چاندی کے دو کڑے ہاتھوں کے لیے۔ بس یہی تو کل سامان تھا جو وہ اپنی بہو کے مکلاوے کے جوڑے کے لیے مہیا کر سکا۔ آج اگر وہ بے روزگار نہ ہوتا تو کیا ایسا گھٹیا جوڑا اور چاندی کا صرف ایک زیور دیتا اپنی بہو کو، کچھ نہیں تو اطلس کا پاجامہ، بناری کام کا دوپٹہ، سونے کی مرکیاں، سونے کے کڑے اور چاندی کے

جھانجن تو ضرور ہی بنواتا۔ آخر ایک ہی بیٹا تو تھا اُس کا۔ آج اُس کی ماں اگر زندہ ہوتی تو کیا......

سورج کے ساتھ بندو کے چہرے کی مسکراہٹ بھی بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اُس کی بیوی کو مرے ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ پھر بھی اُس کی یاد آتے ہی بندو کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ کتنا چاؤ تھا اُس کو اپنے بیٹے کے بیاہ کا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتی۔

تھوڑی دیر تک بندو خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر جب دوسرے جھونپڑوں میں چراغ جلنے لگے تو اُس کو خیال آیا کہ اُس کا گھر اندھیرا پڑا ہے۔ اب اُس کا بیٹا بہو کو لے کر آنے والا ہی ہوگا۔ ایسے موقع پر گھر میں روشنی کا نہ ہونا شاید بدشگونی کا باعث ہو۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور اندر جا کر کڑوے تیل کا چراغ جلایا۔ آج اُس نے اپنے گھر کو خاص طور سے صاف کیا تھا۔ گھر کیا تھا چار دیواروں کے اندر بارہ فٹ مربع کچی زمین گھری ہوئی تھی۔ اوپر ٹین کی چھت جو گرمی کے دنوں میں تپنے لگتی تھی، برسات میں ٹپکتی تھی اور جاڑوں میں ٹھنڈی برف ہو جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک کوٹھری کے جھونپڑوں میں بندو کے سب ہمسائے رہتے تھے۔ اُن کی یہ آبادی نئی دہلی سے میل بھر پرے، پہاڑی پر تھی۔ پانچ برس پہلے تک وہ سب آٹھویں دہلی کی تعمیر کے کام میں لگے ہوئے تھے مگر جب شہر بن کر تیار ہو گیا تو وہ سب بیکار ہو گئے فاقوں پر نوبت آ گئی۔ بندو خاندانی معمار تھا۔ اپنے فن کا ماہر۔ اُس کے باپ دادا نے لال قلعہ اور جامع مسجد جیسی عمارتیں بنائی تھیں۔ بندو نے وائسریگل لاج اور اسمبلی چیمبر۔ پھر بھی وہ اب چھوٹے چھوٹے مکانوں کی تعمیر میں چونے گارے اٹھانے کی مزدوری کرنے پر مجبور تھا۔ اب جب سے جنگ شروع ہوئی تھی تو لوہے، لکڑی اور سیمنٹ کی قیمتیں بڑھ جانے کی وجہ سے بیٹے نے ایک ٹھیکیدار کے مکان پر بیرا گیری کی ملازمت کر لی تھی۔ اُسی کی تنخواہ سے گزارہ ہوتا تھا۔ کتنا دکھ ہوا تھا بندو کو، جب اُس کے بیٹے نے یہ نوکری کرنا منظور کی تھی۔ بندو معمار کا بیٹا اور نوکری! مانا کہ اُس کو دس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور کھانا مفت اور اس سے زیادہ تو آج کل کے معماروں کو بھی کہاں نصیب تھا۔ مگر ایک معمار پھر معمار ہی ہوتا ہے۔ کاریگر اپنے فن کا ماہر، اپنے وقت، اپنے ہاتھ پاؤں، اپنے دل اور دماغ کا مالک جہاں جی چاہے کام کرے۔ جس وقت جی چاہے کام کرے۔ وہ کسی کا ملازم نہیں کہ کوئی اُس پر رعب جمائے۔ بندو کو خاندانی معمار ہونے پر فخر تھا۔ کتنا اہم کام تھا اُس کا۔ اُس کی ذرا سی

غفلت سے دیوار ٹیڑھی رہ جائے تو پوری عمارت بدنما معلوم ہونے لگے۔ وہ اور اُس جیسے معمار ہی تو انجینئروں کے نیلے نقشوں کو خوب صورت اور شاندار عمارتوں میں تبدیل کرتے تھے۔ اینٹ اور گارے اور چونے سے تاج محل جیسا حسن، قطب مینار جیسی عظمت۔ جنتر منتر جیسی حکمت پیدا کرتے تھے۔ نقاش اپنی تصویروں میں رنگ بھر کر شاہکار بناتا ہے۔ بت تراش پتھر کی مورتوں میں جان ڈالتا ہے۔ موسیقار اپنے ستار کے تار چھیڑ کر محفل کے جذبات کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ اسی طرح معمار محرابوں اور ستونوں، دیواروں اور دروازوں، دریچوں اور جھروکوں، جالیوں اور کٹہروں، میناروں اور گنبدوں، کلیسوں اور کنگوروں کے ذریعہ تخلیق حسن کرتا ہے اور آج ایک ایسے معمار کا بیٹا دن بھر ایک جاہل، بدتمیز ٹھیکے دار کی خدمت کرنے پر مجبور ہے۔

بندو اقتصادی مسائل سے ناواقف تھا۔ سیاست سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اُس کو تو یہ شکایت بھی نہ تھی کہ یہ نئی دہلی سات سمندر پار والے فرنگیوں کے لیے کیوں بسائی گئی ہے۔ اُس کو دکھ تھا تو یہ کہ معماروں کا اب کوئی قدرداں نہ رہا تھا۔ اُس جیسا ماہر معمار بے روزگار ہو۔ آخر کیوں؟

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دروازے کے باہر کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

''ارے بھئی بندو۔ کہو بہو آگئی؟''

''آؤ چچا خیرالدین۔ اندر آؤ۔ بہو کو لینے گیا ہے ابراہیم، اب آتا ہی ہوگا۔''

چچا خیرالدین جن کے متعلق روایت مشہور تھی کہ شاہجہاں کی سب عمارتوں کا سنگ بنیاد انھوں نے ہی رکھا تھا۔ لاٹھی ٹیکتے اندر داخل ہوئے۔ وہ معماروں میں سب سے بڑے تھے اور اپنی برادری کے سرپنچ گرو، پیتا، سب کچھ سمجھے جاتے تھے۔

''چلو اچھا ہوا۔ ابراہیم کی بہو آجائے گی تو تیرے کھانے حقے کی تو خبر رکھے گی۔ مگر بندو......

''یہ کہہ کر چچا خیرالدین رک گئے گویا کچھ کہتے ہوئے جھجکتے ہوں۔

''کہو۔ چچا۔''

''بھئی کہنا کیا تھا۔ ایسے ہی خیال آیا کہ پوچھ لوں کہ رات کو تو کہاں سوئے گا۔''

''میں کہاں سوؤں گا؟ کیوں؟ اور پھر دفعتاً بندو چچا خیرالدین کا اشارہ سمجھ گیا۔ آج اُس کا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ پہلی رات بسر کرے گا اور اُن کے گھر میں صرف یہ ایک کوٹھری بارہ فٹ

مربع۔ اتنی جگہ بھی تو نہیں تھی کہ بیچ میں پردہ ہی ٹانگ لیں۔ کم از کم آج کی رات دولہا دولہن کو تخلیہ چاہیے۔

''فکر مت کر۔ تو میرے ہاں پڑ رہیو۔'' یہ کہہ کر چچا خیرالدین کچھ کھسیانی سی کھانسی کھانستے ہوئے چل دیے۔ گویا ہمدردی کے اظہار سے شرماتے ہوں۔

''نہیں۔ میں چچا خیرالدین کے ہاں نہیں جاؤں گا۔'' بندو نے دل ہی دل میں کہا۔ برادری والے سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ میں کہیں اور پڑ رہوں گا۔''

یہ سوچ کر اُس نے الگنی پر سے اپنی کاڑھے کی چادر اتار کر کندھے پر ڈال لی۔ سردی چمک رہی تھی۔ ''کہیں سر چھپانے کی جگہ ملی تو یہی اوڑھ کر لیٹ رہوں گا۔ ایک رات ہی کی تو بات ہے۔''

اتنے میں اُس کا بیٹا اپنی بیوی کو لے کر آ گیا۔ وہ اُس کا دیا ہوا جوڑا پہنے ہوئے، گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی۔ بندو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نئی دلہن سے کیا بات کرے۔

''کیوں بھئی ابراہیم، آ گئے تم لوگ؟'' اُس نے خاموشی توڑنے کے لیے بیکار سا سوال کیا اور بغیر جواب کا انتظار کیے۔ ''اچھا تو تم آرام کرو۔ آج کی رات میں کہیں اور سو جاؤں گا۔'' کہا اور جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

نئی دہلی کا شہر میلوں تک جگمگا رہا تھا۔ پہاڑی پر سے بندو کو ایسا معلوم ہوا جیسے سنگِ اسود کے فرش پر کسی معمار نے ہیروں کو جڑ دیا ہو۔ ''اتنے بڑے شہر میں۔'' اُس نے سوچا۔ ''کیا ایک آدمی کو رات بسر کرنے کی جگہ نہیں مل سکتی؟ کوئی کمرہ کوٹھری نہیں تو کسی برآمدے ہی میں پڑ رہوں گا۔

نئی دہلی کے راستے بندو کو خوب یاد تھے۔ آخر کیا یہ اُس کے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا شہر نہیں تھا؟ وہ ہر عمارت سے واقف تھا۔ یہ ہے وائسر یگل لاج لاٹ صاحب کے رہنے کا مکان۔ اُس میں کئی سو کمرے ہیں۔ ہر کمرہ اتنا بڑا کہ اس میں بندو جیسی دس کوٹھریاں آ جائیں۔ غسل خانے، سنگِ مرمر کے درجنوں، وہ بھی تو کسی کمرے سے چھوٹے نہیں اور کیا فرش ہیں چکنی اور چمکتے ہوئے۔ چاہے کھانا بکھیر کر کھا لو۔ ناچنے کا بڑا کمرہ۔ چاروں طرف آئینے ہی آئینے اور لکڑی کے فرش پر ایسا پالش کہ وہ بھی آئینہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی پر تو صاحب لوگ اور اُن کی میمیں ناچتی ہیں۔

مگر آج وائسریگل لاج میں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ ہاں ٹھیک یاد آیا۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں لاٹ صاحب کلکتہ جاتے ہیں نا؟ تو یہ اتنا بڑا محل خالی پڑا ہے۔ سینکڑوں کمرے، کمرے سے بڑے غسل خانے۔ میلوں لمبے برآمدے۔ آئینے جیسا فرش والا ناچنے کا کمرہ۔ سب خالی۔ کیا اس کے شاگرد پیشے میں، کسی گودام کی کوٹھری، کسی برآمدے میں بھی بندو معمار کو سر چھپانے کی جگہ نہیں مل سکتی؟ وائسریگل لاج کے صدر دروازے کے پاس بندو کو ایک لکڑی کی کا بک نما کوٹھری نظر آئی۔ شاید یہی خالی پڑی ہو اور وہ رات یہاں ہی بسر کر سکے گا۔ مگر وہ ادھر بڑھا ہی تھا کہ اس کا بک میں سے ایک بڑی مونچھوں والا سپاہی نکلا اور بندو کو دیکھ کر للکارا۔ ''کون ہے۔'' اور پھر قریب آ کر ''ابے او اُچکے۔ یہاں کیا سونگھتا پھر رہا ہے۔ کیا لاٹ صاحب کی کوٹھی میں نقب لگانے کا ارادہ ہے؟'' بندو وہاں سے چپکے سے سرک آیا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔

نئی دہلی کی سڑکیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ چوڑی صاف شفاف سڑکیں۔ بندو کے مکان کا فرش بھی ایسا نہیں تھا۔ بجلی کی روشنی سے رات پر دن کا گمان ہوتا ہے۔ مگر بجلی کی روشنی میں گرمی بھی تو نہیں ہوتی جو بندو کسی ہنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ ہی تاپ لیتا۔ ڈاکخانے کے گھنٹے نے دس بجائے۔ اب وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ بندو تیز تیز چلنے لگا تا کہ بدن میں کچھ گرمی آ جائے۔ مگر ہوا اتنی ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اُس کی ہڈیوں میں کوئی برف کے بھالے چبھو رہا ہے۔

اُس کے دماغ میں وائسریگل لاج کا نقشہ گھوم رہا تھا۔ ایک آدمی کے رہنے کا مکان ہاں۔ لاٹ بھی تو ایک آدمی ہی ہوتا ہے۔ پھر اُس کے لیے کئی سو کمروں کی ضرورت ہے اور ایک ایک کمرہ اتنا بڑا کہ جس میں معماروں کی ساری بستی سما جائے۔ درجنوں غسل خانے، میلوں لمبے برآمدے۔ ناشتہ کا کمرہ الگ۔ دوپہر کے کھانے کا الگ۔ رات کو کھانا کھانے کا کمرہ الگ۔ اور وہ شیشہ جیسی فرش والا ناچ کا کمرہ۔ ایک آدمی کے لیے یہ سب کچھ اور بندو معمار کے لیے جس نے اپنے ہاتھوں سے ان سب عمارتوں کو بنایا تھا رات گزارنے کو ایک کوٹھری بھی نہیں۔ عمر میں پہلی مرتبہ بندو کے دماغ میں ایک باغیانہ سوال گھوم رہا تھا۔ ''کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟''

اسی طرح چلتے چلتے بندو نے دہلی کی ساری سڑکیں طے کر ڈالیں مگر کہیں سر چھپانے کا

ٹھکانہ نہ ملا۔ جب سڑکوں کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں تو بندو دفعتاً رک گیا۔ یہ سامنے کون سی عالیشان عمارت ہے جو چاندنی رات میں چمک رہی ہے۔ اب اس کو یاد آیا کہ یہ تو ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ شاید اس دروازے کے کسی کونے میں پڑ رہنے کی جگہ مل جائے۔ بندو کی تھکی ہوئی ٹانگوں میں پھر جان آ گئی اور وہ اور جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا مقبرہ کی طرف چلا۔ مگر دروازہ میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ محکمۂ آثار قدیمہ کے ایک چپراسی نے ڈانٹ پلائی۔

''ابے کون ہے تو؟ نکل سالے یہاں سے نہیں تو ایک رسید کرتا ہوں۔''

اب بندو میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ اس سے بحث کرتا یا اُس کی خوشامد ہی کرتا۔ وہ اُلٹے پیروں واپس ہو گیا۔ پھر نئی دہلی کی طرف چل دیا۔ اب اُس کے دماغ میں دوہرا ہیجان بپا تھا۔ بادشاہ مر بھی جائے تو اُس کی مردہ ہڈیوں کے لیے اتنا بڑا محل چاہیے اور میری زندہ ہڈیوں کے لیے ایک کوٹھری بھی نہیں۔ آخر یہ ہمایوں کا مقبرہ کس نے بنایا تھا۔ میرے باپ دادا نے۔ اور آج مجھے یہاں سے کتے کی طرح دھتکار کر نکال دیا............ کیوں؟ آخر کیوں؟ ...... لاٹ صاحب کا محل...... تین چار سو کمرے...... چائے پینے کا کمرہ الگ...... سگریٹ پینے کا کمرہ الگ............ شراب پینے کا کمرہ الگ............ اور ایک بادشاہ............ جس کو مرے ہوئے کئی سو برس ہو گئے............ اس کی قبر کے لیے بھی محل چاہیے۔...... اور بندو معمار کے لیے کچھ بھی نہیں۔ آخر کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

جب ٹانگوں نے چلنے سے جواب دیدیا تو سڑک کے کنارے ہی بندو چادر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ برف کے بھالے چبھتے رہے مگر پھر بھی بندو سو گیا۔

صبح کو پہاڑی کے پیچھے سے سورج نے منہ نکالا اور نئی دہلی پر سے کہرے کا نقاب ہٹایا۔ سورج کی کرنیں وائسر یگل لاج پر پڑیں مگر اُس کی سنگین دیواروں کو توڑ کر آگے نہ جا سکیں۔ ایک کالے دیو کی طرح وائسر یگل لاج کا سایہ زمین پر رینگتا ہوا آیا اور بندو معمار کی ٹھٹھری ہوئی لاش کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

○

رادھا

رادھا آج کتنی خوش تھی۔ دیوالی کے دن ہمیشہ اس کے رقص کے متوالوں کا غیر معمولی مجمع ہوتا تھا۔ کم از کم سو روپے آمدنی کی امید تھی۔ اس موقع کے لیے اس نے ایک بالکل نیا پجارن کا ناچ سوچ رکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سب کو پسند آئے گا۔

رادھا نے اپنا لہنگا اوپر سرکایا اور گورے گورے سڈول ٹخنوں پر گھنگھرو باندھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ گانا بھی گنگنا رہی تھی، جو آج کے مجرے میں وہ گانے والی تھی۔ دوسرے کمرے میں سازندوں نے اپنے اپنے سازوں کو چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ رادھا کا جسم موسیقی کی اطاعت کرنے کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ ناچ کی گت سنتے ہی بے اختیار اس کا رُواں رُواں رقص کرنا شروع کر دیتا۔ بچپن سے اس کو ناچنے کا شوق تھا۔ ناچ ہی اس کا مذہب تھا، ناچ ہی اس کی زندگی۔ ناچتے وقت وہ اپنے تمام دکھوں، تمام تکلیفوں، تمام ذلتوں کو بھول جاتی تھی۔ جیسے ہی سازندوں نے مشق کے لیے ایک چلبلے ناچ کی گت بجانی شروع کی، رادھا کے دونوں پاؤں زمین پر تال کے ساتھ حرکت کرنے لگے ـــ چھن، چھن، چھن، چھنا، چھن، چھن، چھن، چھنا، چھن!

''رادھا، رادھا بٹیا!'' ہانپتے! پسینے میں بھیگے ہوئے استاد جی کمرے میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا بڑے میاں زینے پر تین تین سیڑھیاں ایک جست میں پھلانگتے ہوئے آ رہے تھے۔

''کیا ہے استاد جی؟'' رادھا نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اس بوڑھے گویے کو بہت پسند کرتی تھی، جس نے اسے بچپن میں ناچنا اور گانا سکھایا تھا اور جو اس وقت سے رادھا کے باپ، دوست، مشفق اور دلال کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

''رادھا!'' استاد جی سانس کو قابو میں لاتے ہوئے بولے، ''آج ہماری قسمت جاگ اٹھی ہے۔ آج لکشمی دیوی واقعی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی ہیں۔''

''کیا ہوا استاد جی؟ آخر کچھ بتاؤ گے بھی؟''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آج جل پور کے راجا صاحب ہمارے یہاں مجرے میں آرہے ہیں — راجا صاحب جل پور! کچھ سمجھیں!''

''جی ہاں۔'' رادھا نے موقع کی اہمیت سے مرعوب ہو کر جواب دیا، ''مگر ان راجا صاحب کے متعلق کچھ بتایئے! کیا بوڑھے ہیں راجا صاحب؟''

''بوڑھے؟'' استاد نے اتنے حقارت آمیز لہجہ میں یہ لفظ ادا کیا گویا بڑھاپا دنیا میں صرف ان کا حق تھا، ''بوڑھے؟ بھئی کمال کر دیا! ارے ان راجا صاحب کی تو پیدائش مجھے ایسی یاد ہے جیسے آج کا دن۔ ان کے مرحوم والد، راجا صاحب نے جو جلسہ بیٹا ہونے کی خوشی میں کیا تھا وہ بھی یاد ہے۔ ہاہاہا، کیا شاندار جلسہ تھا! کچھ نہیں تو طائفے پورے چھ ہوں گے۔ راجا صاحب کی عمر پچیس چھبیس سے زیادہ تو ہرگز نہ ہوگی۔ ابھی پانچ ہی برس تو ہوئے ہیں ان کی شادی کو۔ تمھیں یاد نہیں؟ تمہاری بیچاری ماں بھی تو گئی تھی اس موقع پر ناچنے! مگر ہاں، تم تو جب بہت ہی کم عمر تھیں، اس لیے تمھیں......''

استاد جی کا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا، کیوں کہ انھوں نے دفعتاً اپنی غلطی محسوس کر لی تھی۔ ان کو رادھا کی ماں کا ذکر نہ کرنا چاہیے تھا۔ ماں کی موت کا صدمہ رادھا کو بہت ہوا تھا۔ چھ مہینے میں تو وہ ادھ موئی ہو گئی تھی۔ کسی بات کا ہوش نہ رہا تھا۔ ناچنا بھی بھول گئی تھی۔ چند مہینے سے استاد جی اس کا جی بہلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ مگر اب بھی کوئی بھولے سے گفتگو میں اس کی ماں کا ذکر کر دیتا تو رادھا دفعتاً غم کے بے پایاں سمندر میں ڈوب جاتی تھی۔

''بٹیا...... بٹیا......!'' استاد جی اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش میں ہکلانے لگے، ''روؤ مت۔

مجھے یہ ذکر ہی نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ اچھا، اب آنسو پونچھ ڈالو۔ دیکھو، آج دیوالی کی رات ہے۔ اب جلدی تیار ہو جاؤ، راجا صاحب آنے والے ہوں گے۔"

ایک سازندا گھبرایا ہوا داخل ہوا، "راجا صاحب آرہے ہیں۔"

رادھا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اپنی ہچکیوں کو گھونٹ دیا۔ یہ رونے دھونے کا وقت نہیں ہے اور پھر ناچنے والی طوائف کو کب یہ حق ہے کہ وہ اپنے غم کا اظہار کرے؟ — یہ سوچ کر وہ اپنی لاچاری پر خود ہی مسکرائی۔ ایسی مسکراہٹ، جس میں دکھ ہی دکھ تھا۔

راجا صاحب جل پور ایک قد آور نوجوان تھا۔ راجپوتی شان اس کے چہرے اور ٹیڑھے صافے سے ٹپکتی تھی۔ اس کے انداز گفتگو اور عام برتاؤ میں ایک قسم کی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ دولت اور طاقت انسان کو معمولی تکلفات اور جھجک سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ مسند پر بیٹھے، وہ ناچتی ہوئی رادھا کو بے باک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تجربہ کار اور جہاں دیدہ، آنکھیں رادھا کے جسم کی بوٹی بوٹی کو ٹٹول رہی تھیں، پرکھ رہی تھیں، دولت کے ترازو میں تول رہی تھیں۔ اس کے سیاہ چمکیلے بال، جن کو ناگن جیسی لہراتی چوٹی میں گوندھا گیا تھا۔ اس کا دل کش کتابی چہرہ اور گلابی ہونٹ، جو پیار کرنے کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ اس کا سینہ، جس میں نوجوانی کا خمیر اٹھ رہا تھا، اس کی پتلی کمر، جو چولی اور لہنگے کے درمیان چمک رہی تھی؛ اُس کے سڈول گورے گورے ٹخنے، جو ناچ کے دوران میں اکثر برہنہ ہو جاتے تھے — راجا کی آنکھوں نے ان سب چیزوں کی قیمت لگائی دماغ ہی میں میزان کر کے فیصلہ کرلیا کہ دس ہزار میں پر یہ سودا برا نہیں ہے اور ممکن ہے، خریدنے کی ضرورت ہی نہ پڑے، کرائے پر مل جائے۔ عورت کے جسم کی قیمت بھی تو قسط وار ادا کی جاسکتی ہے۔ راجا نے اپنی عمر میں ہر قوم اور رنگ کی عورتوں کے جسم خریدے تھے۔ خود اس کی بیوی کافی حسین تھی، مگر راجا تنوع کا قائل تھا۔ ہر سال اپنی موٹر بدلتا تھا اور موٹر کے ساتھ ساتھ......

رادھا نے ناچ ختم کیا تو اس کی داد دینے کے لیے کمرے میں راجا کے سوا کوئی نہ تھا اور سب تماشائی راجا کے سکریٹری کا اشارہ پا کر آہستہ آہستہ اٹھ چکے تھے۔ اور لوگوں کو نہ دیکھ کر رادھا کو کسی قدر مایوسی ہوئی، کیونکہ وہ ہمیشہ ایک مجمع کے سامنے ناچنا چاہتی تھی، ان کی تعریف اور واہ واہ کی وہ خواہش مند رہتی تھی۔ اتنے آدمیوں کو اپنے ناچ سے خوش کر کے اس کو بھی خوشی ہوتی

تھی۔ یہی اس کا انعام تھا اور یہی اس کی زندگی کا سب سے روشن ترین پہلو۔ اسی سے اس کا حوصلہ بڑھتا تھا اور بہتر سے بہتر ناچ ناچنے کی امنگ دل میں پیدا ہوتی تھی۔ اس کے کوٹھے پر تو بیس پچیس ہی کا مجمع ہوتا تھا۔ اگر باہر کہیں کسی شادی بیاہ کے جلسے میں جاتی تو دو تین سو آدمی اس کا ناچ دیکھنے جمع ہو جاتے تھے۔ مگر رادھا تو چاہتی تھی کہ ہزاروں کا مجمع ہو اور اس میں وہ ناچے اور ایسا ناچے کہ ہر ایک اس کے کمال فن کا معترف ہو جائے اور ہال یا منڈپ ان کی تالیوں سے گونج اٹھے۔

''واہ، واہ! سُندر، سندر!'' ہزاروں تالیوں کے شور کے بجائے صرف راجا کی تالیوں کی آواز خالی کمرے میں عجیب معلوم ہوئی۔ مگر عادت کے مطابق رادھا نے مسکرا کر اور ہاتھ جوڑ کر راجا کا شکریہ ادا کیا۔ پان کی تھالی پیش کی۔ راجا نے پان کا بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر تھالی میں رکھ دیا۔ رادھا نے پھر سلام کیا اور ادب سے آنکھیں جھکا کر (جیسا کہ استاد جی نے اسے سکھایا تھا) بیٹھ گئی۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' راجا نے سوال کیا۔

''رادھا!''

''جیسی سندر ہو ویسا ہی نام بھی سندر ہے۔'' راجا نے بغیر کسی شرم یا جھجھک کے کہہ دیا اور دل میں سوچا، آواز بھی اچھی ہے۔ راجا نے نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے تین سال کے قیام کے دوران ولایت کی بھی حسین ترین عورتوں کو دیکھا تھا مگر رادھا میں اسے کچھ اور ہی دلکشی نظر آتی تھی۔ کم از کم اس وقت اس کی نظر میں رادھا کے سامنے تمام دنیا کی عورتیں ہیچ تھیں۔

''کہو رادھا، میں پسند ہوں؟'' راجا جانتا تھا کہ اس طبقے کی عورتوں سے ایسی بے تکلفی کی گفتگو جائز ہے۔

سازندے اپنے اپنے ساز سنبھال کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تجربہ کار ایکٹروں کی طرح، جن کو معلوم ہے کہ کس وقت اسٹیج چھوڑ دینا چاہیے۔

''ہاں راجا صاحب، مگر میں بھلا کس قابل ہوں۔'' رادھا نے انکسار سے جواب دیا۔ امیر آدمیوں سے اسی طرح بات کرنی چاہیے، یہی استاد جی نے سکھایا تھا۔ اگر کوئی ادنیٰ درجے کا آدمی ایسے سوال کی جرأت کرتا، تو ممکن ہے تھپڑ کھاتا!

''تو پھر، کیا تم میرے محل میں رہنا پسند کروگی؟'' راجا نے مطلب کی بات کہی۔

رادھا کو اس سوال کا جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے پیشے کے سنگین قاعدے اور قانون کے بہ موجب وہ شرمائی، استاد جی کی طرف مدد اور مشورہ کے لیے دیکھا اور ایک ادا سے پلّو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں راجا صاحب!'' استاد جی نے جلدی سے کہنا شروع کیا، ایک ایسے دوکاندار کی طرح، جس کو ڈر ہو کہ کہیں گاہک ناراض ہو کر نہ چلا جائے،'' یہ تو رادھا کی عین خوش قسمتی ہے، اس کے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔''

راجا نے اپنے سکریٹری سے دبی آواز میں کچھ باتیں کیں اور پھر ''اچھا...... میں جاتا ہوں'' کہتا ہوا زینے سے نیچے اتر گیا۔ اب سکریٹری اور استاد جی میں کاروبار کی باتیں شروع ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد رادھا کو معلوم ہوا کہ پانچ سو روپے ماہوار پر اس کو راجا کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ رادھا کو اس خبر سے نہ کوئی خاص خوشی ہوئی، نہ افسوس۔ کم از کم راجا ایسا بدصورت تو نہ تھا جیسا وہ موٹا اور بدبودار زمیندار، جس کو رادھا کا پہلا گاہک ہونا نصیب ہوا تھا۔

اگلے دن رادھا اپنے سب ساز و سامان کے ساتھ راجا کے محل میں اٹھ گئی۔ اس رات کو رادھا کا کوٹھا ویران اور اندھیرا پڑا رہا اور بازار والوں نے رادھا کے گھنگھروؤں کی سریلی آواز نہ سنی۔

تین مہینے بعد —

ایک پر تکلف اور آراستہ کمرے میں رادھا اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔ یہ کمرا راجا نے خاص طور سے رادھا کے لیے سجایا تھا، مگر اس وقت اس کی تمام آرائش پر ہلکے ہلکے اندھیرے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ باہر سورج غروب ہو رہا تھا، مغرب کی طرف کی پہاڑیاں سیاہ دیو معلوم ہوتی تھیں۔ درختوں کے سائے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے تمام زمین پر چھا رہے تھے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا، رادھا کے چہرے پر بھی سوچ اور فکر کا گہرا رنگ چڑھتا جا رہا تھا۔

تین مہینے میں پہلی بار اسے سوچنے اور اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اپنی جیسی سب عورتوں کی طرح وہ حقیقت شناس تھی اور اپنی قسمت پر قانع۔ اس کو معلوم تھا کہ رنڈی کی اولاد کی سماج میں کیا جگہ ہے اور گو وہ اس ذلت کو محسوس کرتی

تھی، مگر سماج سے لڑنے کی اس میں نہ ہمت تھی اور نہ خواہش۔ رنڈی کی بیٹی شہر کی بہترین ناچنے والی ہی کیوں نہ ہو، وہ طوائف ہی رہے گی۔

اس پیدائشی بندھن سے کوئی چھٹکارا نہ تھا، اور پھر اوروں کے مقابلے میں رادھا بہت آرام سے تھی۔ ایک جوان، صحت مند راجا کی داشتہ ہونا، اس سے تو ہزار درجہ بہتر تھا کہ وہ بازار میں بیٹھ کر ہر رات کو ایک نئے گاہک کے ہاتھ اپنا جسم فروخت کرے۔ یہاں سوائے راجا کے کسی کی مجال نہ تھی کہ رادھا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ رہی پریم اور بیاہ اور گرہستی کی خواہش جو ہر عورت کے دل میں ہوتی ہے، خواہ وہ طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ سو اس خواہش کو ہمیشہ اپنے دل کے سب سے اندھیرے کونے میں دبا کر رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی قسمت میں یہ نعمتیں نہیں لکھی تھیں۔ استاد جی نے اسے بتایا تھا کہ انسان بھگوان سے نہیں لڑ سکتا اور جس حالت میں بھگوان نے انھیں پیدا کیا ہے، اس کو بدلنے کی کوشش کرنا سب سے بڑا پاپ ہے۔

مگر آج نہ معلوم کیوں رادھا کے دل میں ایک کھچڑی سی تھی۔ بے کار اور خوفناک اس پر نرغہ کیے ہوئے تھیں۔ کاش، میں بھی ایک بیاہتا بیوی ہوتی۔ کاش، میں بھی ایک ماں ہوتی! کاش، سماج میں میرے لیے بھی ایک عزت کی جگہ ہوتی! اس وقت وہ اپنی موجودہ حالت کے عیش و آرام سب کو قربان کرنے کے لیے تیار تھی۔ عورت کے محسوسات اور جذبات، جو سماج، مذہب اور قانون سے بھی پرانے اور مضبوط ہیں، آج پھر بغاوت پر آمادہ تھے۔

رادھا کی بے چینی کی وجہ جل پور کی رانی تھی۔ اُسی نے رادھا کی حقیقت شناسی کو متزلزل کر دیا تھا۔

جب سے وہ راجا کے محل میں آئی تھی، رادھا نے رانی کی لاجواب خوب صورتی کی تعریفیں سنی تھی۔ وہ اکثر سوچتی تھی، ’’آخر اتنی خوب صورت بیوی گھر میں ہوتے ہوئے راجا صاحب مجھ جیسی بازاری عورتوں کے پیچھے کیوں پھرتے ہیں؟‘‘ (اس کو معلوم نہ تھا کہ دولت والوں کے چاؤ بھی نرالے ہوتے ہیں، وہ گھر کا اچھا کھانا چھوڑ کر تبدیلیٔ ذائقہ کے لیے اکثر ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں) کئی بار رادھا نے راجا سے کہا کہ وہ زنان خانہ میں جا کر ایک بار رانی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر ہر بار کسی نہ کسی بہانے سے راجا نے اس کو ٹال دیا، ’’پیاری، میں تم سے پریم کرتا ہوں

اور تم مجھ سے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے پریم میں کسی تیسرے کا نام بھی مخل ہو۔" مگر ان باتوں سے رادھا کو تسلی نہ ملتی بلکہ رانی کو دیکھنے کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار اس نے ایک دن بوڑھی لکشمی سے اپنی خواہش کا ذکر کیا۔ لکشمی راجا کے گھر کی پرانی نوکرانی تھی اور اس کو خاص طور سے رادھا کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ جب رادھا نے بہت اصرار کیا تو وہ تیار ہوگئی اور ایک دن، جب راجا شکار پر گیا ہوا تھا، وہ رادھا کو پھٹے پرانے کپڑے پہنا کر زنانے محل میں لے گئی۔

ایک آراستہ دالان میں بیچ مسند پر رانی براج مان تھیں — حسین، پُر رعب اور مغرور! رادھا ایک کونے میں ادب سے لکشمی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ کسی نے اس کو پہچانا نہیں تھا۔ جس نے دیکھا بھی، وہ یہی سمجھا کہ لکشمی اپنی کسی بھانجی بھتیجی کو رانی صاحبہ کے درشن کرانے لائی ہے۔ رادھا یہ سن کر مسکرا دی کہ اس محفل میں خود اسی کا ذکر ہو رہا تھا۔

"رانی جی، " ایک منہ چڑھی داسی کہہ رہی تھی، " آپ اس کل موہی رادھا کو کیوں نہیں نکلوا دیتیں؟ اس چڑیل نے تو راجا صاحب کو بالکل اپنا کر رکھا ہے۔"

رانی نے بات کا جواب دیے بغیر کہا: "میں نے سنا ہے کہ وہ ہے کافی خوب صورت!"

"آپ کی تو جوتی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔" ایک خوشامدی عورت نے جلدی سے کہا۔

"مگر کیا آپ کو اس سے حسد نہیں محسوس ہوتا؟" قریب کے ایک زمیندار کی بیوی نے سوال کرنے کی جرأت کی۔

رانی کا جواب تیز چھری کی طرح رادھا کے کلیجے کے پار ہو گیا۔ "میرا اس کا کیا مقابلہ! میرے لیے اس بازاری عورت سے حسد کرنا بھی توہین ہے۔ اس کے علاوہ کون سا راجا یا زمیندار ایسا ہے، جو ایک آدھ داشتہ عورت نہیں رکھتا؟ بازار کی ناچنے والی کبھی گھر کی مالکن کا مقابلہ کر سکتی ہے؟"

رادھا یہ طمانچہ برداشت نہ کر سکی۔ چپکے سے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ 'بازار کی ناچنے والی کبھی گھر کی مالکن کا مقابلہ کر سکتی ہے؟' رانی کے الفاظ اب تک اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ وہ اس کو پریشان کر رہے تھے، پاگل بنا رہے تھے۔ ان الفاظ میں رانی نے رادھا کو ایک آئینہ دکھا دیا تھا، جس میں اس کو حقیقت کی بھیانک شکل نظر آئی تھی۔ اس آئینے میں اپنی اصلی حیثیت جان کر رادھا کانپ اٹھی۔

اگر رادھا سماجی اور اقتصادی مسائل پر فلسفیانہ نظر سے غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتی تو وہ ان تمام حالات پر غور کرتی، جو اس کے موجودہ پست خستہ رتبہ کے ذمہ دار تھے۔ مگر اس وقت تو وہ صرف ایک عورت تھی— جس کے سوئے ہوئے نسوانی جذبات دفعتاً بیدار ہو گئے ہوں۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتی تھی کہ بازار کی ناچنے والی کبھی گھر کی مالکن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔'' اس کا دل دفعتاً آرزوؤں اور امنگوں سے بھرپور ہو گیا۔ کاش!! میں بھی کسی کی بیاہتا بیوی ہوتی! کاش، میری بھی اولاد ہوتی! کاش، میں بھی ماں کہلاتی! کاش، میں بھی کسی گھر کی مالکن ہوتی— چاہے وہ گھر جھونپڑا ہی کیوں نہ ہو!' یہ سب ناممکن معلوم ہوتا تھا، مگر پھر بھی چاروں طرف کے اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ کیا راجا نے ہزاروں مرتبہ اپنے پریم کا اعلان نہیں کیا تھا؟ کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا، ''رادھا! تمھارے لیے آسمان کے تارے بھی توڑ کر لا سکتا ہوں۔''...... کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا، میں دھرم اور سماج کے بندھنوں کو نہیں مانتا۔ میرا دھرم تو بس پریم ہے۔ اگر اس کو رادھا سے واقعی اتنی محبت تھی تو وہ کیسے اس سے شادی کرنے سے انکار کر سکتا تھا؟ اور اگر وہ واقعی راضی ہو جائے!— اس خیال سے رادھا کا چہرہ چمک اٹھا۔ گھریلو زندگی کا سکون، سماج میں ایک باعزت پوزیشن، اولاد! مگر ایک خیال تھا، جو رادھا کی اس خوشنما تصویر کو بگاڑ رہا تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد سماج اس کو ناچنے کی اجازت نہیں دے گا اور ناچ رادھا کی زندگی کا ایک لازمی جز تھا۔ اس کے بغیر اس کا جیون پھیکا اور نامکمل رہ جائے گا۔ ناچ کا شوق اس کے خون، گوشت اور ہڈیوں اور ہر ایک رگ میں رچا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ناچنا چاہتی تھی بلکہ ایک محفل کے سامنے ناچنا چاہتی تھی وہ، 'واہ واہ' کے نعروں اور تالیوں کی گونج سننے کی خواہش مند تھی۔ وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی کہ ایک دن وہ کسی بڑے تھیٹر کے اسٹیج پر اپنا ناچ دکھا کر ہزاروں لوگوں سے خراج وتحسین وصول کرے گی۔ جب سے وہ راجا کی داشتہ بن کر آئی تھی، اس کو صرف ایک آدمی کے سامنے ناچنا پڑتا تھا۔ یہی ایک بات اس کے لیے سوہان روح تھی مگر ہمیشہ کے لیے ناچ کا خیال چھوڑ دینا، رادھا جیسی کلاکار کے لیے کیسے ممکن تھا؟ مگر سماج میں عزت پانا اور گھریلو زندگی کی عافیت کو حاصل کرنا بھی تو کوئی آسان کام نہ تھا۔ رادھا جیسی سینکڑوں رنڈیاں اسی امید میں زندگی کے دن گذار دیتی ہیں۔ پتنی اور ماں بننے کے لیے اسے اپنے ناچ کو قربانی کرنا ہی پڑے گا۔

رادھا نے دل کڑا کر کے فیصلہ کر لیا۔

برآمدے میں جانے بوجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دن بھر کے شکار سے تھکا ہوا راجا داخل ہوا۔ ''کہو جان من، کیا حال ہے؟'' اس نے بندوق پھینک کر رادھا کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ تم نے آج مجھے کتنی بار یاد کیا؟'' رادھا نے استاد جی کے سکھائے ہوئے نخرے کے ساتھ سر ہلا دیا۔

راجا نے سگریٹ جلا کر دھوئیں کے بادل اڑانے شروع کر دیے۔ جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ رادھا کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ''رادھا، کیا بات ہے؟ تم پریشان معلوم ہوتی ہو۔'' اور پھر پریم بھرے لہجے میں کہا: ''بتاؤ میری جان، تمھیں بھی میری قسم ہے۔''

رادھا نے پوری ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا: ''راجا صاحب...... میں آپ سے پریم کرتی ہوں۔ بہت پریم کرتی ہوں۔'' اور پھر نگاہیں جھکا کر بولی، ''راجا صاحب، کیا ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی؟''

یہ سن کر راجا کو کوئی خاص تعجب نہیں ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ سوال ضرور ہی ہوگا۔ اس نے سوچا، یہ عورتیں سب ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ اب تک جتنی لڑکیاں اس نے داشتہ رکھی تھیں ان سب نے چند مہینے کے بعد شادی کی فرمائشیں کر کے راجا کے مزے کو کرکرا کر دیا تھا۔ رادھا بھی آخر اسی ڈھرے پر آ گئی۔ حالانکہ راجا کو امید ہو چلی تھی کہ وہ کم از کم سمجھدار ثابت ہوگی۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں، راجا صاحب؟'' رادھا نے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پوچھا، ''کیا آپ مجھ سے اتنا بھی پریم نہیں کرتے کہ شادی کر لیں؟''

'یہ لڑکی اب وبالِ جان ہوئی جا رہی ہے'، راجا نے سوچا۔ مگر وہ خوب صورت تھی اور ابھی تک اس سے عیش پرست راجا کا دل نہیں بھرا تھا۔ ابھی چند دنوں تک اس کو کسی نہ کسی طرح راضی رکھنا چاہیے۔

''پیاری، میری جان رادھا!'' اور یہ کہہ کر اس تجربہ کار عیاش نے رادھا کو کھینچ کر گلے سے لگا لیا اور اس کے گالوں اور ہونٹوں پر بوسوں کی بارش کر دی۔ ''تو کیا تم بھی اس شادی بیاہ کے

ڈھکوسلوں کو مانتی ہو؟ میں تو بس ایک ہی چیز پر اعتقاد رکھتا ہوں — وہ ہے پریم! پریم، جو دو دلوں کو ملاتا ہے؛ پریم، جو عورت مرد کے تعلقات کی اصل بنیاد ہے۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں اور تم مجھ سے پریم کرتی ہو۔ اگر کسی پنڈت نے ہم دونوں کے پلو باندھ کر اور ہَون کے چاروں طرف پھرا کر کچھ اشلوک پڑھ دیے تو کیا فرق پڑ جائے گا؟ میں تو کہتا ہوں، پریم کو سماج کے بندھنوں میں جکڑنا ایک پاپ ہے، مہا پاپ!''

رادھا راجا کی گود میں لیٹی ہوئی تھی، اس کے مضبوط ہاتھوں میں جکڑی ہوئی۔ راجا کے فلسفہ پر فوراً ایمان نہ لا سکی، ''مگر راجا صاحب، ہمیں رہنا تو اسی سنسار میں ہے اور یہ سماج بغیر بیاہ کے پریم کو پاپ سمجھتا ہے۔ میں آپ کی ہونا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

رادھا جانی! میری تو تم ہمیشہ رہوگی۔ میرے جیون میں آج تک کوئی ایسی لڑکی نہیں آئی، جس سے میں نے اتنا پریم کیا ہو، جتنا تم سے کرتا ہوں، اور نہ اب کبھی آئے گی۔ میں تمھارے گالوں کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ہمیشہ تم سے پریم کروں گا اور رادھا کے گال چوم کر کہا: ''لو، یہ ہو گیا ہمارا بیاہ...... دو دل ملے اور بیاہ ہو گیا...... رہا سماج، تو میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔ ہزاروں کو کھلا کر کھاتا ہوں۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا............ اور دیکھو، پیاری! میں تو ولایت بھی ہو آیا ہوں۔ وہاں تو کوئی شادی بیاہ کا قائل نہیں۔ بس، سب پریم کے پجاری ہیں۔''

راجا چرب زبان تھا۔ رادھا جیسی سیدھی اور ناتجربہ کار لڑکی کو پھسلا کر راہ پر لے آنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ شادی کا شوق پریم کی آگ میں جھلس کر رہ گیا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی اور ایک لونڈی داخل ہوئی، ''راجا صاحب!...... رانی صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔'' اور فوراً ہی راجا زنانے محل میں چلا گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا: ''ابھی آیا، رادھا۔''

جذبات اس وقت عجیب طریقے سے الجھے ہوئے تھے۔ اس کو نہ معلوم تھا کہ ہنسے یا روئے! ایک طرف اس بات کی خوشی تھی کہ راجا جیسا خوب صورت اور امیر آدمی اس پر اتنا فریفتہ تھا، دوسری طرف گھریلو زندگی کا جو شاندار خیالی محل اس نے بنایا تھا، اس کے کھنڈر!

بڑھیا لکشمی کی سسکیاں لینے کی آواز آئی تو رادھا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بیچاری ایک کونے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ ''کیوں لکشمی، کیا ہوا تجھے؟'' رادھا نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ وہ

اکثر لکشمی کے متعلق سوچا کرتی تھی کہ اس بڑھیا نے کس قسم کی زندگی گذاری ہوگی؟ مگر آج تک اس سے سوال کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ آج اسے روتا دیکھ کر رادھا کو تعجب بھی ہوا اور دکھ بھی۔ وہ فطرتاً نرم دل واقع ہوئی تھی اور کسی کو روتا دیکھ کر اس کا خود دل بھر آتا تھا، ''لکشمی، لکشمی! بول نا! کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، بائی جی۔'' بڑھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں، کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟''

بڑھیا نے سسکیاں بھرتے ہوئے جواب دیا: ''بائی جی، آپ برا نہ مانیں تو کہوں۔'' اور پھر رادھا کی اجازت پاکر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، آپ کی اور راجا صاحب کی باتیں سن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ پچیس برس پہلے ان کے باپ، بڑے راجا صاحب، مجھے بھی اسی طرح یہاں لائے تھے اور جب میں نے شادی کرنے کو کہا تھا تو مجھ سے اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔

رادھا کی نظروں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا۔ اس نے لکشمی کے جھریوں دار چہرے کی طرف دیکھا اور پھر آئینے میں اپنے حسین چہرے کو دیکھا۔ کیا پچیس برس میں میرا بھی یہی حشر ہونے والا ہے؟ یہ سوچا اور ایک لمحہ میں اس نے فیصلہ کرلیا۔

اگلی رات کو رادھا کے کوٹھے پر پھر روشنی ہوئی اور رادھا کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے تمام بازار گونج اٹھا۔

○

پاؤں میں پھول

خواجہ احمد عباس کا دوسرا افسانوی مجموعہ جو پہلی بار مکتبۂ سلطانی ابراہیم رحمت اللہ روڈ
ممبئی سے 1948 میں شائع ہوا

تعارف

خواجہ احمد عباس کے افسانے جنس کے محور پر نہیں گھومتے۔ جنس کا ذکر اُن کے ہاں ضمناً ہے۔ کسی سماجی مسئلے یا معاشی اُلجھن یا سیاسی امور کے بیان میں جنس کا ذکر آجائے تو آجائے، وہ بھی اگر اس کی ضرورت پڑے تو، ورنہ نہیں۔ اُن کے افسانوں میں جنسی حدت بہت کم ہے۔ معشوق کا سراپا مشکل ہی سے ملے گا۔ ایسی تشبیہیں اور استعارے بھی نظر نہیں آتے جن کا اطلاق کم از کم اس دُنیا کی عورتوں پر نہیں ہوتا۔ جنس کے معاملے میں عباس، ارضی قدروں کی طرف جھکتے نظر آتے ہیں (بارہ گھنٹے)۔ آسمانوں کی طرف نہیں اڑتے۔ مبالغے پر حقیقت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جذباتیت پر عقلیت کو، خوب صورتی پر انسانیت کو۔ اُنہیں معلوم ہے کہ انسان محض جنس نہیں ہے، وہ مرکب ہے مختلف جذبات و احساسات کا، مجموعہ ہے متضاد جبلّیات کا، اُس کے خمیر میں مختلف قوتیں کام کرتی ہیں اور اُس کے مزاج کی ترکیب میں سماجی و معاشی ماحول، وراثت، تربیت اور اقتصادیات کے پس منظر کو بڑا دخل ہے۔ انسان اور اس کے سماج کے متعلق عباس کا نظریہ سائنسی ہے، رومانی نہیں۔ مشینی ہے، ساختی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسے سماج میں جو ابھی ساختی ہے صنعتی نہیں، جو عقل کی بجائے توہمات پر زیادہ یقین رکھتا ہے اور جو جنسی محبت کو رومانی عینک سے دیکھنے کا عادی ہے، عباس کے افسانے ابھی تک شک و شبہ کی نظروں سے دیکھے

جاتے ہیں۔ عباس جاہلوں، جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ پڑھے لکھے باشعور، بالغ اذہان کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماضی اور حال سے آگے جا کر مستقبل کی تعمیر کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ اُن کا ادب صنعتی انقلاب کے فروغ کا ادب ہے۔ اور جوں جوں ہندوستان میں اس انقلاب کو تقویت حاصل ہوگی۔ عباس کی تحریروں کی تابانی بڑھتی جائے گی اور اگر کبھی مخالف انقلاب آیا اور فسطائیت کے اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا تو عباس کی تحریریں سب سے پہلے جلائی جائیں گی۔

عباس مستقبل کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ کہیں اس سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیں کہ وہ حال سے بے بہرہ ہیں۔ حال کے دقیق مطالعے کے بغیر مستقبل کے متعلق اشارے نہیں کیے جاسکتے۔ جہاں تک حال کے مشاہدات اور تجربات کا ذکر ہے عباس بے حد ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں اُن کی صحافی زندگی نے بھی اُنہیں بڑی مدد پہنچائی ہے۔ اس ملک میں جہاں اخبار بینی تضیع اوقات میں داخل ہے، جہاں عشقیہ مضامین کے علاوہ اور کسی تحریر کا شمار ادب میں نہیں ہوسکتا، وہاں عباس کی جرأت یقیناً قابل احترام ہے کہ وہ ہر نئے موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ لیتے ہیں جس کا شمار اپنے حسن بیان اور قوت تخلیق کے اعتبار سے سچے ادب میں ہوسکتا ہے جنگ ہو یا فتح ہو، آزادی کا دن ہو یا کشمیر کی لڑائی ہو، یا بمبئی کا فرقہ وارانہ فساد ہو یا راشننگ کا جھگڑا ہو، ان کے افسانے ہر موضوع کو سمو کر ایک ایسی دلکش کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو افادی بھی ہے اور ابدی بھی۔ یعنی وقتی موضوعات پر قلم اٹھانے کے بعد وہ اپنی تحریروں میں اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں کہ افسانہ آج بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور آج سے بیس سال بعد بھی دلچسپ معلوم ہوگا۔ اخبار کی رپورٹ میں اور ادب میں یہی فرق ہے۔ عباس کی تحریروں میں فوری تاثر اور مستقل تاثر دونوں ملتے ہیں۔ (ایک پائلی چاول)

مجھے عباس کے افسانوں میں جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ دوسروں کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ یعنی اُن کا انداز نگارش، اس کی بے مثال سادگی اور سلاست۔ منٹو کے ہاں مرعوب کُن شوخی کی نمود ہے، عصمت کے جملے اپنے موضوع سے قطع نظر بڑے شستہ، بڑے منجھے ہوئے جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ کے حامل ہوتے ہیں۔ بیدی کے ہاں متین رنگ غالب ہے۔

اور اپنے ہاں بھی اُسی انداز نگارش کے نمونے ملتے ہیں جو جاگیردارانہ ماحول میں نہایت مناسب اور بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن جو صنعتی دور کی ترجمانی کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ اس انداز نگارش اور عباس کے اسٹائل میں وہی فرق ہے جو ہارڈی اور ہیمنگ وے میں ہے۔ جو TESS اور THE BELL TOLLS FOR WHOM میں ہے۔ میں جب اپنے افسانے پڑھتا ہوں اور عصمت، بیدی اور منٹو کے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایک نہایت خوب صورت رتھ پر بیٹھے چلے جا رہے ہیں اور عباس ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ اپنے ہاں شعریت ہے خوب صورتی ہے، پہیے منقش ہیں۔ حودہ مطلا ہے، گھوڑوں کے گلے میں نقرئی گھنٹیاں ہیں، لیکن چال میں قیامت کی سست رفتاری ہے، اور سڑک کچی ہے، جگہ جگہ ہچکولے لگتے ہیں۔ لیکن عباس کی تحریروں میں کہیں ہچکولے نہیں ہیں، سڑک صاف سیدھی اور پختہ ہے اور قلم میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے ہیں۔ ہوا کی روانی اور پرواز کی تیز رفتاری دونوں اس میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور اور آنے والے زمانے کے مسائل ہم رتھ میں بیٹھ کر نہیں طے کر سکیں گے۔ اس کے لیے ہمیں فضائی پرواز ہی سے کام لینا پڑے گا۔ شعریت کو کم کرنا ہوگا اور جاگیردارانہ تکلفات کو خیرباد کہنا ہوگا کہ جمہوریت کا تقاضا یہی ہے کہ ادیب زیادہ سے زیادہ صاف، آسان اور سلیس زبان استعمال کریں جو جمہور کی سمجھ میں آسکے۔ اُسے بھاری بھرکم الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مغرب میں تو ادب کے ڈانڈے بلند صحافیت سے ملتے جا رہے ہیں اور رپورتاژ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور سلیس تر ہوتے جا رہے ہیں لیکن اُن کی فکری رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے، جیسے اُنہیں پَر میسر آگئے ہوں۔ اپنے ہاں آپ کو یہ رنگ صرف عباس کے ہاں ملے گا، دوسروں کے ہاں اس سے بہت کم۔ یہ تضاد تو مغرب میں بھی ہے۔ اس وقت برطانیہ سے زیادہ امریکہ میں اور فرانس سے زیادہ روس میں آپ کو یہ انداز نگارش ملے گا، کیونکہ جہاں مشینی دور کی دھڑکن تیز ہے وہاں کے ادیبوں کی زبان بھی زیادہ نئی، مختصر اور تیز رفتار ہے، وہاں زندگی کی لے تیز ہو چکی ہے، زیادہ باتیں بنانے کا وقت نہیں۔ لوگ مبہم الجھاوے پسند نہیں کرتے۔ وہ سیدھا، صاف، براہ راست انداز نگارش زیادہ پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عباس سادگی اور سلاست پر حسن اور شعریت کو قربان کر

دیتے ہیں۔ حسن اور شعریت کے وہ بھی قائل ہیں اور اسے سچے ادب کے اوصاف میں شمار کرتے ہیں لیکن وہ ظاہری حسن اور ظاہری شعریت کے پرستار نہیں۔ اُن کے خیال میں محض خوب صورت جملوں سے خوب صورت ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ حسن اور شعریت کی تخلیق ایسے ادب میں دیکھتے ہیں جو موضوع اور اندازِ نگارش کے باطنی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ فقروں کے رنگ وروغن کے قائل نہیں۔ وہ موضوع کی لے کو دیکھتے ہیں جو موجودہ دور میں اکثر و بیشتر تلخ ہے اور تیز رفتار ہے، اور پھر وہ اپنی زبان سے فوق البھڑک لباس اتار دیتے ہیں، اور پھر اُن کی زبان اور اُن کے جملے موضوع سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ موضوع کی رفتار جملوں کی رفتار بن جاتی ہے اور موضوع کا رنگ جملوں کا رنگ بن جاتا ہے۔ اور اس طرح جو نئے حسن اور نئی شعریت کی تخلیق ہوتی ہے وہ جملوں کے اوپر نہیں آتی بلکہ زیرِ آب گویا اک ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی کی طرح اندر ہی اندر جھلکتی نظر آتی ہے، صبا جو نگینے کے سینے سے پھوٹ کر نکلے اُس نور سے کہیں بہتر ہے جو خوب صورت جملوں سے مستعار لی جائے۔

عباس اپنے آپ کو اشتراکی سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اشتراکی نہیں ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو کانگریسی بھی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ کانگریسی بھی نہیں ہیں۔ اُن کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ محض مسلمان بھی نہیں ہیں۔ وہ حالی کے خاندان سے ہیں اور مسلم تہذیب کی بہترین روایات کے علمبردار ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہندو تمدن کے بہترین اوصاف بھی اُن میں پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سو سال میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے اس ملک میں جو ایک مشترک تہذیب، کلچر، زبان، لباس اور قومیت کا تصور پیدا ہوا تھا، عباس اُس کے بہترین مظہر ہیں۔ اُن کی نگاہیں صرف ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود نہیں، اُن کے اعتقادات بین الاقوامی ہیں۔ وہ ہر مسئلہ کو عقلیت اور انسانی بہتری کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر اس میں کوئی کمی، نقص یا خامی دیکھتے ہیں تو بلا تکلف اُس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اشتراکیوں، لیگیوں، کانگریسیوں، ترقی پسندوں، ناترقی پسندوں سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود وہ ہر اُس جماعت کے ساتھ اس مسئلہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جس میں انھیں انسانیت پسندی کی تصویر نظر آئے۔ اُن کے خلوص اور اُن کی ذاتی دیانت کے، دوست دشمن

سب ہی معترف ہیں۔ مگر میں اس وقت اُن کی شخصیت کے بارے میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا، اس کام کو کسی دوسرے کے لیے اٹھا رکھتا ہوں آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ عباس مجھے بہت پسند ہیں، کیونکہ اُن کی شخصیت میں مجھے اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ میری طرح گنجے ہیں، میری طرح کوتاہ ہیں، میری طرح اک عجیب بے ہنگم چال سے چلتے ہیں۔ ہاں ایک بات میں وہ مجھ سے ضرور الگ ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ہے۔ ایسی مسکراہٹ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یعنی مسکرانے پر بھی اس مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی ہے۔ گویا یہ مسکراہٹ ابھی رو دے گی کئی انجانی ان دیکھی اَن بوجھی حسرتوں کا مزار ہے یہ مسکراہٹ۔ ایسی حسرتیں جو ابھی انسانی سینے میں پیدا بھی نہیں ہوئیں۔ کسی موہوم چاہت کی سلگتی ہوئی آرزو، افق کے پار کسی نئی انسانیت کے مستقبل کی نازک تصویر، کہکشاں کے دودھیا راستے پر کسی نوزائیدہ ستارے کا سفر............ نہ جانے یہ حسرتیں کیا یاد دلاتی ہیں، یہ دل دوز تجسم کیا ہے؟ عباس کے حسین افسانے آپ کو اس سوال کا جواب دیں گے۔

— کرشن چندر

○

پاؤں میں پھول

میرے دوست رام کشن کا شمار ہندوستان کے اچھے فلم ڈائریکٹروں میں ہوتا ہے۔ دس برس سے فلمی دنیا میں ہے۔ اپنے کام میں ہوشیار ہے، درجنوں چوٹی کے اداکار اس کے فلموں میں کام کر چکے ہیں، سب اسٹوڈیو والے اس کی عزت کرتے ہیں۔ مگر اس میں بس ایک کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتا جب تک آدھے درجن دوستوں یا جاننے والوں سے مشورہ نہ کر لے۔ بدقسمتی سے میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ ہر چوتھے پانچویں روز ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور رام کشن صاحب کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

''ارے بھائی میں ہوں رام کشن۔''

''ہاں۔ ہاں وہ تو میں سمجھ ہی گیا۔ کہو کیا کام ہے؟''

''شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر سے ہوتے جانا۔ ایک نئی کہانی آئی ہے۔ چاہتا ہوں تم بھی ذرا سن لیتے۔''

اگر نئی کہانی نہیں تو کسی نئی گانے والی کی آواز کا ٹیسٹ ہے۔ یا اسٹوڈیو میں کوئی نیا سیٹ لگا ہے۔ یا فلم کے لیے کسی ناچ کا ریہرسل ہے یا تاریخی فلم کے لیے ہیروئن کے کپڑے یا زیور تیار ہو کر آئے ہیں۔ اور ڈائریکٹر رام کشن ان کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک زید، بکر،

عمر، گوپال، دنو داور موہن کی رائے نہ معلوم ہو جائے۔

ہاں تو کوئی سال بھر کا ذکر ہے کہ ایک دن میں دفتر میں 'آخری صفحہ' لکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک جانی بوجھی آواز سنائی دی۔

''ارے بھائی میں ہوں رام کشن۔''

''بولو کیا بات ہے؟''

''شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر ہو جانا ایک معاملہ میں مشورہ کرنا ہے۔''

''آخر کس معاملے میں؟''

''یہ جب آؤ گے تب بتاؤں گا۔ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔'' اور ٹیلیفون کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

خیر صاحب، شام کو رام کشن کے فلیٹ پر پہنچے۔ دیکھا کہ داؤد پریلی، وسنت داور کر اور شکور پہلے سے موجود ہیں اور چائے اڑا رہے ہیں۔ میں نے کہا کیوں بھائی لوگو، آج کون سی نئی آفت آئی ہے کہ رام نے ہم سب کو بلایا ہے۔

شکور نے جواب دیا۔ یہ رام ہی سے پوچھنا۔ وہ ابھی کپڑے پہن کر آتا ہے اور میں نے شکور کے پتلی دھاری والے نیلے سوٹ کو جو دیکھا تو سمجھ گیا کہ کام جو کچھ بھی ہو اس میں کسی لڑکی کا دخل ضرور ہوگا۔

رام آیا تو سفید کلپ لگے ہوئے چکن کے کرتے، سفید ڈھیلے پائجامے اور سفید چپلوں میں ملبوس۔ بال کنگھا کیے ہوئے۔ میں نے کہا ''خیریت تو ہے؟ آج کس کے قتل کا سامان ہے؟''

تب یہ بھید کھلا کہ رام کو اپنے نئے فلم ''معصوم قاتل'' کے لیے ایک ڈانسر یعنی ایک رقاصہ یعنی ایک ناچنے والی کی تلاش تھی اور کیونکہ جتنی مشہور و معروف ناچنے والیاں فلموں میں کام کرتی ہیں وہ سب دوسرے اسٹوڈیوز میں کام کر رہی تھیں یا روپیہ زیادہ مانگتی تھیں یا بمبئی سے باہر گئی ہوئی تھیں یا بہت موٹی ہو گئی تھیں یا بہت دبلی ہو گئی تھیں...... غرض مطلب یہ ہے کہ ایک نئی ناچنے والی کی تلاش تھی اور اس غرض سے یہ قافلہ روانہ ہونے والا تھا!

کم سے کم فلموں میں آپ نے ان نڈر اور جیوٹ شکاریوں کو دیکھا ہوگا جو افریقہ کے

جنگلوں میں شیر کے شکار کو جاتے ہیں۔ کس طرح کیل کانٹے سے درست ہو کر نکلتے ہیں! ایک کاندھے پر بندوق دوسرے پر رائفل، پیٹی میں چھرا، گلے میں دوربین لٹکی ہوئی، سر پر خوفناک قسم کا ٹوپ، پاؤں میں موٹے تلے کے اونچے اونچے بوٹ۔ بس کچھ اسی طرح سے فلم والے 'نئے چہروں' کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یونیفارم ذرا مختلف ہوتی ہے۔ تلوار بندوق کے بجائے جیبوں میں پارکر یا شیفر کے فاؤنٹن پین رکھے جاتے ہیں تاکہ شکار پھنستے ہی اس سے کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے جائیں۔ کارتوسوں کے بجائے سگریٹوں کے ڈبے ہوتے ہیں۔ بٹوے میں دو تین سو روپے والے نوٹ اور دس بارہ دس روپے والے نوٹ ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں جستجو اور دلوں میں کسی اچھے 'شکار' کے پھنسنے کی امید ہوتی ہے۔

جنگل میں شیر کے شکار کو جایے یا فوراس روڈ پر ایک 'نئے چہرہ' کی تلاش میں ایک 'گائیڈ' کی مدد لازمی ہے۔ 'گائیڈ' یعنی راہبر یعنی وہ معتبر انسان جو جنگل کے ہر راستے اور پگڈنڈی سے باخبر ہو، جو دور سے شکار کو سونگھ سکے اور جو جنگل کے ہر جانور کی عادات و خصلات، کمزوریوں اور چالاکیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ رام کشن کی موٹر فوراس روڈ کے جنگل (یا کہنا چاہیے جنگلوں) میں داخل ہی ہوئی تھی کہ نہ جانے کہاں سے ایسا ہی ایک انسان چلتی موٹر کے پائیدان پر ٹپک پڑا۔ اس کی ہیئت کذائی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس کا پیشہ کیا ہے۔

''کیوں صاحب۔ لڑکیاں دیکھنی ہیں؟ بالکل تحفہ مال ہے۔'' اور یہ کہہ کر اس انداز سے آنکھ ماری کہ مارے جھینپ کے رام کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ وہیل پھسل گیا اور روشنی کے کھمبے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ رام نے خیریت اسی میں سمجھی کہ موٹر روک کر بات کی جائے۔

''دیکھو میاں۔ ہمیں ایک ناچنے والی چاہیے، فلم کے لیے سمجھے۔ اچھی شکل ہو اور ناچتی بھی اچھا ہو۔''

''تو چلیے میرے ساتھ۔ عین آپ کے مطلب کی لڑکی آج ہی آئی ہے۔ ناچ میں سادھنا بوس اور آزوری کو مات کرتی ہے۔''

''مگر شکل وصورت کیسی ہے؟'' شکور نے جلدی سے پوچھا۔

''حور کا بچہ ہے صاحب۔ بس نسیم اور وینا کا مجموعہ سمجھ لیجیے۔''

ایک بدبودار زینے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے، کوٹھے پر پہنچے تو دیکھا کہ جس کو ہمارے گائیڈ صاحب 'حور کا بچہ' اور 'نسیم اور وینا' کا مجموعہ بتا رہے تھے وہ پھیکے شلجم کی رنگت کی کم از کم تیس سالہ طوائف تھی جو فلمی ناچوں کی بھدّی نقل اتار سکتی تھی۔ نام اب بھول گیا ہوں۔ شاید پریم لتا یا پریم بالا تھا۔ مگر یہ کہانی اس پریم لتا یا پریم بالا (یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا) کے متعلق نہیں ہے۔ نہ ان چھ موٹی دبلی کالی سانولی چیچک منہ داغ، پستہ قد، بلند قامت، ناچنے والیوں کے متعلق جن کے ہاں یکے بعد دیگرے ہمارا 'گائیڈ' ہمیں لے گیا۔ نہ آپ کو اس سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے ایک کوٹھے پر جو پہنچے تو میں نے دیکھا کہ طبلچی پانی پت کا ایک ڈوم ہے اور اس ڈر سے کہ یہ وہاں جا کر سب سے کہے گا۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر الٹے پیروں بھاگا اور اس سے بھی آپ کو کیا غرض کہ پان کی مختلف تھالیوں میں رام کشن کو تقریباً بیس پچیس روپے ڈالنے پڑے اور میں دل میں سوچتا رہا کہ اسٹوڈیو کا خزانچی اس رقم کو کس مد میں لکھے گا۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ بارہ بجے 'گائیڈ' صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی 'حور کے بچے' کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ ہمیں کسی ''مادھوری اور سلوچنا کے مجموعے'' میں دلچسپی ہے۔ مگر وہ بھی عجب لیچڑ انسان تھا۔ کہنے لگا ''اچھا اب میری خاطر ایک اور جگہ چلیے یہ بھی آپ کو ناپسند ہو تو جو چور کا حال سو میرا حال مگر کانگریس ہاؤس چلنا پڑے گا۔''

''کانگریس ہاؤس؟'' ہم سب نے ششدر ہو کر کہا، یا مظہر العجائب! کیا جب سے پولیس نے کانگریس ہاؤس پر قبضہ کیا ہے وہاں یہ سب حرکتیں ہوتی ہیں؟

'گائیڈ' نے ہماری حیرانی دور کرنے کے لیے کہا ''میرا مطلب یہ ہے کہ کانگریس ہاؤس کے پاس۔ کنیڈی برج کے نیچے۔''

وسنت داور کر کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اب زیادہ تلاش بے کار ہے۔ میں بھی کچھ اسی خیال کا تھا۔ مگر رام کشن کا سیٹ رکا ہوا تھا اور ناچنے والی نہ ملنے کی وجہ سے فلم مکمل ہونے میں دیر ہوئے جا رہی تھی۔ رہے شکور اور داؤ دتو وہ رات بھر چکر لگانے کو تیار تھے............ یا جب تک رام کشن کی جیب میں پان کی تھالیوں میں روپے...... موجود تھے!

''چلو بھئی۔ یہ بھی سہی۔ مگر اُس کے بعد سیدھے گھر واپس!! میں نے کہا اور ہماری موٹر

لیمنگٹن روڈ ہوتی ہوئی، کانگریس ہاؤس کے سامنے سے گزر کر ایک اندھیری گلی میں رک گئی۔

اونچی پانچ منزلہ عمارت تھی نئی بنی ہوئی۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ گھونگھرو بھی چھنک رہے تھے۔ دو چار فوجی بے تابانہ ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ایک ہوٹل کا ''باہر والا'' لپکا ہوا سوڈے کی بوتلیں لیے اوپر جا رہا تھا۔ کسی کمرے میں کوئی عورت بے تحاشا قہقہہ مار کر ہنسے جا رہی تھی، جیسے اس کو ہنسی کا دورہ پڑ رہا ہو۔ اس قہقہہ کی آواز کو چیرتی ہوئی کسی اور عورت کی چیخ سنائی دی۔ مگر فوراً ہی بجلی کی طرح ریل کی خوفناک گڑگڑاہٹ، قہقہے اور چیخ دونوں پر چھا گئی۔ جب ریل گزر گئی تو گھونگھرو بدستور چھنک رہے تھے، طبلہ بدستور کھڑک رہا تھا اور کوئی بے سری آواز گا رہی تھی 'ہماری گلی آنا' اور اس عرصہ میں ہم سب سیڑھیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ طے کر رہے تھے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی، جو کبھی نہ کبھی ضرور سفید رہی ہوگی۔ دیوار کے سہارے گاؤ تکیے لگے تھے ایک بوڑھے ملازم نے ''آیئے آیئے'' کہہ کر ہمارا استقبال کیا اور ہم جوتے اتار کر بیٹھ گئے مگر کمرہ خالی تھا۔ ایک کونے میں ہارمونیم کی پیٹی پڑی تھی، دوسرے میں طبلوں کی جوڑی۔ ایک میلے سے پردے کے پیچھے دوسرے کمرے میں جانے کا دروازہ تھا۔ ہمارا 'گائیڈ' بے تکلفی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر میں وہاں سے پان کھاتا ہوا آیا۔

''باہر گئی ہوئی ہے مگر ابھی آتی ہے۔ بس پانچ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔''

بوڑھا ملازم جس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی تھی اور جس کی آنکھوں میں کچھ عجیب افسردگی تھی، پانوں کی تھالی لے کر آیا اور ہمارے سامنے رکھ دی اور پھر چپ چاپ چلا گیا۔

شکور نے کہا۔ ''یار کچھ عجیب ماحول ہے یہاں تو؟''

میں نے کہا ''ہاں جیسے اس میلے پردے کے پیچھے کوئی پراسرار راز ہو۔''

داؤد نے کہا ''یا کوئی ٹریجڈی ہو۔''

رام کشن نے کہا ''تم سب پاگل ہو۔''

شکور نے کہا ''اس بوڑھے ملازم ہی کو دیکھو۔ اس کی آنکھیں......''

''دیکھنے آئی ہیں۔'' رام کشن نے فقرہ پورا کیا۔

وسنت نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ''ساڑھے بارہ بجنے کو آئے۔ اب چلنا چاہیے۔ آخر کب تک انتظار کریں گے؟''

میں بھی اس کی تائید کرنے ہی والا تھا کہ پردے کے پیچھے ایک شخص برآمد ہوا۔ اور اس کے آتے ہی کمرے کی ساکت فضا میں ہلچل مچ گئی۔ اس شخص کا حلیہ تو معمولی تھا۔ درمیانہ قد گہرا سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی مگر چمکیلی آنکھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ موٹی موٹی فوجی قسم کی مونچھیں۔ لمبے گھونگر والے بال جو تیل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بدن پر ایک لمبا سا تہبند اور لمبی دھاری دار سلک کی قمیض۔ مگر اس کی گفتگو کا طریقہ کچھ عجیب تھا۔ جیسے مشین گن چل رہی ہو۔ اس طرح الفاظ کی گولیاں اس کے منہ سے چھوٹتی تھیں۔ میں نے چرب زبان دکاندار بھی دیکھے ہیں اور فلم کے پبلسٹی والوں سے بھی میرا سابقہ پڑتا رہتا ہے مگر ان حضرت کے سامنے وہ سب ہیچ تھے۔

''آداب عرض۔ آداب عرض۔ نمستے۔ بندگی۔ تشریف رکھیے۔ فرمایئے کیا خاطر کی جائے؟ وہسکی برانڈی جو کہیے حاضر ہے۔ یا بیئر کا شوق ہو تو وہ منگوائی جائے۔ آپ نہیں پیتے؟ خیر۔ تو کچھ ٹھنڈا کچھ گرم۔ ارے او مسیتا..........'' اور جب افسردہ آنکھوں والا بوڑھا آیا تو اس سے ''ذرا پانچ لیمن تو لے آ۔ برف ڈلوا کر۔'' اور ہم سے مخاطب ہوکر'' آپ چندرا کا ناچ دیکھنے آئے ہیں نا؟ معاف کیجیے انتظار کرنا پڑا۔ بات یہ ہے کہ ابھی ابھی پولیس کلب میں ڈانس کر کے آ رہی ہے۔ بڑی تالیاں بجیں۔ خود پولس کمشنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہار پہنایا۔ پورے تین گھنٹے ڈانس کرتی رہی۔ اب بھی بڑی مشکل سے چھٹکارا پاکے آ رہے ہیں ورنہ وہ لوگ کب آنے دیتے تھے۔ پچھلے ہفتے ریڈیو کلب میں ڈانس کیا تھا۔ وہاں کوئی ہالی ووڈ کا ڈائرکٹر آیا ہوا تھا کہنے لگا، میڈم چندرا ہم تم کو ہالی ووڈ لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ تو آج کل جنگ کی وجہ سے جہازوں کا آنا جانا رکا ہوا ہے ورنہ سب معاملہ طے ہو چکا تھا۔ یہ سب تو اخباروں میں بھی آ چکا ہے۔ آپ نے تو پڑھا ہوگا؟''

یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں اخبار نویس ہوں۔ اس لیے جھوٹ مجھے ہی بولنا پڑا۔ ''جی ہاں۔ یہ خبر تو سارے اخباروں میں آ چکی ہے۔''

اتنے میں ایک عدد سیٹھ صاحب جو نشے میں چور تھے اور دو عدد ان کے ساتھی داخل ہوئے۔" چندرا ادھر رہتا ہے؟" سیٹھ صاحب نے فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ہم چندرا کا ڈانس دیکھنے مانگتا۔

مشین گن پھر چل پڑی" آیے۔آیے۔سیٹھ صاحب۔بندگی۔نمستے ادھر تکیے سے لگ کر بیٹھیے۔چندرا کی تو قسمت جاگ اٹھی ہے آج کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ابھی حاضر ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈانس تھا۔وہاں سے ابھی ابھی چلی آرہی ہے۔سرکاری معاملہ۔انکار بھی نہیں کر سکتے۔مگر سچ بات یہ ہے کہ یہ انگریز لوگ آرٹ کی قدردانی بھی خوب کرتے ہیں۔خود گورنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہار پہنایا۔جی ہاں اپنے ہاتھ سے.........."

وغیرہ وغیرہ۔مشین گن چلتی رہی اور ہم سب حیرت سے اس کا منہ تکتے رہے اور داؤد نے میرے کان میں کہا"اس بار کوئی آیا تو معاملہ بادشاہ سلامت تک پہنچ جائے گا۔"

"آؤ بیٹی آؤ۔" میلے پردہ کو ایک جنبش ہوئی اور چندرا داخل ہوئی پیچھے پیچھے لمبی قلموں، باریک مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا نوجوان سفید قمیض اور پتلون میں تھا۔

چندرا!! اگر آپ اس انتظار میں ہیں کہ میں اس کا بیان کچھ اس انداز سے کروں کہ "پردہ کو ایک جنبش ہوئی اور کمرے میں ایک بجلی کوند گئی۔ایک شعلۂ جوالہ رقص کرتا ہوا آ کھڑا ہوا۔چندرا ایک عورت نہیں تھی وہ حسن و جوانی کا پیکر تھی۔کیلوپیٹرا کا بے پناہ حسن، نور جہاں کی نزاکت، سیتا کی معصومیت، اُس میں کیا کچھ نہ تھا۔" تو آپ کو مایوس ہونا پڑے گا۔چندرا کو کسی طرح سے حسن کا پیکر نہ کہا جا سکتا تھا۔باوجود پاؤڈر کے سانولی رنگت کھڑا نقشہ، بھاری ناک، نزاکت کے بجائے اس کی ساخت میں ایک قسم کی کرختگی تھی اور معصومیت کے بجائے ایک خاص قسم کا پکا پن جو اس طبقے میں پایا جاتا ہے۔پھر بھی وہ تھی جوان۔شباب کا خمیر اس کے بدن میں ضرور تھا۔عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس کی ہوگی مگر وہ اس پودے کے مانند تھی جس کو پوری نشو ونما سے پہلے ہی زمین میں سے اکھاڑ کر ایک گملے میں لگا کر بند کمرے میں رکھ دیا گیا ہو۔اس میں جوانی کا رنگ تھا، جوانی کی بو باس تھی مگر جوانی کی تازگی اور شگفتگی نہیں تھی۔

چندرا سب کو سلام کر کے ایک بناوٹی حیا کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئی۔اب سیٹھ صاحب کو ہوش

آیا، کچھ دیر اپنی آنکھیں اس پر گاڑنے کے بعد بولے" تم چندرا؟ نا ئیں۔ تم چندرا نا ئیں۔"

چندرا بناؤٹی شرم کو فی الحال بالائے طاق رکھ کر بناؤٹی ہلسی ہنس پڑی۔ مشین گن کو پھر موقع مل گیا۔

"آپ بھی بڑے پر مذاق آدمی ہیں، سیٹھ صاحب۔ مگر اکثر لوگ اسے نہیں پہچانتے۔ تعجب کرتے ہیں کہ سولہ برس کی عمر میں ناچ میں اتنا کمال کوئی کیسے حاصل کرسکتا ہے؟ آج ہی پولس کمشنر صاحب.......... میرا مطلب ہے گورنر صاحب کے سامنے تھالی کے کنارے پر ڈانس کر کے آئی ہے۔ دنگ رہ گئے سب؟"

"تھالی کے کنارے پر ڈانس؟ کمال! کمال!" سیٹھ صاحب چہکے۔

"اجی جناب تھالی کے کنارے پر کیا تلوار کی دھار پر ڈانس کراؤ اس سے۔" اور پھر چلایا" مسیتا۔ مسیتا...... ذرا وہ تلوار تو لے آنا۔"

مسیتا جب تلوار لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں افسردگی ہی نہیں بلکہ پریشانی بھی تھی۔ پریشانی سے بھی زیادہ۔ جیسے کوئی بکرا قصائی کے لیے خود چھرا لیے چلا آرہا ہو۔ تلوار میان سے نکالی گئی تو اس کی چمکیلی دھار دیکھ کر سب دم بخود ہو گئے۔ کیا یہ لڑکی سچ مچ اس پل صراط پر قدم دھر سکے گی؟"

"دیکھا آپ نے۔ ایک دن اسی تلوار کی دھار پر ڈانس کر کے آپ کو دکھائے گی۔" اور پھر میان میں واپس رکھتے ہوئے" مگر آج نہیں اس کے لیے تو ایک بڑا جلسہ کرنا پڑے گا۔ ڈانس کے بڑے بڑے استاد آئیں گے۔ کیا عجب ہے خود گورنر صاحب بہادر — میرا مطلب ہے پولس کمشنر صاحب — بھی قدم رنجہ فرمائیں۔ اور پھر مسیتا سے "لو یہ اندر رکھ آؤ۔" نہ جانے کیوں میری نظر پھر بوڑھے ملازم کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی بدستور تھی مگر ہلکی سی جھلک اطمینان کی بھی۔ جیسے قصائی نے بکرے کو ذبح کرنا ملتوی کر دیا ہو۔ بکرے کی آنکھوں میں پھر زندگی کی امید آ گئی ہو یا یہ سب میرے دماغ کی خیال آرائی تھی؟

سب کی فرمائش پر چندرا نے ناچنا شروع کیا۔ یہ تو فوراً معلوم ہو گیا کہ بے چاری نے اس فن کی کوئی تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ اس کے رقص میں آرٹ نہ تکنیک۔ نہ کوئی مدرا درست تھا نہ پاؤں

کے توڑے۔ گھونگھروؤں کی جھنکار اکثر بے سری ہو جاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ تھی پیدائشی رقاصہ۔ اس کے بدن میں ایک عجیب دلفریب لچک تھی۔ اور وہ ہر جذبے کو اپنی آنکھوں سے ظاہر کر سکتی تھی۔ اس کے قدموں کی ٹھوکر میں ایک والہانہ پن تھا۔ ایک قدرتی امنگ۔ اس کی آواز سریلی نہ تھی مگر بری بھی نہ تھی۔ اور فلمی گیتوں کی نقل کرنے میں وہ کمال رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی اداؤں میں ایک عامیانہ بے تکلفی، ایک بازاری پن تھا جو اکثر فلمی ناچوں کی مقبولیت کا راز ہوتا ہے۔ رام کشن کو اپنی فلم کے لیے ایسی ہی ناچنے والی کی ضرورت تھی۔

''کیوں کیا خیال ہے؟'' رام نے داؤد پریلی سے دھیمی آواز میں پوچھا؟

'چلے گی۔؟'

''تم کیا کہتے ہو؟'' خطاب مجھ سے تھا۔ میں ان معاملات میں داؤد کو استاد مانتا ہوں اس لیے میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

چندرا گا رہی تھی۔ ''چولی نیلی رنگا دو سیاں۔'' نہ جانے ان کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے گروہ کا سردار رام کشن ہے۔ بار بار ان کے پاس جا کر گاتی تھی، آنکھ مارتی تھی، انداز دکھاتی تھی اور سیٹھ صاحب تھے کہ دیکھ دیکھ کر جل رہے تھے۔ ایک دفعہ اس نے رام کے پاس آ کر جب ''چولی نیلی رنگا دو سیاں۔'' کہا تو رام سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا ''تم آؤ تو میری جان۔ چولی بھی رنگا دیں گے اور لہنگا بھی! جس پر بڑا قہقہہ پڑا مگر سیٹھ صاحب نہیں ہنسے۔

ناچ ختم کر کے چندرا نے پان تقسیم کیے اور تھالی میں پندرہ بیس روپے جمع ہو گئے۔ سیٹھ صاحب کے پاس گئی تو انھوں نے فرمایا ''اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔'' چندرا نے ناز سے گلوری اٹھائی اور سیٹھ صاحب کے منہ میں رکھ دی جس پر تھالی میں دس روپے کا اور اضافہ ہو گیا۔ مگر سیٹھ صاحب اتنے الطاف پر اکتفا کرنے والے نہ تھے۔ ہاتھ پکڑ کر چندرا کو بٹھا لیا اور نشہ سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے ''یہاں بیٹھو میری جان، ابھی جوان ہو جوانوں کے پاس جاتی ہو۔ ہمارے پاس آتی گھبراتی ہو۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی چندرا۔'' اور ایک خوفناک قہقہہ لگا کر چلاّ تا ''چندرا نائیں۔ تم چندرا نائیں۔''

میں گھبرایا کہ اب کوئی جھگڑا کھڑا ہوگا اور اگر کسی چیز سے میں دور رہنا چاہتا ہوں تو وہ

شرابیوں کی دھینگا مشتی ہے۔ مگر چندرا کا جواب سن کر میں دنگ رہ گیا اور مدہوش سیٹھ لاجواب۔ وہ بولی" سیٹھ صاحب جو جوان ہے وہ بوڑھا ضرور ہوگا اور جو بوڑھا ہے وہ ایک روز ضرور مرجائے گا۔ نہ موت کے ڈر سے کچھ حاصل ہے، نہ بڑھاپے کے خوف سے۔" اور پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں کی چمک میں ایک افسردہ گہرائی دیکھی اور اس کی آواز میں ایک عجیب تلخی محسوس کی جو بازاری بات چیت کی نقلی مٹھاس سے کہیں بہتر تھی۔ سیٹھ صاحب نے نشے میں کچھ سنا اور کچھ نہ سنا مگر ان کا تجربہ کار ہاتھ آپ سے آپ چندرا کی گداز برہنہ بانھوں پر پہنچ گیا۔ چندرا وہاں سے سرک کر دور بیٹھ گئی۔

"جھینپتی ہو؟" اور پھر سیٹھ صاحب نے ایک خوفناک قہقہہ مارا۔ میری جان جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں کا کیا ڈر؟" اور پھر نہ جانے کیوں میری طرف پلٹ پڑے" کیوں مسٹر تم کیا کہتے ہو؟"

میرا جی نہ چاہتا تھا کہ کچھ جواب دوں۔ کون شرابی کے منہ لگے! مگر وہ بندۂ خدا میرے پیچھے ہی پڑ گیا۔ "بولو مسٹر کیا رائے ہے تمہاری؟"

"ٹھیک فرماتے ہیں سیٹھ صاحب آپ۔" میں نے تنگ آ کر اسے ٹالنے کے لیے الل ٹپ جواب دیا" اگر کوئی چلتی ہوئی مشین میں ہاتھ ڈالے گا تو ضرور ہاتھ کٹ جائے گا۔"

"جی ہاں۔" چندرا کی آواز سن کر میں چونکا" جی ہاں اگر پاؤں ڈالے گا تو پاؤں کٹ جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے بلا تکلف لہنگے کو ٹخنوں سے اوپر اٹھالیا۔ جہاں گھونگرو چمڑے کے تسموں سے کسے ہوئے تھے وہاں زخم پڑ گئے تھے۔ مرہم کے پھائے لگے تھے اور ایک ٹخنے پر پٹی بھی بندھی تھی۔

سیٹھ صاحب اشارہ پا کر تہبند والے آدمی کے ساتھ دوسرے کمرے میں کوئی کاروباری گفتگو کرنے چلے گئے۔ اب ان پتلی مونچھوں والے جوان صاحب کو بات کرنے کا موقع ملا۔ نہایت بے تکلفی سے بولے:"چندرا کچھ معلوم بھی ہے یہ صاحب کون ہیں؟ یہ ہیں ہمارے مشہور ڈائریکٹر رام کشن صاحب، جنھوں نے 'نیا مجنوں' اور 'کالی شلوار' جیسی فلم بناتی ہیں۔"

رام بیچارے کا سب بھانڈا پھوٹ گیا۔ حالانکہ اس نے 'گائیڈ' سے صاف صاف کہہ دیا تھا یہ ہرگز نہ ظاہر کیا جائے کہ ہم کسی فلم کمپنی کی طرف سے آئے ہیں۔ مگر اب تو مجبوری تھی اور سب کا

بھی تعارف کرانا پڑا۔ جب میری باری آئی تو رام نے اپنا بدلہ مجھ پر اتارنے کے لیے خوب بڑھا چڑھا کر تعریف کی اور کہا ''ان کے مضمون اور کہانیاں تو آپ نے اخباروں رسالوں میں ضرور پڑھی ہوں گی۔'' اور چندرا نے صاف جھوٹ بولا ''جی ہاں کیوں نہیں'' اور پھر انداز سے منہ بنا کر ''ہم پر بھی ایک کہانی لکھ دیجیے نا۔''

مگر پتلی مونچھوں والے صاحب گفتگو کا رخ اپنی جانب موڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ رام صاحب۔ خاکسار کو امرت ٹھاکر کہتے ہیں۔ میں بھی آپ کی طرح یو پی ہی کا رہنے والا ہوں اور اب تو آپ کی دعا سے ہم پیشہ بھی ہوں۔''

''جی...............آپ بھی...............؟''

''جی ہاں میں بھی اس ڈائرکشن لائن میں ہوں۔ پہلے فلم کا سینریو لکھ رہا ہوں۔ کبھی فرصت ہو تو سنئے اور مشورہ دیجیے۔''

''کون سی کمپنی میں ہیں آپ؟''

''کام تو بہت سی کمپنیوں میں کیا ہے۔ پربھات۔ بمبئی ٹاکیز۔ پرکاش ابھی کچھ دنوں سے موہن میں تھا۔ اب نئی کمپنی کھولی ہے۔ اس کے لائسنس کا انتظار ہے۔''

''کہئے۔ کیا کاسٹ لے رہے ہیں؟ ذرا ہم غریبوں کا بھی خیال رہے۔'' داؤد کو ٹھاکر صاحب کی ٹانگ کھینچنے کا موقعہ ملا تو وہ کیا چوکنے والا تھا۔

''کاسٹ میں مس چندرا تو ہوں گی ہی۔ ویسے MALE LEAD کے لیے سوچ رہا ہوں موتی لال کو لوں یا پرتھوی راج کو۔ ابھی طے نہیں کیا۔''

''آپ خود کیوں نہیں ہیرو کا پارٹ کر لیتے؟'' شکور کم بولتا ہے مگر جب زبان کھولتا ہے تو نشانہ خطا نہیں جاتا۔

ممکن ہے بات آگے بڑھتی مگر اسی وقت سیٹھ صاحب تہبند والے صاحب کے ساتھ باہر آگئے۔

''بیٹی۔ سیٹھ صاحب کو نمسکار کرو۔ وہ جا رہے ہیں۔''

''اچھا چندرا ہم جائیں گا۔ کل رات کو آئیں گا۔ بھولنا مت۔'' یہ کہہ کر سیٹھ صاحب نے

نہایت اطمینان سے چندرا کے گالوں کو کھینچا اور اپنے ساتھیوں کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے چل دیے۔

'مسیتا ابا۔'' چندرا نے آواز دی'' ذرا ایک گلاس پانی دینا'' مسیتا ابا! اور ابا پر اس قدر پیار بھرا زور۔ افسردہ آنکھوں والا بوڑھا ملازم کمرے سے باہر گیا ہی تھا کہ مشین گن پھر چل پڑی۔ بڑا پرانا ملازم ہے ہمارا۔ بچپن میں چندرا کو گود کھلایا ہے اس لیے مسیتا ابا مسیتا ابا ہی کہتی ہے۔'' اور پھر موضوع بدلنے کے لیے' کہیئے ڈائریکٹر صاحب کیا حکم ہے؟''

رام کشن نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ دی۔'' اپنی بیٹی کے فلم میں کام کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟''

''اجی کام کا تو اس کو بڑا شوق ہے اور یوں ٹرائیل کے طور پر موہن پکچرز کی فلم 'ایرانی حور' میں سائیڈ ہیروئن کا کام بھی کر چکی ہے۔ مگر میں نے طے کر لیا ہے کہ ہیروئن رول ہی ملے گا تب ہی بھیجوں گا۔''

''ہیروئن رول؟'' رام کشن نے زور دیتے ہوئے الفاظ دہرایا۔''

''جی ہاں۔'' اور پھر کچھ گھبرا کر کہ ایسا نہ ہو موقعہ ہاتھ سے نکل جائے۔'' مگر یہ تو اوروں کے لیے ہے۔ آپ جیسے قابل ڈائریکٹر کے ہاں تو کوئی اور کام مل جائے تو کافی ہے۔''

''تو دیکھئے کوئی کام نکلا تو میں پروڈکشن منیجر کو بھیج دوں گا۔ رام کشن جانتا تھا کہ روپے پیسے کی بات چیت کرنا اس کے بس کا کام نہیں ہے۔'' اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔''

وہ سین مجھے ہو بہو اب تک یاد ہے۔ ہم اٹھنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ دروازے میں ایک نوجوان پھولوں کی ٹوکری لیے نظر آیا۔ بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ خاصا خوش شکل بھی تھا۔ ٹوکری میں ہار، گلدستے اور بالوں میں لگانے کے ہلال نما گجرے جو 'وینی' کہلاتے ہیں۔ چندرا پاؤں پسارے آدھی بیٹھی اور آدھی لیٹی تھی۔ ایک لمحے کے لیے پھول والا نوجوان اس کو دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔ پھر گا کر بولا'' بابو پھول والا آیا۔ ہار اور گجرے اعلیٰ لایا۔''

چندرا نے تنک کر کہا'' کچھ نہیں چاہیے۔''

''ایک وینی ہی لے لیجیے، بالوں کے لیے''

'دیکھتا نہیں پہلے ہی لگی ہے' اور چندرا نے اپنے جوڑے کو پیار سے تھپکی دی جہاں پھولوں کا نیم دائرہ بالوں کے گرد لگا ہوا تھا۔

''تو پھر پاؤں ہی میں باندھ لیجیے۔'' اور یہ کہہ کر چشم زدن میں اس نے ٹوکری زمین پر رکھی اور اس میں سے سب سے اچھی 'وینی' چھانٹ کر چندرا کے ٹخنے پر پازیب کی طرح باندھ دی۔ روزانہ ناچنے کی مشق نے اس کے ٹخنوں کو بڑا سڈول اور خوشنما بنا دیا تھا۔ اس کے گرد پھولوں کے گجرے نے ایک عجیب مگر دلکش کیفیت پیدا کر دی۔ پھول والے کی یہ حرکت اس قدر بے ساختہ اور بھولی تھی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور وہ خود کھسیانہ ہو کر چل دیا۔ چندرا چلاّتی رہی 'پیسے تو لے جا۔''

خیر ہم چلے آئے۔ واپسی پر راستے میں حسب معمول فقرے چلتے رہے۔

''بھئی اس لڑکی کے تین ابا نکلے۔'' رام کشن نے کہا ''دلال ابا۔ مستا ابا۔ ڈائریکٹر ابا۔''

داؤد فوراً 'مادری' زبان پر اتر آیا ''اور تینوں کے تینوں......''

''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ چندرا ہے کس کی بیٹی؟'' میں نے سوال کیا۔

طوائف کی بیٹی صرف اپنی ماں کی بیٹی ہوتی ہے۔ شکور نے فوراً اپنا فلسفیانہ فیصلہ دیا۔

''میرے خیال میں مستا کے نطفے سے ہے جو چندرا کی ماں کا ملازم رہا ہوگا اور بیٹی کے خیال سے پڑا ہوا ہے۔''

''تو دلال ابا سے کیا رشتہ داری ہے؟'' ہم لوگ گویا جاسوسی ناول میں قاتل کا سراغ لگا رہے تھے۔

''معلوم ہوتا ہے دلال ابا نے چندرا کی ماں سے شادی کر لی ہے تاکہ بیٹی کی آمدنی پر قانونی حق ہو جائے۔''

''اور ڈائریکٹر ابا؟''

''یہ ایک فلم زدہ نوجوان معلوم ہوتا ہے جو اس تاک میں ہے کہ چندرا کے سہارے ڈائرکشن مل جائے۔ جانتے نہیں ہو کتنے ہی گدھے ایک جاذب نظر لڑکی کے طفیل ڈائریکٹر بن جاتے ہیں۔ دلال ابا ٹھاکر کو اس لیے شہ دے رہے ہیں کہ چندرا کو کسی فلم میں ہیروئن کا رول مل

جائے، روپیہ چاہے سیٹھ کی جیب سے آئے یا کسی فلم اسٹوڈیو کی تجوری میں سے، بہر حال دلال لبا کی جیب میں جانے والا ہے۔"

معاملہ بالکل صاف اور سیدھا تھا۔ چندرا شیرے کا ایک قطرہ تھی جس پر بھن بھن کرتی ہوئی زہریلی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ چندرا کا جسم روپیہ بنانے کی ایک مشین تھا، جس پر ہر شخص قبضہ کرنے کی تاک میں تھا۔ مگر خود چندرا کیا تھی؟ یا وہ صرف ایک طوائف زادی تھی جو بچپن سے اس پیشے کے لیے ہی تیار کی گئی تھی—— چندرا۔ دلال لبا۔ مسجا۔ امرت ٹھاکر شرابی سیٹھ—— ان سب کے کردار، ان سب کے اغراض و مقاصد کھلے ہوئے تھے۔ جسم فروشی کی اس دنیا میں ان سب کی ایک جگہ تھی۔ لالچ اور شہوانیت کے اس ڈرامے میں وہ سب اہم کردار کر رہے تھے۔ مگر وہ پھول والا اور اس کی معصوم حرکت...... ان کا تعلق اس دنیا، اس ڈرامہ، سے کیا تھا؟

اس رات کو دیر تک میرے دماغ میں ایک تصویر گھومتی رہی۔ پیر پیارے ہوئے چندرا اور اس کے پاؤں میں پھولوں کی پازیب۔ پاؤں میں پھول! پاؤں میں پھول!! پھول اور پاؤں۔ پاؤں اور پھول ایک دلفریب نقش۔ ایک بلیغ اور جامع اشارہ۔ ایک معنی خیز نشان مگر کس اصلیت کا نشان؟ کس طرف اشارہ؟ کئی گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد بھی میرا دماغ اس معمے کو حل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میں سو گیا اور اگلے دن جب اٹھا تو پچھلی رات کے نقوش اتنے مدھم پڑ چکے تھے کہ روزانہ کے معمول میں چندرا یا اس نامعلوم پھول والے کا خیال بھی نہ کر سکا اور یوں کئی مہینے گزر گئے۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ شروع ہوتی ہے۔ چندرا نے رام کشن کی فلم میں ناچا جس کا معاوضہ اس کو پانچ سو روپے دیا گیا۔ میں نے یہ ناچ صرف اس وقت دیکھا جب فلم تیار ہو گئی۔ ناچ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر بعد میں سنا کہ عوام نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی وجہ سے چندرا کو کئی فلموں میں کام ملا۔

"دلال لبا" نے کئی بار رام کشن کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی مگر وہ ایک دفعہ بھی نہ گیا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے نہ چندرا سے ملنے کا کوئی موقعہ درپیش آیا اور نہ کبھی مجھے اس کا خیال آیا مگر ایک دن پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ارے بھائی میں ہوں رام کشن۔"

''کہو کیا بات ہے؟''

''شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر ہو جانا۔ تم سے کچھ کام ہے۔''

خیر صاحب دفتر سے فارغ ہو کر رام کشن کے فلیٹ پر پہنچا وہ اکیلا ہی تھا۔ کہنے لگا۔ ''دیکھو بھائی ایک کہانی چاہیے۔ اپنی اگلی فلم کے لیے۔

میں نے کہا ''تو پھر ذدے صاحب سے بات کرو۔ اگر وہ مصروف ہیں تو کمال امروہوی، آغا جانی، دیوان شرر، مدھوک درجنوں کہانی لکھنے والے موجود ہیں۔''

اس نے کہا ''مگر مجھے تو کوئی نئی چیز چاہیے، وہ تم ہی دے سکتے ہو۔''

اگر تمھارا مطلب 'نیا' یا 'نئی' کے نام سے ہے تو وہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ نیا ترانہ، نیا زمانہ، نئی دنیا، نئی زندگی، نئی روشنی، اب ایک ہی نیا نام رہ گیا ہے۔ نیا پرانا۔

''نہیں۔ مجھے نیا یا نئی کا نام نہیں چاہیے۔ نئی قسم کی کہانی چاہیے ایسی کہانی جس کے قدم زندگی کی اصلیت میں گڑے ہوئے ہوں۔''

میرا خیال ہے کہ ہر شخص کے دماغ کے کسی کونے میں ایک چھوٹا سا ہمزاد بیٹھا رہتا ہے جو وقت بے وقت کان میں کچھ کھس پس کر دیتا ہے۔ اسی کو 'آمد' یا تخلیقی تحریک کہتے ہیں۔ میرا یہ بھی تجربہ ہے کہ یہ ہمزاد پڑا سوتا رہتا ہے جب تک کوئی اقتصادی ضرورت اس کو کچوکے دے کر نہ اٹھائے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں میری مالی حالت خراب تھی۔ مہنگائی نے کمر توڑ رکھی تھی۔ دفتر کے 180 روپے ماہوار پر کیسے گذارہ ہوتا؟ مگر کہانی بک جائے تو کئی ہزار مل سکتے ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب رام کشن نے ایک نئی قسم کی کہانی لکھنے کو کہا تو میرے ہمزاد نے ایک عورت کی آواز بنا کر میرے کان میں کہا ''ہم پر بھی ایک کہانی لکھ دیجیے نا۔''

میں نے فوراً رام کشن سے کہا ''تو سنو ایک کہانی پنجاب کے کسی شہر میں ایک طوائف رہتی تھی۔ اس کے ناچ گانے کا دور دور شہرہ تھا۔ (دیکھا تم نے ناچ گانے کا انتظام فوراً ہو گیا) ہاں تو اس طوائف کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس پر بڑا جشن منایا گیا۔ کیونکہ بیٹی ہی تو طوائف کا وہ خزانہ ہوتی ہے جو بڑھاپے میں اس کے کام آتا ہے۔ طوائف نے اپنی بیٹی کو بڑے ناز و نعم سے پالا۔ ناچ گانا بھی سکھایا اور پڑھنا لکھنا بھی۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ بڑی ہو کر اس کی بیٹی کو یہ

پیشہ نہ کرنا پڑے بلکہ کسی شریف گھرانے میں اس کی شادی ہو جائے۔ اسی لالچ میں اس نے ایک سفید پوش آدمی سے خود شادی کر لی جو دراصل چھٹا ہوا بدمعاش تھا اور جو خود طوائف کی بیٹی کو ذریعہ آمدنی بنانا چاہتا تھا۔ جب بیٹی جوان ہوئی تو وہ بمبئی آیا۔ بیوی کو مکان لے کر الگ رکھا اور بیٹی کو بازار حسن میں ایک کوٹھے پر۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے فلموں میں کام کرائے اور ساتھ میں پیشہ بھی اور ساری آمدنی پر خود قبضہ کرے مگر اس عرصے میں لڑکی کو ایک پھول بیچنے والے نوجوان سے اصلی محبت ہو گئی—

''اور اس کہانی کا نام ہے چندرا؟'' رام کشن نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں۔ چندرا نہیں۔ پاؤں میں پھول۔'

'اچھا آگے کہو۔''

''ہاں تو اس لڑکی کو پھول والے نوجوان سے از حد محبت ہو گئی وہ اپنی زندگی سے متنفر تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ شادی کر کے غریبانہ مگر شریفانہ زندگی بسر کرے گی۔ (دیکھا کس طرح گناہ پر پاکبازی غلبہ پاتی ہے) مگر اس کے سوتیلے باپ کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس لڑکی کی خوشامد کی، اس کو دھمکیاں دیں، لالچ دیا کہ وہ ایسا قدم اٹھانے سے باز رہے لیکن لڑکی کی محبت پکی اور سچی تھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس پر اس کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر لڑکی کی ماں کی مدد سے پھول والے نے اس کو پیغام بھیجا کہ وہ رات کو اسے بھگا کر لے جائے گا۔ آخری وقت پر سوتیلے باپ کو بھی یہ معلوم ہو گیا..........''

''پھر کیا ہوا؟'' رام کشن نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر کیا ہوا؟ پھر کیا ہو؟................ یہ ابھی نہیں معلوم..........کل بتاؤں گا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہانی خوب ہے، دوست۔ اگر اس کا انجام بڑھیا بنالاؤ تو چار ہزار دلوائے دیتا ہوں۔''

چار ہزار کا لالچ بھی کتنا زبردست ہوتا ہے! میں فوراً ٹیکسی لے کر دن دہاڑے اس بدنام گلی میں پہنچا۔ کونے پر ایک پھول والے کی دکان تھی۔ میں نے اس سے پوچھا: ''کیوں'' میاں یہاں ایک بابو پھول والا ہوا کرتا تھا۔ کہاں ہے اس کی دکان؟'' بوڑھے پھول والے نے کہا ''اجی صاحب

اس کی دکان یہی تھی جہاں میں بیٹھا ہوں۔ مگر وہ اب بابو پھول والا نہیں رہا، مجنوں پھول والا ہو گیا ہے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے ایک معنی خیز نگاہ اس عمارت پر ڈالی جہاں چندرا رہتی تھی۔

''کہانی کی ایک کڑی تو ٹھیک بیٹھی۔'' یہ سوچ کر میں نے خواہ مخواہ آٹھ آنے کا ایک گلدستہ بنوالیا تاکہ پھول والے سے اور بات چیت کر سکوں۔''

''وہ سامنے ہی رہتی ہے سالی، چندرا۔ چندرا کہتے ہیں دِسے (اسے)۔'' وہ گلدستہ بناتا جارہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ''اچھے خاصے لمڈے (لونڈے) کو پاگل بنا دیا۔ ان حرامجادیوں (حرام زادیوں) کا کیا ہے۔ آج یہ تو کل وہ مگر وہ بابو کہیں کا نہیں رہا۔ دوکان بھی چھوڑ دی۔ جو کچھ جمع جوڑ تھا سب اس لمڈیا (لونڈیا) کے پیچھے اڑا دیا.........لو جی گلدستہ بھی تحفہ بنا دیا ہے۔''

اب کوئی بہانہ بات کرنے کا نہ رہا۔ میں گلدستہ ہاتھ میں لیے چندرا کے مکان پر پہنچا اور سیڑھیوں کا لامتناہی سلسلہ طے کرتا ہوا اوپر چلا۔ دن کو ساری عمارت سنسان تھی۔ میں نے پانچویں منزل پر جا کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اسی افسردہ آنکھوں والے بوڑھے مسیتا نے دروازہ کھولا اور میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں افسردگی کے ساتھ وحشت اور غم کی بھی جھلک تھی۔

''چندرا ہے گھر پر؟''

میں نے سیدھا سادھا سوال کیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مسیتا پریشان سا ہو گیا۔ ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آواز دھیمی کر کے کہا ''چندرا تو باٹلی والا اسپتال میں ہے۔ بڑی بیمار.........'' ابھی وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اندر سے ''دلال ابا'' نکل آیا اور مسیتا دم بخود ہو گیا۔ میں سمجھا کہ آؤ بھگت کی مشین فوراً چالو کر دی جائے گی۔ مگر میں اس کا حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں میں لال ڈورے، میلے تہبند پر ایک جیکٹ بنیان اور بجائے روغنی چاپلوسی کے نہایت بدتمیزی کا لہجہ۔ ''او مسٹر۔ کیا ہے؟ چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' اور پھر مسیتا سے ''کیا کھسر پسر کر رہا تھا؟ چل اندر حرامزادے'' وہ بیچارہ تو اندر چلا گیا مگر خونیں آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں تھا۔

''پولیس! تم پولیس کے آدمی ہو مگر یہ مت بھولو کہ میں کون ہوں۔ میں پولس کمشنر صاحب کا دوست ہوں۔ دوست۔''

''پولیس؟'' میں نے حیرت سے کہا'' تم کیا بک رہے ہو؟''

''ہاں۔ہاں۔تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔میری چندرا نے پولیس کلب میں ڈانس کیا تھا۔خود گورنر صاحب نے اس کے گلے میں ہار ڈالا تھا سمجھے۔'' یہ کہہ کر اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس کا مطلب کچھ نہ سمجھا مگر اسی شام کو ملاقاتیوں کے اوقات پر باٹلی والا ہسپتال پہنچا۔ بڑی مشکل سے چندرا کا پتہ ملا۔ جب میں اس کے پلنگ کے قریب گیا تو دیکھا کہ وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے ہوئے لیٹی ہے،صرف چہرہ کھلا ہوا تھا مگر اس پر اتنی زردی چھائی ہوئی تھی کہ چند لمحوں کے لیے تو میں سمجھا کہ وہ مرگئی ہے۔مگر میری آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ میں کرسی نزدیک سرکا کر بیٹھ گیا اور گلدستہ اس کے تکیے پر رکھ دیا۔چندرا نے میری طرف کروٹ لی تو اس کا چہرہ گلدستے کے مقابل آ گیا۔خوشبو نے اس کے حواس کو بیدار کر دیا۔اس کے منہ سے بس ایک لفظ نکلا ''پھول!'' اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔کمزوری اور بیماری اور آنسوؤں نے اس کے چہرے پر سے گناہ اور ریاکاری کے سب نشانوں کو دھو دیا تھا۔

''آپ؟ یہاں کیسے؟'' اس نے کمزور آواز میں پوچھا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ چار ہزار روپے میں اس کی کہانی بیچنے کے لیے میں انجام کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں اس سے ملنے اس کے گھر گیا تھا،وہاں معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اس لیے میں نے یہاں آنا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔

''آپ بہت اچھے ہیں۔'' اس نے کہا۔اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر۔''آپ کہانی لکھتے ہیں نا؟''

کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ میں نے سفید چادر پر ایک سایہ پڑتے ہوئے دیکھا۔ پیچھے مڑا تو بابو کو کھڑا پایا۔شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی راتوں سے سویا نہیں ہے۔اور شاید روتا بھی رہا ہے۔اس کے ہاتھوں میں پھولوں کی ایک ''وینی'' تھی۔میرے لالچی دماغ نے کہا۔'' کہانی پوری ہوا چاہتی ہے چار ہزار روپے مبارک۔''

بابو نے نہ جانے مجھے دیکھا یا نہیں۔وہ چندرا کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا اور الفاظ کا ایک دھارا بہہ پڑا۔''مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا چندرا کہ تم یہاں ہو۔انھوں نے مجھ سے بڑے بڑے

جھوٹ بولے۔ یہ بھی کہا کہ تم ایک سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ہو۔ مگر میں نے ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا مگر یہ تمھارا کیا حال ہوگیا ہے، چندرا؟ تم غم کی وجہ سے بیمار ہوگئی ہو۔ مگر اب تم کوئی غم نہ کرو۔ میں نے کھولی کرائے پر لے لی ہے۔ آج ہی تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

بابو بکے جا رہا تھا اور میں ٹکٹکی باندھے چندرا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں مختلف جذبات ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں نے پہلے دیکھا کہ بابو کی آمد سے اس کے چہرے پر رونق، اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آ گئی ہے۔ مگر پھر نہ جانے کیوں دفعتاً یہ چمک اس طرح غائب ہوگئی، جیسے بٹن دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جائے اور اس کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ پھر ان آنکھوں میں ایک نئے اور..........خوفناک ارادے کی لہر آئی ....اور پھر..........

میں نہ صرف عورت پرست نہیں ہوں بلکہ عام طور سے ان کی پاکبازی، محبت اور قربانی کے دعوؤں کو ایک ڈھونگ سمجھتا ہوں جس کو وہ مردوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے رچاتی ہیں۔ مگر میں کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ ایک عورت اتنی طوطا چشم، اتنی سنگدل، اتنی گری ہوئی ہوسکتی ہے جتنی چندرا اس لمحے میں نکلی۔ جب اس نے بجائے بابو کا جواب دینے کے میری طرف مڑ کر کہا: "ڈارلنگ، اس آدمی سے کہو یہ جائے یہاں سے!"

ڈارلنگ! اور مجھے؟۔ جس کی شکل اس نے زندگی میں صرف دو بار دیکھی تھی۔ اور یہ شخص یہاں سے چلا جائے جس نے اپنی محبت، اپنی زندگی، اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ اور کیوں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی کہ بابو ایک غریب پھول والا تھا۔ اور میں نسبتاً ایک کھاتے پیتے اور سفید پوش طبقے کا۔ افوہ رے عورت! کیا تو اسی برتے پر عشق و محبت کے راگ الاپتی ہے؟

بابو چند لمحے تک اس طرح ساکت کھڑا رہا جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو اور اس کے ہاتھ میں اب بھی پھولوں کی وہ "وینی" تھی جو وہ چندرا کے لیے لایا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کو پلنگ کی پائینتی پر رکھ دیا۔ "میں..........میں..........یہ لایا تھا..................تمھارے لیے۔"

چندرا نے اپنا رخسار میرے لائے ہوئے پھولوں سے لگاتے ہوئے کہا اس کی ضرورت

نہیں۔ دیکھو یہ کتنے خوب صورت پھول لائے ہیں۔

''تو پھر پاؤں ہی میں باندھ لینا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور مجھے معلوم ہوا جیسے چھن سے اس کی امید اور محبت کا تار ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا ہو۔

میں نے چندرا کی طرف دیکھا اور سوچا ''اس ذلیل عورت پر بھروسہ کرنا بے کار ہے۔ یہ سوائے نفرت...... عمیق، بے پناہ نفرت اور کسی چیز کے قابل نہیں ہے۔''

وہ بولی ''میں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی اس کی معافی چاہتی ہوں۔''

میں نے 'وینی' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''معافی ان پھولوں سے مانگو۔ بات یہ ہے چندرا کہ تم ان بدنصیب عورتوں میں سے ہو جو نہ پھولوں کی قدر جانتی ہیں اور نہ محبت کی۔ اس رات کو جب بابو نے تمھارے پاؤں میں پھولوں کا گجرا ڈال دیا تھا تم اس کو مذاق سمجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ مگر میں سوچتا رہا تھا کہ سر کے پھولوں کی یہ تحقیر کہ وہ پاؤں میں ڈالے جائیں۔ آخر کیوں؟ بابو نے تمھارے پاؤں میں پھول نہیں ڈالے تھے بلکہ اپنا دل تمھارے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ تمھیں چاہیے تھا کہ ان پھولوں کو پاؤں سے نکال کر اپنے سر میں لگاتیں مگر نہیں تمھیں تو پھولوں اور دلوں دونوں کو پیروں سے مسلنے میں مزا آتا ہے۔ آج میری سمجھ میں آیا ہے کہ پاؤں میں پھول کس اصلیت کا نشان ہے؟ یہ تمہاری جیسی عورتوں کی سنگ دلی اور آوارگی کا نشان ہے۔ تم پھولوں کو پاؤں میں پہنتی ہو اور پھولوں کی طرح پاک اور پوتر جذبات کو قدموں میں روندتی ہو، تو، لو.................'' مجھ پر جنون سا سوار ہو گیا۔'' تو لو ان پھولوں کو پہنو اپنے پاؤں میں۔ یہ پھول نہیں ہے چندرا یہ بابو کا دل ہے۔'' میں نے ایک ہاتھ سے وینی کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پائینتی سے چادر الٹتے ہوئے کہا وہ کہہ گیا ہے کہ پاؤں ہی میں باندھ لینا''۔ میں اس کا کہنا............

فقرہ نامکمل رہ گیا۔ وینی میرے ہاتھ سے گر گئی اس جگہ جہاں چندرا کے پاؤں ہونے چاہیے تھے مگر وہاں پاؤں نہ تھے۔ وہاں کچھ نہ تھا صرف دو ٹانگوں کے ٹھنڈ پٹیوں میں بندھے ہوئے تھے۔

''چندرا!'' اور دفعتاً میرے دماغ میں چند تصویریں مجنوں طریقے سے چکر کھانے لگیں۔

''دلال ابّا'' کی خونیں آنکھیں۔ایک دھار دار تلوار اور سیتا کا افسردہ چہرہ اور پھر وہ خونیں آنکھیں۔

''چندرا!''

''تلوار کی دھار پر ناچنا آسان نہیں ہے۔ بڑا خطرناک ہوتا ہے یہی انھوں نے ڈاکٹر سے کہا۔''

''چندرا!''

''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اگر کوئی چلتی مشین میں پاؤں ڈالے گا تو اس کا پاؤں ضرور کٹ جائے گا۔''

O

چڑھاؤ اتار

چڑھائی کتنی خوشگوار تھی!

جوں جوں سڑک بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی تمام کثافت، گندگی، گرد و غبار، آرام، مصائب دور — بہت دور — رہ گئے ہیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی اور ایک عجیب خوشبو۔ چیڑ کے درختوں، پھولوں، گھاس اور گیلی مٹی کی ملی جلی خوشبو، سرسبز پہاڑیاں گل پوش تھیں اور عطر بیز فضا میں عجیب سا کیف تھا۔ جیسے بے پیے نشہ چڑھتا چلا جا رہا ہو۔ مگر ایسا نشہ جس کی مدہوشی بھی ہوش آور ہو جس سے دماغ سونے کے بجائے جاگ اٹھے اور دل کے تار زندگی کی مضراب سے چھو کر جھن جھنا اٹھیں۔

لاری کھانستی، کھنکارتی، شور مچاتی، ایک بے سرا گیت گاتی چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ گیئرز کی تبدیلی کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ موڑ پر پہاڑی کے دامن سے پہلو بچاتی اوپر چڑھی تو شمالی پنجاب کا تمام نقشہ زرل کی نظر کے سامنے پھیلا جاتا تھا۔ اس نے فتح مندی کے احساس کے ساتھ میدان پر نگاہ دوڑائی۔ راولپنڈی کا شہر ایسا نظر آیا جیسے گڑیوں کے گھروں کی بستی ہو۔ وہ تھا ریلوے اسٹیشن جہاں وہ دو گھنٹے پہلے صبح سویرے لاہور ایکسپریس سے اترا تھا اور وہ تھی بچوں کے کھلونے والی ریل گاڑی کی ریلوے لائن جو لاہور کی سمت کو اُفق پر پہنچ کر غائب ہو گئی تھی۔

لاہور، مال روڈ، سرکلر روڈ، بھاٹی دروازہ، تانگے، تانگے والے، بھاٹی درداجے (دروازے) اک اک آنے۔ لارنس گارڈن۔ سفید شلواریں۔ رنگین دوپٹے۔ "میرا حصہ دور کا جلوہ۔"

لاہور! ریلوے کلیرنگ آفس۔ مکھیوں کا ایک چھتہ بھن بھن ہر کلرک ایک مکھی تھا۔ وہ خود— نرمل کمار جو قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ طبیعت اور ذوقِ حسن لے کر آیا تھا— ایک کلرک تھا، ایک مکھی تھا! ٹن ٹن۔ صبح کے دس بجتے اور سینکڑوں مکھیاں بھن بھن کرتی چھتے میں داخل ہو جاتیں اور پھر چھ بجے شام کو باہر نکلتیں۔ نہیں ایک کلرک مکھی سے بھی بدتر تھا۔ مکھی کے چھتے پر کوئی حملہ کرے تو مکھی اس کو کاٹ سکتی ہے۔ مگر کلرک کو ہیڈ کلرک اگر گالی دے تو وہ اس کو کاٹ نہیں سکتا۔ مکھی اور مکھی برابر ہوتی ہے، مگر کلرک کے اوپر ہیڈ کلرک، ہیڈ کلرک کے اوپر میرنٹنڈنٹ سپرنٹنڈنٹ کے اوپر ٹرافک منیجر اس کے اوپر جنرل منیجر اور سب کے اوپر ریلوے بورڈ ریلوے ممبر ایک اینٹ پر دوسری اینٹ انسانوں کا قطب مینار اور ساتوں منزلوں کا بوجھ کلرک کے کاندھوں پر۔ خیال ہی سے نرمل کے کاندھوں میں درد سا محسوس ہونے لگا۔

لاہور! ہر پہلی تاریخ کو ساٹھ روپے۔ بس۔ وہ ہر دفعہ سوچتا امید کرتا اور دعا مانگتا کہ اکاؤنٹنٹ کی غلطی سے اس کے لفافے میں پانچ دس روپے زائد نکل آئیں مگر وہی ساٹھ روپے نکلتے۔ کبھی پانچ پانچ روپے کے بارہ نوٹ۔ کبھی کبھی دس دس روپے کے چھ نوٹ اور پھر دو تاریخ کو ان میں سے دس روپے گھر کے کرائے میں چلے جاتے اور پچیس روپے وہ گھر چلانے کے لیے اپنی بیوی کو دے دیتا۔

اُس کی بیوی، اُسے کتنی نفرت تھی اس سے! گوبندی۔ گوبندی کتنا غیر شاعرانہ نام تھا۔ اتنی ہی غیر شاعرانہ وہ خود تھی۔ اس کی ایک جھلک ہی رومان بھرے خوابوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کو کافی تھی۔ زرد زرد چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ سیدھے، تیل سے چپڑے ہوئے بال۔ نہ کپڑے پہننے کا سلیقہ، نہ بات کرنے کا ڈھب۔ میلی شلوار، ڈھیلی ڈھالی قمیض، ملگجی سی اوڑھنی، جو مل گیا پہن لیا۔ رومانیت اس کو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ دن بھر چولہے یا ہانڈی میں لگی رہتی۔ دفتر سے آ کر نرمل آواز دیتا "گوبندی" تو اس ہیئت کذائی میں آ کر کھڑی ہوتی کہ ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے، منہ پر راکھ کا غازہ، گالوں پر چولہے کی کالونچ۔ اور ایک نفرت انگیز انکسار کے ساتھ

''جی!'' کہہ کر اس کے جوتے کے تسمے کھولنے لگتی۔ نرمل کے تمام رومانی تصورات اور شاعرانہ تخیلات ایک لمحے میں چکنا چور ہو جاتے۔ وہ کہتا ''کیوں، گوبندی، سنیما چلنا ہے؟'' جواب ملتا ہے: ''جی، میں کیا کروں گی آپ چلے جایے۔ مجھے تو ابھی روٹی پکانی ہے'' روٹی پکانی ہے! گویا انسان بس روٹی کھانے پکانے کے لیے ہی زندہ رہتا ہے۔ سنیما، ناچ، گانا، سیر تفریح، کسی چیز کا بھی تو شوق نہیں تھا کمبخت کو! کبھی نرمل کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ باہر چلی بھی جاتی تو الٹے سیدھے سوالوں سے ناک میں دم کر دیتی۔'' کیوں جی، یہ موٹر کتنے کی ہوگی؟ کیوں جی، یہ بجلی کے ہنڈوں میں تیل کون ڈالتا ہے؟ کیوں جی، یہ اندو بالا اور کنن بالا دونوں بہنیں ہیں کیا؟'' کیوں جی! کیوں جی! اس کا جی جل جاتا کہ اب سے کبھی اسے اپنے ساتھ سیر کو نہ لے جائے گا۔

نہ جانے کس طرح اس نے گوبندی کے ساتھ یہ تین سال گزارے تھے۔ جہاں اس کے ماں باپ نے اس پر اور بہت سی ''عنایات'' کی تھیں وہاں گوبندی جیسی بیوی اس کے پلّے باندھ دی تھی۔ اس کی زندگی تباہ کرنے کے لیے انھوں نے کیا کچھ جتن نہیں کیے تھے۔ سب سے پہلے تو اس کو مادھو سنگھ جیسا نام دیا تھا۔ مادھو سنگھ! کیا بھونڈا گنوارو نام تھا! بھلا اس نام کا کوئی شاعر، افسانہ نگار یا آرٹسٹ ہوا ہے! ''محبت کی شفق۔'' از جناب مادھو سنگھ صاحب! ''نغمۂ شباب'' از جناب مادھو سنگھ صاحب مادھو! ''شعلۂ انقلاب'' از مادھو! مادھو! بیس سال تک اس نام نے اس کی زندگی کو تلخ بنائے رکھا تھا۔ اس نام کو لے کر بھلا وہ کس منہ سے محفلِ ادب میں جاسکتا تھا۔ اس لیے لاہور آ کر اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس ''مادھو سنگھ'' نام کو راوی کی تہہ میں ڈبو دیا تھا۔ اب وہ نرمل کمار تھا۔ نام ہی سے شاعری اور رومانیت ٹپکتی تھی۔'' آپ کا اسم شریف خاکسار کو نرمل کمار کہتے ہیں!'' اوہ وہی نرمل کمار جن کا افسانہ، روحِ ادب کے سالنامے میں شائع ہوا ہے! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' کتنا فرق تھا نرمل کمار اور مادھو سنگھ میں! مگر وہ اپنے گاؤں جلال پور جٹاں جاتا تو اس کے ماں باپ اس کو مادھو، مادھو کہہ کر پکارتے۔ اسی لیے وہ وہاں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ سال بھر میں ایک آدھ بار جاتا اور دو چار روز ہی میں کوئی بہانہ کر کے واپس آجاتا۔

لاری ہانپتی کانپتی ایک اور موڑ پر چڑھی تو پھر میدان نظر آیا، مگر اب وہ اتنے اونچے چڑھ آئے تھے کہ نہ راولپنڈی نظر آتا تھا نہ ریلوے لائن، راولپنڈی، لاہور، ریلوے کلیرنگ آفس،

گوبندی، جلال پور جٹاں مادھو، مادھو پکارنے والے ماں باپ۔ یہ سب اب بہت دور، بہت نیچے رہ گئے تھے اور وہ ایک آزاد پرندے کی طرح فضا میں اونچا اڑتا چلا جا رہا تھا اونچا بہت اونچا۔

نرمل کمار نے دو سو روپے میں اپنے افسانوں کا مجموعہ ایک پبلیشر کو دیا تھا۔ سو روپے ریڈیو کی تقریروں سے کمائے تھے۔ ان تین سو روپے کے سہارے وہ گوبندی کو جلال پور جٹاں بھیج کر، ریلوے کلیرنگ آفس سے ایک مہینے کی چھٹی لے کر اب کشمیر جا رہا تھا۔ کشمیر جنت نظیر۔ وہ ایک مہینے کے لیے بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کی پیدائش جلال پور جٹاں جیسی غیر شاعرانہ جگہ میں ہوئی ہے، اس کا باپ اَن پڑھ زمیندار ہے، اس کی بیوی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی گوبندی ہے اور وہ ریلوے کلیرنگ آفس کا ایک کلرک ہے جو ہر روز ہیڈ کلرک کی جھڑکیاں اور سپرنٹنڈنٹ کی گالیاں کھانے پر مجبور ہے۔ لاہور سے راولپنڈی تک وہ سیکنڈ کلاس میں آیا تھا۔ روالپنڈی سے اس نے 'سوپر بس' میں اگلی سیٹ لی تھی تاکہ اس سفر سے وہ پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ ماضی کے تلخ ایام پس پشت پڑے تھے۔ اس کا رخ رومانی دلچسپ روح پرور مستقبل کی طرف تھا۔ وہ پستی سے بلندی کی طرف جا رہا تھا۔

برابر کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی! اس کو صرف لڑکی کہنا اس کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی۔ لڑکی تو گوبندی بھی تھی مگر کتنا فرق تھا گوبندی میں اور اس لڑکی میں۔ زمین آسمان کا فرق، جہنم اور جنت کا فرق۔ اس لڑکی کی قربت کتنی روح پرور تھی۔ اس کے ریشمی لباس سے ایک عجیب خوشبو آ رہی تھی۔ یہ تیز عطر نہیں تھا جس کی خوشبو کا طمانچہ لگتا ہے۔ یہ ولایتی سینٹ کی دھیمی دھیمی، دبی دبی خوشبو تھی جو دھیرے دھیرے انسان کے نتھنوں میں سے ہوتی ہوئی، اس کے دل کی تہہ میں اترتی ہے۔ سینٹ کے ساتھ ایک اور خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ خوشبو جو ایک جوان صحت مند عورت کے جسم سے، اس کے بالوں سے، اس کے روئیں روئیں سے نکلتی ہے۔ بظاہر نرمل کھڑکی کے باہر پہاڑی نظارہ دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے دل و دماغ کی توجہ برابر والی نشست پر مرکوز تھی۔ کاش اس لڑکی سے کسی طرح اس کی ملاقات ہو جائے!۔

مڑ کر دیکھنا خلافِ تہذیب تھا۔ مگر ایک بار نرمل نے سامنے نظر کی تو ڈرائیور کے مقابل لگے ہوئے آئینے میں اس کو اپنی ہم سفر کا چہرہ نظر آیا۔ اُف کتنا شاداب چہرہ تھا وہ۔ میدہ اور شہاب کی

ملاوٹ والی رنگت۔ گوری گوری، گلابی گلابی، چہرے پر ہلکا سا غازے کا غبار، ستوان ناک، نیلی آنکھیں جو کبھی تاروں کی طرح چمکنے لگتی تھیں، کبھی لانبی لانبی پلکوں کے پردے میں چھپ جاتی تھیں۔ کمان دار ابرو، شفاف پیشانی، سر پر ایک پھولوں والا ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ پھر بھی بالوں کی چند باغی لٹیں چہرے پر بل کھا رہی تھیں۔ مگر جس چیز نے نرل کو بالکل دیوانہ بنا دیا۔ وہ تھے اس کے ہونٹ جو لپ اسٹک کی لالی سے گلنار تھے۔ کتنی مٹھاس تھی ان ہونٹوں میں۔ کتنا رس، کتنا گداز، نرل کے شاعرانہ دماغ نے ان کے لیے کتنی ہی تشبیہیں سوچیں مگر کوئی بھی تسلی بخش ثابت نہ ہوئی۔ وہ دبی ہوئی آواز میں گنگنانے لگا۔

آہ وہ دوشیزہ لب، گُریز لب، گلنار لب

آہ وہ لب، آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

ہوا کے ایک جھونکے سے جارجیٹ کی ساڑی کا آنچل اڑ کر نرل کے چہرے پر نقاب بن کے چھا گیا۔ کتنا کیف آور لمس تھا اس پلّو کا۔ کتنی غنودہ سی خوشبو تھی اس میں۔ ہلکی ہلکی، دبی، دبی، نرل کا جی چاہا کہ بس یہ پلّو اسی طرح اس کے چہرے پر پڑا رہے۔ مگر چوڑیوں کی ہلکی سی کھنکھناہٹ کے ساتھ ایک گوری کلائی میں جنبش پیدا ہوئی اور پلّو کھینچ لیا گیا۔

لاری مَری کے قریب پہنچ گئی تھی 'سنی بینک' کا موڑ آیا تو دوسری طرف ایک موٹر بغیر ہارن دیے آ گئی۔ ڈرائیور نے ہوشیاری سے اسٹیرنگ وہیل بائیں طرف موڑ کر بچا لیا۔ مگر دفعتاً اس جھٹکے سے لاری کے سب مسافر اور سامان منوں کی طرح خلط ملط ہو گئے۔ نرل خود بائیں جانب کی کھڑکی سے ٹکرایا، لوہے کا فریم اس کے بازوں میں چبھ گیا، مگر اسی وقت اس کے دائیں پہلو پر ایک نیم گداز و ریشمی بوجھ آ پڑا۔ نرل کے تمام بدن میں ایک جھری جھری سی آ گئی۔ ایک لمحے میں لاری پھر سیدھی ہو گئی اور سب مسافر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''SORRY۔'' لڑکی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں'' نرل نے موقع کو غنیمت پا کر گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

''وہ موٹر والا بڑا ہی نالائق تھا۔''

لڑکی خاموش تھی۔ اب کیا بات کی جائے؟ کچھ سوچ کر نرل نے کہا ''اگر آپ اس کھڑکی

میں سے باہر کی سیر کرنا چاہیں تو آپ ادھر آ جایئے میں آپ کی جگہ لے لوں گا۔''

''تھینک یو۔''

چلتی گاڑی میں اتنے تنگ مقام پر نشستیں تبدیل کی جائیں تو دو جسموں کا ٹکرانا بلکہ رگڑ کھانا قدرتی ہے۔ لاری کا سفر نرل کے لیے ایک ناقابلِ فراموش رومانی 'حادثہ' بنتا جا رہا تھا۔

''کیا آپ کشمیر جا رہی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اکیلی ہی؟''

'جی ہاں۔ اور آپ؟''

''میں بھی کشمیر جا رہا ہوں۔ کتنے عرصے قیام رہے گا آپ کا؟''

''کوئی ایک مہینہ۔''

عجب اتفاق ہے۔ میں بھی ایک ہی مہینے کے لیے جا رہا ہوں۔

گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تو ایک بات سے دوسری بات نکلتی چلی گئی۔ لڑکی کا نام شیریں تھا۔ شیریں اتنا میٹھا نام! کتنا پیارا نام۔ وہ بمبئی کی پارسن تھی۔ کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک آزاد ماحول سے آئی تھی۔ اس لیے اُس میں شمالی ہندوستان کی لڑکیوں کی سی غیر ضروری شرم اور جھجک نہیں تھی۔ وہ مردوں سے اُن کی ہی سطح پر بات کر سکتی تھی۔ لٹریچر، سیاست، آرٹ، فلم۔ نرل نے جو موضوع بھی چھیڑا شیریں کو اس میں طاق پایا۔ یہ تھا نمونہ اُس نئی دنیا کی نئی عورت کا جو نرل کا آئیڈیل تھی اور ایک گوبندی تھی کہ وہ سوائے روٹی پکانے کے اور کسی بھی موضوع پر گفتگو نہ کر سکتی تھی! کتنا فرق تھا گوبندی اور شیریں میں! آسمان و زمین کا فرق۔ جہنم و جنت کا فرق۔

لاری ہانپتی کانپتی چڑھائی پر چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً انجن میں گڑگڑاہٹ ہوئی اور گاڑی جھرجھری لے کر ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر انجن کھولا اور مسافروں سے کہا۔ آپ کچھ دیر اتر کر ستالیں۔ انجن ٹھیک ہونے میں دیر لگے گی۔'' کئی گھنٹوں سے بیٹھے بیٹھے بدن اکڑ گئے تھے۔ موقعہ غنیمت جان کر سب مسافر اتر پڑے۔ پنجابی سوداگر۔ دہلی کے رئیس، پانوں کی ڈبیہ بٹوہ سنبھالے ہوئے۔ دو نوجوان کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے اور شیریں کی طرف گھور گھور کر

دیکھ رہے تھے۔ (نہ جانے کیوں نرمل کو اُن کی یہ حرکت نہایت نامعقول معلوم ہوئی) تین غریب کشمیری جنھوں نے میلے دھسّے اوڑھ رکھے تھے۔ ایک برقعہ پوش عورت اور اس کا خاوند مگر اس وقت نرمل کو صرف ایک ہم سفر میں دلچسپی تھی۔

انجن کو ٹھیک کرنے میں پورے ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ مگر نرمل اور شیریں دونوں کو ڈرائیور کی سستی سے کوئی شکایت نہ ہوئی۔ اس عرصے میں وہ دونوں ٹہلتے ہوئے دور سڑک پر نکل گئے۔ پہاڑی پر پگڈنڈی کے راستے چڑھے۔ شیریں اونچی ایڑی کا جوتا پہنے ہوئے تھی۔ جب وہ کنکریوں پر پھسلنے لگی تو نرمل کو اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینا پڑا۔ کتنا نرم اور نازک ہاتھ تھا اس کا! پتلی پتلی گوری گوری انگلیاں جن کے ناخن کیوٹکس کی بدولت یا قوت کی طرح سرخ ہو رہے تھے! جب وہ تھک گئے تو پہاڑی کی ڈھلان پر گھاس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے، خود رو پھول اُگے ہوئے تھے۔ نرمل نے چھوٹے چھوٹے پھولوں کا ایک گچھا شیریں کو دیا جو اس نے اپنے بالوں میں لگا لیا۔ بھوک لگی تو پہاڑی بچوں سے سیب اور ناشپاتیاں خرید کر کھائیں۔ پھر قریب کے ایک چشمے پر جا کر پانی پیا۔ اس کے بعد چہرہ دھویا۔ کتنا ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا! اور شیریں کے سیاہ گھنگھریالے بالوں پر پانی کی بوندیں کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھیں! منہ دھو کر شیریں نے اپنا چہرہ اور ہاتھ نرمل کے سفید رومال سے خشک کیے اور پھر اپنے بیگ میں سے پاؤڈر پف اور لپ اسٹک نکال کر اپنے چہرے کا حسن دوبالا کرنے لگی۔

"شکریہ۔ لیجیے اپنا رومال۔" "آیئے اب واپس چلیں۔"

جیب میں رومال رکھنے سے پہلے نرمل نے شیریں کی نظر بچا کر اس کو سونگھا تو سینٹ اور شیریں کی ملی جلی خوشبو سے معطر پایا۔ تین آنے کا سفید چیتھڑا چند لمحوں میں ایک بیش قیمت یادگار بن گیا تھا۔

سورج زوال پر تھا۔ ہوا میں کافی خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ لاری چلنے سے پہلے شیریں نے اپنا کوٹ پہن لیا۔ قیمتی، ملائم کپڑا۔ نئی وضع کی تراش۔ کالر پر بیش بہا سمور لگا ہوا۔ نرمل نے اپنا اوور کوٹ باہر رکھ چھوڑا تھا۔ مگر شیریں کے سامنے اس پرانے، رفو کیے ہوئے، فرغل نما اوور کوٹ کو پہنتے اس کو شرم محسوس ہوئی۔

''آپ بھی اپنا کوٹ پہن لیجیے نا، مسٹر نرل'' شیریں نے کہا ''سردی بڑھتی جا رہی ہے۔''
اب تو کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ لاری چل پڑی سورج بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ ہوا خنک سے برفیلی ہوگئی۔ شیریں نے اپنے کوٹ کے سموری کالر کو الٹ لیا۔ نرل نے جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے۔ دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی ملی اور اس تھیلی کو ہاتھ لگاتے ہی اس کو گوبندی کی بیوقوفی یاد آئی۔

''اس تھیلی میں میں نے سپاری، الائچی، سونف اور لونگیں رکھ دی ہیں۔ سنا ہے موٹر جب پہاڑ پر چڑھتی ہے تو چکر آنے لگتے ہیں۔ متلی بھی ہوتی ہے۔''

''نہیں نہیں۔ مجھے یہ واہیات چیزیں نہیں چاہییں۔ مجھے کیا دودھ پیتا بچہ سمجھا ہے۔''

''پھر بھی لے جایے نا۔ آپ کے نہیں تو شاید کسی اور ہی کے کام آ جائے۔''

''میں نے کہہ دیا مجھے نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے۔'' جب گوبندی اس قسم کی جاہلانہ فرض شناسی کا اظہار کرتی تھی تو نرل کو بھی ضد ہو جاتی تھی۔

اس نے تھیلی کو اٹھا کر پرے پھینک دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ گوبندی نے آنکھ بچا کر اسے پھر کوٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ ''کیسی جاہل، کندہ ناتراش عورت سے واسطہ پڑا ہے۔'' نرل نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ اس تھیلی کو جو گوبندی کی طرح گنوار و اور دقیانوسی تھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے مگر وہ بیچ میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف ڈرائیور تھا اور دوسری طرف شیریں۔ انھوں نے دیکھ لیا تو پھر خواہ مخواہ سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔ پھر بھی اس نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ تھیلی کو چھو کر اس کو گوبندی کا خیال آتا تھا اور گوبندی کا خیال آتے ہی غصہ۔

لاری پھر مستعدی سے چڑھائی پر چڑھ رہی تھی۔ سامنے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بادل تیر رہے تھے۔ فضا میں عجیب حسن، ایک عجیب سکون تھا، لاری کی گھر گھراہٹ بھی لاہوتی موسیقی معلوم ہوتی تھی۔ دور نیچے گھاٹی میں دریا کا پانی نیلگوں تھا۔ اوپر پہاڑی کی سرسبز ڈھلان پر بھیڑیں چر رہی تھیں۔ کہیں کوئی چرواہا بانسری بجا رہا تھا ایک درد بھرا راگ مگر یہ میٹھا میٹھا درد تھا میٹھا میٹھا راگ۔ پرسوز، پرسکون، اور کچھ ایسا ہی راگ ان آبشاروں میں جن کے قریب سے لاری گزر رہی تھی اور جن کی پھوار اڑ کر شیریں کے چمکیلے بالوں میں موتی پرو رہی تھی۔

بریک کے جھٹکے کے ساتھ لاری ٹھہر گئی۔ یہ ڈومیل کا ڈاک بنگلہ تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔ آج کی رات یہیں رہنا ہوگا۔

نرمل اور شیریں نیچے اتر کر ڈاک بنگلے میں چلے گئے۔ خانساماں سے کہہ کر اپنا سامان لاری سے اتروایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ ڈاک بنگلہ خالی تھا اس لیے ان دونوں کو ایک ایک کمرہ آسانی سے مل گیا۔ گرم پانی سے منہ ہاتھ دھو کر نرمل باہر نکلا تو دیکھا کہ شیریں نے اس عرصے میں لباس بھی تبدیل کر لیا، ساڑی اور بلاؤز کے بجائے اب وہ ریشمی شلوار اور قمیض پہنے ہوئے تھی اور قمیض پر ایک عنابی رنگ کا دھنسا ہوا سوئیٹر جس نے اس کے سینے کے ابھار کو بہت نمایاں کر دیا تھا۔ کاندھوں پر ایک ریشمی دوپٹہ والہانہ انداز میں پڑا ہوا تھا۔

چائے کی میز پر بیٹھتے ہوئے نرمل نے کہا: ''تو آپ شلوار قمیض بھی پہنتی ہیں؟''

''جی ہاں۔ مجھے پنجابی لباس بہت پسند ہے۔''

''اور پنجابی؟'' نرمل نے ہمت کر کے سوال کر ہی دیا۔

شیریں نے چائے انڈیلتے ہوئے ایک نقرئی قہقہے کے ساتھ جواب دیا یہ آپ پر منحصر ہے— آپ پہلے پنجابی ہیں جن سے میری ملاقات ہوئی ہے''

ڈومیل کا ڈاک بنگلہ ایک نہایت پرفضا مقام پر واقع تھا نیچے دریا بہتا تھا۔ جس کے دوسری طرف ایک اونچی پہاڑی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ چائے پی کر نرمل اور شیریں دریا کے کنارے ٹہلنے چلے گئے۔ دریا کے اوپر کچھ فاصلے پر ایک معلق پل بنا ہوا نظر آیا۔ جھولے کی طرح موٹے موٹے تاروں میں لٹکا ہوا۔

شیریں نے کہا۔'' آیئے اس پل پر سے دوسری طرف چلیں۔''

نرمل نے کہا'' چلیے۔ مگر آپ کو ڈر تو نہ لگے گا؟''

شیریں نے کہا'' آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے؟''

پھر بھی جب شیریں نے پل پر پہلا قدم رکھا اور جھولے کی طرح سارا پل تھرتھرا اٹھا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ نرمل نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہارا دیا۔ اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے ہنستے، ڈگمگاتے پل کے وسط میں پہنچ گئے۔

پچاس فٹ نیچے دریا ڈھلوان، پتھریلی سطح پر نہایت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ چٹانوں سے ٹکرا کر پانی میں سبزی مائل جھاگ اٹھ رہا تھا۔

''کتنا حسین منظر ہے۔'' نرمل نے کہا۔ مگر شیریں سے کوئی جواب نہ پایا وہ ایک ہاتھ سے لوہے کے موٹے تار کو مضبوطی سے تھامے اور دوسرے ہاتھ سہارے کے لیے نرمل کے شانے پر رکھے، نظر جھکائے دریا کو دیکھ رہی تھی۔

چند منٹ تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ نرمل نے نرمی سے پوچھا'' کیا سوچ رہی ہیں آپ؟''

شیریں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ یہ پنجابی نوجوان کتنا اچھا ہے۔ کتنا مہذب، کتنا شیریں گفتار، اس کی باتیں کتنی دلچسپ ہیں اس کے خیالات کتنے بلند ہیں۔ غریب ضرور ہے مگر اس کا دل امیر ہے۔ اصل دولت دل اور دماغ ہی کی ہوتی ہے اور میرے ماں باپ کو دیکھو کہ اس بد مذاق کھوسٹ کرسٹ جی اور کہاں نرمل! وہ سوائے اپنی دولت مندی کے اظہار کے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب دیکھو رعب ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، میں نے نئی کار لی ہے۔ پیکارڈ، بالکل نیا موڈل'' ''کل ریس میں دس ہزار ہار گیا مگر کچھ پروا نہیں' لا فانز گیا تھا۔ دس نئے سوٹ آرڈر کیے ہیں اور نرمل کو دیکھو۔ اس کے پرانے اوورکوٹ میں کئی جگہ رفو کیا ہوا ہے۔ کپڑے بالکل معمولی ہیں۔ مگر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بال کتنے اچھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے نہ کبھی تیل ڈالتا ہے نہ کنگھی کرتا ہے۔ مگر ان مصنفوں اور آرٹسٹوں کی تو یہی شان ہوتی ہے۔ اس لاپرواہی میں بھی کتنی دلکشی ہے! اور وہ کرسٹ جی! سَر اگنجا ہونے پر بھی رہے سہے بالوں کو تیل سے چپڑے رہتا ہے اور کرسٹ جی کے گنج کا، خیال آتے ہی وہ مسکرا دی۔

''کیوں آپ کیا سوچ کر مسکرا رہی ہیں۔''

''کچھ نہیں۔ ایسے ہی، نہ جانے کیوں میں اتنی خوش ہوں۔''

اور وہ سوچ رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا میں ماں باپ سے لڑ کر یہاں بھاگ آئی۔ نہیں تو وہ جبر کر کے کسی نہ کسی طرح کرسٹ جی سے میری شادی کر ہی دیتے اور میرے رومان بھرے خواب خاک میں مل جاتے مگر اس وقت میں اس کھوسٹ کرسٹ جی کا خیال کر کے کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔

نظر اٹھائی تو نرمل کو مسکراتا پایا ''اب آپ بتایئے آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟''

نرمل نے کہا: ''آپ کا چہرہ بھی سینما کے پردے کی طرح ہے، جس پر ہر لمحے سین بدلتا رہتا ہے۔ ابھی ابھی آپ مسکرا رہی تھیں۔ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئیں اور آپ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔''

شیریں نے نرمل کے شانے پر خفیف سا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چلیے واپس چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔''

سورج سامنے والی پہاڑی کے پیچھے گم ہو چکا تھا۔ سرسبز پہاڑیاں کالی پڑ گئی تھیں۔ شام کے سناٹے میں دریا کے بہاؤ کا شور اور بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ پل پر سے اُتر کر وہ پگڈنڈی پگڈنڈی ڈاک بنگلے کی طرف چلے۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا مگر راستہ بھول گئے اور کسی بنگلے کے قریب جا نکلے۔ وہاں سے ٹھیک راستہ معلوم کر کے چلے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ صرف تیسری رات کے چاند اور ستاروں کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شیریں اب بھی نرمل کے شانے کا سہارا لیے ہوئے تھی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اس طرح چلنا۔ غیر شعوری طور پر نرمل کا دایاں بازو شیریں کی کمر کے گرد لپٹ گیا اور اُس کا جی چاہا کہ رات بھر وہ راستہ بھول کر یوں ہی چلتے رہیں۔ کچھ عجیب کیف، کچھ عجیب سکون تھا اس قرب میں، کچھ عجیب سی کرب آمیز لذت!

ڈاک بنگلے کے قریب آ کر وہ آپ سے آپ علیحدہ ہو گئے مگر اس علیحدگی میں آئندہ قربت کا وعدہ تھا۔

کھانا کھا کر وہ کچھ دیر برآمدے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شیریں نرمل کی ادبی مصروفیتوں کے بارے میں سوال کرتی رہی۔ اور نرمل جو گوبندی سے کبھی اس قسم کی باتیں نہ کر سکا تھا آج نہ جانے کس رو میں بہتا چلا گیا۔ جو کچھ اس نے لکھا تھا، جو لکھنا چاہتا تھا وہ سب بیان کر ڈالا۔ کہانیاں، ناول، ڈرامے، نظمیں اس کے دماغ میں کتنے منصوبے تھے۔ کتنی خواہشیں، امید، امنگیں، مگر آج تک اس نے ان کو اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا۔ اس کے دوست اور دفتر کے کلرک اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔ گوبندی، ان باتوں کے سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتی تھی مگر شیریں نہ صرف دلچسپی سے اس کی باتوں کو سنتی رہی بلکہ تعریفی الفاظ اور معقول مشوروں سے اس کا حوصلہ بھی بڑھاتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی — نرمل ادب کی کان کا ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے۔ میں اپنے اثر

سے اس کو آسمان شہرت پر پہنچا سکتی ہوں' اور نرل سوچ رہا تھا۔ ''ایسی حسین، ذہین اور ہمدرد لڑکی رفیق زندگی ہو تو انسان کیا کچھ نہیں کرسکتا۔''

دس بجے شیریں تو ''گڈ نائیٹ'' کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر نرل دیر تک آرام سے کرسی پر لیٹا مسرت بھرے خیالات میں گم رہا۔ سردی چمک اٹھی تھی۔ بارہ بجے کے قریب وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سونے سے پیشتر اس کا آخری خیال یہ تھا کہ ''جس دنیا میں شیریں ایسی ہستی موجود ہو وہ کتنی حسین دنیا ہے۔''

اگلی صبح جب وہ لاری میں سوار ہوئے تو دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں کے دوست ہیں۔ نرل ہی نے شیریں کا اسباب رکھوایا، اس کی شال، بٹوہ، دستانے، مفلر اس کو لاکر دیے۔ اس کو مفلر لپیٹ لینے کی ہدایت کی کیونکہ ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ شیریں نے نرل سے کہا کہ وہ بھی اپنے اوورکوٹ کا کالر چڑھالے اور سر پر ہیٹ رکھ لے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے میں اتنی دلچسپی لیتے دیکھ کر، دوسرے مسافر اور ڈرائیور ان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مگر نرل کو آج ان نگاہوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

لاری روانہ ہوئی۔

سڑک اور بھی پیچیدہ ہوگئی۔ ایک کے بعد دوسرے میل کا نشان آتا گیا اور اب وہ اونچی پہاڑیوں پر چڑھتے اترتے چلے جارہے تھے۔ سڑک ناگن کی طرح بل کھاتی چلی جارہی تھی۔ چکر۔ لاری کی گھوں گھوں۔ ایک چکر کے بعد دوسرا چکر۔ تیسرا چکر۔ اور پھر شیریں کی نازک مزاجی۔ ایک بار نرل نے اس کی طرف دیکھا۔ شیریں کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔ یہ کم بخت چکر کب ختم ہوں گے۔''

اور دفعتاً نرل کے کان میں کسی جانی بوجھی آواز نے کہا۔ ''اس تھیلی میں میں نے سپاری، الائچی، سونف اور لونگیں رکھ دی ہیں۔ سنا ہے پہاڑ پر موٹر چڑھتی ہے تو چکر آنے لگتے ہیں۔ متلی ہوتی ہے............ آپ نہیں تو شاید کسی اور ہی کے کام آجائے۔'' جلدی سے اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر ہی اندر تھیلی سے سپاری الائچی اور دو چار لونگ نکال کر شیریں کو دیں۔

''یہ کھا لیجیے۔ آپ کی طبیعت فوراً ٹھیک ہو جائے گی۔''

''تھینک یو۔''

شیریں کے منہ سے الائچی کی بھینی بھینی خوشبو اڑ کر ہوا میں پھیل گئی۔ نرمل کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی الائچی اتنی خوشبودار ہو ہی نہیں سکتی۔

''اب کیا حال ہے؟''

''اب بہتر ہوں۔'' اس کے گالوں پر سرخی پلٹ آئی تھی۔ سڑک کے چکر بھی اب کم ہو گئے تھے اور دور برفیلے پہاڑوں سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا فرحت بخش تھی۔

شیریں نے نرمل کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ اُف ان حسین آنکھوں میں کتنا خلوص، کتنا بھولا پن تھا!

اب سڑک اتنی بلندی پر پہنچ گئی تھی کہ موٹر تقریباً بادلوں میں گزر رہی تھی۔ چاروں طرف دھند ہی دھند چھائی ہوئی تھی۔ دیوداروں کے درخت سورج کو چھپائے ہوئے تھے۔ زمین گیلی تھی۔ شاید رات کو یہاں بارش ہو چکی تھی۔

''اُفوہ کتنی سردی ہو رہی ہے!'' شیریں نے کہا'' لایے یہ شال ڈال لوں میں۔'' یہ کہہ کر اس نے ملائم خوب صورت سرمئی رنگ کی شال اپنی اور نرمل کی ٹانگوں پر ڈال دی۔

دھند اتنی کثیف تھی کہ موٹر سے گز بھر آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لاری رینگتی رینگتی راستہ ٹٹولتی، آگے بڑھ رہی تھی۔

شال کے نیچے نرمل کو اپنے بائیں ہاتھ پر ایک لطیف نازک لمس محسوس ہوا۔ مگر اس کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ جیسے وہ اس کا پہلے ہی سے منتظر تھا۔

شیریں کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ نرمل نے اسے اپنے گرم ہاتھ میں اس طرح لے لیا، جیسے کوئی بچے کو گود میں لے کر یا کبوتر کو ہاتھ میں لے کر تھپکی دیتا ہے۔

کتنا چھوٹا سا، پیارا سا ہاتھ تھا شیریں کا۔ اس کے نرم دباؤ میں کتنی محبت، کتنی گرمجوشی اور معصومیت تھی۔ اس میں دنیا کی ازلی اور ابدی مسرتوں کا پیغام تھا۔ اس میں دعوت بھی تھی اور وعدہ بھی۔

لاری دھند کو چیرتی ہوئی اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔ شیریں خاموش تھی۔ پوری کائنات خاموش تھی۔ نرمل نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں تھا بلکہ ایک طلسمی کشتی میں شیریں کے ساتھ بادلوں میں تیرتا ہوا لامتناہی بلندی کی طرف چلا جارہا تھا۔

اتار

اترائی کتنی تکلیف دہ، کتنی ناخوشگوار تھی!

لحظہ بہ لحظہ گرمی زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ گلمرگ سے جب وہ صبح سویرے چلے تو سردی کے مارے کانپ رہے تھے۔ سری نگر پہنچتے پہنچتے دھوپ نکلی اور اوورکوٹ اتار دینے پڑے۔ سری نگر سے جب وہ دوسری لاری میں چلے تو نرمل اپنا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا اور شیریں اپنا سرمئی سوئیٹر۔ مگر پہنچتے پہنچتے ان کپڑوں میں بھی گرمی محسوس ہونے لگی۔

''آخر کوٹ کیوں نہیں اتار دیتے؟'' شیریں نے کہا۔

بات معقول تھی۔ مگر نہ جانے کیوں نرمل کو شیریں کے لہجے میں قدرے درشتی معلوم ہوئی۔ پھر سوچا ''نہیں شاید میرے کانوں کا قصور ہے۔

اس نے کوٹ اتار کر گود میں رکھ لیا۔ آپ سے آپ اس کے ہاتھ نے شیریں کے ہاتھ کو تلاش کرلیا۔ وہی چھوٹا سا، نازک سا ہاتھ۔

سڑک ہموار وادی میں سے چلی جارہی تھی۔ دونوں طرف کے قدآور درخت سنتریوں کی طرح تنے کھڑے تھے۔ دور دھوپ میں گلمرگ کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں۔ ایک کے بعد دوسرے میل کا نشان آتا جارہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے اہم، سب سے زیادہ مسرت بھرے سفر کے سنگ راہ تھے۔ ایک مہینہ وہ اُن کو گنتا ہوا کشمیر پہنچا تھا اور اب ایک ماہ بعد ان کو گنتا ہوا واپس آرہا تھا۔

ایک مہینہ۔ تیس دن۔ ایک دن میں چوبیس گھنٹے۔ مگر زندگی کو ان دنوں، گھنٹوں کے حساب سے نہیں ناپا جاسکتا۔ صرف زندہ رہنا ہی زندگی نہیں ہے۔ یوں تو جانوروں کی بھی زندگی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں پودوں کی بھی زندگی ہوتی ہے۔ مگر انسان کی زندگی جذبات اور محسوسات کے

مجموعے کا نام ہے۔ایک لمحے میں حیات جاودانی کا نچوڑ مل سکتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیس برس انسان زندہ رہنے پر بھی زندگی سے محروم ہے۔ کشمیر آنے سے پہلے نرمل بھی بس جی رہا تھا۔ حیوانوں یا پودوں کی طرح۔ کھاتا تھا، پیتا تھا، سوتا تھا، دفتر جاتا تھا، واپس آتا تھا۔ اس بے کار اور بے روح دوڑ دھوپ سے اکتا جاتا تو ایک افسانہ یا نظم لکھ کر ایک نقلی رومانی دنیا میں اپنے کو کھو دینے کی کوشش کرتا مگر اصل اور نقل میں وہی فرق تھا جو شیریں اور گوبندی یا آسمان اور زمین میں تھا۔ ایک مہینے تک وہ دونوں ساتھ رہے تھے۔ پچھلے تیس دن ایک دلکش فلمی افسانے کی طرح اس کی نظر کے سامنے پھر گئے۔ پُرسکون ڈل کی سطح پر شکارے کی سیر۔ شیریں کا سر اس کے زانو پر۔ شالیمار میں ایک چنار کے سائے میں پکنک۔ گلمرگ کا مخملیں سبزہ۔ جس پر لیٹے لیٹے انھوں نے پورے پورے دن گذارے تھے۔ کھلن مرگ تک گھوڑوں پر چڑھائی۔ وہاں سے الپتر۔ سفید سفید برف پوش پہاڑیاں۔ نیلی جھیل اور اس میں برف کے تودے تیرتے ہوئے اور شیریں کی قربت سے ان سب نظاروں میں دُگنی دلکشی پیدا ہو جاتی۔ قدرت حسین تھی۔ مگر قدرت کا حسین ترین شاہکار خود شیریں تھی کتنی کیف آور تھی اس کے بالوں کی مہک۔ کتنی خوب صورت تھیں اس کی آنکھیں۔ کتنے نازک اور نرم تھے اس کے ہاتھ۔ نازک اور سبک اور برف کی طرح ٹھنڈے نہیں۔ گرم۔ پسینے سے نم آلود۔

ایک جھٹکے کے ساتھ نرمل خیالی سے اصلی دنیا میں آ گیا۔ شیریں کا ہاتھ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اور دونوں ہاتھ پسینہ میں تر تھے۔ ''میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ اس گرمی میں بے چاری کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوں۔'' یہ سوچ کر اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر نہ جانے کیوں اسے دفعتاً محسوس ہوا کہ شیریں کو اپنے ہاتھ کا چھٹکارا اچھا نہ معلوم ہوا۔

شیریں سوچ رہی تھی۔ ''ایک وہ دن تھا کہ نرمل میرے ہاتھ کو چھونا ہی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا اور آج اس کو میرا وہی ہاتھ برا لگنے لگا ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا تو سرخ اور پسینے سے تر پایا۔ اپنا رومال نکال کر اس نے نرمل کو جلانے کے لیے ہاتھ کو دیر تک رگڑ کر خشک کیا۔

''اچھا۔ اب ہمارا پسینہ بھی اتنا برا لگتا ہے!'' نرمل نے سوچا اور جلن میں اس نے بھی رومال نکال کر اپنا ہاتھ خشک کر لیا۔

ڈرائیور نے پٹرول بچانے کے لیے انجن بند کر دیا تھا اور لاری ڈھلان پر آپ سے آپ لڑھکتی ہوئی تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔

"شیریں۔ تم نے گھر خط لکھ دیا نا؟" یہ سوال غیر ضروری تھا مگر نرل نے پوچھ ہی لیا۔

"کتنی بار تو کہہ دیا۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔" شیریں کو گرمی، پٹرول کی بو اور موٹر کے چکر دں سے کوفت ہو رہی تھی۔ اس لیے غصہ نرل پر اتارا وہ نرل کو بتا چکی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو لکھ دیا ہے کہ وہ کرسٹ جی کے بجائے نرل سے شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ چاہتی بھی یہی تھی مگر اس بات کو بار بار دہرانے سے اس کو چڑ سی ہو گئی تھی کیونکہ اس کا بیان سچ بھی تھا اور جھوٹ بھی۔ خط اس نے ضرور لکھا تھا اور اسی مضمون کا مگر ابھی تک ڈاک میں ڈالا نہ تھا۔ آخری لمحے میں وہ نہ جانے کیوں مذبذب ہو گئی تھی اور اس نے یہ سوچ کر اسے بیگ میں رکھ لیا تھا کہ لاہور میں کئی روز تو ٹھہرنا ہی ہے وہاں سے بھیج دیا جائے گا۔

نرل نے شیریں کو یہ نہ بتایا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کو وہ جھوٹ نہ سمجھتا تھا کیونکہ گوبندی سے اس کی شادی مارے باندھے کی تھی۔ اب اس نے طے کر لیا تھا کہ گوبندی اور لاہور اور جلال پور جٹاں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وہ بمبئی چلا جائے گا۔ وہاں اس کو کسی فلم کمپنی میں افسانہ نگار اور مکالمہ نویس کی جگہ ملنے کی کافی امید تھی۔ پھر شیریں سے سول میرج کر کے وہ اپنی ساری عمر وہیں گزار دے گا۔ یہ تھا اس کی آئندہ زندگی کا خوش آئند پروگرام۔

بارشوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب آسمان صاف تھا اور زمین خشک۔ باوجود اس کے کہ وہ اب بھی تین چار ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ دھوپ کافی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی موٹر یا لاری آتی تو گرد و غبار کا ایک بادل اڑاتی ہوئی اور نہ صرف ان کے کپڑے دھول میں اٹ جاتے بلکہ مہین مہین گرد ان کے منہ اور نتھنوں میں بھی گھس جاتی۔ شیریں اس مصیبت سے بچنے کے لیے اپنے سر پر باندھنے کے ریشمی رومال کو منہ پر نقاب کی طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ ایک بار رومال ہٹایا تو چہرہ پسینہ میں نہایا ہوا تھا۔

"بے چاری۔" نرل نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ اور پھر شیریں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کھڑکی کے پاس گرد زیادہ آ رہی ہے تم چاہو تو ادھر آ جاؤ۔"

انھوں نے نشستیں تبدیل کر لیں۔ ان کے جسموں میں اس بار بھی ایک دوسرے سے ٹکر اور رگڑ ہوئی مگر اب نرمل کو وہ پر کیف سنسناہٹ نہ محسوس ہوئی جو ایک مہینے پہلے ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں!

بیچ کی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ کر شیریں نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے پاؤڈر پف نکالا۔ نرمل نے دیکھا کہ شیریں کے گالوں پر پسینہ کی وجہ سے پاؤڈر کی بتیاں سی بن گئی ہیں۔ سرخی بہہ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک کہیں لگی ہوئی تھی اور کہیں سے غائب ہو گئی تھی۔ کمان دار ابروؤں کے اوپر ہلکی سی نیلی سی کمانیں نمودار تھیں۔ کئی دن سے شاید ان کو موچنے (بال اکھاڑنے کا آلہ) سے باریک نہ بنایا گیا تھا۔ جس چہرے کو دیکھ کر کبھی نرمل کی نبض تیز ہو جایا کرتی تھی۔ آج اس کو دلکش نہ معلوم ہوا، نہ جانے کیوں!

شاید شیریں کو نرمل کے خیالات کا اندازہ ہو گیا تھا، اسی لیے وہ جلدی جلدی پاؤڈر اور سرخی کی مدد سے اپنے چہرے کی 'مرمت' کر رہی تھی۔ نرمل نے ایک بار کہا تھا کہ شیریں سے ملنے سے پہلے اسے ان لڑکیوں سے نفرت تھی جو پاؤڈر اور لپ اسٹک لگاتی ہیں۔ 'تمہاری بات اور ہے۔' اس نے کہا تھا۔ مگر شیریں کو شبہ تھا کہ نرمل اب بھی اس قسم کے سنگھار کو ناپسند کرتا تھا۔ اس لیے ایسے موقعہ پر وہ ہمیشہ کچھ خفیف سی ہو جاتی تھی اور پھر اپنی نگاہ میں اپنی وقعت برقرار رکھنے کے لیے وہ سوچتی 'نرمل قابل اور ذہین سہی مگر آخر وہ گنوار ہے۔ بمبئی جیسے شہر کی 'سوسائٹی' میں ملا جلا ہوتا تو اس کا ذہن اس قسم کے تعصبات سے پاک ہوتا۔'' اور یہ خیال آتے ہی وہ سوچنے لگتی کہ بمبئی آ کر وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں نرمل کو کس طرح متعارف کرائے گی' اور اگر نرمل نے انھیں پسند نہ کیا؟ یا انھوں نے نرمل کو ناپسند کیا؟'' یہ سوال اکثر اس کے دماغ میں پیدا ہوتا مگر وہ اس کو اپنے شعور کے پچھلے کونے میں ٹھونس دیتی۔

لاری کے سفر میں اگر انجن نہ بگڑے تو پنکچر ہونا تو لازمی ہوتا ہے۔ گھنٹہ بھر سے زیادہ رکنا پڑا۔ پہلی بار نرمل اور شیریں نے دوسرے مسافروں کو دیکھا۔ دو ایک تو وہی تھے جو پچھلی بار بھی ان کے ہم سفر رہ چکے تھے اور ان دونوں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے۔ ایک گورا سا بڑی ناک والا نوجوان تھا۔ فلم ایکٹروں جیسی مونچھیں بنائے ہوئے۔ سر پر بانکا فیلٹ ہیٹ۔ گلے میں ریشمی مفلر اور کوٹ کے بجائے ہوائی جہاز کے ''پائلٹوں'' جیسی

چمڑے کی آستینوں والا جاکٹ۔ منہ میں پائپ۔ شیریں کو دیکھ کر یہ شخص اس طرح آگے بڑھا جیسے کوئی شکاری پرندہ اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

"آپ مس باٹلی والا ہیں؟" اس نے پہلے انگریزی میں پوچھا اور شیریں کا جواب پاکر اس نے نہایت بے تکلفی سے ہاتھ ملا کر گجراتی میں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ایم چھے۔ کیم چھے۔ سوں چھے۔ سارہ چھے۔ یہ چھے۔ وہ چھے! نرمل کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ بیچ میں شیریں نے نرمل کا تعارف بھی کرایا۔ "یہ میرے دوست ہیں مسٹر نرمل کمار۔ کشمیر میں ہماری ملاقات ہوئی اور آپ ہیں مسٹر دارو والا۔ موٹروں کا کاروبار کرتے ہیں اور تمام بمبئی میں سب سے اچھا ٹینگو ڈانس کرتے ہیں۔"

"آپ خود کیا برا ناچتی ہیں۔ پچھلے کرسمس پر یاد ہے جب تاج میں کوکا کوا اور آپ کو انعام ملا تھا۔" اور پھر نرمل کی طرف مخاطب ہو کر "ہاں تو مسٹر کمار مجھے یاد پڑتا ہے ہم کہیں ملے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ تاج کے ہار بر بار میں، نہیں نہیں کرکٹ کلب میں۔" اور جب نرمل نے عاجزی سے جواب دیا کہ تاج اور کرکٹ کلب کیا اس نے تو کبھی بمبئی شہر ہی نہیں دیکھا تو مسٹر دارو والا نے پھر شیریں کی طرف، پوری توجہ مبذول کر کے ایم چھے۔ کیم چھے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ دیر تو نرمل بیوقوفوں کی طرح کھڑا ان کی گجراتی گفتگو کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر "تاج" "گرین" "سی سی آئی" "مہالکشمی" "ریس کورس، گولڈن فان" کے سوا کوئی لفظ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک بار اس کو شبہ ہوا کہ وہ دونوں شاید سیاست کے متعلق باتیں کر رہے ہیں کیونکہ 'اسٹالن' اور 'چرچل' کے نام بار بار لیے جا رہے تھے۔ مگر پھر 'بیٹنگ' کا ذکر ہوا تو پتہ چلا کہ یہ گھوڑ دوڑ کے گھوڑے تھے نہ کہ سیاستداں! نرمل محبت کے معاملے میں 'احساس ملکیت' اور حسد کا قائل نہ تھا۔ مگر شیریں کا اس اجنبی نوجوان سے گھل مل کر باتیں کرنا اسے اچھا نہ لگا۔

وہ ٹہلتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پر چلا گیا جہاں چند اور مسافر پتھروں کی دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مشفقانہ انداز میں نرمل سے پوچھا "کیوں، بابو جی، یہ جو بائی آپ کے ساتھ ہیں یہ آپ کی بیوی ہیں۔" نرمل نے جلدی سے جواب دیا "جی نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ صرف میری دوست ہیں۔ کشمیر میں ملاقات ہوئی ہے" وہ

صاحب زیرلب مسکرا دیے۔

خدا خدا کر کے لاری روانہ ہوئی تو شیریں سے بات کرنے کا پھر موقع ملا۔ مگر وہ آپ ہی آپ کوئی انگریزی گیت گنگنا رہی تھی۔ نرمل کو اگر کسی چیز سے چڑ تھی تو وہ انگریزی کا گانا تھا۔

''کیا گا رہی ہو؟''

''ارے تم نے یہ گیت نہیں پہچانا؟'' ڈاؤن ارجنٹائن دے'' میں کارمن مرانڈا گاتی ہے نا!'' نرمل نے یہ فلم ہی نہ دیکھا تھا۔ مگر گیت اس کو بے معنی اور لغو معلوم ہوا۔ ''ماما یا کیرد ماما یا کیرد''

''بھلا یہ بھی کوئی گانا ہے! مجھے تو بکواس معلوم ہوتا ہے۔''

''تمھیں تو ہر انگریزی چیز بکواس معلوم ہوتی ہے۔''

نہ جانے کیوں دونوں کے طرز گفتگو میں درشتی آتی جا رہی تھی شاید گرمی کے اثر سے جو ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

شیریں سوچ رہی تھی۔ 'یہ بھی کوئی بات ہے کہ انگریزی ناچ ناچو، انگریزی گانا نہ گاؤ۔ آخر زندگی میں یہی تو دو چار دلچسپ چیزیں ہیں۔

نرمل سوچ رہا تھا'' کیا بمبئی جا کر اور شیریں کے دوستوں۔۔۔ دارو والا جیسے دوستوں۔۔۔ کی صحبت میں رہ کر مجھے بھی انگریزی ناچ گانے کی عادت ڈالنی پڑے گی؟''

شیریں کے ساتھ پرمسرت زندگی گزارنے کے ہوائی قلعے جو اس نے اپنے دماغ میں بنائے تھے، دارو والا سے مل کر کچھ متزلزل سے ہو گئے تھے۔ کیا شیریں کے سب دوست اسی قسم کے ہوں گے؟ کیا اس کے ساتھ وہ ایسا ہی سلوک کریں گے؟ تیس دن ان دونوں نے ایک دوسرے کی صحبت اور رفاقت میں ہنسی خوشی گزارے تھے۔ انہوں نے اپنے دلوں اور دماغوں میں ہم آہنگی پائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا تھا۔ مگر جو لڑکی دارو والا سے ہنس ہنس کر گھوڑ دوڑوں اور ناچ گھروں کی باتیں کر رہی تھی وہ تو کوئی اور ہی شیریں تھی۔ جس سے وہ اب تک بالکل ناواقف رہا تھا۔ کیا اس شیریں سے بھی عمر کا نباہ ممکن تھا؟

عمر بھر کا نباہ! گوبندی سے بھی تو اس کو عمر بھر کا نباہ کرنا تھا۔ بے چاری گوبندی! جو انگریزی

گانا تو کیا ہندوستانی گانا بھی نہ جانتی تھی۔ جو صرف روٹی پکانا جانتی تھی۔ اس نے گوبندی سے کہا تھا۔ ''میں کشمیر جارہا ہوں۔ مہینہ بھر کے لیے۔ تم جلال پور جٹاں چلی جاؤ۔'' اور اس نے جواب دیا تھا ''بڑی اچھی بات ہے۔ کشمیر جاکر آپ کی صحت بھی اچھی ہو جائے گی۔ یہاں کام بھی تو بہت کرتے ہیں آپ۔ دن بھر دفتر میں مغز مارنے کے بعد پھر رات کو بھی لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔'' اور ایک بار بھی گوبندی نے یہ نہیں کہا تھا کہ ''مجھے بھی لے چلیے کشمیر۔'' کہا تھا تو بس یہ کہ ''اس تھیلی میں میں نے سپاری، الائچی، سونف اور لونگیں رکھ دی ہیں۔ سنا ہے پہاڑ پر جب موٹر چڑھتی ہے تو چکر آنے لگتے ہیں۔'' اور اس بار گوبندی کے الفاظ کو یاد کر کے وہ غصہ ہونے کے بجائے مسکرادیا۔

''کیا بات ہے جو آپ ہی آپ مسکرائے جارہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ ''یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں اور پھر موضوع بدلنے کے لیے کہا: ہاں شیریں یہ تو بتاؤ اپنی والدہ کے نام وہ خط تو ڈال دیا تھا نا؟'' اور نرمل کا جی چاہا کہ شیریں جواب دے ''نہیں'' نہ جانے کیوں!

''پھر وہی سوال! کہو تو حلف نامہ لکھ دوں؟'' شیریں کے جواب میں تلخی تھی اور طنز تھا۔

کچھ دیر پھر خاموشی۔ دونوں طرف تناؤ، لاری کے پچھلے ڈبے سے دارو والا کے سیٹی بجانے کی آواز آئی۔ کوئی انگریزی ناچ کی دھن تھی، شیریں کے نازک اونچی ایڑی کے جوتے لاری کے آہنی فرش پر رقص کرنے لگے۔ نرمل نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کا جائزہ لینا شروع کردیا۔

''نرمل!'' اس بار شیریں کی آواز میں نرمی تھی۔

''ہاں۔ کہو۔ کیا بات ہے؟''

''کیا تمھیں انگریزی ناچ سے واقعی اتنی نفرت ہے؟''

''ہے تو۔ بات یہ ہے کہ میں ٹھہرا گنوار۔ ہندوستانی قسم کا آدمی!'' اور اسے امید ہوئی کہ اب شیریں کہے گی کہ ''ایسا ہے تو تمہاری خاطر میں بھی ناچنا چھوڑ دوں گی۔'' مگر شیریں نے کہا ''یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔'' اور پھر خاموش ہوگئی۔

ساڑھے پانچ کے قریب وہ ڈومیل کے ڈاک بنگلے پر پہنچے۔ ڈرائیور نے کہا'' آج تو

راولپنڈی نہیں پہنچ سکتے۔ رات کو یہیں ٹھہرنا ہوگا۔

چلے تو تھے اس ارادے سے کہ اسی رات کو راولپنڈی پہنچ جائیں گے۔ مگر نرل کو ڈومیل ٹھہرنا اچھا معلوم ہوا۔ اس نے سوچا ''اسی ڈاک بنگلے میں ہماری محبت کی ابتداء ہوئی تھی۔ اس ماحول میں ہم ایک دوسرے کو پھر پاسکیں گے اور آج کی جلی کٹی باتیں بھول جائیں گے۔''

مگر دارووالا کی مصیبت سر پر نازل تھی۔ ان کے کمروں کے برابر ہی اس نے بھی کمرہ لیا اور شیریں سے آکر حسب معمول بے تکلفی سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ''دیکھئے۔ آج کل ریل میں رش بہت ہوتا ہے۔ اس لیے سیٹیں ریزرو کرانے کے لیے یہاں سے تار دے دینا چاہیے۔ ورنہ بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ کہئے تو تار دے دوں دو فرسٹ کلاس سیٹوں کے لیے؟''

شیریں نے کہا ''مسٹر نرل کمار سے دریافت کر لیجیے ان کو بھی تو سیٹ ریزرو کرانی ہوگی، اور ہاں دیکھئے ایر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کے لیے تار دے دیجیے گا ورنہ کشمیر کی سیر کا مزا کرکرا ہو جائے گا۔'

برآمدے میں نرل یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر اپنے بٹوے کا جائزہ لیا تو صرف ساڑھے گیارہ روپے نکلے۔ تین سو میں بڑی مشکل سے مہینے بھر تک گزارہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ شیریں ہمیشہ اپنا خرچ خود اٹھاتی تھی اور کبھی کبھی نرل کا بھی، اب صرف ساڑھے گیارہ روپے رہ گئے تھے۔ ڈاک بنگلے کا کرایہ اور کھانے کا دام دے کر مشکل سے چھ سات روپے بچنے کی امید تھی وہ لاہور تک فرسٹ چھوڑ تھرڈ میں بھی نہیں جا سکتا تھا اور شیریں سے روپیہ مانگنا یہ اس کی حمیت کو گوارا نہ تھی۔

''کہیے مسٹر کمار۔ تو آپ کے لیے بھی تار دے دوں؟'' دارووالا نے کمرے میں جھانک کر کہا۔

''میرے لیے............جی..........تکلیف نہ کیجیے۔''

'ارے بھئی اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ ڈاک خانے تو جا ہی رہا ہوں۔ جہاں دو سیٹوں کے لیے تار دوں گا، وہاں تین کے لیے بھی دے سکتا ہوں یا آپ نے پہلے سے سیٹ ریزرو کرا رکھی ہے؟''

نرل نے یہ بہانا غنیمت جانا ''جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں تو پہلے ہی ریزرو کرا چکا ہوں۔''

اور برابر کے کمرے میں یہ سن کر شیریں کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔

''اپنی سیٹ ریزرو کرالی اور میرا خیال بھی نہ کیا!''

ڈاک خانہ بند ہو چکا تھا۔ تار نہ جا سکا مگر دارو والا کو بک بک کے لیے ایک مستقل موضوع مل گیا۔'' عجیب کوفت ہوگئی۔ نہ جانے کل ٹرین میں کوئی فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ برتھ ملے بھی یا نہیں یا ممکن ہے سیکنڈ کلاس میں جانا پڑے۔'' اور اس نے سیکنڈ کلاس کا ذکر اس طرح کیا گویا اس درجے میں سفر کرنا اس کی سخت ہتک تھی'' مگر مسٹر کمار آپ تو مزے میں ہیں پہلے سے انتظام کر لیا۔''

شیریں اندر کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ اس لیے دارو والا کی باتوں سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کی زبان تھی کہ قینچی کی طرح چلتی جا رہی تھی۔ ارے مسٹر کمار، آپ بمبئی آیئے بمبئی۔ پھر آپ کو دنیا کی سیر کرائی جائے گی۔ میری بات مانئے تو نومبر میں آیئے۔ ریسیز بھی ہوں گی۔ ذرا لطف رہے گا۔ مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ اگر آپ کو نومبر میں آنا ہے تو ابھی سے خط لکھ کر تاج میں کمرہ ریزرو کرا لیجیے ورنہ مشکل پڑ جائے گا۔ آپ ہوں گے تو پھر روز ملاقات ہوا کرے گی۔ میں دوپہر کا کھانا اکثر وہیں کھاتا ہوں اور پھر ہر ڈانس نائٹ پر تو ڈنر بھی وہیں ہوتا ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس نے وہیں برآمدے کی فرش پر ڈانس کے انداز میں تھرکنا شروع کر دیا۔'' او بوائے او بوائے۔ ایسا ڈانس فلور دنیا میں کہیں نہیں ہے.......... مگر آپ تو شاید باٹلی والا پیلس میں ٹھہریں گے۔ مالا بار ہل پر۔ اہاہا۔ کیا مکان بنایا ہے مس شیریں کے والد نے۔ ہر چیز ولایت سے منگائی ہے۔ یہاں تک کہ فرنیچر سارا کا سارا فرانس سے بن کر آیا تھا۔ خوب بامذاق آدمی ہیں مسٹر باٹلی والا بھی۔ گھٹیا چیز کو تو کبھی گوارا کر ہی نہیں سکتے۔''

نرمل کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا'' بھلا وہ ایک گھٹیا داماد کو کیوں گوارا کرنے لگے۔''

شیریں باہر آئی تو دونوں اس کی تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ سری نگر سے چلتے وقت وہ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی مگر اس وقت اس نے ساڑی باندھی تھی اور وہ بھی خاص پارسی انداز میں۔ دارو والا بولا'' تھینک گاڈ۔ آپ نے وہ گنوار کپڑے تو اتارے۔'' اور شیریں نے جواب دیا'' کبھی کبھی پہننے کے لیے پنجابی لباس بھی برا نہیں ہوتا!''

جھولے کے پُل پر پھر سیر کو گئے ایک مہینے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ دارو والا کی موجودگی نے ان کو ٹھیک طرح سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ واپسی پر شیریں کچھ سوچتی ہوئی بچوں کی طرح زور زور سے بیگ ہلاتی آگے آگے جا رہی تھی۔ اور دارو والا نرمل کے کان کھا رہا تھا۔ ''بھئی کپڑے سلوانا ہوں تو لا فائز میں سلواؤ۔ یہ لاہور کے درزی کیا جانیں سوٹ سینا کسے کہتے ہیں۔ '' اتنے میں شیریں کے ہاتھ سے پھسل کر بیگ کچھ دور جا گرا۔ کلپ کھل گیا اور سب چیزیں بکھر گئیں۔ نرمل اور دارو والا دونوں چیزوں کو چننے کے لیے دوڑے پاؤڈر پف۔ لپ اسٹک۔ بالوں کے پن چند روپے اور نوٹ رومال .... اور ایک خط! اس سے قبل کہ شیریں اس کو جھپٹ لے نرمل نے پتہ پڑھ لیا ''مسز روشن باٹلی والا۔ باٹلی والا پیلس۔ مالا بارہل۔ بمبئی۔'' یہ وہی خط تھا جو نرمل سے شادی کرنے کے بارے میں اس نے اپنی ماں کو لکھا تھا اور جو اس کے بیان کے مطابق ڈاک میں ڈالا جا چکا تھا۔

''ارے یہ خط — لو — ڈالنا ہی بھول گئی۔ جھوٹ بولنے کی ناکام کوشش میں وہ ہکلا رہی تھی مگر نرمل کو اس پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ یہ دیکھ کر کہ خط ابھی ڈاک میں نہ پڑا تھا اس کو کچھ اطمینان سا ہو گیا۔ اس نے کہا ''خیر۔ اب ڈاک میں بھیجنے سے کیا فائدہ۔ اس سے پہلے تو تم خود ہی بمبئی پہنچ جاؤں گی۔''

اگلے دن سویرے جب لاری ڈومیل سے روانہ ہوئی تو نرمل نے دیکھا کہ شیریں کے چہرے پر خفت سی تھی۔ بیگ گرنے کے بعد ان دونوں نے اس خط کا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔

لاری تیزی سے ڈھلوان پر چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ فرنٹیر میل کے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ ان کو راولپنڈی پہنچا دے گا۔

'شیریں!'' نرمل نے نرمی سے کہا۔

''ہاں، نرمل!'' شیریں کی آواز میں کچھ عجیب افسردگی تھی۔

''تم نے جان کر وہ خط نہ ڈالا تھا؟'' نرمل نے انگریزی میں سوال کیا تا کہ ڈرائیور ان کی باتیں نہ سمجھ سکے۔

شیریں نے جواب میں آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''تم فیصلہ نہ کر پائی تھیں ہمارے بارے میں؟ یہی ہے نا؟'' جواب کی ضرورت نہ تھی۔

''تم نے ٹھیک کیا، شیریں۔ میرے تمھارے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ ہم کبھی خوش نہ رہ سکیں گے'' اور یہ کہہ کر اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی زبردست بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو۔

شیریں کچھ دیر خاموش رہی۔ اب راولپنڈی نظر آنے لگا تھا۔ پھر وہ بولی: ''مگر ہم دوست تو رہیں گے نا؟ مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟''

نرمل نے خلوص سے جواب دیا'' بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے۔ شیریں تم نے ایک مہینے کے لیے میری روکھی پھیکی زندگی کو کیف آور بنا دیا۔ یہ احسان کم ہے تمھارا؟ تم بھول جاؤ تو اور بات ہے۔ شاید میں کبھی بمبئی آؤں اور تم سے ملنے کے لیے باٹلی والا پیلس پر جاؤں تو تم مجھے دیکھ کر کہو، ہاں یاد آ گیا کہیں دیکھا ہے آپ کو؟''

شیریں نے نرمل کے الفاظ دہرائے'' بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے۔''

اور پھر نرمل نے کہا'' اچھا تو یاد رکھنا۔ میں آؤں گا تو تم شلوار قمیص پہننا۔ کبھی کبھی پہننے کے لیے پنجابی لباس برا نہیں ہوتا۔''

راولپنڈی کے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ مسافروں کی بھیڑ میں کھو گئے دارو والا نے بھاگ دوڑ کر ایک بابو کی مٹھی گرم کی اور فرسٹ کلاس کے ایک درجے میں دو سیٹوں کا انتظام کر ہی لیا مگر یہ ایرکنڈیشنڈ نہیں تھا۔ اگست کی دوپہر پنکھوں میں سے بھی گرم ہوا نکل رہی تھی۔

ریل چلنے والی تھی کہ نرمل نظر آیا۔ دارو والا نے کہا'' کہیے آپ کو کہاں جگہ ملی؟''

نرمل نے ٹرین کے دوسرے حصے کی طرف اشارہ کر دیا۔

''اوہ۔ ایرکنڈیشنڈ؟ بڑے خوش قسمت ہیں آپ!''

''جی ہاں، بالکل ایرکنڈیشنڈ درجہ ہے۔''

گارڈ نے سیٹی دی اور نرمل۔ شیریں اور دارو والا دونوں سے ہاتھ ملا کر اپنے تھرڈ کلاس کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔

اب ریل تیزی سے لاہور کی طرف چلی جا رہی تھی۔ نرمل کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا گرم لو کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔ مگر اس تکلیف میں بھی عجیب راحت تھی۔ اب وہ خیالی، جذباتی بلندیوں

سے اتر کر زمین پر آ گیا تھا۔ حقیقت اس بے گدّے کی سیٹ کی طرح سخت اور غیر آرام دہ تھی مگر تھی جانی بوجھی اور قابل اعتبار۔ نرل کے چاروں طرف دھوپ کے تپے ہوئے جسموں والے کسان بیٹھے تھے۔ وہ تاج محل اور کرکٹ کلب کی باتیں نہیں کر رہے تھے بلکہ زمین اور بارش اور فصل کی۔ ایک منشی جی عینک لگائے اخبار میں سے اسٹالن اور چرچل کی تازہ ملاقات کا حال پڑھ کر سنا رہے تھے۔ مگر یہ چار ٹانگ والے اسٹالن اور چرچل کا ذکر نہیں تھا۔ وہ شرمیلی چودہ برس کی دلہن جو ایک کونے میں بیٹھی تھی اس کے چہرے پر شرم کی لالی تھی۔ پاؤڈر اور 'روژ' کی نہیں! اس درجے میں سچ مچ کے انسان بیٹھے تھے۔ اس کے باپ جیسے کھردرے میلے کچیلے۔ گنوار۔ اکھڑ۔ اَن پڑھ۔ مگر انسان۔ سچ مچ کے انسان۔ محنت مزدوری کرنے والے۔ ٹھوکریں کھانے والے انسان تھے۔ ان کی محبت میں اسے ایک عجیب احساس رفاقت حاصل ہوتا تھا۔ وہ اپنی اور ان کی مفلسی اور پست حالی پر قانع نہیں تھا مگر اس کو معلوم تھا کہ ان کو نیچے چھوڑ کر وہ خود اوپر چڑھ گیا تو اس کو بھی مسرّت حاصل نہ ہوگی۔

کھیت، درخت، بجلی کے کھمبے، کسانوں کے جھونپڑے، گاؤں، اسٹیشن۔ یہ سب اس کے سامنے سے تیزی سے گھومتے ہوئے چلے جا رہے تھے اور ان سب میں اس کو ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پیلا پیلا چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، منہ پر راکھ کا غازہ، گالوں پر چولہے کی کالونچ مگر اس وقت یہ چہرہ اس کو دنیا کا حسین ترین چہرہ معلوم ہو رہا تھا اور اس کے کان ریل کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں برابر ایک ہی آواز سن رہے تھے۔ ''کیوں جی! آپ آگئے؟''

O

بارہ گھنٹے

دسمبر کا مہینہ!

اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا گھنٹہ پونے آٹھ بجا رہا تھا۔ گاڑی کے آنے میں اب بھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔ بینا نے سوچا اور پلیٹ فارم کے گرد چکر لگانے لگی۔

چھوٹا سا اسٹیشن۔ نہ کتابوں اور اخباروں کی دوکان۔ نہ کوئی ہوٹل، چائے کی ایک پیالی ملنی بھی ممکن نہیں۔ بس دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت۔ ایک کمرے میں اسٹیشن ماسٹر کا دفتر دوسرے میں ٹکٹ گھر۔ ٹکٹ گھر پر بھیڑ بھی تو نہیں تھی۔ دو کسان گاڑھے کی چادروں میں لپٹے، کانوں کو رات کی ٹھنڈی ہوا سے بچانے کے لیے ڈھاٹا باندھے، برآمدے میں سکوے بیٹھے تھے۔ دور سگنل کی لال روشنی اندھیرے میں چمک رہی تھی۔

بینا ساڑی پر ایک سوئیٹر پہنے ہوئے تھی۔ اس پر ایک اونی چادر مگر اس وقت اُس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ جب سے وہ انقلابی پارٹی میں شامل ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک اہم کام اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اسی خیال سے اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور باوجود برفیلی ہوا کے اس کے گال تمتما رہے تھے۔ کیا وہ یہ کام بخوبی انجام دے سکے گی؟ کوئی گڑبڑ تو نہ کرے گی؟ گھبرا تو نہ جائے گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اُس نے سوچ سمجھ کر انقلابی پارٹی میں شرکت کی تھی۔ وہ

انقلاب کے لیے بڑے سے بڑا کام کرنے کو تیار تھی۔ اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی اور یہ بالکل معمولی کام تھا۔ لیڈر نے جو ہدایات دی تھیں وہ اب تک بینا کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

''دیکھو ہمارا پرانا ساتھی و۔ جے سنگھ سولہ برس کی جیل کاٹ کر آ رہا ہے۔ مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہر پہنچتے ہی اس کو پھر گرفتار کرلیا جائے گا کیونکہ پولس ڈرتی ہے کہ اس کی واپسی سے انقلابی پارٹی کا اثر اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس لیے تم اسے رام نگر کے اسٹیشن ہی پر اُتار لینا۔ رات بھر وہ تمھارے مکان پر ٹھہرے گا اور صبح کو وہ شہر آ کر اپنے آپ کو پولیس کے سامنے گرفتاری کے لیے پیش کرسکتا ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ جیل جانے سے پہلے وہ کم از کم بارہ گھنٹے تو آزاد رہے۔ یہ خط تم اسے دے دینا اور اس کا جواب جو وہ لکھے پارٹی کے دفتر میں پہنچا دینا۔''

''رات بھر وہ تمھارے مکان پر ٹھہرے گا۔ مگر بینا کا مکان، چھوٹے چھوٹے کمروں سے زیادہ نہ تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار پانے والی ایک اسکول کی استانی اس سے بڑے مکان کا خرچ کیسے برداشت کرسکتی۔ پھر وہ رہتی بھی تھی اکیلی۔ نہ کوئی رشتہ دار نہ نوکر۔ اپنا کھانا بھی خود پکاتی تھی۔ ان حالات میں ایک غیر مرد کا اکیلے مکان میں اس کے ساتھ رات گزاری۔ بینا کی پرورش ایک مذہبی، رواج پرست گھرانے میں ہوئی تھی۔ کالج کی تعلیم اور انقلابی خیالات نے اس کا دماغ کافی حد تک آزاد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کے دل کی نچلی تہہ میں سماج کا خوف سمایا ہوا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے اور ساتھ ہی ایک جوان مرد کی قربت کی نا قابل بیان کشش، جنسی تجربے اور دبی ہوئی خواہش، خواہش بھی اور خوف بھی۔ وہ جوان تھی مگر مرد کی آغوشِ محبت سے ناآشنا۔ وہ کتابی علم کی مدد سے جنسیات پر اصولی بحث کرسکتی تھی مگر اس کے عملی پہلوؤں سے بالکل ناواقف تھی۔ ہاں قدرت نے از خود اس کے بدن میں ایک عجیب سی گدگدی، ایک عجیب سی چبھن، ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ایک ہی دوا ہے۔ مگر شادی سے پہلے اس دوا کی خوراک پینا، یہ بھی تو اتنا آسان نہ تھا۔

دور اندھیرے میں سگنل کی لال روشنی سبز روشنی میں تبدیل ہوگئی۔ پلیٹ فارم کے سامنے کی ریل کی پٹریاں اپنی جھنجھناہٹ سے آنے والی ٹرین کی خبر دینے لگیں بینا کی توجہ جنسی مسائل سے ہٹ کر و۔ جے سنگھ کی طرف مبذول ہوگئی جو ابھی چند منٹ میں رام نگر پہنچنے والا تھا۔ جو رات بھر۔۔۔

بارہ گھنٹے — کے لیے اس کا مہمان تھا۔ وجے سنگھ۔ انقلابی پارٹی میں اس نام کی دھوم تھی۔ اس کے انقلابی کارناموں کو آج تک یاد کیا جاتا تھا۔ آج وہ سولہ برس کی قید کاٹ کر واپس آ رہا ہے۔ کل شاید پھر کسی کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے یہی اس کی زندگی تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر جان کی بازی لگا چکا تھا۔ وہ نہ قید خانے سے ڈرتا تھا نہ پھانسی کے تختے سے۔ بینا نے پارٹی کے دفتر میں لگی ہوئی وجے سنگھ کی تصویر دیکھی تھی۔ شاندار وجیہ جوان، چوڑا چکلا سینہ، اونچی پیشانی اور چمکدار کالی آنکھیں جو تصویر کے پردے میں سے بھی دلوں کو برما دیتی تھیں، خوب صورت آنکھیں خوفناک آنکھیں۔ ان کی گہرائی میں جنون تھا۔ مگر ان کی سطح پر بچوں کی سی سادگی کھیل رہی تھی۔ ناممکن تھا کہ کوئی ان آنکھوں کو دیکھے اور ان کا شکار نہ ہو جائے۔ بینا نے ان آنکھوں سے انقلاب کا سبق سیکھا تھا۔ اپنے اصولوں کے لیے مر مٹنے کی تمنا اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی حسرت۔ سب کچھ۔ جان، مال، عزت، ہاں عزت بھی۔ جب کبھی اس کا قدم انقلاب کی دشوار گذار راہوں پر ڈگمگاتا۔ بینا ان آنکھوں کی طرف دیکھتی اور ایک لمحے میں اس کا دل ایک نامعلوم طاقت سے بھر جاتا اور پھر اس میں ہر مشکل، ہر مصیبت کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی۔ مگر یہ آنکھیں ایک انقلابی ہی کی نہیں، ایک مرد کی آنکھیں بھی تھیں۔ ان میں ایک حیوانی کشش تھی، ایک جنون انگیز شرارہ جو ممنوعہ لذتوں کا ایک اشارہ، اُس دلفریب دنیا کی ایک جھلک جس کا دروازہ توڑا بھی جاسکتا ہے۔ بینا اپنی پارٹی ہی میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی۔ جنھوں نے اس خیالی دروازے کو توڑ کر آزاد جنسی تعلقات کی سرزمین میں قدم رکھا تھا۔ کیا آج کی رات وہ بھی وجے سنگھ کی مدد سے......؟ وہ اس خیال ہی سے شرما گئی۔ ایسی باتیں سوچنی بھی نہیں چاہئیں مگر کیوں نہیں۔ وجے سنگھ خوب صورت ہے، جوان ہے۔ تندرست ہے، اور اس کی آنکھوں میں دلفریب مسرتوں کا پیغام ہے۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ بینا کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا اور وہ وجے سنگھ کی تلاش میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑنے لگی۔ کہیں اس کا پتہ نہ ملا۔ کسی درجے میں بھی پارٹی کے دفتر والی تصویر سے ملتا جلتا مسافر نہ تھا۔ ٹرین سے اُترا تو بس ایک مجہول شخص، بڈھا فقیر۔ دونوں کسان برآمدے سے اٹھ کر ایک تھرڈ کلاس کے بھرے ہوئے ڈبے میں گھس گئے۔ انجن

نے سیٹی دی اور ٹرین چلدی تو کیا و جے سنگھ اس گاڑی سے نہیں آیا؟ کیا اس کو پہلے ہی گرفتار کرلیا گیا؟ مگر وہ بڈھا کیوں پلیٹ فارم کی لالٹین کے نیچے بینا کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا؟

''کیا آپ مس بینا ہیں؟'' فقیر کی آواز میں نفاست تھی۔

اور جب بینا نے ''ہاں'' کہا تو اس کی نگاہ بڈھے کی آنکھوں پر پڑی— آنکھیں جو ایک جھاڑ جھنکار داڑھی میں سے اس طرح چمک رہی تھیں۔ جیسے گھنے جنگل میں کسی خوب صورت مکان کی دو کھڑکیاں جگمگا رہی ہوں۔

''آپ......ہی..........کامریڈ و جے سنگھ ہیں؟''

''ہاں۔ مجھے پارٹی سکریٹری کا تار پچھلے اسٹیشن ہی پر مل گیا تھا۔ مجھے اس اسٹیشن پر اترنا ہے اور یہ کہ تم مجھے لینے آؤ گی۔''

''چلیے۔''

بینا و جے سنگھ کو اپنے گھر لے آئی۔ کھانا تیار کر کے گئی تھی۔ ایک تھالی میں پروس کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ بغیر ایک لفظ کہے اس نے کھانا شروع کر دیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا ''تم نہیں کھاؤ گی۔؟''

بینا پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ و جے سنگھ انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کتنے ہی دن کے فاقے کے بعد کھانا ملا ہے۔ بینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ سوچ کر کہ سولہ برس تک دھول ملی روٹی اور چنے میں پکی ہوئی دال کھانے کے بعد اس کو آج انسانوں کی خوراک نصیب ہوئی تھی۔ وہ و جے سنگھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی چوڑے چکلے سینے اونچی پیشانی چکنے بالوں والا و جے سنگھ ہے۔ جس کی تصویر پارٹی کے دفتر کی دیوار پر ٹنگی تھی؟ نہیں یہ وہ نہیں ہوسکتا۔ اس کا سر گنجا ہے اور اس پر مدتوں تک نہ نہانے کی وجہ سے پھنسیوں اور میل کے کھرنڈ جمے ہوئے ہیں۔ اس کی داڑھی— آدھی کالی آدھی سفید— خوفناک طریقے سے اگی ہے۔ ہونٹوں کے اوپر اور نیچے کے بال شاید دال کے دھبے لگتے لگتے زرد ہو گئے ہیں۔ دانت کچھ غائب ہیں اور کچھ زردی مائل۔ ناخن بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے ہوئے۔ باوجود شدید احساس ہمدردی کے بینا یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ ٹرین آنے سے چند سیکنڈ پہلے ہی وہ اسی شخص کے

ساتھ جنسی زندگی کی پہلی منزل طے کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

وجے سنگھ نے کھانا ختم کر لیا تو بینا نے کہا اب آپ نہا کر کپڑے بدل لیجیے۔ پارٹی والوں نے آپ کے لیے یہ کپڑے بھیجے ہیں۔ میں غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیتی ہوں۔'' یہ سن کر وجے سنگھ نے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ جیسے اس کو دفعتاً اپنی غلاظت کا احساس ہوا۔ بغیر ایک لفظ بولے وہ غسل خانہ میں چلا گیا۔ سولہ برس کا طویل عرصہ اس نے اکیلے کال کوٹھری میں گذارا تھا۔ اسی لیے اس کو انسان سے بات چیت کرنے کی عادت ہی نہ رہی تھی اور بینا جیسی نوجوان لڑکی کی موجودگی میں تو ایسا چپ ہو گیا تھا۔ جیسے گونگا ہے۔

نہا کر وجے سنگھ نے صاف کپڑے پہنے اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپنے لگا جو بینا نے سردی کے خیال سے جلا رکھی تھی۔ لال لال کوئلوں کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں بینا کو ہلکی سی مسرت کی جھلک دکھائی دی۔ جیسے انگاروں پر سے راکھ جھٹک دی گئی ہے۔ اس نے بینا سے قینچی مانگ کر اپنے ناخن کاٹے اور پارٹی سکریٹری کا خط پڑھنے بیٹھ گیا۔ بینا کو معلوم تھا کہ اس خط میں پچھلے سولہ سال کے سیاسی واقعات پر تبصرہ ہے۔ انقلابی پارٹی کی کارروائی کی رپورٹ ہے۔ جوں جوں وجے سنگھ اس کو پڑھتا تھا اس کی آنکھوں میں وہی پرانی انقلابی چمک واپس آتی جا رہی تھی، غصہ، افسوس۔ خوشی سب جذبات اس کی آنکھوں کے آئینے میں یکے بعد دیگرے نظر آ رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی وہ پھر انقلابی لیڈر تھا۔ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کو اپنی پارٹی کو ہدایات دینی تھیں۔ اُس نے بینا سے کاغذ اور قلم مانگا اور خط کا جواب لکھنے بیٹھا۔ مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ چکی چلاتے چلاتے قلم پکڑنے کی عادت نہ رہی تھی۔

خط ختم کر کے اس نے بینا کو دیا کہ اگلے دن حفاظت سے سکریٹری تک پہنچا دے۔

بینا نے گھڑی دیکھی ابھی صرف سوا نو بجے تھے، خاموشی توڑنے کے لیے اُس نے کہا ''ابھی آپ سونا چاہتے ہیں یا............... یا کچھ دیر بیٹھنا ہے؟''

وجے سنگھ کا جواب سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ ''میں سنیما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سنیما۔'' دفعتاً بینا کے دماغ میں سولہ برس قید کے ہولناک نتائج کی ایک جھلک بجلی کی طرح کوند گئی۔ سولہ برس 1927 سے 1943 تک یوں وجے سنگھ نے کوئی ٹاکی ہی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اُس نے سہگل کی آواز سنی تھی

نہ رمولا کا حسن دیکھا۔ نہ کانن بالا کے رسیلے گانے اور نہ چندر موہن کی کمال اداکاری۔ وہ تو بولتی ہوئی تصویروں کے جادو سے اتنا ہی ناواقف تھا جیسے افریقہ کے تاریک ترین جنگلوں میں رہنے والا۔ سولہ برس وہ زندگی کے دلچسپ اور خوشگوار پہلوؤں سے محروم رہا تھا۔ سنیما اور تھیٹر، گانا ناچ، بچوں کی آواز، غروب آفتاب کا رنگین منظر، چاند اور ستارے، برسات کی رم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو، درختوں کی چھاؤں، پھولوں کی بہار، ماں کی ممتا، اولاد کی اُمنگ، عورت کا پیار، کچھ بھی نہیں، بس ایک گندی اندھیری کوٹھری۔ جیل کے افسروں اور وارڈنوں کی کرخت آوازیں عادی مجرموں، ڈاکوؤں اور خونیوں کا ساتھ۔ زندگی کے سمندر میں موت کا یہ جزیرہ۔ انسانیت کی حدود سے باہر۔ دُنیا کے بیچ میں مگر دنیا سے بہت دور اور یہاں وجے سنگھ نے سولہ برس یعنی ایک سو بانوے مہینے تقریباً چھ ہزار مصیبت بھرے دن اور چھ ہزار کالی راتیں اور اس کے بعد صرف بارہ گھنٹے زندگی کے۔ بارہ گھنٹے روشنی رنگ اور خوشبو کے۔ اس کے بعد پھر جیل خانے کے مہیب کالے دروازے بند ہو جائیں گے۔

''میں سنیما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سنیما۔'' بچپن کی سادگی کے ساتھ وجے سنگھ نے کہا تھا۔ ہر انسان کی فطرت میں بچپن ہوتا ہے اور انقلابی بھی تو آخر انسان ہے پھر کیا تعجب ہے کہ آج کی رات اس کے دل میں سنیما دیکھنے کی یہ شدید آرزو پیدا ہوگئی۔ کیا معلوم ہے اب جو وہ جیل جائے تو پھر کبھی زندہ نہ نکلے۔ شاید سنیما دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ جائے۔

رام نگر میں ایک ہی معمولی سنیما تھا۔ جہاں کئی سال کے پرانے ہندوستانی فلم دکھائے جاتے تھے۔ بینا تو وہاں ایک دفعہ بھی نہ گئی تھی مگر وجے سنگھ کو لے گئی۔ تماشہ شروع ہونے والا ہی تھا۔ جب وہ ٹکٹ لے کر داخل ہوئے۔ روشنیاں گل ہوگئیں اور روپہلی پردے پر تصویروں نے حرکت شروع کر دی۔ فلم تھا 'طوفان میل' پرانا ذلیل فلم مگر وجے سنگھ کے لیے تو معجزے سے کم نہ تھا۔ تصویروں کو چلتے پھرتے تو اس نے ضرور قید ہونے سے پہلے دیکھا تھا مگر گاتے بولتے دیکھ کر وہ بالکل دنگ رہ گیا چارلی اور غوری کے بھونڈے مذاق پر وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔ کھلکھلا کر تالیاں بجا کر۔ دوسرے تماشائی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ بینا کو پہلے تو ذرا کوفت ہوئی۔ مگر فوراً ہی اس کو خیال ہوا کہ شاید سولہ برس میں پہلی بار وجے سنگھ ہنس رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی اس کو

'طوفان میل' فلم بھی اچھا لگنے گا۔

مادھوری اور بلیمو ریا پردے پر محبت کا رنگین کھیل کھیل رہے تھے۔ بیباک، بے پروا، حیوانی محبت، وہ محبت نہیں جو شب فراق کے آنسوؤں میں ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ وہ محبت جو قہقہوں اور معنی خیز نگاہوں میں جھلکتی ہے۔ مادھوری ایک چست، بدن سے چپکے ہوئے لباس میں مجسم آرزو بنی ہوئی تھی، شہوانیت کا ایک شرارہ، جس کی قربت ہر ایک کو جھلس دینے کو کافی تھی۔ اُف رے اس کی شرارت آمیز، شہوت خیز باتیں، کٹیلی نظر، وہ اس کا سینہ کے ابھار پر ہاتھ رکھ کر ایک عجیب انداز سے کہنا "ہائے۔ یہاں۔"

وجے سنگھ بڑے انہماک سے فلم دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ — کیا یہ بھول سے بینا کے ہاتھ پر رکھا گیا تھا چکی پیستے پیستے ہاتھ سخت ہو گیا۔ مگر پھر بھی اس میں ایک قسم کی نرمی تھی۔ کسی زمانے میں یہ ہاتھ نازک اور حساس رہا ہوگا۔ انگلیاں اب بھی لمبی اور نازک تھیں۔ وجے سنگھ تماشا دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ بینا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ وہ بینا کے ہاتھ کو دبانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ "شاید غلطی ہی سے یہ ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا گیا ہو۔" بینا نے سوچا اور نرمی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ہال میں اندھیرا تھا مگر پھر بھی بینا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وجے سنگھ کو اس کا ہاتھ ہٹا لینا برا معلوم ہوا ہے۔ اس کے بعد فلم میں اس کی دلچسپی اور انہماک بھی ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے کہا 'چلو گھر چلیں۔ بس دیکھ لیا فلم' اور جب وہ باہر سڑک کی روشنی میں آئے تو وجے سنگھ ایک روٹھے ہوئے بچے کی طرح زمین پر نظریں جمائے چل رہا تھا۔

گھر پہنچ کر بینا نے اپنے پلنگ پر وجے سنگھ کے لیے بستر درست کر دیا اور اس سے کہا کہ آرام سے سو جایئے کیونکہ صبح ہی اُس کو شہر جانا تھا اس کے بعد اُس نے دوسرے کمرے میں فرش پر دری بچھا کر اپنے سونے کا انتظام کیا۔ ایک گلاس میں پانی بھر کر وجے سنگھ کے سرہانے رکھ دیا اور پوچھا 'اور کچھ چاہیے۔' وجے سنگھ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر بینا نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں اور ان آنکھوں کی گہرائی میں وہی جنون، ان کی سطح پر وہی بچوں کی سی سادگی اور ساتھ ہی وہ حیوانی کشش بھی ہے جو پارٹی کے دفتر والی تصویر میں تھی۔ بینا کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ آنکھیں دھندلا گئیں اور ان میں آگ کی بجائے دھواں سا، تحکم

کے بجائے التجا سی جھلکنے لگی۔ بینا نے جلدی سے روشنی بند کی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔
مگر دونوں کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا۔ اس کی چٹخنی اس طرف لگتی تھی۔ جدھر دجے سنگھ کا پلنگ تھا۔ بینا نے کواڑ بھیڑتے ہوئے آواز دی "مہربانی کر کے چٹخنی لگا لیجیے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور انتظار کرتی رہی کہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئے۔ ایک منٹ گذرا، دو منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ اور بینا کو ایسا محسوس ہوا کہ جب تک چٹخنی بند نہ ہوا سے نیند نہ آئے گی مگر چٹخنی بند نہ ہوئی۔
بینا نے سوچا "کیا دجے سنگھ سو گیا ہے؟" مگر دوسرے کمرے سے پلنگ پر کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے معلوم ہوا جیسے وہ اٹھ بیٹھا ہو۔ پھر کمرے میں چلنے کی آواز۔ وہ سویا نہ تھا ٹہل رہا تھا۔
بینا کو دجے سنگھ کی بے چینی کی وجہ معلوم تھی۔ اس لیے کہ وہ خود اس بے چینی کی وجہ تھی۔ سولہ برس کی تنہائی اور بے لطف زندگی کے بعد 'طوفان میل' کی بے باک محبت کے سبق دیکھ کر اس کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھے تھے اور اپنی تسلی چاہتے تھے۔ کل صبح وہ پھر جیل چلا جائے گا۔ بس چند گھنٹے باقی تھے۔
بینا نے اب تک اپنے آپ کو جنسی لذتوں سے محروم کر رکھا تھا۔ کیا اسی لیے کہ ایک کریہہ المنظر، لمبی داڑھی والے، گندے اور بیمار بڈھے کی ہوس کی آگ بجھائے؟ اس نے ہمیشہ ایک خوب صورت، تندرست نوجوان کے خواب دیکھے تھے۔ نوجوان جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اس کے ساتھ اپنا تمام جیون بتانے کو تیار ہو۔ کہاں اس کے سپنوں کا وہ کڑیل جوان، کہاں یہ مرجھایا ہوا بڈھا! نہیں ہرگز نہیں۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔
مگر بینا کے حساس مگر ہمدرد دماغ نے اسی صورت حال کو دوطرح یوں پیش کیا۔ "بے شک دجے سنگھ قبل از وقت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرے پر خوفناک داڑھی ہے۔ اس کی پیشانی پر جھریاں پڑی ہیں۔ اس کے سر پر پھنسیاں نکلی ہیں۔ اس کے منہ سے زرد اور گندے دانت جھانک رہے ہیں۔ مگر کیوں؟ بینا، سوچ۔ سولہ برس ہوئے یہی دجے سنگھ ایک خوب صورت کڑیل جوان تھا۔ تو نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ کیا تو نے اس تصویر کی طرف تمنا بھری نظروں

سے نہیں دیکھا؟ آج اسی وجے سنگھ کی یہ حالت کیوں ہے؟ کیوں؟ سولہ برس میں پچیس برس کا نوجوان اتنا بوڑھا تو نہیں ہوسکتا۔ وجے سنگھ کیوں اپنی جوانی، اپنا حسن، اپنی تندرستی کھو بیٹھا۔ انقلاب کے لیے، بینا انقلاب کے لیے۔ اسی انقلاب کے لیے جس کی خاطر تو جان دینے کو تیار ہے۔ مگر تو تو باتیں ہی بناتی ہے۔ اس نے تو کر دکھایا۔ اپنی جوانی، اپنی تندرستی، اپنے دوست اور عزیز، اپنے رومان بھرے خواب، سب کچھ انقلاب کے لیے قربان کر دیے۔ سولہ برس جیل میں کاٹے، کال کوٹھری میں رہا، کوڑوں کی مار کھائی، وارڈنوں کی ٹھوکریں کھائیں، گالیاں سنیں۔ کس لیے؟ انقلاب کے لیے۔ اور تو، تیرا دل اتنا چھوٹا ہے کہ آج تو اس وجے سنگھ کی داڑھی، اس کی جھریوں اور اس کی پھنسیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لعنت ہے تجھ پر۔''

دوسرے کمرے میں وجے سنگھ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ قدم چلتے چلتے دروازے کے قریب آئے اور رُک گئے۔ بینا کا دل بھی حرکت کرتے کرتے رک گیا۔ نہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئی نہ دروازہ کھلا۔ چند سیکنڈ کے بعد قدم واپس چلے گئے۔ بینا کا دل پھر حرکت کرنے لگا۔

''نہیں وہ اپنی طرف سے پہل نہیں کرے گا۔ وہ حساس ہے۔ اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ تجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرے گا اگر تو اُس کمرے میں نہیں جائے گی تو وہ رات بھر ٹہل کر گذار دے گا اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر پھر جیل چلا جائے گا۔ جس نے سولہ برس یوں گذار دیے وہ تو باقی زندگی بھی گذار سکتا ہے۔ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہ کر سکے گی۔ اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی۔

وجے سنگھ کے قدم چلتے چلتے رُک گئے۔ پلنگ پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر لیٹنے کی۔

''شاید سو جائے۔'' بینا نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر فوراً ہی کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ اور یہ کیا؟ کیا بینا کے کان دھوکا دے رہے تھے۔ یا واقعی وجے سنگھ رو رہا تھا؟ بینا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ وجے سنگھ رو رہا ہے۔ وجے سنگھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے کوڑے مارے گئے تو وہ ہنس رہا تھا۔ وجے سنگھ جو پھانسی کا حکم پا کر بھی مسکرایا تھا۔ وہی وجے سنگھ جس نے پچاس دن بھوک ہڑتال کی تھی۔ جو نہ قید سے ڈرتا تھا نہ مار سے۔ جو موت سے گھبراتا تھا نہ کالے پانی کی سزا سے۔ وہی وجے سنگھ آج رو رہا ہے۔ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر۔

وجے سنگھ کی آنکھیں بینا کے شہوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی تھیں۔ اس نے بینا کے ہاتھ کو چھوا تھا مگر یہ پیغام بے کار ثابت ہوا تھا لیکن اس کو روتا دیکھ کر بینا کی ممتا جاگ اٹھی، بچوں کی ہر ضد پوری کرنی چاہیے۔ اور ہندوستان کا سب سے بڑا انقلابی، نڈر وجے سنگھ بھی اس معاملے میں بچہ ہی تو تھا۔ باوجود اپنی داڑھی، اپنی پھنسیوں اور میلے میلے زرد دانتوں کے۔

بینا کے دل کی تہہ میں سے رواجی اخلاقیات نے سر اٹھایا اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''عصمت عورت کا بہترین زیور ہے۔ کیا تو اس کو یوں لٹا دے گی؟'' اور جب یوں بھی نہ مانی تو اس کو ڈرانے کی کوشش کی۔'' وہ بیمار ہے۔ اس کے پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔ تجھے کوئی بیماری لگ جائے گی؟

مگر بینا اس وقت، ان خوفناک سولہ برسوں کا خیال کر رہی تھی جو وجے سنگھ نے قید میں گذارے تھے۔ وہ طویل عرصہ جس میں وہ زندگی کی ہر دلچسپ اور خوشگوار رنگینی سے محروم رہا تھا۔ سنیما اور تھیئٹر گانا اور ناچ۔ بچوں کی آواز غروب آفتاب کا رنگین منظر۔ چاند اور ستارے۔ برسات کی رم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ درختوں کی چھاؤں۔ پھولوں کی بہار۔ ماں کی ممتا۔ اولاد کی امنگ۔ عورت کا پیار۔ اور کل پھر وہ اسی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور یہ زندگی کے بارہ گھنٹے یوں ہی گذر جائیں گے۔ وجے سنگھ اپنی پیاس کو ساتھ لیے واپس چلا جائے گا۔ وہ جس نے اپنی جان، قوم کی آزادی اور انقلاب کے لیے قربان کر دی تھی۔ اس کے واسطے ایک عورت چند گھنٹے کے لیے اپنا جسم بھی دینے کو تیار نہ ہوگی۔ عورت نرمی۔ پیار۔ دل کے قریب ایک اور دھڑکن۔ سولہ برس تک وہ اُن سے محروم رہا۔ اس وقت اس کو اگر یہ نصیب نہ ہوا تو شاید مرتے دم تک نصیب نہ ہوگا۔

نہیں وہ ایسا نہ ہونے دے گی۔ اس نے اپنی جان انقلاب کے لیے وقف کر دی تھی۔ اپنی جان، اور اپنا جسم، اپنی عصمت بھی۔ وجے سنگھ کی قربانیوں کے سامنے اس کے حقیر جسم کی کیا وقعت تھی۔ اس سے بہتر جسم بازار میں پانچ پانچ روپے میں فروخت ہوتے ہیں، نہیں وہ اپنی محبت سے، اپنے بدن کی گرمی سے وجے سنگھ کو آرام پہنچائے گی۔ چند گھنٹے میں سولہ برس کی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے بدن میں وجے کو چند لمحے کے لیے ہی سہی،

پھولوں کی بہار بچوں کی آواز، ماں کی ممتا، موسیقی کی جھنکار، غروب آفتاب کی رنگینی۔ برسات کی رم جھم۔ سب کچھ مل جائے گا اور آئندہ زمانے میں جب وہ جیل کی سختیوں سے تنگ آکر دنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگے گا تو اسے ان چند گھنٹوں کی یاد آئے گی، ایک لڑکی کی ...، ایک نوجوان جسم کی یاد، اور وہ مسکرا دے گا۔ مایوسی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ وہ زندگی سے منہ موڑتے موڑتے رک جائے گا۔ وہ اپنے جسم اور دماغ اور دل کو زندہ رکھے گا۔ ہندوستان کی خاطر انقلاب کی خاطر اور پھر جب ملک آزاد ہو جائے گا تو وجے مایوس شکستہ خاطر نہیں بلکہ مسکراتا ہوا قید خانے سے نکلے گا۔ تاکہ پھر اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کر سکے۔ لاکھوں اس کی کہانی سنیں گے اور اس کی قربانی اور ایثار سے ان کے سر بلند ہو جائیں گے اور دل فخر سے بھر جائیں گے۔ اس وقت شاید وجے سنگھ بینا کا نام بھی بھول جائے گا۔ انقلابی حکومت کو چلانے کے کام میں اس کو ایک گمنام لڑکی کو یاد کرنے کی کب فرصت ہوگی مگر اس وقت بینا کو وہ احساسِ فتح نصیب ہوگا جو ایک آرٹسٹ کو اپنا شاہکار دیکھ کر نصیب ہوتا ہے۔

بینا اٹھی، دروازہ کھولا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

○

ایک پائیلی چاول

ناگنوں کی طرح بل کھاتی، چیونٹی کی رفتار سے رینگتی، شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھناتی، دو لمبی قطاریں — ایک مَردوں کی اور ایک عورتوں کی — سرکاری اناج کی دکان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کی قطار مَردوں کی قطار سے بھی زیادہ لمبی۔ کوئی ایک فرلانگ لمبی۔ اس کا آخری سرا سڑک کے نکڑ پر سے مڑتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں پہنچا ہوا تھا۔ دیر میں آنے والی عورتیں ایک کے پیچھے ایک کھڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کو تو اناج کی دکان کی دور سے جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ بس کچھ نظر آتا تھا تو اپنے سے اگلی عورت کا سر۔

کئی سو عورتیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، یہودی، مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھے ہوئے اور بغیر برقعہ کے۔ کالے چکنے جسم والی مچھلی والیاں، جن کے بالوں کے پھولوں کی خوشبو ان کے کپڑوں کی مچھلی کی بو میں مل کر ہوا میں پھیل رہی تھی۔ فراک پہنے ہوئے، ننگی ٹانگوں، پاؤں میں چپل غریب دیسی عیسائی گوا کی عورتیں۔ گھٹیا قسم کے پینٹ اور پاؤڈر اور سینٹ میں نہائی ہوئی۔ نقلی سلک کی جرابیں اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اینگلو انڈین لڑکیاں۔ پھول دار ریشمی شالیں کاندھوں پر ڈالے گوری چٹی کالے بالوں والی یہودنیں۔ سڈول جسم کی مرہٹنیں اور بہت دبلی یا بہت موٹی گجراتنیں۔ کلرکوں کی بیویاں، مزدوروں کی بیویاں، معمولی درجے کے

دکانداروں کی بیویاں، ٹیکسی ڈرائیوروں کی بیویاں، شادی شدہ بیویاں، غیر شادی شدہ بیویاں، موتیا کی کلیاں اور مرجھائے ہوئے پھول۔ سینٹ اور پسینہ مچھلی کی بو اور ناریل کے تیل کی بو۔ اور دوپہر کی دھوپ میں ان مختلف خوشبوؤں اور بدبوؤں کے ملے ہوئے ابخرات اوپر کو اٹھتے ہوئے۔ مرہٹی اور گجراتی اور ہندوستانی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کا ایک ناقابل فہم شور۔ کئی لاکھ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ انتظار، ساٹھ سیکنڈوں کا ایک منٹ۔ اور ساٹھ منٹوں کا ایک گھنٹہ۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ، تین گھنٹہ اور ناگن کی طرح بل کھاتی، چیونٹیوں کی رفتار سے رینگتی عورتوں کی یہ لمبی قطار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی۔ جتنی دیر میں اگلے سرے پر ایک عورت اناج لے کر رخصت ہوتی تھی دو نئی عورتیں پیچھے آکر شامل ہو جاتی تھیں۔ دو سو عورتیں، ڈھائی سو عورتیں، تین سو عورتیں، ساڑھے تین سو عورتیں۔ کتنے صبر کے ساتھ صبح سے انتظار کر رہی تھیں۔ ایک ٹانگ تھک جاتی تو دوسری کے سہارے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ صبر اور خلوص اور عقیدت کا ایک عجیب مظاہرہ۔ جیسے پجارنیں مندر کے دروازے کھلنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک نیا شوالہ، جہاں ہندو اور مسلمان، پارسنیں اور یہودنیں سب پوجا کے لیے آئی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تھیلا۔ ہر ایک کے دماغ میں بس ایک خیال۔ ایک آرزو، ایک ہوس، ایک پائیلی چاول۔

درگا آئی اور عورتوں کی قطار کے آخری سرے پر سب سے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس کو آج یہاں آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ صبح سے اُس کے سر میں، جسم میں، پیٹ میں بڑا شدید درد ہو رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ آج یہاں گھنٹوں کے لیے آکر کھڑی ہوتی مگر مجبور تھی۔ گھر میں چاول کے آخری چند دانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ دو وقت بازار کا کھانا کھایا۔ آج کئی دن کے بعد دکان کھلی تھی اگر اس نے چاول نہ خریدے تو معلوم نہیں پھر کب تک گھر کا کھانا نصیب نہ ہو اور اس عرصے میں اگر کہیں دن پورے ہو گئے اور وہ وقت آ گیا جس کا انتظار تھا تو پھر تو اور بھی مشکل ہو جائے گا۔

دُرگا کا شوہر ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ صبح کو گھر سے نکلتا تو کبھی چراغ جلے واپس آتا۔ وہ بھی دن بھر مشین کی طرح کام کرنے کے بعد تھکا ماندہ۔ بازار کا سب سودا سلف درگا ہی کو لانا پڑتا تھا۔ وہ مزدوری پیشہ عورت ٹھہری۔ اس کو کام کرنے میں نہ عار تھا اور نہ کوئی دقت۔ وہ

جب تک اپنے ماں باپ کے پاس گاؤں میں رہتی تھی کھیتی کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی، چرخہ کاتتی، چکی چلاتی۔ اپنے باپ بھائی کے لیے روٹی پکا کر کھیت پر لے جاتی۔ گائے بیلوں کے لیے کٹی کاٹتی۔ دودھ دوہتی، رات کو سونے سے پیشتر ان کے پاؤں ملا کر باندھتی...... بیاہ کے بعد جب سے شہر آئی تھی اپنے نندو کی طرح وہ بھی کارخانے میں کام کرتی تھی۔ دس گھنٹے روزانہ وہاں کام کرتی، پھر گھر آ کر چولہا پھونکتی۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہ گذرا تھا کہ وہ بہت محنت کرتی ہے۔ اپنے نندو کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

چڑیا گھر، چوپاٹی، اپالو بندر، کئی دفعہ سنیما لے گیا۔ ایسی چیزیں درگا نے اپنے گاؤں میں کاہے کو دیکھی تھیں۔ نندو اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور مزدوروں کی طرح وہ نہ شراب پی کر آتا تھا نہ اپنی بیوی کو پیٹتا تھا۔ اور ابھی چھٹا مہینہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اس نے درگا کا کارخانے جانا بند کر دیا۔ ''اب تجھے گھر میں آرام کرنا چاہیے۔ اب تو میرے لونڈے کی ماں بننے والی ہے نا؟'' نندو نے ہنس کر کہا تھا ''دیکھ! درگا لونڈا لے لوں گا۔ لونڈیاں نہیں چاہیے۔''

ناگن کی طرح بل کھاتی۔ چیونٹی کی رفتار سے رینگتی، عورتوں کی لمبی قطار اناج کی دکان کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اب درگا کے پیچھے بھی آٹھ دس عورتیں قطار میں آ ملی تھیں۔ کہیں کہیں آپس میں بحث و مباحثہ ہو رہے تھے۔ ایک پارسن بازار کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر مبسوط تبصرہ کر رہی تھی۔ ایک خوجن اناج کی کمی کا الزام کانگریس کے سر رکھ رہی تھی۔ ایک عیسائی عورت کا خیال تھا کہ یہ سب مہاتما گاندھی کا قصور ہے۔ نہ وہ سرکار سے لڑائی مول لیتے نہ سرکار ہندوستانیوں کو سزا دینے کے لیے اناج پر پابندیاں لگاتی۔

'کانگریس اور مہاتما گاندھی کو کیوں دوش دیتی ہو۔ معلوم نہیں ہے کہ گورنمنٹ نے لاکھوں من گیہوں ایران، اور عراق اور مصر بھیج دیا ہے، ایک گجراتن بولی۔

'ہاں گورنمنٹ نے اناج باہر بھی بھیج دیا ہے۔' ایک مرہٹن چمک کر بولی۔ 'مگر ہم ہندوستانی کب بے قصور ہیں۔ بنیوں اور آڑھتیوں نے اپنے گھروں میں کچھ کم اناج بھر رکھا ہے۔

'اور کیا! ہم ایک پائلی چاول کے لیے پانچ اور چھ گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہتے ہیں اور یہ بنیے ہیں کہ ہر ایک نے ہزاروں من اناج چھپا کر رکھا ہے اور چوری سے دگنی تگنی قیمتوں پر بیچ رہے ہیں۔'

'ایسے لوگوں کو پھانسی دے دینی چاہیے۔'

''وہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو ان کو رائے بہادر خان بہادر کے خطاب ملتے ہیں۔ جنگی کاموں کے ٹھیکے دیے جاتے ہیں یہ ہندوستان ہے۔''

دوسری طرف جنگ کی خبروں پر تنقید ہو رہی تھی۔

''ارے تمھیں نہیں معلوم۔ یہ جرمن اور جاپان ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جاپان کو موقع مل گیا تو روس پر حملہ کرنے سے باز نہ آئے گا۔''

''اجی تو مان لو کہ اس کی شامت ہی آگئی۔ یہ برما اور فلپائن نہیں ہیں کہ ہڑپ کر گیا اور ڈکار بھی نہ لی۔ یہ ''روس ہے روس!'' یہ کسی اخبار نویس کی بیوی تھی جس کا شوہر شاید خواب میں بھی خبروں کی سرخیاں پڑھا کرتا تھا۔

روس! دھوپ میں درگا کا سر چکرا رہا تھا مگر اس نے سوچا لفظ ''روس'' میں نے سنا ہے۔ اور نہ جانے کیوں اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس ''روس'' اور اس کی اپنی زندگی میں کوئی بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہاں! اب یاد آیا۔ نندو اُسے ایک دفعہ ایک جلسہ میں لے گیا تھا۔ مزدوروں کا جلسہ تھا۔ کوئی پچیس تیس ہزار مزدور ہوں گے۔ کئی ہزار تو عورتیں ہی تھیں۔ ہر طرف لال لال جھنڈے اور جھنڈوں پر ہتھوڑے اور درانتی کا نشان بیچ میں ایک اونچا سا چبوترہ جس پر کھڑے ہو کر لوگ تقریر کر رہے تھے اور درگا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ تقریر تو اتنی دور چبوترے پر ہو رہی ہے مگر آواز اس کے قریب ہی ایک کھمبے پر لگے ہوئے کالے بھونپو میں سے آرہی ہے۔ عجیب سی آواز جیسے کوئی کنویں میں منہ کر کے بول رہا ہو۔ اور یہ آواز کہہ رہی تھی ''بھائیو! ہٹلر کے خونی بھیڑیوں نے روس پر حملہ کر دیا ہے۔ روس جو مزدوروں کا اپنا ملک ہے۔ روس جہاں مزدوروں کا اپنا راج ہے...... دنیا کے مزدوروں کو چاہیے کہ وہ روس کی مدد کے لیے کھڑے ہو جائیں...... اور پھر ''سویت روس زندہ باد، کے نعرے ہزاروں گلوں سے اس طرح نکلے کہ معلوم ہوتا تھا آسمان پھٹ پڑے گا۔

کتنی دیر ہو گئی تھی اس کو کھڑے کھڑے؛ درگا نے مڑ کر دیکھا کوئی سولہ سترہ عورتیں اس کے پیچھے تھیں۔ اب وہ قطار کے ساتھ بڑھتے بڑھتے سڑک کے نکڑ پر آگئی تھیں۔ گردن ٹیڑھی کر کے وہ اناج کی دکان کا لال لال سائن بورڈ بھی دیکھ سکتی تھیں۔ مگر اب بھی کم سے کم سو عورتیں اس کے

اورایک پائلی چاول کے درمیان حائل تھیں۔ معلوم نہیں کیوں دکاندار اتنی دیر لگاتا ہے! درگا نے ایک تھکی ہوئی ٹانگ سے دوسری تھکی ہوئی ٹانگ پر بوجھ بدلتے ہوئے سوچا۔ اور عورتیں بھی بولتے بولتے تھک گئی تھیں اور گرمی اور خاموشی نے پوری قطار کو اپنے پنجے میں دبوچ رکھا تھا۔ نیلی وردی پہنے ایک پولیس کا سپاہی سامنے درخت کے نیچے اونگھ رہا تھا۔ اس کو اونگھتے دیکھ کر درگا کی تمام تھکن، اس کی ٹانگوں کا درد، پیٹ کی چبھن سب اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس کا جی چاہا وہیں سڑک کی پٹری پر سر رکھ کر لیٹ جائے۔ اس کے قدم ڈگمگائے تو اس نے اپنے سے اگلی عورت کے شانے کا سہارا لے لیا۔

''اری میری بہن۔ ذرا اپنے ہی سہارے کھڑی رہو۔'' کوئی بڑھیا عورت تھی۔ اس کی آواز میں کوئی غصہ یا جلن نہیں تھی مگر درگا شرمندہ ہو کر گھبرا سی گئی۔ بے خیال پیچھے ہٹی تو اس دفعہ سخت ڈانٹ پڑی.........!'' اندھی ہے میرا پاؤں کچل دیا۔'' اور یہ عورت جب درگا سے بچنے کے لیے بے اختیار پیچھے ہٹی تو قطار کے اخیر تک گالیوں اور کوسنوں کا کئی مختلف زبانوں میں شور بلند ہوتا گیا۔

درگا شرمندگی سے پانی پانی ہوگئی۔ اس نے دانت کچکچا کر اپنے آپ کو قابو میں کیا اور زمین میں نظریں گڑا دیں۔ ایک دفعہ اس کا جی چاہا کہ ایک پائلی چاول کی امید چھوڑ کر گھر بھاگ جائے، مگر پھر سوچا کہ نند و شام کو تھک کر آئے گا تو کیا کھائے گا۔ اس کا اچھا اچھا نند و جو اس کی خاطر آج کل کئی کئی گھنٹے روزانہ ''اوور ٹائم'' کام کرتا ہے۔ اور اب تو وہ دکان کے قریب ہی آ گئی تھی۔ اگر کسی نہ کسی طرح ایک آدھ گھنٹہ اور گزر جائے تو پھر وہ چاول لے کر ہی گھر جائے گی۔

مگر یہ پیٹ میں اتنا درد کیوں ہو رہا ہے؟ جیسے کوئی آری چلا رہا ہے۔ درگا تکلیف کے مارے پسینوں میں نہا رہی تھی۔ اس کا سر پھر چکرا رہا تھا۔ اور پیٹ کے اندر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کرب و اذیت کا جوار بھاٹا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دشمن بھالا لیے بار بار حملہ کر رہا ہے۔ ایک وار کا زخم نہیں بھرتا کہ دوسرا وار کرتا ہے۔ کیا دن پورے ہو گئے ہیں؟ کیا وہ وقت آ گیا ہے جس کا وہ اتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تین ہی دن تو ہوئے دائی نے کہا تھا کہ دس پندرہ دن اور لگیں گے۔ شاید یہ کوئی اور قسم کا درد ہے! درد اور تکلیف کے

اس طوفان میں درگا نہ جانے کس طرح پوری قطار کے ساتھ آپ سے آپ دکان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب صرف ایک عورت اس کے سامنے تھی۔ جب یہ عورت بھی دکان کے اندر چلی گئی تو درگا نے دیکھا کہ اس کو بھی سیڑھی پر چڑھ کر جانا ہوگا۔ ایک ایک فٹ کی یہ سیڑھیاں اس کو ایسی معلوم ہوئیں جیسے اس کے گاؤں کا مندر والا ٹیلہ جس کی چوٹی پر جانے کے لیے سو سے زیادہ سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا تھا، ہے بھگوان! وہ اس ڈگمگاتی ہوئی لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ کر دکان کے اندر کیسے جاسکے گی۔

اس سے اگلی عورت تھیلے میں ایک پائیلی چاول لیے، مسکراتی، پسینہ پونچھتی دکان سے باہر نکل آئی۔ درگا کے پیچھے والی عورت نے اس کا ٹھوکا دیا' چل بابا چل۔ کیا سو رہی ہے۔' بنئے نے بھی درگا کی طرف دیکھا اور کہا: 'آ۔ بائی۔ کیوں دیر لگا رکھی ہے؟' مگر اس نے یہ نہ دیکھا کہ درگا کی رنگت پیلی پڑتی جارہی تھی۔ اس کی ٹانگیں سیڑھی پر چڑھنے کے خیال سے ہی ڈگمگا رہی تھیں۔

'مجھ سے...... مجھ سے.......... مجھے یہیں دے دو، بھائی؟' اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ آواز بھی مشکل سے نکلی۔

'تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ لینا ہے تو اندر آکر لو۔'

'چلتی کیوں نہیں آخر؟'

'نہیں لینا ہے تو رستہ چھوڑ دے۔ دوسروں کو جگہ دو۔'

ہر قدم پر درگا یہی سمجھتی رہی کہ وہ چکرا کر گر پڑے گی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر دکان کے اندر پہنچا دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلا بنئے کی طرف بڑھا کر اس نے دام سامنے رکھ دیے جو چار گھنٹے سے وہ اپنی مٹھی میں لیے ہوئے تھی اور جو پسینے سے گیلے ہو رہے تھے۔ دکاندار نے پائیلی کا پیمانہ اٹھایا، اس کو چاول سے بھر کر درگا کے تھیلے میں ڈال دیا۔ پھر درگا نے دیکھا کہ وہ موٹا بنیا آپ سے آپ گھوم رہا ہے۔ پائیلی برتن بھی چاول کا تھیلا بھی۔ پوری دکان گھوم رہی ہے اور گھومتے گھومتے پوری دکان— اناج کی بوریاں، گھی کے پیپے، دیوار پر لٹکی ہوئی ہنومان کی تصویر— درگا سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ چاولوں کے ایک ڈھیر کے نیچے دبی پڑی ہے۔ اس کا سانس گھٹا جارہا

ہے۔ مگر اس کے اوپر سے چاول آپ سے آپ ہٹ گئے۔ ہنومان جی ان چاولوں کو پائیلی کے برتن میں بھر بھر کر سب عورتوں کو بانٹ رہے ہیں۔ یہ لو ایک پائیلی چاول۔ یہ لو ایک پائیلی چاول۔ اور ہنومان جی کی دُم خوشی سے ناچ رہی ہے۔ مگر نہیں یہ تو دُم نہیں ایک ناگن ہے اور اس کا منہ اس عورت کی طرح سے ہے، جس نے درگا کو گالی دی تھی۔ اور دَم بھر میں یہ ناگن پھول گئی، بڑھتی گئی اور دکان سے لے کر بل کھاتی ہوئی نکڑ والی گلی تک جا پہنچی۔ پھنکاریں مارتی ہوئی اب وہ درگا کی طرف بڑھتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دم میں اس کو ہڑپ کر جائے گی۔ ناگن نے اوپر کا سانس لیا اور درگا کھنچتی ہوئی اس کے پیٹ میں چلی گئی......

مگر نہیں یہ ناگن کا پیٹ نہیں تھا بلکہ ایک اندھیرا کمرہ تھا۔ اندھیرا اور گرمی تھی، ہوا بند۔ درگا کا دم گھٹنے لگا۔ اندھیرے کی تہہ میں سے کسی کی آواز آئی۔ 'یہ ہندوستان ہے ہندوستان۔' اور پھر اندھیرے میں دور سے دو لال روشنیاں چمکنے لگیں۔ درگا سمجھی یہ ناگن کی آنکھیں چمک رہی ہیں مگر قریب آئیں تو اس نے دیکھا کہ یہ تو لال جھنڈے ہیں اور ان پر ہتھوڑے اور درانتی کا نشان۔ آپ سے آپ ہوا میں اڑے جا رہے تھے۔ اب چاروں طرف روشنی ہوگئی۔ ہزاروں لاکھوں مزدور کچھ عجیب زبان میں گاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ایک کنویں کے اندر سے آواز آئی۔ 'یہ روس ہے روس' اور پھر دفعتاً بادل چھا گئے اور بجلی چمکنے لگی۔ دور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز آئی۔ نہیں یہ بادل نہیں گرج رہے تھے بلکہ توپیں چل رہی تھیں۔ بم برس رہے تھے۔ جیسے اس نے سنیما میں دیکھے تھے۔ ایک بم بالکل درگا کے قریب آکر گرا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ہوا میں اڑ گئے......

اور اب اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ننگی پڑی ہے۔ ننگی، مادرزاد ننگی۔ درگا شرم کے مارے گڑ گئی۔ مگر وہ اٹھنے نہ پائی تھی کہ ایک ہیبت ناک دیو آیا اور ایک بہت بڑے آرے سے اس کا پیٹ کاٹنے لگا مگر جب اس کو قریب سے دیکھا تو درگا کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ خود اس کا شوہر نندو تھا۔ خوشی خوشی وہ اس کا پیٹ کاٹ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ 'لونڈا لوں گا لونڈا، مجھے لونڈیا نہیں چاہیے۔' 'یہ ہندوستان ہے ہندوستان۔' تو اس پر وہ موٹی گجراتن بولی گاندھی جی کو کیوں دوش دیتی ہے۔ ان کو تو خود انگریز بھوکا مار رہے ہیں......'

سب لوگ غائب ہو گئے۔ اب درگا نے دیکھا کہ وہ موٹی ہو گئی ہے۔ اس بنئے سے بھی زیادہ موٹی اور اس کی توند نکل آئی ہے ایک مٹکے کے برابر۔ اور پھر کسی نے اس کی توند میں ایک سُوا گھپا دیا اور اس میں سے خون نکلنے لگا۔ اتنا نکلا کہ اس کے تمام کپڑے اور جسم خون میں لت پت ہو گیا اور اس کا پیٹ پچک کر کمر کو لگ گیا۔ کہیں دور کوئی درگا کے دماغ کے دروازے کو کھٹ کھٹا رہا تھا۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے اور بے ہوشی کے بادلوں میں سے دکان گھومتی گھومتی نکل رہی تھی۔ گھومتے گھومتے............ آہستہ آہستہ دکان ٹھہر گئی۔ سامنے ہنومان جی کی تصویر بدستور لگی ہوئی تھی۔

کمزوری کی وجہ سے درگا گردن بھی نہ موڑ سکتی تھی۔ مگر اس کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے دکان آدمیوں سے بھری ہوئی ہو۔ آوازیں بدستور آ رہی تھیں مگر کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔

'............ بیچاری............ شاید پہلا ہی ہے............'

'کسی مزدور کی............ معلوم نہیں کہاں ہو گا............'

'چلو ہٹو............ تماشہ............ نکلو'

درگا نے اپنے پیٹ میں ایک عجیب خلا محسوس کیا۔ ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو ایسا معلوم ہوا گویا تمام کپڑے پانی...... نہیں خون...... میں لت پت ہیں اور دفعتاً اس کے دماغ میں ایک ہولناک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔

''میں نے یہاں...... تمام دنیا کے سامنے بچہ جنا ہے! ہے بھگوان کیا یہ بے شرمی میرے ہی بھاگ میں لکھی تھی؟'' اس کا بس چلتا تو وہیں زمین میں گڑ جاتی۔ ایسی بے عزتی سے تو موت ہی بہتر تھی۔ کمزوری کی ایک لہر آئی اور درگا نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا اب میں کس طرح یہاں سے جاؤں گی؟ کیسے کسی کو منہ دکھاؤں گی؟ ساری دنیا میری طرف اشارہ کرے گی۔''

کئی منٹ درگا اسی شرمندگی کے سمندر میں غرق رہی۔ کمزوری اور بے ہوشی کا پھر غلبہ ہونے والا تھا کہ............

''قیں۔ ایں۔ ایں۔ ایں............''

ایک بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ ایک بچہ۔ درگا کا بچہ۔ نندو کا بچہ۔

اور اس ننھی سی آواز نے سماج کو بنائی ہوئی شرم اور نفاست کی دیواروں کو لرزا دیا۔ درگا کے دماغ پر سے کمزوری اور بے ہوشی کے بادل چھٹ گئے۔ اس نے تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گردن موڑی اور دیکھا کہ چند میلے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک لال بوٹی سا بچہ ننھا سا منہ کھول کر رو رہا ہے۔ بھوکا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا اور اپنی چولی کے بند کھولنے لگی۔

ماتا کی عظمت، نسائی تجسس پر غالب آئی اور سب لوگ مسکراتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئے۔

چند منٹ کے بعد درگا دیوار کا سہارا لیتی ہوئی اٹھی اور ڈگمگاتے قدموں مگر فاتحانہ نظروں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ ایک ہاتھ سے وہ گود میں اپنے بچے کو تھامے ہوئی تھی۔ دوسرے میں اس کا تھیلا اور تھیلے میں ایک پائلی چاول۔

O

ماں

سلویا!

وہ ایک نرس تھی۔ دہلی کے ارون اسپتال میں ملازم تھی۔ دن بھر میں بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتی، تب جا کر مہینے میں پینتالیس روپے نصیب ہوتے تھے۔ ہر تیسرے مہینے رات کی ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی۔ تیس یا اکتیس راتوں کو (فروری کا مہینہ آج تک اس کے حصے میں نہ آیا تھا) جاگتے جاگتے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ دن میں سونے کا وقت تو ملتا مگر روشنی اور شوروغل میں رات کا چین کب نصیب ہوتا ہے۔ آخر کی پانچ چھ راتوں میں تو اس کی یہ حالت ہو جاتی کہ اگر ہر گھنٹے ٹھنڈے پانی سے منہ نہ دھوئے تو کھڑی کھڑی سو جائے۔

جنرل وارڈ جہاں اس کو کام کرنا پڑتا تھا۔ پچاس گز لمبا تھا۔ چالیس مریضوں کے پلنگ ایک طرف اور چالیس کے دوسری طرف، بیچ میں جو جگہ چھٹی ہوئی تھی۔ ایسی معلوم ہوتی جیسے جنگل کے بیچوں بیچ ایک سیدھی سڑک نکالی گئی ہو۔ اسی سڑک پر سلویا کو بارہ گھنٹے میں کم از کم پچاس پھیرے کرنے پڑتے۔ دس بارہ مرتبہ اسپیشل وارڈ میں جانا پڑتا۔ چار پانچ مرتبہ باورچی خانے میں جا کر مریضوں کی خوراک کے متعلق ہدایات دینی ہوتیں۔ دو تین بار ڈاکٹر کو بلانے اسپتال کے دوسرے سرے تک جانا ہوتا۔ کل ملا کر بارہ گھنٹے میں اسے تقریباً چھ سات میل پیدل

چلنا پڑتا۔ بیٹھنے کی مہلت تو شاید ایک گھنٹہ کی بھی نہ ملتی تھی۔ چلنا نہ ہوتا تب بھی کھڑا رہنا پڑتا۔ روز کی اس تکان سے اس کی ٹانگیں سوج گئی تھیں۔ کبھی کبھی تو یہ حالت ہو جاتی کہ قدم نکالنا مشکل ہو جاتا تھا مگر پھر وہ تیل کی مالش سے تھکے ہوئے پٹھوں اور ابھری ہوئی رگوں میں کچھ جان ڈالتی اور اپنا روزانہ کا چکر جاری رکھتی۔ اس سے اگر جنت کے تخیل کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ ضرور یہ کہتی کہ ''جنت وہی مقام ہے جہاں میں چوبیس گھنٹے پلنگ پر لیٹی رہا کروں گی اور مجھے کھانا کھانے کے لیے بھی ٹانگیں ہلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

سلویا!

وہ ایک نرس تھی۔ بیماروں کو دوا پلانا۔ ان کی دیکھ بھال کرنا اس کا کام تھا۔ ہر تین گھنٹے کے بعد اسی بیماروں کا ٹمپریچر لینا۔ ہر تین گھنٹے کے بعد اسی بیماروں کو دوا پلانا۔ ہر صبح انہی اسی بیماروں کے پلنگوں کی چادریں بدلنا اور پھر ان کے کپڑے بدلوانا۔ ہر ایک کا منہ دھلوانا۔ جو زیادہ بیمار تھے ان کو دن میں کئی کئی بار پیشاب پاخانہ کرانا۔ اگر وہ قے کریں تو تسلہ لیے سامنے کھڑے رہنا اور پھر غلاظت سے بھرے ہوئے برتنوں کو اٹھا کر باہر لے جانا۔ کمزوری کی وجہ سے یا بیہوشی کی وجہ سے بعض بیماروں کو اپنے قویٰ پر قابو نہیں تھا۔ ان کو اٹھانا بٹھانا، ان کو کھانا کھلانا یہ سب اسی کے ذمے تھا۔ اگر اپنی بے چارگی کی وجہ سے ان کا پیشاب پاخانہ نکل جاتا تو سلویا پلنگ کی چادر بدلتی، کپڑے تبدیل کراتی اور پھر (ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق) فوراً مریض کی کمر پر تیل کی مالش کرتی۔

سلویا!

کیا وہ انسان نہیں تھی؟ کیا وہ مشین تھی؟ بے حس اور ان تھک؟ کیا مریضوں کی قے اور ان کی پیپ، ان کے پیشاب اور پاخانے سے اس کو کراہیت نہ آتی تھی؟ کیا ان بیماروں، زرد، یرقانی، جریانی، سفلسی، جھریاں پڑے ہوئے چہروں کو دیکھتے دیکھتے اس کا احساس حسن بالکل فنا ہو گیا تھا۔ کیا وہ بھی دل اور دماغ رکھتی تھی؟ کیا اس کے دل میں بھی امنگیں تھیں؟ کیا اس کے دماغ میں بھی منصوبے تھے؟ کیا اس کے کان بیماروں کی کراہوں اور موت کی ہچکیوں کو سنتے سنتے اتنے بے حس ہو گئے تھے کہ ستار کی ایک گت، کسی خوش گلو کے ایک گانے، چڑیوں کے چہچہانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا؟ کیا بیماری اور موت کی قربت نے زندگی اور زندگی کی تڑپ کو بالکل فنا کر دیا تھا؟

سلویا!

وہ ایک نوجوان، خوب صورت نرس تھی۔ اپنے کام میں ہوش مند خلیق، ملنسار، ہنس مکھ، مگر سب نرسیں بظاہر ایسی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے یہ سب طور طریقے بناوٹی ہوتے ہیں۔ دراصل وہ بڑی آوارہ، بڑی مطلب پرست ہوتی ہیں۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں ہوتا۔ کالج کے لڑکے، ہسپتال کے ڈاکٹر، جنسی بھوک کے مارے کلرک سب ہی تو ان کے شکار بنتے ہیں۔ اپنی سفید، کلپ لگی ہوئی وردی میں وہ ہمدردی اور رحم کا فرشتہ معلوم ہوتی ہیں مگر ان کے سیاہ دلوں میں سوائے نفس پرستی اور روپے کی محبت کے دوسرا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ شاید نرس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ شاید نہیں ہوتیں۔ کون کہہ سکتا ہے سوائے اس کے کہ عام طور سے انسان خواہ وہ فلم ایکٹرس ہو، مولوی ہو، پنڈت ہو یا نرس ہو پھر بھی انسان ہی ہوتا ہے اگر بعض نرسیں اپنی روزانہ کی مشقت اور کم تنخواہ سے تنگ آ کر اپنا دل اور جسم بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں تو پھر بھی انسانیت سے عاری نہیں ہو جاتیں اگر اپنے ماحول کی کثافت اور بیماری کو بھولنے کے لیے چند گھنٹوں کے لیے اپنے آپ کو کسی صحت مند، صاف ستھرے نوجوان کی گود میں بھول جاتی ہیں تو یہ تو ان کے انسان ہونے کے ثبوت ہیں۔ شیطان اور فرشتے دونوں میں جذبات جیسی انسانی کمزوری کا پتہ بھی نہیں ملتا۔

سلویا!

وہ انسان تھی۔ انسانی کمزوریوں کا مجموعہ۔ نہ وہ پاکبازی کا فرشتہ تھی اور نہ عصمت وعفت کی دیوی، ایک دفعہ نہیں کئی بار اس نے تجرباتی معاشقے کیے تھے۔ معاملات جسمانی تعلقات تک بھی پہنچ چکے تھے۔ اسپتال کی خشک، صحت اور غیر رومانی فضا کا ردعمل اگر سلویا جیسی نرسوں کے پاس تھا تو وہ کیا تھا۔ مریضوں کی کراہیں، قے اور پیپ کی بو، پھنسیاں اور پھوڑے، پیشاب اور پاخانہ، انجکشن اور ایجما، پیشانی میں دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، نیلی نیلی ابھری ہوئی رگیں، گلٹیاں اور رسولیاں اور فیل پائے۔ ان سب کو ایک لمحے کے لیے بھولنے کی صرف ایک ہی صورت تھی! کسی کے گرم گرم بدن کی قربت، اس کا سانس، اس کے بدن کی 'صاف ستھری' خوشبو۔ ان سب میں کتنا جادو کا اثر تھا۔

مگر افسوس اس جادو کا اثر چند منٹ، زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے ہی رہتا تھا۔ ہر ایسے تجربے کے بعد سلویا اپنے دل کو ایک نامعلوم درد سے بھرا پاتی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہو۔ اس کے ''دوست'' عام طور سے مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اس کو سینما لے جاتے، تحفے خرید کر دیتے، موٹروں میں سیر کراتے، میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ غرض ایک کڑوی گولی پر ہر قسم کی شکر چڑھاتے مگر پھر بھی سلویا کے منہ میں کونین کا مزہ رہ جاتا۔ ان سب مہربانیوں کی آڑ میں اس کو بازار کی خرید و فروخت کی جھلک نظر آتی۔ ان میٹھی میٹھی باتوں میں ایک مالکانہ لہجہ سنائی دیتا۔ چند گھنٹے کی تفریح کے بعد جب وہ اپنے ہاسٹل واپس آتی۔ جہاں وہ سات اور نرسوں کے ساتھ ایک بڑے کمرے میں رہتی تھی اور اپنے پلنگ پر سونے کے لیے لیٹ جاتی تو اس کی زندگی کی تمام تکلیف، تمام تلخی، تمام تکلیفیں، ایک دم واپس آجاتیں اور چند لمحوں کے عیش کے بعد یہ احساس ناکامی اور بھی شدید ہو جاتا اور اس وقت رات بھر اندھیرے میں سلویا کی سوئی ہوئی روح بیدار ہو جاتی، جن امنگوں کو ہر وقت دل میں بند رکھتی تھی، اس وقت ایک رُکے ہوئے دریا کی شدّت سے امڈ آتیں۔ شادی، ایک ہمدرد، چاہنے والا، مہربان شوہر، ایک عمدہ آرام دہ مکان، ایک بڑا سا نرم نرم بستر والا پلنگ............ اور ان سب سے زیادہ اہم............ بچے۔ سلویا کے اپنے بچے۔ کیا ان سب کو وہ کبھی حاصل نہ کر سکے گی؟ یہ وہ سوال تھا جو اکثر رات کی ڈیوٹی کے اوقات میں بھی پریشان کیے رہتا اور پھر اس کے قدم آپ سے آپ اسے بچّوں کے وارڈ کی طرف لے جاتے اور وہ کسی ننھے مریض سے باتیں کرنے یا کھیلنے میں کھو جاتی — یہاں تک کہ 'سسٹر' کی کرخت چیخیں اسے پھر دُنیا کی تلخ حقیقت کی یاد دلاتیں اور وہ اپنے وارڈ کی طرف لوٹ آتی۔

''ماں!''

رات کا ایک بج چکا تھا۔ وراڈ میں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر تاریکی کے اس سمندر کے بیچ میں روشنی کا ایک جزیرہ وہ میز تھی، جہاں ایک لیمپ کی روشنی میں بیٹھی ہوئی سلویا مریضوں کی رات کی رپورٹ لکھ رہی تھی۔ اس کو پھر کالی کھانسی کی شکایت ہوگئی تھی۔ نمبر 27 کمر میں درد کی شکایت کر رہا تھا۔ بے چارہ ڈیڑھ مہینے سے ایک ہی کروٹ پڑا تھا۔ درد نہیں ہوگا تو کیا

ہوگا۔ نمبر 54 شاید ہی صبح تک زندہ رہ سکے۔ اس کے سر میں بڑا گہرا زخم تھا۔ اندر کی رگیں کٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ غریب شکل اور کپڑوں سے گاؤں کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ شاید آج ہی شہر آیا تھا۔ لاری کی چپیٹ میں آ گیا۔ اس وقت جو وہ بیہوش ہوا تو اب تک ہوش نہ آیا تھا مگر یہ اس نے پکارا۔

''ماں۔''

سلویا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اس اندھیرے میں دیکھنا تو ممکن نہ تھا۔ لیمپ کی روشنی میز کے علاوہ قریب کے دو پلنگوں تک ہی پہنچتی تھی مگر سلویا کے کان اس کے وارڈ کی آوازوں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ وہ اندازا سن سکتی تھی کہ کسی کراہنے کی آواز کدھر اور کس کونے سے آئی ہے۔ کبھی تو یہ بھی بتا سکتی تھی کہ کون مریض کراہ رہا ہے مگر اس وقت وہ اپنے خیالات میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اندازہ نہ لگا سکی کہ کس مریض نے آواز دی۔ کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید اسی مریض کی پھر آواز سنائی دی مگر جب وارڈ کی خاموشی سے سوائے نمبر 35 کے خراٹوں یا نمبر 14 کی کالی کھانسی کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی تو وہ پھر اپنے دماغ میں سمٹ گئی۔

آج رات کو رپورٹ لکھنا سلویا کو عجیب لگ رہا تھا کیونکہ یہ اس کی آخری رپورٹ ہوگی۔ آج اس کی آخری رات کی ڈیوٹی ہے۔ کل سے اس منحوس اسپتال کا منہ بھی نہ دیکھے گی۔ نہ مریض ہوں گے نہ شب بیداری ہوگی۔ نہ اس وارڈ کے چکر لگانے پڑیں گے۔ نہ مریضوں کا پیشاب پاخانہ اٹھانا پڑے گا۔ یہ اس کی غلامی کی آخری رات تھی۔ کل سے وہ آزاد ہوگی۔ آزادی کا خیال کتنا خوشگوار تھا۔ جس نے اس وارڈ سے اس کو اٹھا کر جنت میں پہنچا دیا، جہاں خوشی ہی ہوگی، آرام ہی آرام، ایک عمدہ سا مکان، مکان کے اردگرد باغ، باغ میں پھولوں کے درخت، مکان میں ایک نرم نرم بستر والا پلنگ اور ایک ہمدرد چاہنے والا شوہر!

جارج کا خیال آتے ہی سلویا کی شفاف پیشانی پر فکر کی ایک ہلکی سی شکن پڑ گئی۔ یہ بات نہیں ہے (اس نے اپنے دل کو یقین دلایا) کہ جارج ایک قابل قدر شوہر نہیں ہے۔ این ڈبلیو آر میں گارڈ ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ ہر سال ترقی ملتی ہے۔ بڑھتے بڑھتے تنخواہ ڈھائی سو ہو جائے گی۔ اب بھی وہ ایک چار کمروں والے مکان میں رہتا ہے اور اس کے اردگرد

باغیچہ بھی ہے۔ چھوٹا ہی سا، مگر ہے تو۔ رہا نرم نرم بستر والا پلنگ وہ بھی ضرور ہوگا۔ جارج نے جب سلویا کو دو تین بار اپنے ہاں چائے اور ایک بار کھانے پر بلایا تھا تو سونے کے کمرے میں جانے کا کوئی موقع نہ آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ جارج باقاعدہ گرجا جانے والا ایک مذہبی قسم کا انسان تھا۔ رواجی اخلاقیات کا سخت پابند۔ اس نے اب تک سلویا کو چوما بھی نہیں، بستر تک پہنچنے کا تو ذکر ہی کہاں!

جارج اور بستر کا خیال ایک ساتھ آتے ہی معلوم نہیں کیوں، سلویا کو ایک جھرجھری سی آ گئی اور ہر لحاظ سے جارج ایک مناسب اور معقول شوہر معلوم ہوتا تھا۔ جب سے سلویا اس سے اپنی پھوپھی کے ہاں کرسمس کی رات کو ملی تھی وہ نہایت مہربانی، نہایت اخلاق بلکہ یوں کہیے شفقت کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر محبت؟ تو وہ کوئی نوجوان لڑکا تھوڑے ہی تھا کہ بات بے بات اپنی محبت کا اظہار کرتا یا اندھیرے کونوں کھدروں کی تاک میں رہتا کہ کب موقع ملے اور کب کسی لڑکی کو چوم لے۔ اس کی عمر ایسی حرکتوں کے قابل نہ تھی۔ اس کی عمر؟ ایسی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔'' سلویا نے اپنے آپ کو سمجھایا۔'' ہوگی یہی پینتیس چالیس برس۔ حد سے حد پینتالیس اور پچاس سے زیادہ تو کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ ابھی تو اس کی پنشن ہونے میں کئی برس باقی تھے۔'' اس کی پہلی بیوی کو مرے دس برس گذر چکے تھے۔ اس وقت سے وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ بال بچہ بھی کوئی نہ تھا۔ جب اس نے سلویا سے شادی کی درخواست کی تو کہا تھا ''سلویا۔ دیکھو میں اتنے بڑے مکان میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ میرے کھانے پینے، کپڑے لتے کی خبر لینے والا بھی کوئی نہیں۔ ڈیڑھ سو تنخواہ ملتی ہے۔ وہ سب نوکر اڑا دیتا ہے۔ تم مجھ سے شادی کر لو تو میری دُنیا سدھر جائے۔' بس اتنا ہی۔ سلویا کے دل نے ان الفاظ کو ناکافی سمجھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی شادی کی تجویز جوشیلے اظہار محبت کے ساتھ کرے۔'' تم میری زندگی کا روشن ستارہ ہو۔ تمھارے بغیر میرا جینا محال ہے۔ تم میرے دل کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے آن بسو تو میرے من میں بہار آ جائے۔'' مگر سلویا کے دماغ نے کہا'' بیوقوف ایسے موقع کو ہاتھ سے مت جانے دے۔ محبت کا اظہار تو بہت سے نوجوانوں نے کیا ہے مگر ایک نرس سے شادی کرنے کا ارادہ تو ایک نے بھی ظاہر نہیں کیا۔'' دل پر دماغ غالب آیا اور سلویا نے ''ہاں'' کر دی۔

''ماں!''

اندھیرے کے سمندر کی تہہ میں سے ایک کمزور آواز نے پکارا، سلویا کے خیالات کا سلسلہ منتشر ہو گیا۔ اس آواز میں کچھ ایسا درد بھرا تھا کچھ ایسی فریاد تھی کہ اس سے نہ رہا گیا۔ وہ ٹارچ لے کر کھڑی ہو گئی۔ آواز دائیں ہاتھ کے کونے سے آئی تھی۔ وہ مریضوں کے چہروں پر روشنی ڈالتی ہوئی چلی۔ نمبر 50 کمبل اوڑھے آرام سے سو رہا تھا۔ اب اس کا ٹائیفائڈ جاتا رہا۔ دو چار دن میں جانے والا ہے۔ نمبر 51 کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس لیے الٹا منہ کے بل سوتا ہے۔ نمبر 52 کو صرف ملیریا کی شکایت ہے۔ جو اس وارڈ میں سب سے کم مہلک مرض ہے۔ نمبر 53 کو بواسیر کی بیماری ہے۔ آپریشن ہونے والا ہے اور معلوم نہیں یہ بے چارہ زندہ بھی ہے یا چل بسا۔ سلویا کی چارٹ کی روشنی نمبر 54 کے منہ پر پڑی۔ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں سے نکلا ہوا چہرہ ایک کسان کا تھا۔ جس کی عمر کوئی پچاس برس کے قریب ہوگی۔ شام ہی اس کو داخل کیا گیا تھا مگر اس وقت سے وہ بیہوش تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اسے رات کو ہوش آ جائے تو فوراً اطلاع دی جائے اور اگر ہوش نہ آیا تو اس کے بچنے کی امید نہیں ہے۔

'ماں!'

پٹیوں کے اندر سے دبی ہوئی آواز مظلوم کی فریاد کی طرح نکلی۔ تو نمبر 54 ہوش میں آ رہا ہے۔ سلویا نے یہ سوچا اور فوراً باہر دوڑی۔ ڈاکٹر کو اس کے کمرے سے بلا لائی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور ایک انجکشن دیا۔ ایک دوا بھی دی کہ جب ذرا زیادہ ہوش آئے تو پلا دی جائے۔ مریض کے بچنے کی ہلکی سی امید ہو چلی۔

ڈاکٹر واپس چلا گیا۔ مگر سلویا نمبر 54 کے پلنگ کے پاس کھڑی رہی۔ مریض کے بدن میں موت اور زندگی کی کش مکش ہو رہی تھی۔ مقابلہ سخت تھا۔ اس کا سیاہ بالوں والا ہاتھ جو سفید چادر پر رکھا ہوا تھا۔ دفعتاً شدت کرب سے آپ سے آپ اٹھتا پھر بے جان ہو جاتا۔ ایک دفعہ ہاتھ کی انگلیوں نے پلنگ کو ٹٹولا کہ کسی چیز کو پکڑ لیں مگر چکنی چادر پھسل گئی اور انگلیاں تشنج کے زور سے ایک دوسرے میں گھس گئیں۔ پٹیوں کے اندر سے دبی ہوئی آواز آئی۔ ''ماں'' سلویا نے اپنا نرم ہاتھ بوڑھے کسان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بخار سے تپ رہا تھا۔ ہلکے ہلکے سہلانے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس

سے کچھ آرام پہنچا کیونکہ تشنج میں کمی ہوگئی۔

''ماں۔ارے میری ماں۔''

اس دفعہ نمبر 54 کی آواز زور سے نکلی۔ سلویا دواؤں کے کمرے میں گئی اور ایک خوراک بنا کر لے آئی۔ ایک ایک چمچہ کر کے پلائی۔ بوڑھا کسان آدھا ہوش میں تھا۔ منہ بھی مشکل سے کھولتا تھا اور کھلتا تھا تو اس میں سے یہی آواز آتی تھی ''ماں۔ارے میری ماں۔''

''ہاں بیٹا۔ یہ دوا پی لو۔'' سلویا نے آہستہ سے، نرمی سے، محبت سے کہا۔ بوڑھا کسان جس کا نیم بے ہوش دماغ معلوم نہیں بچپن کی کس وادی میں سیر کر رہا تھا۔ بڑبڑایا 'اچھا ماں' اور اس نے دوا پی لی۔

اسپتال کے گھنٹے نے چار بجائے مگر سلویا نمبر 54 کے سرہانے سے نہ ہٹی۔ ایک مہینہ کی رات کی ڈیوٹی کرتے کرتے ہوگیا تھا، ٹانگیں تھک کر چور ہوگئی تھیں۔ چند گھنٹے پہلے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ میز پر سر رکھ کر ہی سوجائے مگر کسی مریض کو تکلیف میں دیکھ کر اس کو نہ معلوم کیا ہوجاتا تھا۔ نہ نیند رہتی اور نہ ٹانگوں کی تکان۔ اس کے دل کی اُمنگیں، دماغ کے منصوبے، جوانی کے خواب، ماں بننے کی حسرت — کوئی جذبہ، کوئی خیال بھی تو باقی نہ رہتا اگر کوئی خیال رہتا تو یہی کہ اس مریض کی تکلیف کس طرح کم ہوجائے۔ جب وہ کسی مریض کو ایسے شدید مرض میں مبتلا دیکھتی کہ جان کا خطرہ ہوتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ ایک میدانِ جنگ میں ہے اور موت کی بے پناہ فوجوں سے تن تنہا مقابلہ کر رہی ہے اور اگر اس مریض کی جان بچ جاتی تو اس کو وہی خوشی محسوس ہوتی جو کسی ملک کے فاتح کو ہوتی ہے۔ موت انسان کی سب سے زبردست دشمن ہے۔ اس کو زیر کر کے سلویا کا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

'ماں!!'

اس دفعہ بوڑھے کسان کی آواز میں کرب کم تھا اور سکون زیادہ۔ سلویا پھر ہلکے ہلکے ہاتھ سہلانے لگی اور دوسرا ہاتھ اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں اس کو آرام سے سوتا دیکھ کر اس کو جو خوشی ہوئی وہ ان تمام تکلیفوں کا بدلہ تھی جو سلویا نے پانچ سال کی نرسنگ میں اٹھائی تھیں، موت کے لشکر پیچھے ہٹ گئے تھے!

اور دفعتاً سلویا کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ وارڈ، یہ مریض، یہ اسپتال، یہ سب اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکے ہیں۔ ان کے بغیر اس کا جیون ادھورا رہ جائے گا۔ جب جارج اپنی ڈیوٹی پر جایا کرے گا تو وہ اکیلی، بے کار گھر میں بیٹھی کیا کرے گی؟ پھر وہ موت کے لشکروں کا مقابلہ کر کے ان کو کیسے شکست دے گی؟ دوسری نرسیں کبھی کبھی تھک کر سو جاتی ہیں۔ اگر وہ بھی رات سو گئی ہوتی اور اس بوڑھے کسان کی آواز نہ سنتی تو وہ بے چارہ ممکن ہے مر جاتا۔ ہرگز نہیں، یہ کام وہ نہیں چھوڑ سکتی۔

مگر جارج نے تو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "میں نرسنگ ورسنگ کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میری بیوی نرس کہلائے۔" یہ خیال آتے ہی سلویا کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا اور اس کے پیچھے جارج اپنے اصلی خد و خال میں نظر آیا۔ سلویا اس کو دیکھ کر کانپ اٹھی۔ "کیا اسی شخص کے واسطے میں اپنا کام، اپنی زندگی قربان کر رہی تھی؟" چھوٹا قد، سینہ چڑیا جیسا، چوہو جیسی مونچھیں جو سگریٹ کے دھوئیں سے زرد ہو گئی تھیں.......... دانت جن میں سے کئی نقلی، سر گنجا، دماغ قدامت پرست خیالات سے بھرا ہوا۔ اپنے ہر اتوار کو گرجا گھر جانے کا کتنا غرور۔ مگر مذہب کی روح سے کتنا دور۔ "یہ آج کل کے آوارہ لڑکے اور لڑکیاں خداوند یسوع مسیح کے حکم سے جہنم میں جلائے جائیں گے۔" "میں نے سنا ہے نرسیں بڑی آوارہ ہوتی ہیں تم تو ایسی نہیں ہو سلویا؟"

"ہاں میں تو ایسی ہی ہوں۔ میں نے تو کئی مردوں سے محبت کی ہے بلکہ محبت سے بھی زیادہ۔" سلویا یہ سوچ کر مسکرا دی۔ جب وہ یہ کہے گی تو جارج پر کیا اثر ہوگا۔ شادی کو وہ خود ہی منسوخ کر دے گا۔ اس کو تو اپنے گھر کے لیے کوئی ماما چاہیے۔ ویسی بیوی اس کو مل ہی جائے گی۔"

"مگر بچے؟" اولاد کی تمنا نے پھر سلویا کے قدم ڈگمگائے۔ ماںتا کا یہ جذبہ جس سے اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ شادی کے بغیر اس کا کیا ہوگا؟ وہ ماں کیسے بن سکے گی؟

'ماں!'

نیند میں بوڑھا کسان بڑبڑایا۔

صبح ہو چکی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی وارڈ میں پڑ رہی تھی۔ سلویا نے

نظر اٹھا کر دیکھا۔ اسّی مریض، اس کے اسّی مریض، اس کے اسّی بچے۔ اس کی اولاد، جن کی دیکھ بھال اس کا فرض تھا۔ ان کو کھلانا، پلانا، دوا دینا۔ ان کا منہ دھلانا، کپڑے بدلوانا، ان کی تپتی ہوئی پیشانیوں پر محبت اور شفقت کا ہاتھ رکھنا۔ جب وہ موت سے لڑتے ہوئے پکاریں 'ماں'۔ تو 'ہاں بیٹا دوا پی لو' کہہ کر ان سب کو سہارا دینا۔

وارڈ کے دوسرے کنارے سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی نمبر 14 کو پھر کالی کھانسی ستا رہی ہے۔ ایک پیالی گرم چائے کی پلادوں تو آرام ہو جائے گا۔ یہ سوچا اور سلویا بوڑھے کسان کے ہاتھ کو ہلکے سے تھپک کر پلنگوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی چلی گئی۔ نہ اس کی چال میں تکان تھی اور نہ اس کی آنکھوں میں نیند۔

○

آزادی کا دن؟

(1)

دُکان

بمبئی کے سب بازاروں میں جس دکان پر دیکھو جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ لال، نیلے، پیلے، ترنگی، پچرنگی، صلیبی نشان، دھاریاں، ستارے، رنگوں کا ایک دریا تھا کہ ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

جھنڈے نہ صرف دکانوں پر لگے ہوئے تھے بلکہ ہر جگہ، ہوٹلوں پر، بینکوں پر، گرجاؤں پر، سرکاری دفتروں پر، بنگلوں اور کوٹھیوں پر، موٹروں پر، فضا میں ہر طرف رنگینی ہی رنگینی تھی، خوشی کی ایک لہر سارے شہر میں دوڑ گئی تھی، سارے شہر ہی میں کیوں، سارے ملک میں، ساری دُنیا میں آج فتح کا دن تھا، امن کا دن تھا، جشن کامرانی کا دن تھا۔ ہر شخص مسرور و شاداں نظر آتا تھا، دکانوں پر بھیڑ تھی، چہل پہل جیسے عید، بقرعید، ہولی، دیوالی، کرسمس کے موقعوں پر ہوتی ہے۔ ہوٹل ریستوران، شراب خانے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ انگریز فوجی سڑکوں پر بوتلیں ہاتھ میں لیے گاتے پھر رہے تھے۔

ہر شخص خوش تھا۔ پھر ڈورو تھی کے اداس ہونے کی وجہ؟ شاید اس لیے کہ اس فتح میں اس کی شکست کا سامان تھا۔ یہ جشن، یہ چہل پہل اس کی آئندہ کساد بازاری کا پیش خیمہ تھی۔ جنگ ختم

ہوگئی تو ولایتی فوجیں ہندوستان سے ہٹالی جائیں گی، پھر اس کا کیا ہوگا؟

اس کا نام دراصل ڈوروتھی نہیں تھا اور نہ وہ ہمیشہ سے اس قسم کا پیشہ کرتی تھی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے وہ ایک دفتر میں ٹائپ کام کام کرتی تھی۔ ساٹھ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اس میں گزارا ہو ہی جاتا تھا مگر جنگ کے ساتھ مہنگائی آئی۔ ساٹھ روپے میں گذارا کب تک ہوتا! مہنگائی کا الاؤنس دس روپے مقرر ہوا حالانکہ ہر چیز کی قیمت تگنی چوگنی ہوگئی تھی۔ جنگ کے ساتھ مہنگائی آئی تھی اور اس کا توڑ بھی ــــ یعنی ہزاروں، ولایتی فوجی جن کی جیبوں میں روپیہ تھا اور دل وہوس۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ غربت، بھوک، پھٹے ہوئے کپڑے، روایتی اخلاقیات کو کتنی جلد فنا کر دیتے ہیں۔ اس نے اپنی دکان کھول لی۔ مس میری ٹامس سے وہ ڈوروتھی ہوگئی، اس کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے وہ میری جیسے مقدس نام کو ایسے پیشے میں نہ لانا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ ڈرورتھی ایک رومانی نام تھا، اس نام کو ڈوروتھی لامور جیسی مشہور فلم اسٹار سے مناسبت تھی، میری ٹامس کا جسم ڈوروتھی لامور کی طرح گوراچٹا نہ تھا، نہ اس کی ٹانگیں ویسی سڈول اور خوب صورت تھیں، نہ اس کی آنکھوں میں وہ جادو تھا، جو ہالی ووڈ کے میک اپ والے اپنے فن سے پیدا کرتے ہیں............ مگر پھر بھی ڈوروتھی نام میں ایک خاص کشش تھی، ایک رومانی انداز تھا۔ جو اس کے خریداروں کی تسکین کے لیے کافی تھا۔ اب وہ ساٹھ روپے ماہوار کے بجائے کبھی کبھی ساٹھ روپے ایک رات میں کمالیتی تھی! لیکن کب تک؟ اس دن جب وہ گیارہ بجے کے قریب اٹھی تھی اور اس نے فتح کی خبر سنی تھی، یہ سوال اس کے دماغ میں شہد کی مکھی کی طرح بھنبھنا رہا تھا، اسی لیے جب وہ بازار سے سودا سلف لانے کے لیے گھر سے نکلی تو اداس تھی۔

مگر وہ بھی اس مسرت بھرے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ رنگینی، چہل پہل، خوشی کی لہر اس کے جسم، اس کے دل و دماغ میں بھی سرایت کرگئی، مارکیٹ سے کھانے پینے کا سامان لینے کے بعد اس کا جی چاہا کہ وہ بھی ان جگمگاتی، سجی ہوئی دکانوں میں جائے اور کچھ خریداری کرے۔ اس بھیڑ میں اپنے آپ کو کھودے، ہنسے جس طرح اور سب ہنس رہے ہیں، مذاق کرے، گنگنائے، گائے، کھائے، پیئے، سگریٹ کا دھواں اڑائے۔

کئی گھنٹے کی خرید و فروخت کے بعد جب وہ واپس گھر آئی تو پلندوں سے لدی پھندی۔ پانچ منزلوں تک اندھیرے، بدبودار زینے پر چڑھنا دوبھر ہوگیا۔ اب وہ پہلے کی طرح جوان اور چست و چالاک بھی تو نہ رہی تھی! اپنے کمرے میں پہنچی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ پلندوں، پیکٹوں اور پارسلوں سے اپنی گود خالی کرتے ہی وہ چند منٹ کے لیے صوفے پر لیٹ گئی۔ تپتے ہوئے، پسینے میں نہائے ہوئے چہرے کو چمڑے کی ٹھنڈی چکنی سطح سے مس کیا تو کتنا اچھا معلوم ہوا۔ اس کے تھکے ہوئے جسم نے اسپرنگ دار صوفے کے آغوش میں وہی آرام، وہی لطف، محسوس کیا جو بچوں کو گود میں ملتا ہے۔ مگر کاروباری زندگی میں چین کہاں لکھا ہے ان دکانداروں ہی کو دیکھو رات کے کتنے گھنٹے انہوں نے اپنی دکانیں سجانے میں صرف کیے ہوں گے!.......... ڈوروتھی اٹھی، نہا دھو کر اس نے نیا ریشمی فراک پہنا جو ابھی خرید کر لائی تھی، بالوں میں کنگھا کیا، کلپ لگائے۔ کریم پاؤڈر، سرخی، لپ اسٹک سے چہرے کی مرمت کی، کان کی لو کے پیچھے سینٹ لگایا، جس طرح اس نے ایک فلم میں ڈوروتھی لامور کو لگاتے دیکھا تھا۔ اسپرے سے اپنے لباس پر لیونڈر چھڑکا اور آئینے میں اپنی شکل دیکھ کسی قدر مطمئن ہوگئی۔

پھر اس نے کمرے کی حالت درست کرنا شروع کی، ڈوروتھی کو اپنے سلیقے اور صفائی پسندی پر ناز تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کے گاہک اسی وجہ سے اس کے ہاں دوبارہ آنا پسند کرتے ہیں۔ ایک پیکٹ کھول کر اس نے سفید براق پلنگ کی چادر نکالی اور دوسرے میں سے تکیے کے غلاف۔ بستر کو جھاڑا، چادر تبدیل کی، تکیوں پر غلاف چڑھائے۔ ایک اور پیکٹ میں سے پھول دار ٹیبل کلاتھ نکال کر گول میز پر بچھایا۔ گلدان میں پھول لگائے گلاس کو دھو کر چمکایا اور ٹرے میں لگا کر میز پر رکھ دیا، بوتلیں تو فوجی اپنے ساتھ ہی لاتے تھے، مگر تمیز دار ڈوروتھی اپنے ہاں انھیں بوتل سے منہ لگا کر پینے کی اجازت کبھی نہ دیتی تھی۔

اب صرف ایک چھوٹا سا پیکٹ رہ گیا، یہ لے کر وہ بالکنی میں آئی۔ بائیں طرف نظر کی تو لوسی کی بالکنی میں دھلے ہوئے پیٹی کوٹ اور جمپر لٹکے ہوئے نظر آئے۔ گندی، بدتمیز کہیں کی، اپنی گندگی کا یوں اشتہار کرتی ہے! داہنی طرف دیکھا تو ایڈتھ کی بالکنی میں ایک مرد کی پتلون الگنی میں لٹکی ہوئی نظر آئی، بے شرم کہیں کی! ان لڑکیوں کو تمیز یا نفاست تو چھو نہیں گئی، اٹھارہ اٹھارہ برس کی

ناتجربہ کار چھوکریاں جب پیشہ کرنے لگیں گی تو اور کیا امید ہوسکتی ہے۔اور سمجھتی ہیں اپنے آپ کو کیلوپیٹرا!

پانچ منزل نیچے چند گورے شراب کی بوتلیں لیے ٹہل رہے تھے، ڈوروتھی نے جلدی سے پیکٹ کھولا اور اس میں سے ایک خوب صورت نیا یونین جیک نکال کر اپنی بالکنی کے کٹہرے پر لٹکا دیا۔نہایت احتیاط سے اور بڑے فخر سے۔اس کے بعد اس نے ایڈتھ اور لوسی کے کمروں کی طرف حقارت اور کسی قدر رحم کی نگاہ سے دیکھا، زینے پر بھاری جوتوں کے چڑھنے کی آواز آرہی تھی، چند لمحے ہی میں اس کے دروازے کی گھنٹی ڈوروتھی کی فتح کا اعلان کررہی تھی۔

(2)

مذاق

بابو باری سال سے کلکتے تک پیدل چل کر آیا تھا، ان دنوں میں جب اُکال کا زور تھا اس نے سینکڑوں کو مرتے دیکھا تھا، بوڑھوں کو، دودھ پیتے بچوں کو، جوان عورتوں کو مگر وہ نہ مرا تھا۔ اسے خود تعجب تھا کہ وہ کیوں زندہ بچا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اکیلا تھا۔نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ بچے، نہ بہن، نہ بھائی، جدھر جی چاہتا چل دیتا، صبح سویرے جب اور سب سوتے ہوتے وہ بھیک مانگنے نکل جاتا۔کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں سے پھل، ترکاریوں کے چھلکے، سڑا ہوا آم، روٹی کا جوٹھا ٹکڑا، جو کچھ بھی ملتا سب سے پہلے نکال لیتا۔غرض کسی نہ کسی طرح وہ اپنے پیٹ کے دوزخ کے ایندھن کا انتظام کر ہی لیتا۔جب ریلیف کمیٹی کے لنگر خانے کھلے تو وہ اپنی ہانڈی لیے لائن میں ہمیشہ سب سے آگے ملتا۔سب سے پہلے گرم گرم کھچڑی اسی کو ملتی، اس کی بھی اس نے ترکیب سوچ رکھی تھی۔لنگر خانہ کھلنے سے کئی گھنٹے پہلے وہ پہنچ جاتا تھا اور عین اس جگہ جہاں سے لائن شروع ہوتی تھی وہ پاؤں پسار کر سو جاتا۔اگر کوئی اس کی جگہ لینے کی جرأت بھی کرتا تو وہ اس کو لات مار کر ہٹا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ میل بھر پرے سے کھانے کو سونگھ لیتا ہے، کہیں خیرات کا کھانا بٹ رہا ہو، بابو وہاں موجود، کہیں جوٹھا پتّل پڑا ہو، بابو وہاں سب سے پہلے پہنچ جاتا، کہیں رسوئیا رات کا

جوٹھا کھانا پھینک رہا ہو بابو زمین پر نہ پہنچنے دیتا، ہوا میں سے لپک لیتا۔ اس کی ساری حسوں کا ایک ہی مرکز ہو گیا تھا۔ خوراک۔۔ کتنی دور بھی کھانا پک رہا ہو اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے، شکاری کتوں کی طرح رات کے اندھیرے میں بھی اسے کھانے کی چیز پڑی نظر آجاتی، وہ سوتے میں خواب بھی دیکھتا تو پوریوں کے انبار، چاول کے ڈھیر، مٹھائیوں کے پہاڑ نظر آتے، جاگتا رہتا تو ہر لحہ اگلا نوالہ حاصل کرنے کے لیے اسکیم بناتا رہتا، کوئی جرنیل بھی اس محنت سے اپنی فوجی مہم کا نقشہ نہیں بناتا، جس انہماک سے بابو روٹی کے ایک ٹکڑے یا چاول کی ایک مٹھی کے لیے پہلے سوچ بچار اور دوڑ دھوپ کرتا تھا، کوئی عاشق اپنے معشوق کی دھن میں اتنا کھویا نہیں ہوتا جتنا بابو کھانے کے خیال میں۔ بھوک نے اس کی ہر حس اور اس کے ہر ذوق کو فنا کر دیا تھا وہ کسی حسین لڑکی کو بھی دیکھتا تو سوچتا اس کے گال خمیری روٹی کی طرح پھولے ہوئے ہیں، اس کی رنگت تو دیکھو انار کی طرح سرخ ہے، کاش یہ لڑکی لڑکی نہ ہوتی ایک خمیری روٹی ہوتی، انار کا ایک دانہ ہوتی، ایک سیب ہوتی، ایک رس گلہ ہوتی.........وہ اپنے دماغ میں ہر لذیذ کھانے کا نام لے ڈالتا۔

سرکاری اعلان کے بموجب اب اَکال نہ رہا تھا۔ باہر کے آئے قحط زدہ کسانوں کو شہر سے نکال دیا گیا تھا، مگر بابو کسی نہ کسی طرح پولیس کی نظر سے بچ گیا تھا، اب تک وہ کلکتے ہی میں تھا، مگر حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ریلیف کمیٹیوں کے لنگر خانے بند ہو گئے تھے۔ اَکال کا خوفناک سایا کسانوں کے جھونپڑوں پر سے پھیلتا ہوا اب شہر کے سفید پوش گھرانوں پر پڑ رہا تھا، اب کوئی خیرات بھی نہ دیتا تھا۔ اب کوئی جوٹھا کھانا بھی کوڑے کے ڈھیر پر نہ پھینکتا تھا۔ اب بابو کھائے تو کہاں سے! چوری کرے۔

مگر عجیب بات تو یہ تھی کہ اب تک بابو نے پیٹ بھرنے کے لیے ہر جتن کیا۔ بھیک مانگی، جوٹھا کھایا، کوڑے کے ڈھیروں کو کریدا مگر چوری نہ کی تھی۔ نہ جانے کیوں (اس کا دل اس کے لیے تیار نہ تھا۔ پولیس کا خوف مانع تھا یا پرماتما کا؟) مگر کوئی جذبہ تھا ضرور جو اس کو ہر بار چوری سے باز رکھتا تھا۔

ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ شرافت کی بھی، جب تین دن فاقے سے گذر گئے تو بابو کا ایمان بھی پگھل گیا، پیٹ اندر اتنا دھنس گیا تھا کہ چلنا مشکل تھا، آنکھوں میں ایک عجیب نیند سی

چھائی رہتی جو دراصل نیند نہیں تھی بلکہ کمزوری تھی موت کا پیغام تھی، چلنا دوبھر ہو گیا، کھانے کی تلاش کرے تو کیوں کر؟ بھیک مانگنے کے لیے زبان ہلانے کی طاقت بھی بدن میں نہ رہی۔ دماغ میں سوچنے کی، دل میں محسوس کرنے کی اہلیت نہ رہی۔ تمام دنیا سمٹ کر ایک روٹی کی شکل میں اس کے شعور پر چھا گئی۔

بابو نے سوچ لیا کہ اب اگر اسے کہیں موقع ملا تو وہ ضرور چوری کرے گا مگر کہاں ــــ؟ کسی کے گھر میں گھسا تو رسوئی تک پہنچنے سے پہلے ہی مرمت کردی جائے گی۔ پھر بھی وہ تلاش میں نکلا، دھرم تلا سے ولزلی اسٹریٹ ہوتا ہوا چورنگی کی طرف چلا، آج نہ جانے کیا بات تھی تمام شہر میں چہل پہل مچی ہوئی تھی، رنگ برنگے جھنڈے، جھنڈیاں، رکر جاؤں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ہنستے اور گاتے چہروں کے غول، اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے لڑکیوں کے جھنڈ ہوٹلوں کی طرف جاتے ہوئے اور بہت سے فوجی جو سڑکوں پر کھڑے یا مکانوں کی دہلیزوں پر بیٹھے بوتلوں سے شراب پی رہے تھے۔ 'شاید کوئی تہوار ہوگا' بابو نے سوچا اور پھر دفعتاً اس کے دماغ میں خیال آیا کہ شراب سے بھی تو پیٹ بھر سکتا ہے۔ ایک مکان کی سیڑھی پر دیکھا ایک فوجی بوتل ہاتھ میں لیے مدہوش بیٹھا ہے، سدھ بدھ کی خبر نہیں، بوتل آدھی سے زیادہ خالی تھی، ہاتھ سے گرا ہی چاہتی تھی۔ بابو نے ادھر اُدھر نظر کی اور گلی کو خالی پا کر ایک جھپٹے میں بوتل چھین لی۔ ایک کونے میں جا کر اس نے ایک نامانوس بدبو کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بوتل منہ سے لگائی اور غٹ غٹ کر کے پی گیا۔

پہلے تو یہ معلوم ہوا کہ اس کے حلق میں کسی نے آگ لگا دی۔ پھر یہ آگ پھیلتے پھیلتے انتڑیوں تک پہنچ گئی۔ بھنچے ہوئے پیٹ میں ایک عجیب تناؤ محسوس ہوا جیسے ڈھیلے طبلے کو کسا جائے اور اس کے بعد کسی نے بابو کی پیشانی پر ایک زور کا گھونسا رسید کیا، سر اٹھایا تو دیکھا دیوار تھی۔ انتقاماً بابو نے گھونسا اٹھایا اور پتھر پر دے مارا۔ ہاتھ جھنا کر رہ گیا 'ہات تیرے کی!' اور وہ آگے بڑھ گیا۔

نہ جانے کہاں کہاں ہوتا ہوا وہ کہاں پہنچ گیا مگر اس کے نتھنوں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ کھانے کی چیزوں سے دور نہیں ہے۔ کوشش کر کے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو اس کے تمام خواب اصلیت کے لباس میں نظر آئے۔ سامنے بھنی ہوئی مرغیاں، لال بٹر سیلڈ کی قابیں، کیک

مٹھائیاں نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا، نشہ میں گھومتا گھامتا وہ گرانڈ ہوٹل کے باورچی خانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کے اور ان نعمتوں کے درمیان صرف ایک دروازہ حائل تھا اور وہ بھی کھلا ہوا، بلا کوئی خوف یا جھجک محسوس کیے ہوئے وہ اندر چلا گیا، میز کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک سوکھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر پڑی، جو ایک چھری کے پاس پڑا ہوا تھا، نہ جانے کیوں اس کے دماغ نے کہا 'روٹی!' اور اس سے پہلے کہ وہ اور بڑھیا کھانوں کی طرف توجہ کرے۔ اس کے ہاتھ نے وہ آدھی کٹی ہوئی روٹی اٹھالی۔ 'روٹی! آہ روٹی اس کے دل نے خوشی سے ناچ کر کہا۔ بابو نے روٹی کا ٹکڑا اپنے منہ کی طرف بڑھایا، خمیری آٹے کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اس کے نتھنوں کو معطر کر دیا" آہاہا" اس نے سوچا۔" روٹی سے بڑھ کر کوئی نعمت دنیا میں نہیں۔" دانتوں سے کاٹنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا!............ منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا، کئی باورچی آگئے، بابو پکڑا گیا، روٹی کا ٹکڑا، اس کے ہاتھ سے چھین لیا گیا، اس کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور جاتے جاتے اس نے ایک خان ماں کو یہ کہتے ہوئے سنا: سالا۔ وکٹری ڈنر کھانے آیا تھا۔" بابو کو ڈنر کے معنی معلوم تھے، مگر وکٹری کے نہیں، اس لیے حوالات کے اندھیرے میں وہ کئی گھنٹے سوچتا رہا کہ وکٹری کیا بلا ہے۔

اور پھر کچھ آہٹ ہوئی، روشنی کا ایک ٹکڑا— گول روٹی کی شکل کا— حوالات کی زمین پر پڑا۔ زمین پر لوہے کے ایک تھال کے گھسنے کی آواز آئی۔ کسی نے کہا۔ 'یہ لے۔' بابو نے زمین کی طرف نگاہ کی اور دفعتاً ہنس پڑا۔

'ابے ہنسنے کی کیا بات ہے؟' سپاہی نے ڈانٹ کر کہا۔

'ہنسنے کی بات نہیں ہے؟ تم مذاق کرتے ہو یار۔' اور بابو اور بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہنستا رہا۔ جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ہر بار جب تھک کر وہ ہنسی کو روکتا تو اس کی نگاہ زمین کی طرف جاتی اور پھر بے اختیار ہنسی کا دورہ شروع ہو جاتا۔

"پاگل ہے سالا۔" یہ کہہ کر سپاہی چلا گیا مگر بابو برابر ہنستا رہا— کیونکہ زمین پر لوہے کا تھال پڑا تھا اور اس تھال میں آدھی ڈبل روٹی کا سوکھا ہوا ٹکڑا۔

(3)

قانون

''اجی سرکار! میری بیٹی اور بیوی کا حصہ بھی دے دو۔''

''چل بے جھوٹ بولتا ہے؟ بیوی بیٹی ہیں تو ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہے کہ اپنا حصہ خود نہیں لے سکتیں۔''؟

رامو بڑا غیرت دار آدمی تھا، وہ اپنے حصے کی چار پوریاں دو لڈو لے کر ہٹ گیا مگر اس نے یہ کہنا گوارا نہ کیا کہ اس کی بیوی بیٹی اس لیے نہ آئی تھیں کہ ان کے پاس پہننے کو کچھ نہ تھا، جو چیتھڑے پہنے گھر میں رہتی تھیں۔ ان میں سے آدھا بدن نظر آتا تھا اس لیے وہ ان کو باہر جانے نہ دیتا، سارے گھر میں بس ایک دھوتی تھی جس کو پہن کر وہ باہر کام کرنے نکلتا، تنخواہ کے دن وہ سارے شہر میں مارا مارا پھرا تھا کہ پانچ پانچ روپے میں بھی مل جائیں تو وہ دھوتیاں خرید لے، چاہے مہینے بھر ایک وقت ہی کھانا لے مگر پانچ روپے تو کیا بیس روپے میں بھی دھوتی دستیاب نہ ہوئی تھی۔ سارے چاندنی چوک میں بڑی دکانوں پر بھی گیا۔ چھوٹی دکانوں پر بھی مگر کہیں نہیں، کسی جگہ 'ہاں' نہ سنا۔ ایک دکان دار نے دبے لہجے میں یہ ضرور کہا تھا— ''میاں تمھیں ایسی ہی ضرورت ہے تو میں کہیں سے دھوتیوں کا انتظام کیے دیتا ہوں— پچاس روپے ؟ لیں گے پچاس روپے! اور اسے مہینے بھر تک پلیٹس PLATES دھونے کے ملتے تو تھے صرف پچیس روپے! پچاس روپے وہ کہاں سے لائے۔

اور پھر وہ کام پر سے بھی ہٹا دیا گیا تھا، امریکن فوج کے لیے جو بیرکیں بن رہی تھیں وہ وہاں مزدوری پر لگا ہوا تھا مگر اب سنا تھا کہ یہ فوجیں واپس جانے والی ہیں اس لیے جو بیرکیں بنی ہوئی ہیں وہ بھی ڈھا دی جائیں گی۔ لاکھ کوشش کی پھر بھی اسے کام نہ ملا۔ بے کار ہوئے اسے ڈیڑھ مہینہ ہو چکا تھا............ دو دن سے گھر میں فاقہ تھا— آج اس نے طے کیا تھا کہ کچھ نہ ہو تو بھیک مانگنا ہی شروع کر دے گا مگر سویرے ہی چراغ دین اور مسیتا کہہ گئے تھے کہ ٹھیکیدار کھنہ سنگھ کے ہاں پوریاں اور لڈو بٹ رہے ہیں! وہ بھاگا بھاگا وہاں گیا، چار پوریاں اور دو لڈو، بھگوان بھلا کرے ٹھیکیدار صاحب کا۔ سنا تھا سرکار کی جو جیت ہوئی ہے اس خوشی میں غریبوں کو

دان دے رہے ہیں مگر تین آدمیوں کے کنبہ (خاندان) میں چار پوریاں اور دو لڈو سے کیا کام چلے گا، اگر بیوی کا حصہ بھی مل جاتا تو غنیمت تھا، مگر ان کے یہاں آئے بغیر یہ ناممکن تھا۔ اب ان کو لائے تو کیونکر؟ ان کے بدن ڈھانکنے کے لیے کپڑا کہاں سے آئے؟

یہی سوچتے ہوئے وہ کناٹ پلیس میں پٹری پٹری چلا جا رہا تھا کہ بھگوان نے اس کے لیے ایک بڑی خوب صورت دھوتی آکاش سے بھیج دی۔ لال، نیلے، سفید رنگوں کا ایک کپڑا عین رامو کے اوپر گرا۔ پہلے تو رامو اس میں الجھ کر گھبرایا پھر اس نے اوپر نظر کی تو دیکھا ایسے ہی سینکڑوں کپڑے ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ دکانوں پر لٹکے ہوئے ہیں۔ ستونوں پر لپٹے ہوئے ہیں۔ اس نے سوچا "ایک کم ہو گیا تو کون دیکھے گا اور پھر یہ تو بھگوان کی دین ہے" دوپہر کا وقت تھا، زیادہ تر دکانوں کے دروازے بند تھے، سوائے ایک آدھ تانگے کے کوئی دور دور نہیں نظر آتا تھا، رامو نے جلدی جلدی لال نیلے کپڑے کو تہہ کیا اور اپنی دھوتی میں چھپا کر گھر لے آیا۔ اب اس کی بیوی اور بیٹی دونوں ٹھیکیدار صاحب کے یہاں جا کر اپنے حصے کی پوریاں اور لڈو لا سکیں گی۔

رامو نے ترکیب یہ سوچ کر نکالی کہ اپنی دھوتی (جو دراصل اس کی بیوی ہی کی تھی) تو بیوی کو دی۔ جوان بیٹی کو اس کے پھٹے کپڑوں پر ماں کے پھٹے چیتھڑے بھی پہنا دیے اور کچھ نہ کچھ تن ڈھانکنے کا انتظام ہو ہی گیا۔ پھر خود اس نے لال نیلے کپڑے کو تہبند کی طرح باندھ لیا۔ کالے پیلے جسم پر رنگین تہبند بہار دینے لگا۔ خوش خوش تینوں گھر سے نکلے، ٹھیکیدار نہال سنگھ کے ہاں اب بھی پوریاں اور لڈو بٹ رہے تھے اگرچہ پوریاں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور لڈوؤں کا چورا رہ گیا تھا، رامو نے بیوی اور بیٹی دونوں کو حصہ دلوایا اور گھر واپس چلا کہ اب ایک وقت تو ڈٹ کر کھانا کھائیں گے۔

پھر کناٹ پلیس سے ہو کر جا رہے تھے، کہ رامو کو ایک دکاندار ٹوکا۔

"ابے او! یہ جھنڈا کہاں سے اڑایا؟"

"جھنڈا۔ اجی میں کیا جانوں کون سا جھنڈا۔"

"کون سے جھنڈے کی دُم! یہ تہبند کی جگہ کیا باندھ رکھا ہے۔

"اجی یہ!................" رامو اتنا سہما ہوا تھا کہ آواز نہ نکلی تھی۔

"ارے یہ تو ہماری دکان کا جھنڈا ہے۔ کب سے تلاش کر رہے ہیں؟"

"کیا مزے میں مٹکائے جا رہا ہے!"

"چھین لو سالے سے۔"

"مارو سالے کو۔"

"بلاؤ پولیس مین کو۔"

"او میاں جمعدار ادھر آنا!"

ابھی پولیس کانسٹبل قریب نہ آیا تھا کہ ایک بگڑے دل نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر جھٹکا مارا تو جھنڈا ہاتھ میں آ گیا اور رامو سڑک پر مادر زاد ننگا کھڑا رہ گیا، اس کی بیوی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے شرم سے منہ موڑ لیا۔

"ہی ہی ہی ہی۔ خی خی خی خی، ہاہاہاہاہا" چاروں طرف سے ہنسی اور قہقہے رامو پر اس طرح برسے کہ وہ زمین میں گڑ گیا۔

کسی راہ چلتے نے رحم کھا کر اس کو اپنی چادر دے دی کہ وہی باندھ لے۔ رامو کی جان میں جان آئی مگر اس عرصے میں پولیس والے نے اس کو گرفتار کر لیا تھا، ہتھکڑی ڈال کر ساتھ لے چلا تو ایک خلقت ساتھ ہو گئی۔

"جھنڈا چور پکڑا گیا۔ سالا جھنڈا چور۔"

"ارے بھائی اس آدمی کو کیوں پکڑے لیے جا رہے ہو؟ کیا کیا اس نے۔؟" کسی نووارد سپاہی سے پوچھا۔

"اجی ایک جرم کیا ہو تو بتائیں۔ تین تین جرم۔" بھیڑ میں سے ایک صاحب بولے جو قانون کے بڑے ماہر معلوم ہوتے تھے۔

"تین جرم! وہ کیا؟"

"پہلا جرم چوری۔"

اور دوسرا؟"

"شاہی جھنڈے کی توہین۔"

''اور تیسرا؟''

''وہ یہ کہ ابھی سر بازار ننگا کھڑا تھا، یہ بھی قانون کے خلاف ہے اور اوپر ہوا میں کئی سو جھنڈے ہوا میں پھرپھرا رہے تھے، گویا ہنس رہے ہوں۔''

(4)

''تم ہندوستانی نائیں ہو۔''

بار بار نشے میں مدہوش ٹامی یہی............ کہے جا رہا تھا۔

''تم ہندوستانی نائیں ہو! تم ہندوستانی نائیں ہو سکتے!

حمید نے پھر کہا ''مگر دس دفعہ کہہ دیا کہ میں ہوں ہندوستانی

''نائیں۔ نائیں۔ تم ہندوستانی نائیں ہو سکتے۔''

شرابی سے بحث کرنا بے کار ہے۔ مگر حمید نے جل کر کہا: ''مگر کیوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو؟''

ٹامی بولا ''لک برادر۔ سنو بھائی۔ میں نشے میں ضرور ہوں مگر بالکل مدہوش نہیں ہوں۔ آدھ گھنٹے سے اتنے آدمیوں کو گالیاں دے رہا ہوں، ٹھوکریں مار رہا ہوں، مگر ان میں سے ایک کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ مجھ سے سوال و جواب کرے اور تم نے آتے ہی میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اگر یہ سب ہندوستانی ہیں تو تم ہندوستانی نائیں ہو سکتے۔''

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔''

حمید چرچ گیٹ اسٹیشن سے شام کو پانچ بجے کے قریب نکلا تو اس نے دیکھا کہ بھیڑ لگی ہے سینکڑوں آدمی گھیرا ڈالے کھڑے ہیں، اور بیچ میں ایک ٹامی۔ کبھی وہ فحش گالیاں بکتا ہے، کبھی لوگوں کو مارنے دوڑتا ہے، کبھی للکار کر کہتا ہے، کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے مقابلہ کرے اور سب لوگ سہمے ہوئے کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ایک اخبار بیچنے والا لڑکا گذرا تو ٹامی نے اس کو دھکا دے کر اس کے اخبار چھین لیے اور ورقہ ورقہ کر کے ان کو ہوا میں اڑا دیا۔ وہ بے چارہ روتا ہوا بھاگا تو ایک چبوترے والے کا خوانچہ الٹ دیا۔ کچھ دیر تک حمید یہ کھڑا

دیکھتا رہا۔ مگر جب ٹامی نے ایک بوڑھے راہ گیر کو پکڑ کر اس کو ایک طمانچہ مارا تو اس سے نہ رہا گیا اور مجمع کو چیرتا ہوا وہ ٹامی کے پاس پہنچا۔

"ان بڑے میاں کو چھوڑ دو۔" اس نے ڈپٹ کر کہا۔

ٹامی نے بڑے میاں کو چھوڑ دیا اور حمید کی طرف پلٹ پڑا۔ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا— "لڑنا چاہتے ہو؟"

حمید نے "گربہ کشتن روز اول" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کا جواب ایک زنانٹے دار چانٹے سے دیا— حمید کا ڈیل ڈول کچھ زیادہ نہیں ہے اور ٹامی بڑا لمبا چوڑا تھا، مگر پھر بھی وہ آستینیں چڑھا کر ٹامی سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوگیا، اس کو یقین تھا کہ چانٹا کھا کر ٹامی زخمی شیر کی طرح اور بھی بپھر جائے گا مگر اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، جب چانٹے کا جواب چانٹے یا گھونسے یالات سے دینے کے بجائے ٹامی اس کے گلے سے لپٹ گیا۔

"او— تم تو ہمارا فرینڈ ہے۔ تم ہندوستانی نائیں ہوسکتا!"

شرابیوں کو کوئی ایک فقرہ مل جائے تو اس کو اس طرح رگیدتے ہیں جیسے گراموفون کا ٹوٹا ہوا ریکارڈ، ایک ہی لفظ کو دہراتا رہتا ہے۔ دس پندرہ بار حمید کو اس کے ہندوستانی نہ ہونے کا یقین دلانے کے بعد ٹامی نے کہا: کم آن فرینڈ" آؤ یار! آج وکٹری ڈے ہے۔ ہم تم کو شراب پلائے گا۔" اب حمید لاکھ لاکھ بہانے بناتا ہے، مگر ٹامی نہیں مانتا، غرض جھگڑا رفع کرنے کے لیے حمید راضی ہوگیا اور دونوں نے ایک 'بار' میں پہنچ کر وہسکی کا ایک پیگ آرڈر دیا۔

ایک پیگ سے دو۔ دو سے تین۔ تین سے چار۔ اور کچھ دیر میں یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ ٹامی اور حمید میں سے کون زیادہ مدہوش تھا۔ مگر ٹامی کو اب بھی اس بات کی رٹ لگی ہوئی تھی کہ — "تم ہندوستانی نائیں ہوسکتا۔"

پانچواں پیگ آیا تو ٹامی نے گلاس اٹھا کر کہا "ہیراز ٹو وکٹری۔ آؤ فتح کی خوشی میں ایک جام اور پئیں۔"

حمید کا قوم پرستی کا جذبہ فوراً بیدار ہوگیا، نشہ سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "ہر گز نہیں— یہ فتح سفید چمڑے والوں کی ہے۔ ہماری فتح نہیں ہے۔ میں نہیں پیوں گا۔"

''آ۔ تو تم گاندھی کے ماننے والے کانگریسی ہو!'' ٹامی نے تعجب سے کہا اور پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ ''نائیں نائیں تم ہندوستانی نائیں ہو سکتے۔''

حمید نے گاندھی اور کانگریس کا نام سن کر نفرت سے کہا۔ ''میں کانگریسی وانگریسی نہیں ہوں اور گاندھی وہ تو برلا، ٹاٹا جیسے سرمایہ داروں کا زرخرید ہے۔''

''اوہ۔ تو کیا تم مسٹر جناح کی لیگ میں ہو؟''

''ہرگز نہیں۔۔۔ جناح اور اس کی لیگ تو زمینداروں کے ہاتھ میں ہیں اور میں ایسے رجعت پسندوں اور ٹوڈیوں کا ساتھ دوں۔ ہونہہ!''

''تو تم ضرور کمیونسٹ ہو؟''

''یہ کمیونسٹ بھی بس نام ہی کے ہیں۔'' حمید نے جواب دیا۔

''سب کے سب گورنمنٹ سے ملے ہوئے ہیں۔''

''بہت اچھا! بہت اچھا!'' ٹامی چلایا ''گورنمنٹ خراب بہت خراب۔''

اب حمید پر نشہ اور چڑھ چکا تھا۔۔۔ بولا ''کانگریسی، لیگی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، یہ سب بکواس کرتے ہیں، آزادی آزادی چلا کر ہمیں غلام رکھتے ہیں۔ سمجھے غلام۔۔۔! میں چاہتا ہوں۔۔۔ میں چاہتا ہوں..............''

''تم کیا چاہتے ہو، دوست؟'' ٹامی نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''میں انقلاب چاہتا ہوں، انقلاب۔ تمام ملک میں آگ لگانا چاہتا ہوں............ حمید کی نشہ بھری آواز سن کر بار میں جتنے لوگ تھے سب چونک پڑے اور پھر وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ جانتے ہو ہم پر قبضہ اس فوج کے ذریعہ کیا گیا ہے، اگر یہ فوج نہ ہوتی تو ہم آزاد ہوتے، سب سے پہلے اس فوج کو ختم کیا جائے گا۔''

''شاباش دوست شاباش۔'' ٹامی چلایا۔ پھر کھڑا ہو کر ''لیڈیز اینڈ جینٹلمین، ہیراز ٹو ریولیشن! انقلاب کے نام پر ایک جام چڑھاؤ!'' اور پھر حمید سے '' آؤ دوست چلو ہم ابھی آگ لگائیں گے مگر کہاں سے شروع کریں۔ گورنمنٹ ہاؤس؟ تاج؟۔۔۔ میں کہتا ہوں سامنے ہائی کورٹ میں آگ لگائیں، آؤ چلو۔ جلدی کرو! انقلاب ہمارا انتظار کر رہا ہے۔''

''مگر مجھے جانا ہے۔ کام پر!'' حمید نے گھبرا کر کہا، نشہ کا اثر کچھ اترتا جا رہا تھا۔

''کام پر؟ کس کام پر؟'' ٹامی نے سوال کیا۔ ''اور انقلاب کا کیا ہوگا؟''

حمید نے چڑھ کر کہا'' میں کیا جانوں۔ مجھے ملٹری سپلائی کے ایک افسر سے ملنے جانا ہے۔ دیر ہوگئی تو ممکن ہے ٹھیکہ ہی نہ ملے۔''

ٹامی زور شور سے چلایا۔'' شاباش۔ تم ضرور ہندوستانی ہو۔ ہم بالکل پہچان گیا، ایک دم!'' اور پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ'' تم ہندوستانی نائیں ہوسکتا۔''

(5)

اندھیرا

آکاش پر اندھیرا اتنا ہی گہرا چھایا ہوا تھا جتنا قیدی کے من میں۔ چاروں طرف اسے دنیا اندھیری نظر آتی تھی۔ کسی طرف بھی تو روشنی کی کرن نہ تھی۔ تین برس اُس نے اس کال کوٹھری میں اپنے اندرونی شعلہ کی روشنی میں گذارے تھے لیکن یہ شعلہ مدھم پڑتے پڑتے اب بالکل بجھ گیا تھا، اب تو دل کی تہہ میں راکھ بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

پھر اب جینے سے حاصل؟ کچھ نہیں— اس نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اب اس میں دس سال اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے کی ہمت نہ تھی، ہاں وہ آج ہی خود کشی کر لے گا۔

کوٹھری میں چھت کے نزدیک ایک روشن دان تھا جس میں موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ قیدی نے اپنی دھوتی کو بل دے کر رسی کی طرح مضبوط بنا لیا اور ایک سرا اُس روشندان کی سلاخوں میں سے گرا کر دوسری طرف ایک پھندا بنا لیا تھا۔ بس اب چند لمحے کی دیر ہے، وہ اسٹول پر کھڑا ہو کر پھندا اپنے گلے میں ڈال لے گا اور پھر اسٹول کو لات مار کر پھینک دے گا— ایک جھٹکا اور کام تمام ہو جائے گا۔

''ہاں اب اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں۔'' اس نے پھندے کو مضبوط کرتے ہوئے سوچا کہ وہ اگست 1942 میں گرفتار ہوا تھا تو اس کو چودہ برس قید کی سزا مذاق معلوم ہوئی تھی، اس کو

یقین تھا کہ چند ماہ میں انقلاب کامیاب ہو جائے گا اور پھر وہ رہا ہو جائے گا۔ مگر بجائے انقلاب ہونے کے سرکاری تشدد کامیاب ہوا تھا۔ خیر آزادی کی جنگ میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے لیکن اس کا دل تو اس وقت ٹوٹا جب اسے معلوم ہوا کہ ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سرفروش بہادر سمجھنے کے بجائے، وطن فروش اور غدار سمجھتے ہیں۔ کیا انھوں نے اسی لیے دیش اور آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ ان پر فاشزم کا پانچواں دستہ ہونے کا الزام لگایا جائے گا؟ یہ گھاؤ بھی اس نے سہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کبھی بھی قوم کی عدالت کے سامنے یہ معاملہ صاف ہو جائے گا، مگر خود قوم کی حالت کیا تھی؟ جیل میں خبریں بہت دیر سے پہنچتی تھیں، مگر جب آتی تھیں تو ان سے ہمت بندھنے کے بجائے ہمت ٹوٹ جاتی تھی۔ چاروں طرف غریبی، کال، بیماری اور ان سب سے بڑھ کر موت سے بھی زیادہ خطرناک جمود، بے ہمتی۔ بنگال میں لاکھوں انسان ایک ایک دانے کو ترستے ہوئے مر گئے اور قوم کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ہزاروں عورتوں نے اپنی لاج ایک وقت کے کھانے کے عوض بیچ ڈالی اور کسی ماں کے لال کی رگِ حمیت جوش میں نہ آئی۔ مانا کہ لیڈر جیل میں تھے لیکن جو باہر تھے وہ کیا کر رہے تھے؟ وہ کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے؟ اکال، بیماری، اور سب سے بڑی بیماری آپس کی پھوٹ.......... ہندو اور مسلمان، کانگریس اور لیگ، اور مہاسبھا۔ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور غیر ملکی حکمران اپنے محلوں میں مسرور و مست اور انسانوں کے خون کی ہولی کھیلتے ہوئے اناج چور۔ ٹھیکے دار، سرمایہ دار، اناج چور، کپڑا چور، نہ زندگی میں کھانا، نہ مرنے کے بعد کفن ہی میسر۔ اف رے جمود۔ اف رے تعطل، تمام دنیا بیدار ہو رہی تھی، آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر ہندوستان سو رہا تھا۔ افیم کے نشہ میں تھا۔ غلامی کی افیم کے نشہ میں۔ تمام یورپ میں جمہوریت، اور آزادی کی قوتیں ابھر رہی تھیں چھوٹے چھوٹے ملک انقلابی نعروں سے بیدار ہو رہے تھے، تخت و تاج خاک میں مل رہے تھے، ظالم حکمرانوں کے قلعے متزلزل ہو رہے تھے مگر ٹس سے مس نہ ہوا تو ہندوستان۔ خبر آئی کہ گاندھی جی اور مسٹر جناح مل رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کانگریس اور لیگ کا سمجھوتا ہو جائے۔ ممکن ہے دونوں مل کر جمود اور ظلم و سامراج کا مقابلہ کریں، قیدی کی تاریک دنیا میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن آئی اور پھر وہ غائب ہوگئی، اس کا دل ڈوبتا گیا، اس کی ہمت

پست ہوتی گئی وہ چار بار جیل گیا تھا۔ عمر کے تیس سالوں میں سے دس سال قید میں گذارے تھے۔ وہ نہ کال کوٹھری سے ڈرا نہ کوڑوں سے۔ اس کو دق ہوگئی تھی، دن رات خون تھوکتے گذرتے تھے۔ پھر بھی اس نے زندگی سے منہ نہ موڑا تھا مگر اُس وقت اسے اپنے ملک والوں سے امید تھی۔ اب وہ امید ہی نہ رہی تھی۔ جینے کا ظلم اور سختی برداشت کرنے کا سہارا ہی نہ رہا تھا۔ اب جیے تو کیوں کر—؟ کس امید پر—؟ کس سہارے پر؟

''بس اب آخری فیصلے کا وقت آ گیا ہے!'' اس نے سوچا اور اسٹول پر کھڑا ہو گیا۔ پھندا اپنے گلے میں ڈالا۔

دور سے آوازیں آ رہی تھیں یا وہ اس کے حواس کا دھوکا تھا؟ نہیں آوازیں ہی تھیں— کچھ لوگ چلا رہے تھے۔ کیا کہہ رہے تھے؟ ''یورپ میں جنگ کا خاتمہ—'' ''روسی فوجیں برلن میں''— ''جرمن فوج نے ہار مان لی''— ''فتح کا دن!''— ''فتح کا دن!''

قیدی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ''فتح کا دن؟ پاگلو! کس کی فتح کا دن؟ ہماری ہماری فتح کا دن تو اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے تھا اور دفعتاً اس کے دماغ میں خیال آیا کہ آج فتح کے دن اس کی موت نہایت با موقع ہوگی۔ فتح کا دن! اور ایک ہندوستانی قیدی کے گلے میں پھانسی کا پھندا!— آج وہ زندگی پر فتح پا کر موت سے ہم آغوش ہوگا۔ موت۔ موت! موت! اور پھر وہ مجنونانہ وار ہنسنے لگا اور اس کے خوفناک قہقہوں کی آواز جیل کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر فضا میں پھیل گئی۔

وہ اسٹول کو ٹھوکر مار کر ہٹانے ہی والا تھا کہ اس کو روشندان میں سے دور کچھ روشنی نظر آئی۔ شاید کچھ لوگ مشعلیں لیے چلے آ رہے تھے، ''فتح کے جشن میں گورنمنٹ نے کوئی جلوس نکالا ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ یہ بھی اچھا ہوا، یہ لوگ جب جیل کی دیوار کے نیچے سے گزریں گے تو میں چلا کر کہوں گا۔ ''آؤ بھائیو! اور دیکھو میں کس طرح زندگی پر فتح پاتا ہوں۔'' مگر نہیں، یہ سرکاری جلوس نہیں ہو سکتا، بھلا سرکاری جلوس اور ''انقلاب زندہ باد کے نعرے۔'' اب جلوس قریب آتا جا رہا تھا۔ نعرے صاف سنائی دے رہے تھے۔ ''لال جھنڈے کی جے۔'' ''انقلاب زندہ باد۔'' ''سوویت روس زندہ باد۔'' لال فوج زندہ باد۔''— مزدوروں کا جلوس تھا۔ جوشیلی آوازیں۔ مشعلوں کے شعلوں کی طرح آسمان کی طرف لپک رہی تھیں اور پھر آوازیں آئیں ''ہندوستان

آزاد ہو" ہندوستان آزاد ہو۔" "ہمارے لیڈروں کو رہا کرو۔" "ہمارے ساتھیوں کو رہا کرو۔"
اور پھر وہ نعرہ جواب بھی قیدی کی روح کو تڑپانے کے لیے، اس کی ٹھنڈی رگوں میں گرمی پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ "انقلاب زندہ باد"۔ "انقلاب زندہ باد۔"

جلوس گذر گیا مگر نعرے، قیدی کے دماغ میں گونجتے رہے اور فتح کے دن کا ایک نیا نقشہ اس کے دماغ میں بنتا گیا، یہ جرنیلوں، بادشاہوں، حکمرانوں کی فتح نہیں تھی۔ یہ یورپ کے عوام کی فتح تھی۔ یہ جنتا کی فتح تھی۔ یہ یونان، یوگوسلاویہ کے گوریلا چھاپہ ماروں کی فتح تھی۔ یہ فرانس کے طالب علموں کی فتح تھی، جنھوں نے ہٹلر کے ظلم کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ روس کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کی فتح تھی۔ جنھوں نے اپنی جان دے کر نازی ازم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا منہ توڑ دیا تھا اور جنہوں نے دوسرے ملکوں کے یہاں تک کہ ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کے دل ہمت سے بھر دیے تھے۔

دنیا کی تاریخ میں ہٹلر سے زیادہ فوجی طاقت کسی بادشاہ، کسی شہنشاہ، کسی حکمراں کے پاس نہ ہوئی تھی اور پھر اس کو بھی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ ہٹلر کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ تو دوسرے ہٹلر۔ چھوٹے ہٹلر۔ کب تک اپنی خیر منائیں گے، غلامی اور ظلم کی اندھیری رات آخر کار ڈھل رہی تھی۔

قیدی نے اپنے گلے سے پھانسی کا پھندا اتار لیا اور روشندان کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا، اجالے کے انتظار میں۔

○

میں اور وہ

بارش دن بھر برستے برستے تھک سی گئی تھی، میں دفتر سے نکلا تو سڑک پر ایک ایک انچ پانی کھڑا تھا۔ جو بہت جلد پھٹے ہوئے تلے میں سے ہوتا ہوا جوتے کے اندر پہنچ گیا۔ مگر یہی غنیمت تھا کہ پانی اوپر سے نہیں پڑ رہا تھا، گو کالے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں تھیلے کو اور دوسرے میں چھتری کو سنبھالتے ہوئے میں نے جلد جلد بس اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھائے کہ شاید کوئی ماہم جانے والی بس مل جائے۔

چھتری!! جس چیز کو میں چھتری کہہ رہا ہوں وہ کسی زمانے میں واقعی چھتری ہی تھی۔ اب بھی دور سے چھتری ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ لپٹے ہوئے کالے کپڑے میں سے ایک ٹوٹی ہوئی موٹھ باہر نکلی ہوئی ہے، ہاں کھلنے پر یہ چھتری چھلنی بن جاتی ہے۔ کیونکہ بارش کا پانی اس میں کئی جگہ سے قطرہ قطرہ کر کے ٹپکتا ہے مگر صرف پانی۔ صاف ستھرا نتھرا ہوا پانی کوئی کچرا وغیرہ نہیں۔ یعنی یہ چھلنی بھی ہے اور فلٹر بھی۔ درختوں کے پتے۔ درختوں میں بیٹھنے والے پرندوں کی بیٹ۔ دوسری تیسری منزل کی کسی کھڑکی سے پھینکے ہوئے ترکاری کے چھلکے۔ سگریٹ یا اس قسم کا کوئی کوڑا کباڑ کبھی اس چھتری کے سوراخوں میں سے گذر کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے جب بارش کے دن نہیں ہوتے، میں بمبئی کی بعض سڑکوں پر گذرتے ہوئے ہمیشہ یہ چھتری کھول کر سر کے اوپر کر لیتا ہوں

کہ "خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔" جو آسمان کی طرف سے انسان کے سر پر نازل ہوتی ہے! ہاں بارش کی اور بات ہے۔...............تو ہر چیز دنیا میں ہر کام تو نہیں دے سکتی۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو چھتری کیچڑ کو روکنے کے لیے بنائی گئی ہو وہ بارش میں بھی کام آئے۔ اس کے علاوہ سنا ہے کہ سمندر میں سے جب بھاپ اٹھتی ہے، تو کبھی کبھی مچھلیاں بھی بادلوں میں کھنچی چلی جاتی ہیں اور پھر پانی کے ساتھ مچھلیوں کی بارش بھی ہوتی ہے۔ اگر کبھی ایسا حادثہ پیش آیا تو میری چھتری آڑے وقت ضرور کام آئے گی کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی مچھلی بھی اس کے بڑے سے بڑے سوراخ میں سے نہیں گذر سکتی۔

آپ کہیں گے اس چھوٹی سی کہانی میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی چھتری کا اتنا لمبا ذکر کیوں۔ تو بات یہ ہے کہ اس کہانی کی ہیروئن یہ چھتری ہی ہے، یا ہیرو کہہ لیجیے کیونکہ ہیروئن تو ایک اور ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ اس کہانی میں ایک ہیرو اور ایک ہیروئن کے بجائے دو ہیروئنیں ہیں۔ ایک تو یہ چھتری اور ایک وہ ! ارہا میں، تو میری وہی حالت ہے، جو دو عورتوں کے درمیان ایک شریف آدمی کی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے کو شریف آدمی کہا، اسے میری تعلّی نہ سمجھئے بلکہ میری بدقسمتی سمجھیے۔ جی ہاں! میری سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ شریف ہوں۔ جبھی تو پانچ بار گدّے کھانے کے بعد بھی بی۔ اے پاس نہ کر سکا۔ چار سال سے اخبار کے دفتر میں پروف ریڈر ہوں، چالیس روپے تنخواہ ملتی ہے مگر آج تک مالک سے تنخواہ بڑھانے کی درخواست نہیں کی۔ شرافت مانع ہوتی ہے۔ پریس کے منیجر، فورمین، ہیڈ پروف ریڈر، یہاں تک کہ دوسرے پروف ریڈروں کی جھڑکیاں سن لیتا ہوں مگر جواب نہیں دیتا۔ شریف ہوں نا! ایک دن ایک شرابی ٹامی نے راہ چلتے یونہی مذاق مذاق میں ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ میں نے سوچا میں بھی یونہی مذاق مذاق میں ایک ہاتھ جھاڑ دوں مگر فوراً شرافت نے کہا۔ چھوڑو جی کیوں رذیلوں کے منہ لگتے ہو۔

اور سنئے میری شرافت کی داستان! پینتیس برس کی عمر ہونے کو آئی۔ آج تک شادی نہیں کی۔ چالیس روپے ماہوار پر، کیا خود کھاؤں اور کیا بیوی کو کھلاؤں۔ ایک کمرے میں تین اور غیر شادی شدہ لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ شادی کروں تو بیوی کو کہاں رکھوں اور پاس نہ رکھوں تو شادی کیوں کروں؟ میرے تینوں ساتھی باقاعدگی سے ہر مہینے ایک بار پہلی تاریخ کی رات کو

فورس روڈ جاتے ہیں اور پھر اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کرتے ہیں، اس دن پہلی تاریخ تھی اور میں جانتا تھا کہ آج وہ تینوں آدھی رات کو گھر واپس آئیں گے میری جیب میں بٹوہ تھا اور بٹوے میں دو تین روپے کی ریز گاری کے علاوہ دس دس روپے کے چار کرارے نوٹ تھے،..........
میں بھی ان کی طرح اس مصرف کے لیے روپیہ، دو روپے، پانچ روپے تک خرچ کرسکتا ہوں مگر میں ان کے ساتھ ایک بار بھی نہیں گیا.......... میں نے کہا نہیں کہ میں شریف ہوں! اور میری چھتری میں چاہے سوراخ ہوں مگر میری شرافت میں نہیں۔

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری چھتری اور تمہاری شرافت!' آپ دل میں ضرور کہہ رہے ہوں گے۔'' وہ کہاں ہے وہ کہانی کی ہیروئین!'' معاف کیجیے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ مگر فلم دیکھتے ہیں تو آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ کامیاب فلم ڈائریکٹر کافی انتظار کرانے اور اشتیاق بڑھانے کے بعد ہی پہلے ریل کے ختم یا دوسرے ریل کے شروع میں ہیروئین کو پردے پر لاتے ہیں۔ آپ نے تو انتظار کے چند منٹ ہی گذارے ہیں، اس شام کو مجھے تو بس اسٹینڈ پر آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ کھڑا رہنا پڑا۔ نہ بس آئی اور نہ وہ!...... یہاں تک کہ سڑک کی بتیاں روشن ہوگئیں اور دوسرے مسافر جو بس کا انتظار کررہے تھے تنگ آکر ٹرام میں بیٹھ کر چلے گئے میں اکیلا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنے والی بس کی روشنی کو تلاش کر رہا تھا کہ میری ناک نے مجھے بتایا کہ وہ آگئی۔ میری آنکھوں نے اسے آتے نہ دیکھا۔ میرے کانوں نے اس کی آہٹ نہ سنی مگر میری ناک نے اس کی خوشبو سونگھ لی۔ دھیمی دھیمی تیز تیز خوشبو جو ولایتی عطر، پاؤڈر، پسینے اور بارش کی بوندوں سے مل کر تیار ہوتی ہے، میں نے سر گھما کر دیکھا تو اس کو برابر کھڑا پایا۔ ہاتھ میں ایک ہرے رنگ کا بیگ اور بس! نہ چھتری نہ برساتی...... وہ آئی ہی تھی کہ بس بھی آگئی۔ دو درجے کی بس۔ اوپر کا درجہ بغیر چھت کا اور نیچے کا کھچا کھچ بھرا ہوا وہ کیو میں میرے پیچھے تھی، میں قدم ہٹا کر پیچھے ہٹ گیا کہ اگر صرف ایک ہی جگہ ہے تو اسے مل جائے۔ میں دوسری بس کا انتظار کرلوں گا.......... میں نے عرض کیا تھا نا کہ میں شریف ہوں۔

مگر میری قربانی بے کار ثابت ہوئی۔ کنڈکٹر نے کہا'' اوپر کی بس خالی پڑی ہے۔ جو مسافر چڑھے گا۔ اس کو اوپر جانا پڑے گا۔'' دوسرے مسافر بارش کے ڈر سے زینے کے پاس دبکے

ہوئے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اوپر چلی گئی اور پیچھے پیچھے میں بھی۔ کنڈکٹر نے ٹھیک کہا تھا۔ اوپر ایک مسافر نہ تھا، صرف میں اور وہ! وہ سیدھے ہاتھ کی بینچ پر بیٹھ گئی اور میں اس کے قریب ہی بائیں ہاتھ کی بینچ پر۔ کنڈکٹر آیا۔ میں نے شیواجی پارک کا ٹکٹ لیا۔ اس نے ماہم کا نہ جانے کیوں مجھے یہ اچھا معلوم ہوا کہ وہ بھی اتنی دور جانے والی ہے۔ اس کے بعد کنڈکٹر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ پیچھے کسی سیٹ پر بیٹھ گیا؟ نیچے چلا گیا؟ یا ہوا میں غائب ہوگیا مگر راستہ بھر میں نے پھر اسے نہ دیکھا۔

ابھی بس بوری بندر نہ پہنچی تھی کہ ایک موٹی سی بوند میرے گنجے سر پر آگری۔ میں نے سوچا گنجے ہونے میں بھی کتنے فائدے ہیں۔ آج اگر سر پر بالوں کا چھپر ہوتا تو جب تک شرابور نہ ہو جاتا پتہ بھی نہ چلتا کہ بارش ہو رہی ہے؟ اوپر نگاہ کی تو آسمان کو بالکل اندھیرا پایا جس پر چمکتے ہوئے بجلی اور ٹرام کے تاروں کا جال بچھا ہوا تھا مگر وہ بوند اپنے قافلے سے بھٹک کر اکیلی ہی چلی آئی تھی کیونکہ اس کا ساتھ دینے کو ایک بوند بھی اور نہ گری۔

بس ٹھہری تو کیپیٹل سنیما کی روشنی میں میں نے اس کا چہرہ پہلی بار دیکھا۔ گورا، گورا، گلابی، یاقوتی ہونٹ، کتابی چہرے کے گرد سنہرے بالوں کا ہالہ۔ بالوں میں دو موٹی موٹی بوندیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے موتی پرو دیے ہوں۔ میں نے دل میں سوچا۔ ”یہ میمیں بھی کتنی خوب صورت ہوتی ہیں۔“ مگر کیپیٹل سنیما کی روشنی شاید میرے چہرے پر بھی پڑی کیونکہ اس نے بھی ایک نگاہ غلط انداز میری طرف ڈالی اور کچھ ایسے انداز سے منہ پھیر لیا گویا دل میں سوچا ”یہ ہندوستانی بھی کتنے بدصورت ہوتے ہیں“ اور اس لمحے میں مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے، پھٹے ہوئے کوٹ، پیوند لگی ہوئے قمیض، بغیر استری کی پتلون، تین دن کی بڑھی ہوئی داڑھی، گنجے سر اور سب سے زیادہ کالی رنگت کا احساس اتنی شدت سے ہوا کہ دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ پڑی مگر یہ احساس بہت جلد دماغ کے پچھلے کونے میں چلا گیا، جب چاند پر دو موٹی موٹی بوندیں پڑیں۔ ان دونوں کو شاید یہ چکنا چکنا کھیل کا میدان پسند آیا اور انھوں نے اپنی بہنوں سہیلیوں بلکہ دور دراز کی رشتہ داروں اور محلّہ والیوں کو بھی بلاوا بھیج دیا بس کرافورڈ مارکٹ نہ پہنچی تھی کہ بارش باقاعدہ شروع ہوگئی۔

مگر مجھے اپنے بھیگنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس کی!.......... مانا کہ اس نے میری طرف نفرت سے دیکھا تھا مگر پھر بھی وہ عورت تھی اور وہ بھی خوب صورت عورت اور کم سے کم اس وقت تو وہ بھی میری طرح مصیبت زدہ تھی، میں نے اس کی طرف نظر کی تو اسے اپنی طرف دیکھتے پایا اور اس بار اس کی آنکھوں میں وہ پہلے جیسی نفرت نہ تھی۔ کیا یہ میری آنکھوں کا قصور تھا یا وہ واقعی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"چھتری کیوں نہیں کھول لیتے؟ اس نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ اب میں اسے اپنی چھتری کا حالِ زار کیسے سناتا کہ یہ دکھاوے ہی دکھاوے کی ہے کام کی نہیں۔

"چھتری! اوہ چھتری؟" میں نے زنگ کھائی ہوئی کمانیوں کو کھولتے ہوئے جواب دیا۔ "خوب یاد دلایا آپ نے شکریہ۔" گویا میں کوئی فلسفہ کا پروفیسر تھا جو صرف بے خیالی کی وجہ سے اپنی پچیس روپے کی ریشمی کپڑے کی چھتری کھولنا بھول گیا ہو۔

بارش ہو رہی تھی، وہ بھیگ رہی تھی، میں چھتری یا چھلنی یا جو کچھ بھی کہیے لگائے بیٹھا تھا، کچھ نہ کچھ بچاؤ ہو ہی رہا تھا۔" "آیئے آپ بھی چھتری کے نیچے اس سیٹ پر بیٹھ جایئے۔" کئی بار میری زبان کی نوک پر یہ الفاظ آئے مگر پھر میں رک گیا۔ کچھ جھجک، کچھ جھینپ، کچھ رعبِ حسن، کچھ یہ ڈر کہ شاید اس بے تکلفی پر ڈانٹ دے، آخر وہ میم ٹھہری اور میں ایک شریف آدمی۔ میں نے بس کے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گویا مجھے کسی بھیگتی ہوئی عورت کی موجودگی کا علم ہی نہ تھا............ اور پھر میری ناک نے مجھے بتایا کہ وہ اٹھ کر میری سیٹ پر آ گئی ہے اور دائیں گھٹنے پر ہلکے سے نرم لطیف سے دباؤ نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

"آیئے آیئے آپ آرام سے بیٹھئے۔" میں نے سرک کر لکڑی کی دیوار میں گھسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا اور چھتری اس کی طرف جھکا دی۔ جدھر سوراخ زیادہ تھے وہ حصہ میں نے اپنی طرف کر لیا تاکہ میں بھیگوں یا بچوں مگر وہ محفوظ رہے۔ بڑی مہربانی ہے آپ کی؟" اس نے واقعی تشکرانہ لہجے میں کہا۔ آپ اپنی چھتری میں آسرا نہ دیتے تو میں تو بالکل ہی بھیگ جاتی" اور میں نے سوچا "اے جانِ جہان۔ یہ ٹوٹی ہوئی چھلنی نما چھتری کیا چیز ہے، اگر دس چھتریاں ہوتیں تو تم پر سے قربان تھیں، تمھارے لیے تو جان حاضر ہے۔"

باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا" آپ کیا کام کرتے ہیں؟ میں اخبار کے دفتر میں ہوں۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ایڈیٹر ہوں یا پروف ریڈر! آپ بھی کچھ کام کرتی ہیں کیا؟ جی ہاں کام ہی سمجھئے۔ میں نے دل میں سوچا۔" بے چاری اسٹینو گرافر ہوگی۔ دن بھر ٹائپ رائٹر پر کام کر تھکی ہوئی واپس جا رہی ہے۔ لوگ بھی خواہ مخواہ ان میموں کو بدنام کرتے ہیں حالانکہ کتنے اخلاق سے پیش آ رہی ہے!"

بارش اب موسلا دھار ہو رہی تھی، میں نے کہا" آپ کا ڈریس بھیگ جائے گا۔ یہ کینوس کا غلاف گھٹنوں پر ڈال لیجیے، چار گھٹنوں پر جب ایک غلاف ڈالا گیا تو ٹکر لازمی تھی، بھیگی ہوئی گداز رانوں کے لمس کے ساتھ ایک بجلی کی سی رو بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنے ان تینوں دوستوں کا خیال کیا جو اس وقت فورس روڈ کی خاک بلکہ کہنا چاہیے کیچڑ چھان رہے ہوں گے اور میرا دل فخر اور خوشی سے بھر گیا۔ بدتمیز گندے کیڑے! گندی نالیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں! اور مجھے دیکھو مجھے، میں ایک بس کی کھلی ہوئی چھت پر اپنی چھتری کے نیچے دنیا کی سب سے حسین لڑکی کو بغل میں دبائے بیٹھا ہوں۔

اب بارش کے ساتھ ساتھ ہوا کا جھکڑ بھی چلنے لگا۔ چھتری کا بس نہ چلتا تھا کہ پیراشوٹ بن کر مجھے اڑا کر لے جائے۔ میں پوری طاقت سے دائیں ہاتھ میں ٹوٹا ہوا ہینڈل اور بائیں ہاتھ سے فریم کو پکڑے ہوئے تھا کہ کہیں ہوا کے زور سے الٹ نہ جائے۔ اتنے میں میں نے اپنے دائیں ہاتھ کے قریب ایک نرم ہاتھ کی قربت محسوس کی، چھتری کو قابو میں کرنے کے لیے وہ بھی میری مدد کر رہی تھی، اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ ہینڈل پر تھا اور بایاں میری کمر کے پیچھے سے ہوتا ہوا چھتری کے فریم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اف کتنے کیف آور تھے وہ لمحات۔

میں شریف ضرور ہوں مگر میرا دل ذرا رومانی واقع ہوا ہے میں نے صورتِ حال پر غور کیا تو کتنی دلفریب نظر آئی۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ ایک حسین عورت۔ ایک ہی چھتری کے سائے میں ایک دوسرے کے اتنے قریب، تقریباً ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ کسی شاعر کا شعر میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

مگر رومانی ہونے کے علاوہ مجھے پالی ٹکس میں بھی دخل ہے، روزانہ اخبار کے پروف پڑھتا ہوں نا! آزادی! بین الاقوامی سیاست! اٹلانٹک چارٹر! سان فرانسسکو! پوٹسڈم! مجھے ان سب کے بچے معلوم ہیں۔ میں نے ہزاروں سیاسی مضمونوں کے پروف پڑھ ڈالے ہیں، اس لیے میں SPECIAL CORRESPONDENT کی طرح ہر موسم میں پولٹیکل معنی تلاش کرسکتا ہوں۔ مثلاً آج گاندھی جی اور مسٹر جناح کی بات چیت کے بارے میں سیاسی حلقے مایوسی کا اظہار کررہے ہیں، آج صبح سورج نے بادلوں میں سے منہ نکال کر جھانکا، جس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید کانگریس یا لیگ میں سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے۔ ویول کانفرنس کے دوران میں شملہ سے جو رپورٹیں آئی تھیں ان کے پروف پڑھتے پڑھتے تو میں اس قسم کی موسم شناسی کا ماہر ہوگیا ہوں.......... ہاں تو اس وقت بھی میں نے اپنی اور اس لڑکی کی ان عجیب حالات میں ملاقات پر غور کیا کہ اسے کس پولیٹکل نکتہ کی طرح ثابت کیا جاسکتا ہے تو فوراً ہی میرے دماغ نے کہا: ''یہ تو بالکل ہی کھلی ہوئی بات ہے، تو ہندوستان ہے مصیبت کا مارا ہندوستان، جس کی چھتری اور جوتے اور قسمت تینوں میں سوراخ ہیں، یہ لڑکی برطانیہ ہے، جو اپنے حسن اور ناز و انداز کے زور سے ہندوستانیوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہے، یہ بارش اور طوفان، جنگ اور فاشیت کا طوفان ہے اور یہ ٹوٹی ہوئی چھتری ہندوستان کی بچی کھچی پونجی ہے جو ہندوستان اور انگلستان دونوں کو اس طوفان سے بچانے کے لیے ضروری ہے......

اب بس بھنڈی بازار سے گذر رہی تھی، ایک دوکان کے اوپر کپڑے پر موٹے موٹے حرفوں پر لکھا ہوا نظر آیا ''پاکستان یا موت۔'' بارش کا پانی پڑنے سے پاکستان کی داڑھی نکل آئی تھی اور موت پھیل کر اور بھی خوفناک ہوگئی تھی، میں نے دل میں کہا میں موت سے ڈرتا ہوں مجھے پاکستان ہی دے دو اور پھر میرے اخباری دماغ نے کہا تو ہندوستان ہے اور یہ لڑکی پاکستان ہے اور یہ طوفان انگریزی سامراج ہے اور یہ چھتری ہمالیہ پہاڑ ہے، جس کی چھاؤں میں دونوں کو پناہ ملتی ہے مگر نہیں نہیں یہ بے پردہ انگریز لڑکی پاکستان کیسے ہوسکتی ہے اور میں ایک گائے کھانے والا مسلمان ہندوستان یا ہندوستانی کیسے ہوسکتا ہوں اور یہ پھٹی ہوئی چھتری ہمالیہ پہاڑ کیسے ہوسکتی ہے۔.......... یہ پولٹیکل تشبیہ کچھ چلی نہیں..........

بارش اور طوفان کا زور کم ہوگیا تھا اور وہ میرے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی، جیسے خوب صورت سی بلی خرخر کرتی ہوئی دبک کر سو جائے۔ لاحول ولا قوۃ میں بھی کیوں خواہ مخواہ سیاسی تشبیہوں کے جال میں پھنس گیا، ہم دونوں ہندوستان اور انگلستان یا ہندوستان اور پاکستان کی علامت نہیں تھے۔ ہم علامت تھے محبت کی.......... وہ ابدی محبت جو آدم اور حوا سے لے کر آج تک مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے ملاتی آئی ہے، ہم دونوں لیلیٰ مجنوں تھے.......... ہم شیریں فرہاد تھے.......... اور.......... اور.......... یہ دودھ کی نہر تھی جو چھتری کے ایک سوراخ میں سے گذر کر میرے کوٹ کے کالر میں سے ہوتی ہوئی میری ریڑھ کی ہڈی پر سے بہہ رہی تھی!..........

ہاں تو وہ میرے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی، اور میں..........تو وہ شاعر پہلے ہی بیان کر گیا ہے کہ..........

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

اور اسی طرح بائیکلہ پریل اور دادر گذر گئے۔ بارش تھم گئی اور بغیر اس کی نیند کو پریشان کیے میں نے چھتری بند کر کے رکھ لی، بس تلک برج پر سے گذر رہی تھی کہ اس نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھولیں۔ ایک انگڑائی لی اور بولی" آپ کا بہت بہت شکریہ" اور نہ جانے کیوں بہت بہت پر اتنا زور..........اور میرے جی میں آئی کہ کہوں شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کیونکہ یہ میری زندگی کے سنہری لمحات تھے۔" مگر ایسا کہنا بدتمیزی معلوم ہوا۔ اس لیے صرف یہ بڑبڑا کر رہ گیا۔
"جی نہیں اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔"

اب بس شیواجی پارک کے نکڑ پر مڑ رہی تھی اور میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کیونکہ ہری نواس پر مجھے اترنا تھا۔ لاکھ کوشش کی کہ ہمت کر کے اس کا پتہ پوچھ لوں مگر اس کمبخت خاندانی شرافت نے زبان پر قفلِ خاموشی لگا دیا۔

"ہری نواس" نیچے سے کنڈکٹر چلایا، جونہی جھٹکے کے ساتھ بس ٹھہری میں ہڑبڑا کر اٹھا، اپنی ٹوٹی ہوئی چھتری اٹھائی۔

''گڈ نائٹ'' اس نے مسکرا کر خدا حافظ کہا۔اب اس کے دانت کتنے چمکدار تھے۔

''گوڈ نائٹ'' میں نے بادل نخواستہ کہا اور آخری نظر اس کے شاداب چہرے پر ڈال کر نیچے اتر آیا۔

سامنے ایرانی کے ہوٹل میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں گھر جانے کو میرا جی نہ چاہا۔سوچا ایک پیالی چائے پی لوں پھر جاؤں گا۔ چائے گرم نہ تھی، ایک گھونٹ میں پی گیا۔چھتری سنبھالی اور چلنے لگا۔

''او مسٹر، پیسے تو دیتے جایئے۔'' بیرے نے آواز دی۔

لاحول ولاقوۃ، میں بھی کس خیال میں مدہوش ہوں کہ دام دیے بغیر ہی جارہا تھا اور یہ بیرا سمجھتا ہوگا کہ میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں۔ میں نے طے کرلیا کہ اس کو ایک آنہ انعام دوں گا تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ میں کوئی ایسا ویسا نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ آج کی رات ایک یادگار رات تھی، اس خوشی میں............میرا ہاتھ کوٹ کی اندر کی جیب میں تھا مگر وہاں بٹوہ نہ تھا، بٹوہ کسی بھی جیب میں نہ تھا، میرے کانوں میں ایک میٹھی آواز آئی ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' اور نہ جانے کیوں بہت بہت پرزور!

ایک ٹیکسی والا برابر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا، سامنے سڑک کے کنارے اس کی ٹیکسی کھڑی تھی، میں نے سوچا اگر میں چاہوں تو اس ٹیکسی میں بیٹھ کر اس بس کو ماہم پہنچنے سے پہلے پکڑ سکتا ہوں۔اس لڑکی کو گرفتار کرا کے اپنا بٹوہ، اپنے چالیس روپے، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی واپس لے سکتا ہوں مگر میں نے اس میں سے کچھ بھی نہ کیا، کیوں؟ اس لیے کہ............اس لیے کہ............آخر وہ انگریز ٹھہری اور میں ایک شریف آدمی............ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ شرافت ہی میری سب سے بڑی بدقسمتی ہے......

○

موت کی شکست

ایک بچہ

زندگی اور موت!

مقابلہ سخت تھا!

موت لشکر کے لشکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ کمزوری، بیماری، خون کی کمی، گہرا زخم، زہریلا مادہ، نو برس کا بچہ، غریب بچہ، کبھی اس کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ چند مہینے ہی کا تھا کہ باپ مر گیا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلا باپ شرابی تھا اور بد مزاج، جب رات کو نشہ میں چور آتا تو بیوی اور سوتیلے لڑکے دونوں کو مارتا۔ تھپڑ، لکڑی، جوتا جو بھی ہاتھ آ گیا۔ ایک دن صبر کا پیانہ چھلک گیا۔ اگلے دن سورج نکلنے سے پہلے ہی بچہ گھر سے بھاگ نکلا۔

اس وقت اس کی عمر سات برس کی تھی۔

دو سال تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اخبار بیچے، جوتوں پر پالش کیا، برتن دھوئے، نالیاں صاف کیں، بوجھ ڈھویا، بھیک مانگی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے باپ کا رنگ بھی کالا تھا اور ماں کا بھی۔ اس کو معلوم تھا کہ کالے ماں باپ کے بچے ہمیشہ کالے ہوتے ہیں مگر پھر بھی وہ اکثر سوچتا: ” کاش میرا رنگ کالا نہ ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالے آدمیوں کو خدا نے گوروں کی خدمت

کرنے، ان کی گالیاں اور ٹھوکریں کھانے کے لیے ہی بنایا ہے۔ نہ جانے ان سب کالوں نے کیا خطا کی تھی۔ خدا کی پرستش میں وہ گوروں سے کہیں زیادہ انہماک دکھاتے تھے۔ گرجا جاتے، پادریوں کے وعظ سنتے، یسوع مسیح پر ایمان لاتے، صدیوں کے غم سے بھری ہوئی درد ناک آوازوں میں مذہبی گیت گاتے، پھر بھی خدا کے دربار میں ان کی شنوائی نہ ہوتی۔ پھر بھی گورے رنگ کے عیسائی ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ اس کو وہ واقعہ اب تک یاد تھا جب اُس نے غلطی سے ایک گوری عورت کے سفید ریشمی لباس کو چھولیا تھا۔ وہ سڑک کے نکڑ پر اخبار بیچ رہا تھا۔ گوری عورت نے اس سے اخبار لیا اور اپنے بیگ میں ریزگاری تلاش کرنے لگی۔ بچے کی نگاہیں بے اختیار اُس عورت کے سفید لباس پر جم گئیں۔ کتنا سفید تھا وہ فراک، دودھ سے بھی زیادہ سفید۔ ان بطخوں سے بھی زیادہ سفید جن کو اس نے ایک دفعہ جھیل میں تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنا سفید تھا وہ فراک! سفید اور چکنا۔ نظر بھی پھسلی جاتی تھی 'نرم بھی ضرور ہوگا' اس نے فراک کی چمکیلی سطح کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ اس کپڑے کو چھو کر دیکھے۔ نرم نرم چکنی چکنی چیزوں کو چھو کر ان پر ہاتھ پھیر کر کتنا مزا آتا تھا۔ ایک دفعہ اس کو کالے ریشم کا ایک ٹکڑا پڑا مل گیا تھا۔ چکنا اور چمکدار۔ وہ اس نے اپنے چھوٹے سے مقفل صندوقچے میں چھپا کر رکھ چھوڑا تھا اور جب موقعہ ملتا اس ٹکڑے کو نکال کر اس پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر کر دیکھتا کہ اس کی ملائمت باقی ہے یا نہیں۔ مگر اس گوری عورت کا یہ فراک تو اس سے بھی کہیں زیادہ چکنا اور چمکدار تھا اور پھر سفید تھا۔ دودھ سے بھی زیادہ سفید، جھیل کی بطخوں سے بھی زیادہ سفید اور سفید چیزوں میں نہ جانے کیا خوبی تھی، کیا جانے کیا خوبی تھی، کیا جادو تھا کہ دیکھتے ہی وہ بیقرار ہو جاتا۔ اس کو چھونے میں تو اور بھی مزا آئے گا۔ اس نے اپنا کالا ہاتھ اٹھایا اور گوری عورت کے دامن کو چھولیا۔

گوری عورت بیگ سے پیسے نکال کر دینے ہی والی تھی کہ اس نے ایک کالے ہاتھ کو اپنے کپڑوں سے مَس ہوتے دیکھا اور اپنی چھتری بند کر کے بچے کو مارنا شروع کر دیا۔

''بدتمیز، ذلیل کتے، تیری یہ مجال! چل تجھے پولیس کے حوالے کرتی ہوں'' اور پولیس کے ڈر سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ اخباروں کا بنڈل بھی وہیں رہ گیا۔ اس کی سزا میں اخبار

والے نے اگلے دن سے اس کو اخبار دینے بند کر دیے۔

شہروں میں چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں، آسماں تک اونچی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر وہ اوپر نظر کرتا تو معلوم ہوتا کہ ہر عمارت کی چوٹی بادلوں میں تیر رہی ہے۔ بادل چلتے ہوئے نہ معلوم ہوتے بلکہ ایسا نظر آتا جیسے عمارت آہستہ آہستہ ڈھلک رہی ہے اور وہ ڈر کے مارے پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا کہ کہیں اینٹ اور پتھر کا یہ پہاڑ اُس کے سر پر نہ آپڑے۔

جب اخبار بیچنے کا سلسلہ بند ہو گیا تو اس نے سڑکوں پر آوارہ پھرنا شروع کر دیا۔ کتنا خوب صورت شہر تھا۔ صاف صاف سڑکیں، کالی کالی چکنی چکنی چمکدار موٹریں۔ دھڑا دھڑ چلنے والی بجلی کی ریلیں، جگمگاتے ہوئے سینما اور تھیٹر، بڑے بڑے ہوٹل، لذیذ کھانوں سے بھرے ہوئے ریستوران، وہ گھنٹوں شیشے کی دیواروں میں سے اندر سجے ہوئے کیک، پیسٹری، پھل، بھنی ہوئی مرغیوں اور شراب کی بوتلوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ سب نعمتیں اس کے سامنے موجود تھیں۔ اتنی قریب کہ وہ چاہے تو ان کو چھو سکتا تھا۔ ایک دن بے اختیار اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ کھٹ سے شیشے کی موٹی چادر سے ٹکرایا۔ ایک پولیس والے نے کرخت آواز میں گھڑکا ''او کالے بدمعاش چلتا پھرتا نظر آ نہیں تو ڈنڈا رسید کرتا ہوں۔'' اور لال سبز کیک پر حسرت بھری نظر ڈال کر بچہ آگے بڑھ گیا۔

نہ جانے کیوں دنیا کی سب اچھی اچھی چیزیں گورے آدمیوں ہی کے لیے ہیں؟ بچہ کے ننھے دماغ میں یہ سوال ایک شہد کی مکھی کی طرح بھنبھنا تا رہتا۔ آخر کیوں؟ ہوٹل، یعنی عالیشان مکان، سب جگہ گورے آدمی ہی رہتے تھے۔ کالے اگر اس دنیا میں تھے تو نوکروں کی حیثیت سے۔ ہوٹلوں میں ویٹر، سینما گھروں کے سامنے پہرے دار، عالیشان مکانوں میں ملازم، جب گورا مالک اور مالکن اپنی موٹر میں بیٹھنے کے لیے گھر سے نکلتے تو کالا نوکر ادب سے ان کے لیے موٹر کا دروازہ کھولے کھڑا رہتا آخر کیوں؟ آخر کیوں؟

دنیا کی سب چیزیں گوروں کے لیے تھیں۔ مگر آسمان پر جہاں خدا رہتا ہے وہاں ضرور کالوں اور گوروں کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہوگا۔ بچے کو اس کا یقین تھا۔ اور رات کو جب وہ پھرتے پھرتے تھک جاتا تو سڑک کے کنارے بیٹھ کر وہ سر اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا۔ ستارے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور وہ بھی اپنی بھوک، اپنی تھکن کو بھول جاتا۔ اس نے سنا

تھا کہ مر کر انسان آسمان پر خدا کے پاس چلے جاتے ہیں۔ وہ سوچتا اچھا ہی ہو اگر میں مر جاؤں۔ پھر میں بھی، وہاں جہاں ستارے ہیں مزے سے رہوں گا۔ میرا باپ انتظار کرتا ہوگا۔ میں وہاں جاؤں گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ مگر زندگی کا اُن تھک چکر ان خیالات کی فرصت ہی کب دیتا تھا۔ پھر کوئی پولیس کا سپاہی پتھر کی سڑک پر اپنے قدموں سے کھٹ کھٹ کرتا آتا اور ڈانٹ کر کہتا۔ ''چلو چلو۔ اٹھو یہاں سے کیا چوری کا ارادہ ہے۔ اپنے گھر جاؤ۔ ایک دم سے۔''

اس کا گھر شہر کے اس حصہ میں تھا جہاں سب کالے ہی کالے رہتے تھے۔ ایک پرانا اصطبل، کسی زمانے میں یہاں گھوڑے بندھا کرتے تھے۔ مگر اب موٹروں کی وجہ سے گھوڑا گاڑیوں کا رواج جاتا رہا تھا۔ اصطبل مدت سے بیکار پڑا تھا اور بہت سے غریب کالے لوگ جن کا کہیں ٹھکانا نہیں تھا یہاں آ کر سو جاتے تھے۔

رات کو جب وہ ''گھر'' واپس آتا۔ تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ جنت سے جہنم میں آ گیا ہے۔ کہاں گورے آدمیوں کے وہ عالیشان مکان۔ کہاں یہ گندی، بدبودار، اندھیری چالیں۔ یہاں کی سڑکیں بھی خراب تھیں اور روشنی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کالوں کے لیے رات بھی کالی رہتی۔ ہاں مگر اس اندھیری اور تکلیف دہ دنیا میں بس ایک جگہ تھی۔ جہاں کالوں کو بھی راحت نہیں تو کم سے کم خود فراموشی نصیب تھی۔ وہ تھا شراب خانہ! وہ کئی بار وہاں گیا تھا۔ وہاں اس کو چاروں طرف اپنے جیسی کالی شکلیں ہی نظر آتی تھیں۔ کالے مرد کالی عورتیں جن کے دانت گوری عورتوں سے کہیں خوب صورت تھے ویٹر، ڈرائیور، خانگی ملازم، چپراسی، بوٹ پالش کرنے والے، خادمائیں، ماما ئیں، انائیں، باورچی اور باورچنیں مگر یہاں تو وہ صرف مرد اور عورتیں، عورتیں اور مرد، کھانا اور شراب، سگریٹ کا دھواں اور اس دھوئیں کو چیرتی ہوئی قہقہوں کی لہریں۔ اور پھر کوئی پیانو پر بیٹھ جاتا اور اس پرانے بغیر پالش کے پیانو میں سے موسیقی کا ایک طوفان جس میں سب ڈوب جاتے، مرد اور عورت، ناچنا شروع کر دیتے۔ تھرک تھرک کر، مٹک مٹک کر ہنس کر، مسکرا کر، قہقہے لگا کر، اچھل کر، کود کر، تالیاں بجا کر، موسیقی اور سگریٹ کا دھواں اور شراب کی بو اور کالے کالے چہروں پر پسینہ کی چمک اور پھر کوئی گانا شروع کر دیتا اور اس موسیقی اور اس گانے میں نو برس کے کالے بچے کو نو ہزار برس کی داستان سنائی دیتی۔ اس کی قوم کی داستان، ایک درد

بھری کہانی، اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ موسیقی کی لہروں میں بہتا ہوا وہ دور کسی ساحل پر پہنچ گیا ہے۔ اندھیری رات ہے اور سناٹا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے۔ چاروں طرف خوفناک جانوروں کی آتشیں آنکھیں نظر آ رہی ہیں۔ پھر کہیں دور سے ڈھولک کی آواز آتی جو آہستہ آہستہ اور قریب ہوتی جاتی۔ ایک ہولناک آہنگ۔ جس کو سن کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ایک نامعلوم قوت اس کے روئیں روئیں میں سما جاتی۔ آسمان کا خوف، سمندر کا خوف، اور طوفان کا خوف، بھوت پریت اور جادو کا خوف۔ شیر، چیتے اور گھڑیال کا خوف۔ ان خوفوں سے بڑھ کر انسان کا خوف اور بچے کو اس موسیقی میں ایک نئی خوفناک دھن سنائی دیتی۔ زنجیروں کی جھنکار۔ غلامی کے احساس سے دم گھٹنے لگتا مگر پھر کہیں زمین کی لامحدود وسعتوں میں سانس آتا اور کپاس کے کھیتوں میں ہزاروں گلوں سے ایک دردناک نغمہ اٹھتا اور آسمان کی اونچائی میں کھو جاتا۔

بچہ اس کہانی کو کچھ سمجھتا اور کچھ نہ سمجھتا مگر جب تک پیانو بجتا بند ہوتا۔ وہ نسلی جذبات اور محسوسات کے اس سمندر میں غوطے کھاتا رہتا اور جب پیانو بجنا بند ہو جاتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک زوردار لہر نے اس کو ساحل پر پٹک دیا ہو۔

شراب خانے میں سب اس سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ کوئی کھانے کو کچھ دیتا، کوئی پینے کو، روٹی کا ایک توس۔ گوشت کا ایک ٹکڑا، کافی کی پیالی۔ اس کا پیٹ بھر ہی جاتا۔ مگر ایک رات اس کو کسی نے شراب کا آدھا گلاس پلا دیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاقو سے اس کے گلے کو چیرا جا رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گلے کی چرمراہٹ جاتی رہی مگر اس کا سر پھولنے لگا۔ فٹ بال کی طرح۔ کم سے کم اسے محسوس ایسا ہی ہوا۔ فٹ بال بڑھتے بڑھتے کپا بن گیا اور وہ ڈرا کہ کہیں سر اتنا بڑا نہ ہو جائے کہ میں دروازے میں پھنس جاؤں۔ اس لیے وہ باہر نکل گیا مگر دریا کی ٹھنڈی ہوا کا ایک تھپیڑ ہی پڑا تھا کہ سر پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ مگر اس کے بدن میں جو بھوک اور بخار سے بالکل کمزور ہو گیا تھا۔ ایک دم نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی۔ بدن میں طاقت اور دل میں ہمت۔ اس نے سوچا۔ میں ابھی سوؤں گا نہیں۔ شہر کی سیر کروں گا اور اس کے قدم سڑک پر نہیں ہوا پر چل رہے تھے! چلتے چلتے وہ پھر گوروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ہوٹل اور شراب خانے، ناچ گھر، سب گورے مردوں اور گوری عورتوں سے بھرے ہوئے تھے مگر

ایک نکڑ پر یہ اتنے بہت سے کالے آدمی کہاں سے آگئے تھے؟ ان کا یہاں کیا کام؟ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا: ''ہمارے ایک ساتھی کو مارا ہے۔ تو ہم دس کا خون کریں گے۔'' بچے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس لیے وہ دیوار کے سائے سے لگا لگا آگے بڑھتا گیا۔

جھن سے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک شور پولیس کی سیٹی۔ کچھ لوگ بھاگ رہے تھے کچھ لوگ ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ دور سے اور شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پولیس کی سیٹیاں، عورتوں کی چیخیں اور ان سب ملی جلی آواز کو چیرتی ہوئی گولی چلنے کی تڑاخ دار آواز۔ پھر جھن سے شیشے ٹوٹنے کی آواز۔ بچے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ عورتیں کیوں چیخ رہی ہیں۔ گولیاں کیوں چل رہی ہیں۔ اس کے دماغ میں تو بس ایک ہی خیال تھا۔ ریستوران کی وہ شیشے کی دیوار، جس کے پیچھے دنیا کی سب نعمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اگر اور شیشے کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں تو وہ بھی توڑی جا سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھاگا ٹھوکر کھائی گرا، اٹھا، پھر بھاگا، بے تحاشہ بھاگا۔ پولیس کی سیٹی سنائی دی مگر وہ نہ رُکا۔

وہ رہی شیشے کی دیوار۔ اندر رنگ برنگ کے کیک اسی طرح جگمگا رہے تھے۔ لال لال سیب، زرد زرد سنگترے۔ سبز رنگ کے کیلے اور ان میں اور اس میں صرف ایک شیشے کی دیوار حائل تھی مگر اور شیشے کی دیواریں توڑی جا رہی ہیں تو یہ بھی توڑی جا سکتی ہے۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور پورے زور سے دے مارا۔

جھن سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس کے اور دُنیا کی نعمتوں کے درمیان جو دیوار حائل تھی وہ ٹوٹ گئی۔

وہ کیک اور پھل اٹھانے کے لیے لپکا۔

ایک تڑاخہ ہوا۔ بچے کو اپنے پہلو میں ایک ٹیس محسوس ہوئی۔ ایک دفعہ اس کو ایک شہد کی مکھی نے کاٹ لیا تھا۔ اس لمحے اُس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک شہد کی مکھی اس کے گوشت کو گولی کی رفتار سے چیر کر اندر گھس گئی ہے۔ اس کے بعد اس کے دماغ پر ایک سیاہی چھا گئی۔ جو اس کے رنگ سے بھی زیادہ تاریک تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ بائیں پہلو میں شہد کی مکھی اب بھی کاٹ رہی

تھی۔۔ ایک گورا ڈاکٹر کہہ رہا تھا "بچہ بہت کمزور ہے اور زخم گہرا ہے۔ شاید سیپٹک بھی ہوگیا ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں صبح تک مر نہ جائے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا کیوں کہتے ہیں" نرس۔۔ ایک گوری نرس نے کہا "کوشش کرنی چاہیے۔ شاید بچ جائے۔ کتنا بھولا ہے۔ بچارا۔"

اور بچے کو ڈاکٹر کا کہنا اچھا معلوم ہوا اور نرس کا کہنا برا۔ "اب بھی میرے بچنے کی امید ہے!" اس نے سوچا۔ "نہیں۔ نہیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اس زندگی میں مجھے کوئی سکھ نہیں ہے۔ یہاں زہریلی شہد کی مکھیاں کاٹتی ہیں۔ میں تو مرنا چاہتا ہوں تا کہ آسمان پر اللہ میاں کے پاس آرام سے رہوں۔ میرا باپ مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا" اور ہلکی سی آہ کے ساتھ اس کے منہ سے یہ آواز نکلی۔ "وہ دیکھو ستارے اچھے اچھے ستارے مجھے بلا رہے ہیں۔"

موت نے زندگی کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بس چند گھنٹوں کی اور دیر ہے۔ یہاں ہی نہیں دنیا کے کونے کونے میں میرا ہی راج ہے۔"

ایک بوڑھا

زندگی اور موت!

مقابلہ سخت تھا!

موت لشکر کے لشکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ بڑھاپا، کمزوری، بھوک۔ جب پیٹ میں خوراک کا ایک دانہ نہ جائے گا تو زندگی کا چکر کیسے چل سکتا ہے۔

ستر برس کا بوڑھا ایک پلنگ پر پڑا تھا۔ اس کا بدن سوکھا ہوا تھا۔ نہ گوشت نہ خون۔ بس ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ پیٹ کمر کو لگ گیا تھا۔ سات دن سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ بڑھتے ہوئے لشکر کی طرح کمزوری اس پر آہستہ آہستہ غلبہ پا رہی تھی۔ آواز بھی مشکل سے نکلتی تھی۔

مگر بوڑھے کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ایک عجیب چمک تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بچوں کی سی مسکراہٹ۔ اس کے دل کی حرکت بے قاعدہ ہوگئی تھی مگر اس کا دماغ۔۔ اس کا دماغ ایک لاجواب مشین کی طرح اب تک بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ اس کا سکریٹری پاس ہی بیٹھا ہوا

اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ تمام ملک میں بوڑھے کے فاقے نے ہلچل مچادی تھی۔ ہزاروں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ہزاروں نے اس سے اپیل کی تھی کہ وہ اکیس دن کے فاقے سے اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالے۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے افتتاحیہ مضمون میں لکھا تھا۔ ''ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی خاطر اس فاقے کو توڑ ڈالیں گے اور اپنی قیمتی زندگی کو موت سے بچالیں گے۔ ہم کسی حالت میں اپنے محبوب قائد کی ہلاکت گوارا نہیں کر سکتے۔'' بوڑھے نے یہ سنا اور مسکرایا۔

ایک نوجوان خطوں اور تاروں کا ایک انبار لے کر داخل ہوا۔ سب کا مضمون ایک ہی تھا۔ خدا کے لیے فاقے توڑ ڈالیے۔ آپ کی جان قوم کی امانت ہے۔ اس کو ضائع نہ کیجیے۔ بوڑھے نے سنا اور مسکرادیا۔

کئی ڈاکٹر داخل ہوئے اور بوڑھے کا معائنہ کیا۔ نبض، دل کی حرکت، آنکھیں اور بوڑھا دھیمی آواز میں ان سے مذاق کی باتیں کرتا رہا۔ ایک ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر بوڑھا بولا۔ ''ارے بھئی فاقہ میں کر رہا ہوں یا تم؟'' اور اس کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔

ڈاکٹر دوسرے کمرے میں مشورہ کے لیے چلے گئے۔

ایک نے کہا۔ ''کمال ہے۔ سات دن ہوگئے۔ ایک دانہ پیٹ میں نہیں گیا۔ اس حالت میں زندہ رہنا ہی ایک معجزہ ہے۔''

دوسرے نے کہا: ''مگر دل کی حرکت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔''

تیسرے نے کہا: ''اس سے تو میں بھی پریشان ہوں۔ بدن میں طاقت ہی نہیں ہے۔ کیسے موت کا مقابلہ کر سکتا ہے؟''

موت قریب ہی کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ وہ یہ سن کر فاتحانہ انداز سے مسکرائی اور پھر بوڑھے کے کمرے میں جا کر اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔

موت کو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا مگر بوڑھے کی بوڑھی بیوی نے محبت کی آنکھوں سے جب اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو اس کو سرہانے موت کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے موت مسکرا رہی ہے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دعا کی۔ ''اے خدا۔ میرے خاوند کی جان

بچا دے۔ میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔ اے خدا ایسا نہ ہو کہ میری موت سے پہلے میرا خاوند مجھ سے بچھڑ جائے۔'

پھر وہ بوڑھے کے پلنگ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہے: ''میری خاطر یہ فاقہ توڑ ڈالو۔ اپنی جان سے نہ کھیلو'' مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

ساٹھ برس کی ازدواجی زندگی میں اس نے اپنے شوہر کے ارادوں کی مخالفت نہ کی تھی۔ اپنے مذہب کے قانون توڑے اور اصولی زندگی کو خیر باد کہا۔ دھن دولت کو تیاگ دیا۔ حکومت سے دشمنی مول لی۔ درجنوں بار فاقہ ہوا مگر پھر بھی بیوی نے اف نہ کی۔ اس کا پریم اس منزل پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں 'میں اور تو'' کا سوال ہی نہیں رہتا اس نے اپنی خودی کو شوہر کی خودی میں تحلیل کر دیا۔ اب اس کا شوہر سے کہنا کہ وہ برت توڑ دے ایسا ہی تھا، جیسے وہ اپنے آپ سے کہے۔ وہ خاموش رہی مگر اپنی آنکھوں پر اس کو قابو نہ تھا، آنسوؤں سے اُمڈ آئیں۔

بوڑھے نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور مسکرا کر بولا ''پگلی پریشان مت ہو۔ میں مروں گا نہیں۔'' بیوی نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک سے جھریوں دار چہرہ چمک اٹھا۔

یہ اس نے بیوی کی پریشانی دور کرنے کے لیے ہی نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ رہنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ زندگی کا قائل تھا۔ زندگی سے منہ موڑنا اس کے ایمان کے خلاف تھا۔ جب ہی تو وہ موت سے اتنے اطمینان کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔

بوڑھا تمام دنیا میں اپنی خصوصیات کے لیے مشہور تھا۔ کوئی اس کو پاگل کہتا تھا، کوئی چالاک وسیاستدان، روحانی شعبدے باز، ننگا فقیر۔ اس کو کیا کیا خطاب نہ ملے تھے۔ حکومت نے اس کو باغی قرار دے کر پھر قید کر دیا تھا۔ اس کے دشمن اسے غدار، مکار، دھوکے باز اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ مگر اس کی قوم کے کروڑوں انسان اس کے نام پر جان قربان کرتے تھے۔ اس کی پوجا کرتے تھے۔

مگر اس کی قوم کے لوگ خود اس کے دوست اور رفقائے کار بھی اس بوڑھے کی بعض

حرکتوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ کہتا تھا کہ کسی جانور کو دکھ دینا پاپ ہے۔ اس نے اپنی قوم کو ہتھیاروں کے بغیر جنگ کرنا سکھایا تھا۔ دشمن کو سچائی اور عدم تشدد سے زیر کرنے کا گر بتایا تھا۔ کسی حد تک اس میں کامیابی بھی ہوئی تھی مگر ایسے وقت میں جب چاروں طرف سے دنیا میں جنگ کے دیوتا کا دور دورہ ہو۔ جب خون کے دریا بہہ رہے ہوں۔ جب ہلاکت اور ظلم اور تشدد انسانی زندگی کے اصول بن چکے ہوں۔ اس کا عدم تشدد کی تعلیم دینا حماقت نہیں تو مضحکہ خیز ضرور معلوم ہوتا تھا۔ وہ دشمن کو مارنا نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ وہ بمبار ہوائی جہازوں، ٹینکوں، مشین گنوں، زہریلی گیسوں کا مقابلہ روحانیت اور سچائی کے مظاہرے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ مشینوں کی طرح سوئے ہوئے بے روح، بے دماغ سنگدل ظالموں کے احساس انسانیت کو بیدار کرنا چاہتا تھا۔ کوئی کہتا تھا وہ مہاتما ہے۔ کوئی کہتا وہ پاگل ہے۔

اس کی روحانیت سے انکار مگر اس کی قیادت سے انکار نہ تھا۔ وہ اپنی قوم کے جذبۂ آزادی کا مظہر تھا اور ان کی جنگ آزادی میں ان کا جرنیل۔ اس نے کروڑوں انسانوں کو آزادی کے لیے کٹ جانا، مر جانا، سکھایا تھا۔ حکومت نے بوڑھے کو اور اس کے ساتھیوں کو قید کر دیا۔ ملک میں ایک آگ لگ گئی۔ حکومت کے ظلم کا جواب لوگوں نے تشدد سے دیا۔ جان کا بدلہ جان سے اور آنکھ کا بدلہ آنکھ سے لیا۔ بوڑھا برسوں سے انقلابی تشدد کے طوفان کو روکے ہوئے تھا۔ جب وہ قید ہو گیا تو یہ طوفان قانون کی بندشوں کو توڑ کر تمام ملک میں پھیل گیا۔

اخباروں میں لمبے چوڑے بیان شائع ہوئے، مضمون لکھے گئے، کتابیں چھاپی گئیں اور ان سب میں اعلان کیا گیا کہ تشدد کا تمام تر ذمہ دار ننگا فقیر ہے۔ اہنسا کے پجاری کو ایک خونی بھیڑیے کے روپ میں پیش کیا گیا۔ اس کے عمر بھر کے کام کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ دنیا یہ سن کر دنگ رہ گئی کہ عدم تشدد کے بھیس میں یہ تو بوڑھا تشدد پھیلا تا رہا تھا اور بوڑھا خود قید میں تھا۔ ان الزامات کو پڑھ کر اس کی روح تلملا گئی۔ اس نے اپنی خودی میں سے غصہ اور نفرت نکال پھینکے تھے وہ اپنے دشمنوں سے بھی پریم کرتا تھا۔ اس کا دل رنج اور افسوس سے بھر گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ اتنی سخت بے انصافی کی جائے گی مگر وہ قید میں تھا۔ نہ کوئی خط لکھ سکتا تھا نہ بیان شائع کرا سکتا تھا۔ دنیا میں اپنے اصولوں کی لاج رکھے تو کیونکر؟ اپنے بدن کو بھوک کی سزا دے کر موت

سے مقابلہ کرے؟ اس کے پاس تو بس ایک ہی نسخہ تھا۔ جو پہلے بھی وہ پانچ بار استعمال کر چکا تھا۔

اس نے ملک کے حکمران کو لکھ بھیجا۔ ''آپ نے اور آپ کے افسروں نے مجھ پر عجیب عجیب الزام لگائے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ چالیس برس سے میں سچائی اور عدم تشدد کے اصولوں کی تبلیغ کر رہا ہوں اور مجھے جواب دینے کا کوئی موقعہ نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں میرے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ ہے فاقہ کر کے اپنے نفس کو مارنا۔ لہٰذا میں نے طے کرلیا ہے کہ میں اکیس دن فاقہ کروں گا۔ میرا مقصد اپنے آپ کو ہلاک کرنا نہیں ہے۔ نہ سیاسی اغراض کے لیے آپ کو اس طریقہ سے مجبور کرنا بلکہ بے انصافی کے خلاف درخواست اس عدالت میں کرنا ہے جو آپ کی اور دنیا کی ہر عدالت سے اونچی ہے۔ اگر میں اس دوران میں مر گیا تو میں اپنی بے گناہی پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔ آئندہ نسلیں فیصلہ کریں گی کہ کون حق پر تھا؟ آپ یا میں۔ دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کا نمائندہ یا میرے جیسا ایک فقیر شخص جو اپنے ملک اور تمام انسانیت کا ادنیٰ خادم ہے۔''

اور اب اس تاریخی برت کے سات دن گذر چکے تھے۔ بوڑھا لحہ بہ لحہ کمزور ہوجا رہا تھا۔ چالیس کروڑ انسان اس کی زندگی کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ ہزاروں اس سے درخواست کر رہے تھے کہ برت توڑ ڈالے۔ ڈاکٹر پریشان تھے۔ موت انتظار کر رہی تھی کہ کب اس لافانی روح کو سمیٹ کر عالم بالا کی طرف لے جائے۔

مگر بوڑھا مسکرا رہا تھا۔

ایک شہر

زندگی اور موت!

مقابلہ سخت تھا!

موت لشکر کے لشکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ بمبار ہوائی جہاز، ٹینک۔ سینکڑوں میل کی مار کرنے والی توپیں، مشین گنیں، رائفلیں اور بندوقیں اور ریوالور، زہریلی گیس، سپاہیوں کے دل بادل، بے روح اور بے دماغ سپاہی جن کو زندگی کی بجائے موت کی تعلیم دی گئی تھی۔ جن کے

دلوں کو انسانیت، رحم، ہمدردی کے جذبات سے اس طرح خالی کر دیا تھا جیسے لیموں کو آہنی انگلیوں سے نچوڑ کر سارا رس نکال دیا گیا ہو۔

ایک شہر، نو جوان شہر، موت کا مقابلہ کر رہا تھا۔

ایک شہر، فولاد کا شہر، جس کا نام اس دیس کے سب سے بڑے سورما کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ پورا شہر لڑائی کے میدان میں اترا ہوا تھا۔ مرد، عورتیں، بچے، فوجی سپاہی، ہوا باز، انجینئر اور ڈاکٹر، مصنف اور شاعر، اخبار نویس اور آرٹسٹ، موٹر ڈرائیور اور باورچی، معمار اور مزدور۔

شہر کی عمارتوں میں کوئی دیوار سالم نہ تھی۔ ہر جگہ بم کے گولوں کے گھاؤ نمایاں تھے۔ مگر گوشت اور پوست کی انسانی دیوار فولاد کی طرح اٹل کھڑی تھی۔ اس دیوار کو دشمن کے پے در پے حملے نہ ہٹا سکے تھے، نہ ہلا سکے تھے۔

شہر دریا کے کنارے بسا ہوا تھا۔ دریا کا پانی انسانی خون سے مل کر لال ہو گیا تھا۔

شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ فیکٹریاں، کارخانے، اسکول، کالج، اسپتال، رہنے کے مکان، دکانیں، سڑکیں، باغات، پارک اور آج ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔ جہاں کبھی زندگی کا دور دورہ تھا۔ وہاں آج موت کا راج تھا۔ جہاں ہنستے ہوئے بچے نظر آتے تھے وہاں آج لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں، اسکولوں، کالجوں، لائبریریوں میں آتشیں بموں نے آگ لگا دی تھی۔ شہر کے کونے کونے سے دھوئیں کے کالے بادل اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔

اس شہر کے رہنے والے مہینوں سے اپنی زندگی، اپنے شہر کی زندگی کے لیے لڑ رہے تھے۔ ان کے رہنے کے مکان بمباری سے کھنڈر ہو گئے تھے۔ وہ دن رات خندقوں میں رہتے تھے۔ ہر لحہ شہر پر گولیوں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ وہ نہ سوتے تھے نہ کام کرتے تھے، نہ ہنستے تھے، نہ مسکراتے تھے۔ کپڑے پھٹ گئے تھے، داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ پپوٹے پھولے ہوئے تھے، کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے، بھوک اور پیاس کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ دن اور رات میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ دن میں دھوئیں کے بادلوں میں سورج چھپا رہتا اور رات کو شعلوں کی روشنی ہوئی۔ دن، تاریخ، وقت سب بے معنی ہو گئے تھے۔

اس شہر کی تاریخ عجیب تھی۔ ایک زمانہ میں یہ ایک معمولی قصبہ تھا۔ اس کا نام ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان دنوں دنیا کے اور شہروں کی طرح یہاں بھی بے کار امیر پڑے پڑے عیش کرتے تھے اور غریب مزدور باوجود سخت محنت کرنے کے بھوکے مرتے تھے۔ پھر انقلاب کا طوفان اٹھا۔ مزدوروں اور کسانوں نے تخت و تاج کو مٹی میں ملا دیا۔ عوام کی حکومت قائم کی۔ مگر ظالم اور جابر رجعت پسند اور سرمایہ دار، یوں آسانی سے ماننے والے تھوڑے ہی تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ خانہ جنگی کے شعلے ملک بھر میں بھڑک اٹھے۔ اس شہر میں۔ اس دریا کے کنارے اس انقلابی جنگ کا ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ شہنشاہ پرستوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر مردمیدان کے زیر کمان انقلابی فوجوں نے حملہ کیا۔ شہر کے لوگ استبداد اور ظلم کے خلاف کھڑے ہو گئے اور رجعت پسندوں کو شکست فاش ہوئی۔ شہر کا نام بدل کر اسی مردمیدان کے نام پر رکھا گیا جس نے اس کو انقلاب اور آزادی کی خاطر دشمن کے پنجے سے بچایا تھا۔

پچیس برس میں اس شہر کی صورت ہی بدل گئی۔ جو مزدور اندھیرے گندے، شکستہ مکانوں میں رہتے تھے۔ ان کے لیے شاندار خوب صورت عمارتیں بنائی گئیں۔ ان کے بچوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں کے دروازے کھول دیے گئے۔ نوابوں، زمینداروں، سرمایہ داروں کے محلوں میں مزدوروں کے لیے کلب اور اسپتال قائم کیے گئے۔ نئے کارخانے قائم ہوئے۔ ریلیں، ٹرامیں، بجلی، تار ٹیلیفون، پارک، تھیٹر، سنیما، لائبریریاں اور ہر چیز کام کرنے والوں کے لیے۔ زندگی کی ایک نئی لہر شہر میں دوڑ گئی۔ نہ صرف اس شہر میں بلکہ اس دیش کے ہر شہر میں، ہر گاؤں میں، آخر کار ہزاروں برس کے بعد انسان نے اپنی دنیا کی دولت پر قبضہ کر لیا۔ غاصبوں اور ظالموں کو مار بھگایا۔ مزدور راج قائم ہوا زندگی کی فتح ہوئی۔

مگر موت اور ہلاکت کے دیوتا کب خاموش بیٹھتے ہیں۔ دنیا میں امن اور چین، مساوات اور عوام کی بہبودی دیکھ کر وہ جل جاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ پھر زندگی پر موت غلبہ پائے۔ انصاف پر بے انصافی، مساوات پر استبداد، اجالے پر اندھیرا، موت کے لشکروں نے زندگی کے اس عظیم الشان مظہر پر حملہ کر دیا۔ امن عالم کو پھر جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔

قتل و غارت کا طوفان خوفناک رفتار سے بڑھا۔ شیطانی دماغوں نے سائنس کی مدد سے

وہ وہ ہتھیار تیار کیے تھے کہ ان کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ شہر ویران ہو گئے، کھیتیاں جلا دی گئیں، لاکھوں کا خون ہوا، عورتیں بیوہ ہو گئیں اور بچے یتیم۔ زندگی کے قدم اکھڑ گئے۔

مگر اس شہر پر زندگی نے پھر قدم جمائے۔ موت کے لشکروں کو رکنا پڑا۔ دشمن نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ زندگی موت کے طوفان میں رک گئی۔

اور یوں ہی کئی ماہ سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ دشمن اپنی بے پناہ قوت کو لیے شہر کے سامنے پڑا تھا۔ شہر پر بمباری ہو رہی تھی۔ چاروں طرف آگ اور تباہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شہر جل رہا تھا اور موت فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

زندگی خاموش تھی۔ مگر زندگی کے قدم مستحکم تھے۔

ایک بچہ

زندگی نے اپنے ہتھیار اٹھائے۔

صبح ڈاکٹر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ بچہ تکلیف سے کراہ رہا ہے۔ باوجود رنگ کالا ہونے کے اس کے چہرے پر خون کی کمی سے زردی جھلک رہی تھی، سانس بھی مشکل سے آ رہا تھا۔

"نرس"!

"جی ڈاکٹر صاحب!"

"آکسیجن!"

موت، گیس کا زندگی بخش سلنڈر آتے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ نلکی لگا ہوا قیف، بچے کی ناک پر رکھ دیا گیا۔ سانس آسانی سے آنے لگا مگر چہرے پر زردی کی جھلک بدستور تھی۔

"نرس!"

"جی ڈاکٹر صاحب!"

"نقلِ خون کرنا پڑے گا۔"

"میں حاضر ہوں۔"

"تمھارے خون کا امتحان ہو چکا ہے؟"

"جی ہاں! اس بچے کے خون کا امتحان کرا کے مقابلہ بھی کرا لیا ہے۔"
"تمھیں اپنا خون ایک کالے بچے کو دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟"
"جی نہیں، میں نسل و رنگ کے امتیاز کو نہیں مانتی۔"
"شاباش۔"

نرس کے گورے گداز بازو میں ایک موٹی سوئی گھسا دی گئی۔ ایک ربڑ کی نلکی میں سے ہو کر لال خون ایک بوتل میں جمع ہوتا گیا۔ بچہ حیرت سے یہ سب دیکھتا رہا جیسے کوئی نئی قسم کا کھیل ہو۔ پھر اس کے بازو پر سے آستین الٹ دی گئی۔

"ڈرنا مت، شاباش! بس ذرا سی تکلیف ہوگی۔"

بازو میں ایک ہلکی سی ٹیس ہوئی اور بوتل میں خون کم ہونے لگا۔

موت پریشان ہوگئی۔ اس کے لشکر کے قدم اُکھڑنے ہی والے تھے کہ اس نے نیا داؤ کھیلا۔ بچے کے کان میں کہا۔ "زندہ رہنے سے کیا فائدہ! دُنیا میں کالے رنگ کے لیے دُکھ ہی دُکھ ہے۔ گندے، سڑے مکان۔ گوروں کی گالیاں اور ٹھوکریں اور پھر کوئی زہریلی شہد کی مکھی کاٹ لے گی۔ زندہ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آسمان پر ستارے تمھیں بلا رہے ہیں اور خود اللہ میاں انتظار میں کھڑے ہیں۔"

نقلِ خون کا عمل ختم ہو گیا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیوں بیٹا! اب کچھ بہتر معلوم ہوتا ہے؟"
"میں زندہ نہیں رہنا چاہتا ڈاکٹر صاحب! مجھے ستارے بلا رہے ہیں ستارے اور اللہ میاں۔"
"نہیں بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

مگر بچے کو اپنے تلخ تجربات یاد آ رہے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بھیک مانگنے اور گالیاں کھانے کے لیے اس کو زندہ رکھنے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔ اُس نے ڈاکٹر کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔ "جب تک وہ تعاون نہ کرے۔ ہم مریض کو کیسے اچھا کر سکتے ہیں۔ صحت کے لیے دوا سے زیادہ قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔"

یہ سُن کر موت، پھر فاتحانہ انداز سے مسکرا دی۔ "ہر جگہ میری فتح ہے!"

ایک بوڑھا

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

انسان کے جسم کی مشین بھی عجیب ہے، جب تک بدن کے سب اعضاء مل کر اپنا کام نہ کریں۔ کل پرزوں میں خرابیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ معدے میں اگر خوراک نہ جائے تو علاوہ کمزوری کے بدن میں زہریلے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بارہویں دن ڈاکٹروں نے بوڑھے کے قارورہ کا کیمیائی معائنہ کیا تو اس میں ایک تشویش ناک زہریلا مادہ پایا۔ اگر دو تین دن اور اسی طرح گذرے تو پھر جان کی خیر نہیں۔

ایک ڈاکٹر جو بوڑھے کا دوست بھی تھا اس کے پاس گیا اور کہا ''دیکھئے، اس وقت میں ایک ڈاکٹر ہوں، نہ آپ کا دوست، نہ چیلا۔ میرا فرض انسان کی جان بچانا ہے۔ آپ کے جسم میں خوراک نہ جانے سے زہریلے اثرات پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ کی جان خطرے میں ہے، اس لیے مجھے آپ کو فاقہ توڑنے پر مجبور کرنا ہوگا۔''

بوڑھا کچھ سوچ کر ہلکے سے مسکرایا۔ طاقت اتنی کم ہوگئی تھی کہ وہ اب زور سے بول بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے کان سوکھے ہوئے ہونٹوں کے پاس لگا دیے ''ڈاکٹر یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔''

''نہیں، یہ آپ کی جان کا معاملہ ہے۔''

''اچھا! کب تک مہلت دے سکتے ہو؟''

''چوبیس گھنٹے۔ اگر کل صبح بھی قارورہ میں یہ زہریلا مادہ نکلا تو آپ کو برت توڑنا ہی پڑے گا۔''

''اچھا بھئی! تمہاری۔'' اور یہ کہہ کر بوڑھے نے آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں پرارتھنا کی۔ ''اے خدا! میری لاج تمھارے ہی ہاتھ ہے۔''

بوڑھے کا برت اس وقت نہ صرف ایک ملک، بلکہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، دور دراز کے غیر ملکی اخباروں کے نمائندے، ہوائی جہازوں سے اس برت کی رپورٹ بھیجنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہر چند گھنٹوں کے بعد ڈاکٹر، بوڑھے کی صحت کے متعلق بیان دے رہے تھے۔ چالیس کروڑ آنکھیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ تار، ٹیلیفون، اخبار، ہر ممکن ذریعہ سے منٹ

منٹ کی خبر تمام ملک میں پھیل جاتی تھی۔

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

ملک کے کونے کونے میں قوم پرستوں کے انقلابی مظاہرے، جلسے جلوس، ریزولیوشن، حکومت کے نام تار، بوڑھے کی رہائی کے مطالبے، اخباروں میں مضامین، سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے بیانات، ہر دل میں دھڑکن، جوش اور بوڑھے کی محبت۔

ایک صبح خبر آئی کہ خود دشمن کے کیمپ میں پھوٹ پڑ گئی۔ بوڑھے کے تین ہم قوموں نے جو اب تک غیر ملکی حکمران کے مشیر خاص بنے ہوئے تھے۔ استعفیٰ دے دیا۔ بوڑھے کو پلنگ پر لیٹے لیٹے یہ سب خبریں مل رہی تھیں۔ اس کا مشن کامیاب ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک کو، اپنے اصولوں کو، پھر دُنیا کے سامنے سرخرو کر دکھایا تھا۔ اُس نے جان کی بازی لگا کر پھر پانسہ جیت لیا تھا مگر اُس کے تن اور من میں ایک زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر صبح تک زہریلے اثرات دور نہ ہوئے تو وہ برت توڑ دے گا۔ برت ٹوٹ جائے گا۔ اس کا سب کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ دنیا اس پر ہنسے گی۔ خیر، اس کا اُسے کوئی خاص افسوس نہ تھا مگر دُنیا اُس کے اصولوں پر ہنسے گی، نہیں، وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی قوت ارادی، بدن کی گھٹتی ہوئی طاقت کے باوجود، آستین چڑھا کر زہر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی مگر کیا بدن کا کیمیائی عمل، ایک ستر برس کے بوڑھے کی روحانی قوت سے رُک جائے گا؟''

موت، زندگی کی امید پرتی پر ہنس رہی تھی۔

ایک شہر

موت کے لشکر برابر بڑھتے آ رہے تھے مگر زندگی نے ہار نہ مانی تھی۔ شہر کے مضافات پر دشمن کا قبضہ ہو گیا تھا۔ خود شہر کے آدھے حصے میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ہر سڑک، ہر گلی، ہر مکان پر بہادر ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک ایک انچ پر خون بہا رہے تھے۔ جان دے رہے تھے۔ عورتیں اور بچے بندوقیں لیے لڑ رہے تھے۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی کام آئے مگر ان کے

ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور توپوں کا آہنی سیلاب بڑھتا ہی چلا آرہا تھا۔

موت خوش تھی، ہنس رہی تھی۔ ''چند روز کی بات ہے، فتح یقینی ہے۔''

مگر زندگی نے ابھی ہمت نہ ہاری تھی۔ شہر کے باشندے قسم کھائے ہوئے تھے کہ دشمن کو ہماری لاشوں پر سے ٹینک گذارنے ہوں گے۔ گوشت اور خون کی ایک چٹان تھی جو دشمن کے راستے میں کھڑی ہوئی تھی۔

آخر وہ کون سا جذبہ تھا، جو ان شہریوں کی ہمتوں کو ابھارے ہوئے تھا۔ آزادی کا جذبہ، مساوات اور انسانیت کا جذبہ۔

ایک سپاہی سے کسی غیر ملکی اخبار نویس نے پوچھا'' کون سی وہ طاقت ہے۔ جو تمھارے شہر کو اب تک دشمن کے بے پناہ لشکروں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر رہی ہے؟''

سپاہی نے کہا:'' بھائی! میری عمر چالیس برس ہے۔ معلوم ہے۔ میں کہاں پیدا ہوا؟ اسی شہر میں، سؤروں کے ایک اصطبل میں۔ وہیں سوکھی گھاس کے ایک ڈھیر میں ایک سؤرنی نے بچے دیے تھے اور وہیں میری ماں نے مجھے جنا تھا۔ میرا باپ ایک زمیندار کا غلام تھا۔ میری ماں، مجھے جنم دینے کے تین دن بعد کام پر جانے کے لیے مجبور کر دی گئی تھی۔ میں وہیں سؤرنی کے بچوں کے پاس پڑا رہتا تھا، سردی لگتی تو ان سؤر کے بچوں کے ساتھ ان کی ماں کے گرم جسم کے ساتھ لیٹ جاتا۔ یہ تھی ہماری زندگی اس زمانے میں اور پھر انقلاب آیا اور کایا پلٹ گئی۔ ہم انسان بن گئے ہمارے لیے اچھے اچھے مکان بنے۔ اسپتال اور کالج، میرا لڑکا اور لڑکی یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ سمجھے! یہ ہیں انقلاب کے نتائج! اس انقلاب کو بچانے کے لیے آج ہم اپنی جانیں دے رہے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر دشمن کامیاب ہوگیا تو مزدوروں اور کسانوں کی حالت پھر جانوروں، کتوں اور سؤروں سے بدتر ہو جائے گی، یہ موت اور زندگی کا سوال ہے میرے بھائی!''

شہر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی دیوار اٹل کھڑی تھی۔

اور پھر ایک دن خبر آئی کہ شمال کی طرف سے کمک آرہی ہے۔ شہر میں ہر شخص کے چہرے پر زندگی اور بشاشت کے آثار نظر آنے لگے۔ ہمتیں بلند ہو گئیں۔ سینے تن گئے۔

موت کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ موت گھبرا سی گئی۔

ایک بچہ

نرس پریشان تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح کالے بچے کے جذبۂ زندگی کو بیدار کرے۔

دن بھر وہ کروٹ لیے، دیوار کی طرف منہ کیے ہوئے پڑا رہتا تھا۔ آکسیجن اور نقلِ خون نے اس کی جان بچالی تھی۔ انجکشنوں نے زخم کے زہر کا اثر کم کر دیا تھا مگر اس کی قوتِ ارادی نے زندگی سے عدم تعاون کر رکھا تھا اور وہ دھیرے دھیرے موت کی تاریک گہرائیوں کی طرف پھسلتا جارہا تھا۔

کالے بچے کے ننھے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا تھا۔ ''یہ گوروں کی دنیا ہے۔ ایک کالے آدمی کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ مرجائے۔ تمام گوری نسل کے خلاف اس کا دل نفرت اور غصے سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں اس نسل سے تھے۔ اس لیے وہ ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی دوا پلاتے تو پی لیتا۔ انجکشن کی تکلیف سہہ لیتا لیکن پاس بیٹھ کر نرس، اس سے بات کرنے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی تو وہ کوئی جواب نہ دیتا اور دیوار کی طرف منہ کر لیتا۔

مگر نرس نے ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ زندگی کی فوج کی بہادر سپاہی تھی۔ اس کا فرض موت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ خود اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے دل میں ہر بچے کے لیے خواہ وہ کالا ہو یا گورا، ایک مادرانہ جذبہ تھا۔ ہر بچہ اس کا بچہ تھا، اس کالے بچے کو بھی وہ اپنا بچہ تصور کرتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اسے مرنے نہ دے گی۔

ایک دن نرس کو بیٹھے بیٹھے ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا ریڈیو اٹھا کر کالے بچے کے کمرے میں اس کے پلنگ کے پاس لگا دیا۔ بٹن دباتے ہی کمرہ موسیقی کی لہروں سے لبریز ہوگیا۔ بچے کے دل و دماغ میں موسیقی کے لیے ایک عجیب کشش تھی۔ شاید یہ ورثہ تھا۔ جو اُس کو اپنی نسل سے ملا تھا۔ جیسے ہی اس نے گانے کی آواز سنی، اس نے دیوار کی طرف سے منہ ہٹا کر دوسری طرف کر لیا۔ نرس ایک لکڑی کے صندوقچے کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ آواز صندوقچے میں سے آرہی تھی، کتنی سریلی، کتنی میٹھی۔

کتنے ہی دنوں کے بعد پہلی بار بچے کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آئی، وہ مسکرا دیا۔

نرس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے کسی نے دنیا کی سب سے بڑی نعمت بخش دی ہو۔

موسیقی کی نرم نرم بارش کمرے میں ہوتی رہی۔ بچّے کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی روح کے زخموں پر کسی نے محبت بھرے ہاتھوں سے مرہم لگا دیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں تاکہ ترنم کا یہ فردوسی چشمہ صرف کانوں کے ذریعے اس کے بدن کے ہر حصے میں رس جائے۔

مگر تھوڑی دیر میں موسیقی کا پروگرام ختم ہوگیا۔ اناؤنسر کی آواز آئی۔ ''اب لاسلکی کی لہروں پر ہم آپ کو دور دراز ملک میں لے جاتے ہیں جہاں سے ہمارا نمائندہ آپ کو دُنیا کی عجیب وغریب جنگ کا حال سنائے گا۔'' اور پھر ایک دوسری اور کسی قدر دھیمی آواز — جیسے دور سے آرہی ہو، سنائی دی۔

''میں جان اسمتھ بول رہا ہوں۔ میں ایک جنگی رپورٹر ہوں۔ میں نے پچھلے بیس سال میں آدھی درجن جنگوں کی خبریں، اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے ملک والوں تک پہنچائی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم، منچوریا کی لڑائی، جنگ حبش، جنگ ہسپانیہ، چین اور جاپان کی جنگ اور اب یہ دوسری جنگ عظیم مگر آج میں آپ کو دُنیا کی سب سے حیرت ناک جنگ کا حال سناتا ہوں۔ یہ ہوائی جہازوں، توپوں اور ٹینکوں کی جنگ نہیں ہے۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور میدان جنگ ایک بوڑھے آدمی کا کمزور جسم ہے۔ جو سترہ دن سے فاقہ کر رہا ہے..........

نرس نے پوچھا: ''یہ پروگرام بدل کر کوئی دوسرا موسیقی کا پروگرام لگا دوں؟''

کالے بچّے نے کہا: ''نہیں۔ نہیں۔ میں اس بوڑھے کا حال سننا چاہتا ہوں —'' نہ جانے کیوں؟ اُس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس بوڑھے کی زندگی اور اس کی اپنی زندگی میں قریب کا تعلق ہے۔

ایک بوڑھا

موت، ایک دفعہ پیچھے ہٹ کر پھر زور شور سے دھاوا کر رہی تھی۔

ڈاکٹر بوڑھے کی قوتِ ارادی کے معجزے پر متحیر اور خوش تھے مگر اگلے چار دن کے خیال سے ہراساں تھے۔

قارورے میں جو زہریلا مادہ پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ آپ سے آپ، بغیر کسی دوا کے، بغیر کسی غذا کے دور ہوگیا تھا۔ سائنس حیران تھی، زندگی نازاں اور بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ اس کو ڈاکٹر فاقہ توڑنے پر مجبور نہ کر سکے۔ وہ اب تک زندہ تھا۔ اس کا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی چمک تھی۔ اس کی مشہور حاضر جوابی کا اب بھی وہی حال تھا۔

مگر سترہ دن کے فاقے کا اثر ہونا ہی تھا۔ دل کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ حرکت برائے نام ہی تھی۔ ڈاکٹر آنے لگا کر دیکھتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی گھڑی میں چابی ختم ہو رہی ہو اور اس کی رفتار اتنی دھیمی ہو جائے کہ ہر لمحے رک جانے کا اندیشہ ہو۔

موت کو اپنی فتح کا پھر یقین ہو چلا تھا مگر زندگی نے ہمت نہ ہاری تھی۔

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

ملک کے کونے کونے میں، محلوں میں، جھونپڑوں میں، کلب میں اور چوپال میں، ریل گاڑیوں میں، بیل گاڑیوں میں، ہر جگہ بس ایک چرچا، ایک خیال، ایک آرزو، صرف ایک امید، بوڑھے کی جان بچ جائے۔ وہ اپنے کڑے امتحان میں کامیاب ثابت ہو۔ مندروں میں اور مسجدوں میں، شوالوں میں اور خانقاہوں میں، گرجا میں اور اگیاری میں، اس کی زندگی کے لیے دعائیں کی جارہی تھیں۔ نماز کے بعد بوڑھی مسلمان عورتیں گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ''اے رحیم وکریم! ہماری قوم کے بوڑھے باپ کی جان بخش دے۔'' پوجا اور گیتا پاٹھ کے بعد بوڑھی ہندو عورتیں بھگوان سے پرارتھنا کرتی تھیں۔ ''اے بھگوان! تو بڑا دیالو ہے۔ ہم پر ہمارے دیش پر کرپا کر۔ بچے دو دو وقت کے فاقے کر رہے تھے تاکہ کھانے کی قیمت بچا کر خیرات کر دیں۔ شادیاں اور خوشیاں، جشن اور جلسے، تہوار اور تیج اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیے گئے تھے، جب تک بوڑھے کا فاقہ خیریت سے ختم نہ ہو۔

بوڑھا مر رہا تھا اور اس کا اصول، اس کا دھرم زندہ ہو رہا تھا تمام دنیا اس کے خیالات میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کی کتابیں اس کے مضامین کو غور سے پڑھا جا رہا تھا۔ اس کی روحانی سیاست کا مقابلہ دنیا کے حکمرانوں کی چالبازی اور خود غرضی سے کیا جا رہا ہے۔ لوگ حیران تھے کہ کون سی طاقت ہے جو اس ضعیفی اور کمزوری کی حالت میں اس ستر برس کے بوڑھے کو زندہ

رنگے ہوئے ہے۔ بوڑھے اور اس کے اصولوں کے ساتھ ساتھ اس کی قوم کی جنگ آزادی کا بھی پرچار ہو رہا تھا۔ ایک فرد کے فاقے نے دنیا کے چالاک سیاستدانوں کو پریشان کر دیا تھا۔

ایک بچہ

نرس از حد خوش تھی۔

جب سے کالے بچے کے کمرے میں ریڈیو لگا تھا۔ اس کی حالت میں حیرتناک تبدیلی ہوگئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے زندگی میں نئے سرے سے دلچسپی ہوگئی ہو۔ اب وہ کبھی دیوار کی طرف منہ کر کے نہ لیٹتا۔ اس کا مزاج بھی چڑچڑا نہ رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی دوا پیتا، انجکشن لگوا لیتا۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں سے ہنس کر بات کرتا۔

ریڈیو کے جادو بھرے ڈبے میں سے موسیقی کا چشمہ بہتا اور وہ گھنٹوں لیٹا لیٹا، آنکھیں بند کیے ہوئے اس کی نرم نرم لہروں.......... میں بہتا رہتا مگر بارہ بجے جب اناؤنسر کہتا۔

''اب

''لاسلکی کی لہروں پر ہم آپ کو ایک دور دراز ملک میں لے جاتے ہیں..............'' وہ آنکھیں کھول کر تکیوں کے سہارے لگ کر بیٹھ جاتا۔ نہ جانے، اس کو دور دراز ملک کے بوڑھے سے اتنا لگاؤ کیوں ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے جنگی رپورٹر کی زبانی سنا تھا کہ بوڑھے کو بچوں سے بہت محبت ہے۔ شاید اس لیے کہ عمر بھر بوڑھا گوروں کی ایک زبردست حکومت سے بے ہتھیاروں کی جنگ کرتا رہا تھا۔ خود اس کا یہ فاقہ بھی اسی جنگ کا ایک معرکہ تھا۔ کالے بچے نے سنا تھا کہ بوڑھے نے اپنے ملک کے کروڑوں کالے رنگ کے لوگوں کو خودداری سکھائی تھی۔ خودداری، خوداعتمادی، آزادی اور اصولوں کے لیے لڑ جانا، مر جانا۔ ان باتوں کو سن کر کالے بچے کے ذہن پر سے ناامیدی اور مایوسی کے بادل چھٹ جاتے اور وہ سوچتا میں بھی جب بڑا ہو جاؤں گا تو اس بوڑھے کی طرح اپنے لوگوں کو آزادی کے لیے لڑنا اور مرنا سکھاؤں گا۔

مگر جب اس نے ریڈیو پر سنا کہ بوڑھے کی حالت نازک ہوتی جا رہی ہے اور وہ اکیس دن کے فاقے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ تو کالے بچے کو ایسا معلوم ہوا جیسے خود اس کے جسم سے

تندرستی اور زندگی نکلی جا رہی ہے۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پلنگ پر چپکا آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اس عرصے میں ریڈیو نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سنا مگر پھر بندوقیں چلنے کی اور بم پھٹنے کی خوفناک آواز آئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

''ڈریے مت۔ یہ بم آپ کے گھر سے چھ ہزار میل کے فاصلے پر پھٹ رہے ہیں۔ لاسلکی کے ذریعہ صرف ان کی آواز ہم آپ تک پہنچا رہے ہیں تاکہ آپ نہ صرف اس جنگ کا حال ہی سن سکیں بلکہ خود اپنے کانوں سے اس جنگ کی اصلی آوازوں کو بھی سن سکیں۔ یہ جنگ آپ کے گھروں سے بہت دور ہو رہی ہے مگر یہ آپ ہی کی جنگ ہے۔ آپ کے اصولوں کی خاطر، آپ کی آزادی کی خاطر، آپ کی ماں بہنوں کی عزت کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔ لال لشکر کے یہ بہادر سپاہی جو گاتے ہوئے میدان جنگ کی طرف جا رہے ہیں، یہ آپ کے ساتھی ہیں۔ یہ آپ کے دشمن کو اپنے گوشت پوست کی دیوار سے روکے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی جان کی قربانی دے کر آپ کی اور آپ کے وطن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ان کی آواز آپ کی آواز ہے............'' اور پھر کالے بچّے کا کمرہ ایک پرجوش گانے سے گونج اٹھا۔

اس لشکر کے سپاہیوں کا گیت ایک نامعلوم زبان میں تھا۔ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکتا تھا مگر ان آوازوں میں وہی خود فراموشی، وہی جوش، وہی خلوص تھا جو اس کو اپنے کالے لوگوں کے گانوں میں ملتا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ بھی ان سپاہیوں کے ساتھ ہوتا اور اسی طرح گاتا ہوا میدان جنگ کی طرف جاتا۔

گانا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ پھر اناؤنسر کی آواز آئی۔

''آیئے آپ کو ہم اس شہر کی سیر کرائیں جو اپنی شجاعت کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ وہ شہر جو سال بھر سے دشمن کی بے پناہ فوجوں کے خلاف ڈٹا ہوا ہے۔ وہ شہر جس میں کوئی عمارت سالم نہیں، جہاں رات دن موت کی بارش ہوتی ہے جہاں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے مگر جہاں کے مرد، عورتیں اور بچّے اپنے شہر اور اپنے ملک کی آزادی کی خاطر ایک ایک انچ پر کٹ رہے ہیں، مر رہے ہیں، مر رہے ہیں، مگر پیچھے نہیں ہٹ رہے۔

ریڈیو میں سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی جہازوں کی خوفناک گونج، گولوں کے دھماکے، گولیوں کی سنسناہٹ اور کالا بچہ اپنے زخم کی تکلیف بھول گیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک اسپتال میں نہیں ہے بلکہ اس شہر میں ہے جہاں لال لشکر دشمن کے خلاف ڈٹا ہوا ہے اور اس کو یقین ہو گیا کہ نہ لال لشکر پیچھے ہٹے گا نہ وہ موت کے سامنے ہار مانے گا۔

ایک شہر

شہر سے میل بھر باہر دشمن کی فوجیں خندقوں میں پڑی تھیں۔ وہ وہاں سال بھر سے پڑی ہوئی تھیں۔ برسات کی بارش، کیچڑ، جاڑے کی برفباری، خون کو جما دینے والی سردی— کیا کچھ ان کو برداشت نہ کرنا پڑا تھا مگر جس چیز نے ان کے قدم اکھاڑ دیے تھے، ان کے حوصلے پست کر دیے تھے، وہ شہر والوں کی ہمت تھی جو باوجود ہتھیاروں کی کمی کے لڑے ہی جاتے تھے۔ دشمن کی فوج کے ہر سپاہی کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا مقابلہ معمولی انسانوں سے نہیں بلکہ ایسی مافوق البشر ہستیوں سے ہے، جن پر کوئی ہتھیار کارگر ثابت نہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں، درجنوں بار، سینکڑوں بار دشمن کی فوج نے شہر پر دھاوا کیا تھا۔ ہوائی جہازوں سے بمباری کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ ٹینکوں کے آہنی ہاتھیوں کو ساتھ لے کر حملہ کیا تھا۔ مضافات تاخت و تاراج کرتے ہوئے شہر کے بیچوں بیچ پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر شہر والوں نے ان کو مار بھگایا تھا اور انھیں دوبارہ اپنی خندقوں میں بڑی بڑی توپوں کے سائے میں، پناہ لینی پڑی تھی۔ یہ شہری فوجی اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ قاعدے سے وہ ہار چکے تھے۔ لڑے ہی جاتے تھے۔ مرے ہی جاتے تھے اور لڑتے بھی تو کتنے اوٹ پٹانگ طریقے سے۔ نہ کوئی باقاعدہ باوردی فوجی دستے، نہ ٹینک، نہ ہوائی جہاز، بس ہر ایک شہری ایک بندوق ہاتھ میں لیے اس طرح لڑ رہا تھا جیسے یہ اس کی اپنی ذاتی لڑائی ہو۔ جب دشمن کے ٹینک اور فوجی دستے سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے شہر کے بیچ پہنچ جاتے تو ہر ٹوٹے پھوٹے مکان، ہر کھنڈر، ہر دروازے، ہر کھڑکی، ہر سوراخ میں سے ان پر گولیوں کی بارش ہوتی اور شہر والوں کے جھنڈ کے جھنڈ انقلابی نعرے لگاتے ہوئے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے،

ٹینکوں پر ٹوٹ پڑتے خوفناک اور گھمسان کی دست بدست لڑائی ہوتی اور دشمن کے دستوں کو پیچھے ہٹنا ہی پڑتا۔

اور اب خبر آئی تھی کہ لال لشکر کے کئی بڑے دستے شہر کی مدد کو آ رہے ہیں۔ دشمن کی فوج کا جرنیل گھبرایا ہوا تھا۔ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ اس کی فوجیں سال بھر سے پڑی ہوئی تھیں مگر یہ کم بخت شہر تھا کہ زیر ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایسا شہر اس نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ کبھی سنا تھا۔ پچھلے تین سال میں مختلف ملکوں میں درجنوں شہروں پر اس نے اور اس کی فوجوں نے حملہ کیا تھا اور ہر شہر پر تھوڑی بہت لڑائی کے بعد قبضہ کر لیا تھا مگر یہ عجیب شہر تھا جس کے رہنے والے ہار کے لفظ ہی سے ناواقف تھے، زیر ہونا جانتے ہی نہیں تھے اور اب اگر عقب سے لال لشکر کے دستوں نے حملہ کر دیا تو اس کی فوج کا تو چکّی کے دو پاٹوں میں پس کر خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

اس نے ٹیلیفون کے ذریعے اپنے ملک کے جابر حکمران کو خبر بھیجی کہ حالت نازک ہوتی جا رہی ہے۔ اس کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی فوج کو پیچھے ہٹا لے۔ اس شہر کو فتح کرنے کا خیال چھوڑ دے۔

جابر حکمران ہزار میل پرے آرام سے اپنے گرم کمرے میں گدے دار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو تو بس ایک ہی دھن تھی۔ ''نہیں۔ یہ شہر فتح ہونا چاہیے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ پرواہ نہیں۔ تم لڑے جاؤ۔''

جرنیل نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

ایک سپاہی گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جیسے اس نے دن دہاڑے کوئی بھوت پریت دیکھ پایا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ کہہ پایا۔

''لال لشکر نے شمال کی جانب سے حملہ کر دیا ہے۔''

ایک اور سپاہی دوڑا ہوا آیا۔

شہر والے ہماری خندقوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔

O

زعفران کے پھول

خواجہ احمد عباس کا تیسرا افسانوی مجموعہ جو پہلی بار
کتب پبلشرس لمیٹیڈ، ممبئی سے پہلی بار مارچ 1948 میں شائع ہوا

زعفران کے پھول

(کرشن چندر کے نام)

آؤ، مسافر، یہاں! اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں...وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمھاری؟...پنکچر ہوگیا ہے؟...کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے...اب بیس کوس کی تو بات ہی ہے...نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیے۔ اور پھر پیسہ لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟...اکیلی جان ہوں، ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں، چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں، اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے۔ پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی اور چاہیے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن...تم بھی کہتے ہوگے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا ہے...

کیا کہا تم نے، بیٹا؟...نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے...ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں...اس کی وجہ کیا ہے؟...یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بے وقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں...

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟...ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی...موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا! پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی، یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیئے جائیں گے، اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟...دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے... ہے نا؟...پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟... یا ابھی تمہاری موٹر درست ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟...خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلہن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے۔

تمہاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا...... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بے چارہ کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے۔ جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا:

''عجیب بات ہے کوئی بھی نہیں آئی۔''

میں نے پوچھا: ''کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو؟''

تو جواب ملا:

''ہنسی، ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے۔ حالانکہ کتابوں میں تو......''

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ بے چارہ کتابوں میں پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے زعفرانی آ گئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی... بیٹا، بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں... ہاں تو زعفرانی... کیا کہا... زعفرانی کون؟... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی... نہیں بتایا تھا؟... بھول گئی ہوں گی... لو دیکھ لو یاد کا یہ حال ہے بیٹا... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی، لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ گدال مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!!... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوب صورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں، مجھے تو اس میں کوئی خوب صورتی ووبصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دبلی تھی جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ دیدے پھٹے ہوئے۔ اوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں، نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب، میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی

ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا...

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون بَر مل سکتا تھا؟... میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہوگیا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے، اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہوگئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہوگئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم لڑکی کو کون بیاہے گا۔

...سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری۔ کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔ کبھی برف میں تباہ ہوجاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجا کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجا پرجا کا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے۔ مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے...کئی برس کی بات ہے، ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نورو چلاتا ہوا آیا۔

''ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں، شیر کشمیر۔''

بس اتنا کہہ یہ جاوہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آدیں... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو—— کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہوگا، تبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہوکر جارہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں..

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر...اے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے—— ایک اسکول ہے—— اب تو مڈل تک کا ہوگیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی

پڑھائی ہوتی تھی ـــــ ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور سامنے نہ شیر نہ چیتا، ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لوجی یہ تھا وہ شیر کشمیر... میں نے کہا۔ ''لوخواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا توا رکھ کے بھونپو والا باجہ بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا، اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہوگئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔ اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجا اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہیے۔ لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہیے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا؟ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں تا کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے، ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں سے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے، وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں...

تم تو جانتے ہی ہو تالاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو۔ سارے پانی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا، یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام چین، صلح، شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمھارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انھیں راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے روکھی سوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں، تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہوئے ہو... پر میری کون سنتا ہے، بیٹا... وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا

تھا۔۔تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟۔۔۔وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں، ہاں، بیٹا۔ اس کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہو گے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھہرے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے۔۔۔ یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں، پر تم تو بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجا نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پر تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے ہی لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا، نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔۔۔

۔۔۔۔۔ جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی۔ بڑا غلام نبی کہنے لگا، میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا۔ چھ۔ مہینے۔ بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڈھا، جہاں بوجھا سنبھالنے کے لیے مزدور پٹکا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانستا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسا گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش آ گئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے۔۔ چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا نورو بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نورو کو گئے تین چار مہینے

ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمھاری خیر نہیں ہے۔ تمھارا منجھلا بیٹا نور وشیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جاجا کے تقریر کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی منیڈ کی کو بھی زکام ہوا وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا نہ میں اس کی ماں...

......زعفرانی؟ تو اس کا تو ذکر ہی کرنا بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں۔ اور یہاں اول تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سُنا سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہوگئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ پوچھومت۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے۔ کبھی اون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا غفورا دس برس کا ہوگیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگادیں۔ پر زعفرانی بولی، نہیں ماں ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہوگئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے میں داخل کروا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں۔ پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہوگئی... مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے۔ اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی... پر بیٹا اس لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلادے......

......جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے بیٹا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں... بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں حور کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سنیما، بائیسکوپ، ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہوگئے ہیں ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آرہی

ہے۔ زار و قطار روتی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو کچھ جواب نہیں بس روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا، گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی۔ بیٹا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ کہنے لگی۔

''ماں! میرا بیاہ کردو''۔ اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اسے چھیڑنے اور اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بد ارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول بیٹھی ہوئی تھی دل میں، ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور رو رہی تھی اور جب ہچکیاں ذرا رکتیں تو یہی کہتی۔

''ماں میرا بیاہ کردو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی۔۔''

...اب تم ہی بولو بیٹا، غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس بدتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے... پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے، تو یہ فکر تو دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل صورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر پٹے کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

''غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمود''۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا۔

''غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا۔ اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کردیں۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمود کے منہ پر

کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟''

محمد و کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

''ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اُسے دق ہوگئی تھی۔'' اور بس چپ ہو گیا

... بیٹا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے... اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے۔

میرا تو، جو حال ہوا سو ہوا، زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا، چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی اور بھی فکر پڑ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کہ پڑھ۔ تختی لکھ۔ مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے۔ نہ جانے کیوں؟...

ہاں اور محمد و کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری دنوں کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

''کب اور کیسے بیمار پڑا، علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟''

اور جب محمد و نے کہا۔

''ہاں بہت سوں کو''۔ تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا۔

تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟'' ... نہ جانے کیوں...

... میرے کہنے سے محمد و ہمارے ہاں تین دن اور ٹھہرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا:

''کیوں محمد و! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟''

وہ بولا۔

''چھوڑ کر کیا کروں گا، ماں جی؟ اور کوئی کام آتا نہیں ہے۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ نہ ماں نہ باپ...''

میں نے جلدی سے پوچھا:

''اور بیوی؟''

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''کب کی مرگئی''

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں، پر میں نے کہا۔

''دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟''

اس کو تین دن میں میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی چمک ہوئی اور اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں۔

''مجھ سے کون بیاہ کرے ہے، ماں جی؟''

...تو بیٹا یوں زعفرانی کا بیاہ محمد و سے طے پایا۔

...کیا کہا؟ زعفرانی کی رائے؟... بیٹا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمد و اسے بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش ہوگئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہوگئی ہو۔

...شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹا، آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمد و آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں

نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر دیر سے ڈرے میری بلا، پر اور عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں نکو بنوں۔ سو میں نے بھی سلوالی...

...اتنا غصہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکا یک سارے گاؤں میں شور مچ گیا، شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے، مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا... پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود بھی راجا ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی، میں نے کہا اب کے اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمد و اور اس کے ساتھی برأت لائے ہوں مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لیے "شیر کشمیر زندہ باد" "ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے۔ اور ہمارا انور دچھ اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا... ک ش م ی ر چھوڑ دو"... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ ہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے کوئی بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

... ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی اور اس میں سے سپاہی کود کر بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔ میں دیوار کی طرف دوڑی، جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہوا کھریا سے لکھ رہا تھا پر غفورا وہاں نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا، جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا... میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی حرفوں کو دہراتے رہے جنھیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ک۔ ش۔ م۔ ی۔ اور ابھی "ر" نہیں کہہ مانا تھا کہ

گڑ گڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی...

...اور اس کے بعد کیا ہوا، بیٹا، یہ مجھے ایسا یاد ہے، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا، دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے۔

...زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں، اس وقت دود ہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں...آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی..

...اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ اور یہ سارا مجمع کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا۔ یہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

...بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف، زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں..

...ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں، زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی...

...عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کے بجائے خون...خون مٹی میں مل رہا تھا...

اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

''میرا بیاہ ہو گیا ماں''

...یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گل لالہ کی طرح سرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

...سنی بیٹا، تم نے میری کہانی؟...پر تم کہاں ہو؟...چلے گئے نا تم؟...میں نہ کہتی تھی کہ ابھی

تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سن پاؤ گے۔
......موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں۔ بیٹا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر سے مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ ''اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟''
پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں...

○

اجنتا

(سردار جعفری کے نام)

''اجنتا ہندوستان کے آرٹ کی معراج ہے، دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے...... بڑے بڑے انگریز اور امریکن یہاں آ کر دم بخود رہ جاتے ہیں...... یہ غار ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہیں۔ ان کو کھودنے، تراشنے، ان میں مجسمے اور تصویریں بنانے میں کم سے کم آٹھ سو برس کا عرصہ لگا ہوگا...... مہاتما بدھ کے اس مجسمے کو دیکھئے......''

سرکاری گائیڈ کی منجھی ہوئی آواز غار کی اونچی پتھریلی چھت سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ اور روپیہ ڈیڑھ روپیہ روزانہ بخشش۔'' کے عوض وہ اپنا طوطے کی طرح رٹا ہوا سبق دن میں نہ جانے کتنی بار دہراتا تھا۔ نرمل کو اس کی آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے رہٹ چل رہا ہو، یا چرخا یا کولہو۔ روں، روں، روں، روں۔ ایک بے معنی، بے روح آواز کا لامتناہی سلسلہ جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

بھارتی— جو آرٹ کی پرستار بھی تھی اور خود آرٹ کا ایک نادر نمونہ بھی— گائیڈ کے الفاظ پر سر دھن رہی تھی۔ ہزاروں برس پرانے آرٹ کے اس اتھاہ سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتی تھی۔ ہر تصویر، ہر مجسمے، ہر ستون، ہر محراب، ہر پھول اور پتی کو دیکھ کر اس کے منہ سے تعریف کا چشمہ بے اختیار پھوٹ نکلتا تھا— ''اوہ نرمل یہ دیکھو......اوہ نرمل وہ دیکھو...... مہاتما بدھ کے چہرے پر

کتنا سکون اور شانت اکسپریشن ہے......اس اپسرا کے بالوں کا سنگھار تو دیکھو...... ہاؤ سوئیٹ......
کتنا سندر...... ہاؤ ونڈر فل......''

نرمل خاموش تھا۔ وہ نہ گائیڈ کی روں روں سن رہا تھا اور نہ بھارتی کے پُر جوش تعریفی جملے......اس کی نگاہیں دیوار پر بنائی ہوئی تصویروں پر ضرور تھیں۔ مگر اسے سوائے دھندلے رنگین دھبوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا......اس کے کان گائیڈ کی رٹی ہوئی تقریر کو سن رہے تھے، پر اب تک وہ صرف آواز تھی۔ بے معنی۔ دھیما دھیما شور چرخے یا کولہو یا رہٹ کی روں روں کی طرح...... بھارتی جب بولتی تو نرمل کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں پر کوئی غیر متعلق اور قطعی غیر ضروری چوٹ پڑی ہے...... جیسے گرمی کی دوپہر میں تانبے کی طرح تپتا ہوا آسمان ایک اڑتی ہوئی چیل کی ہیبت ناک چیخ سے گونج اٹھے......

نہ جانے وہ کس نمبر کے غار میں تھے۔ نہ جانے وہ کس تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے......گائیڈ کی روں روں جاری تھی...... یہ دیکھیے ایک پچھلے جنم میں سنیاسی کے روپ میں مہاتما بدھ اپدیش دے رہے ہیں۔ بنارس کے راجا کی یہ زنگی مہاتما بدھ کے اپدیش سنتی ہے......راجا کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود جا کر سنیاسی سے سوال جواب کرتا ہے......تم کون ہو اور کیا اپدیش دے رہے ہو......وہ کہتے ہیں میں شانتی اور سچائی کا ذکر کر رہا ہوں......راجا اپنے جلاّد کو حکم دیتا ہے کہ وہ سنیاسی کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان تلوار سے کاٹ ڈالے۔ پر ہر بار مہاتما بدھ نے یہی کہا کہ شانتی اور سچائی تو میرے دل میں ہے۔ ناک، کان، ہاتھ، پاؤں میں نہیں ہے...... یہ دیکھئے ان کے زخموں سے خون......

خون!'

گائیڈ کی بے معنی، لامتناہی روں روں میں سے اس ایک الفاظ نے نرمل کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ایک چوٹ لگائی۔

خون! اجنتا کے غاروں کی پتھریلی دیواریں یک لخت فضا میں تحلیل ہو گئیں— اب وہاں نہ مجسّمے تھے، نہ تصویریں نہ ستون— نہ گائیڈ اور نہ بھارتی— نہ سرسبز پہاڑیاں، نہ وہ سریلے شور کے ساتھ بہنے والی ندی— نہ آرٹ اور نہ تاریخ— نہ دھرم اور نہ مذہب— نہ مہاتما بدھ اور نہ بنارس کا

ظالم راجا......

خون!

خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر اور ان خونیں لہروں پر بہتا ہوا نرل پھر بمبئی واپس پہنچ گیا۔ وہی خونی بمبئی جس سے بھاگ کر اس نے تین سو میل پرے اور ڈیڑھ ہزار برس پرانے غاروں میں پناہ لی تھی......

یکم ستمبر۔ شام کو حسب معمول وہ اپنا کام ختم کر کے گرگام اپنے دوست وسنت کے دفتر گیا تھا کہ دونوں ساتھ ہی ٹرین سے دادر جائیں گے کہ خبر آئی کہ شہر میں ہندو مسلم کا فساد ہو گیا ہے۔ کام چھوڑ کر ہر کوئی اس مضمون پر رائے زنی کرنے لگا۔

''تم دیکھنا یہ فساد چند گھنٹے میں دب جائے گا۔ اس بار گورنمنٹ نے پوری تیاریاں کر رکھی ہیں......''

پر آج کیسے ہو گیا؟۔ مسلم لیگ کالے جھنڈوں کا مظاہرہ تو کل کرنے والی ہے......

'یہ کلکتہ کی خبروں کا اثر ہے......'

'سنا ہے کئی ہزار چھرے پکڑے گئے ہیں......'

'سنا ہے گول پیٹھا پر پنڈت جواہرلال نہرو کی تصویر کو ایک مسلمان پرانے جوتوں کا ہار پہنا رہا تھا......'

''سنا ہے بھنڈی بازار میں مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو مار ڈالا......''

'پر تم فکر نہ کرو، اب کے ہندو چپکے بیٹھنے والے نہیں ہیں......'

اتنے میں ایمبولینس کار کی گھنٹی کی آواز آئی اور سب کھڑکی کی طرف بھاگے۔ سامنے ہرکشن داس اسپتال کے دروازے میں زخمیوں کی موٹر داخل ہو رہی تھی۔ ایک گھٹے ہوئے جسم کے راہ گیر نے جو دھوتی اور میلی دھاری دار قمیض اور کالی مرہٹہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسپتال کے دربان سے پوچھا۔

'یہ کون تھے؟ ہندو یا مسلمان؟'

دربان نے جو موٹر میں جھانک چکا تھا جواب دیا۔

'ایک مسلمان، دو ہندو۔'

اور فوراً کونے کے ہندو ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔

ساری چرنی روڈ پر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہوٹل کے سب دروازے بند تھے۔ صرف بیچ والے لوہے کے جنگلے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ٹرام دیر ہوئی بند ہو چکی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ ہاں اوپر کی منزلوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا جیسے تنا ہوا ڈھول چوٹ پڑنے کا منتظر ہو۔

یکایک سینڈھرسٹ روڈ کے چوراہے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہر شخص کی نگاہیں آواز کی سمت پھر گئیں۔ ایک دبلا سا نوجوان کرتا پاجامہ پہنے آرہا تھا۔ بالکل بے فکر جیسے شہر میں فساد ہوا ہی نہیں تھا۔

'سالے کی ہمت تو دیکھو!' ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں سے ایک آدمی نے کہا اور گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کا ہاتھ دھاری دار قمیض کے نیچے اپنی میلی دھوتی کی تہوں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

بے فکر دبلا نوجوان اب وسنت کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ اس کے ململ کے کرتے میں سے اس کی ہڈیاں نظر آرہی ہیں۔ سانولا رنگ، چھوٹا سا قد، مگر اچھا ذہین چہرہ۔ کوئی کلرک یا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں نرمل کا جی چاہا، چلّا کر کہے۔ 'میاں بھائی ذرا سنبھل کر آگے جانا۔ بڑا خراب وقت ہے۔' پر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور چشم زدن میں اس نے ایک چمکیلی چھری کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔

چھری دستے تک دبلے پتلے نوجوان کی کمر میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ ایک بار بے اختیار اٹھے شاید بچاؤ کرنے کے لیے، مگر اگلے لمحے میں وہ چکرا کر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے ایک کراہتی ہوئی آواز نکلی جو فریاد بھی تھی اور آخری ہچکی بھی۔

'ہائے بھگوان؟'

اور ہوٹل کے مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

'ارے یہ تو ہندو ہے ہندو!'

'نہیں رے سالا بن رہا ہے'

'پاجامہ پہنے ہندو کیسے ہو سکتا ہے؟'

'سالے کا پاجامہ کھول کر ختنہ دیکھو'

چھری ابھی تک نوجوان کی کمر میں گڑی ہوئی تھی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی آدمیوں نے بڑھ کر سسکتی ہوئی لاش کو پلٹ دیا اور ایک نے کمربند کی ڈوری کو کھینچ کر گرہ کھولی۔

نرمل کی آنکھیں شرم سے بند ہوگئیں، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غلاظت کے ڈھیر میں اس کا منہ رگڑ دیا ہو۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل لاش کو پھر الٹ کر زخم میں سے اپنی چھری باہر کھینچ رہا تھا۔

'یہ تو مسٹیک ہو گیا'

اس نے کہا: اور اپنی میلی دھوتی میں سے ایک کترن پھاڑ کر اس سے چھری کا خون پونچھنے لگا۔

چھری جب زخم سے باہر نکلی تو نرمل نے دیکھا کہ زخم سے سیاہی مائل گاڑھا گاڑھا خون بہہ نکلا اور مقتول نوجوان کے کپڑوں کو رنگتا ہوا سڑک پر پھیل گیا......

خون!

'خون خرابے' فساد دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل؟'

بھارتی نے نرمی سے، پریم سے نرمل کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ ایک لہر نے اسے خونی سمندر کے باہر کنارے پر لا پھینکا۔

'کیا۔ کیا کہا تم نے بھارتی؟'

میں کہہ رہی تھی کہ اجنتا کے ان خاموش پُرسکون غاروں میں، ہم بمبئی کلکتے کے خون خرابے سے کتنی دور معلوم ہوتے ہیں۔ کئی ہزار برس دور، یہاں تم ضرور ان خوفناک نظاروں کو بھول سکو گے جو تم نے بمبئی میں دیکھے ہیں......'

بے چاری بھارتی! حسین اور حسن پرست بھارتی؟ اس کا دل پریم سے کتنا بھرپور اور اس کا دماغ سمجھ بوجھ سے کتنا خالی، اسے نرمل سے واقعی محبت تھی اور وہ اسے ایک منٹ کے لیے بھی دکھی

نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جس دن فساد شروع ہوا اس سے اگلے دن ہی وہ جان گئی کہ نرمل کا نازک اور حساس دماغ اس خون خرابے کی تاب نہیں لاسکتا۔ چرنی روڈ کے خون کے بعد جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا نرمل نے تین دن کھانا نہ کھایا اور نہ وہ سو سکا۔ اس کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے کسی کو اس کی وجہ نہ بتائی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا بھی تو اس نے ٹال دیا۔ پر بھارتی سے وہ ہر بات کہہ دیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر نرمل نے اس خونیں واقعہ کی تمام ہولناک تفصیل اس کو سنادی۔

'اس دبلے پتلے نوجوان کی صورت اب میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے، بھارتی اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اس نے میری نیند اڑادی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں، اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔'

اور گھونگر والے بالوں میں اپنی ملائم انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بھارتی نے کہا:

'بے چارہ نرمل'

اپنی محبت، اپنی باتوں، سنیما، گراموفون، ریڈیو، کس کس طرح اس نے اپنے دوست کے دل سے اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ناکامیاب رہی۔ نرمل کی شگفتگی، اس کی مشہور ظرافت، اس کی حاضر جوابی سرے سے غائب ہوگئی تھی۔ وہ جب کبھی بھی بھارتی سے ملنے آتا تو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اس کی وحشت بھری آنکھیں ٹکٹکی باندھے فضا میں نہ جانے کیا دیکھتی رہتیں۔ وہ کہتی۔

'میں جانتی ہوں نرمل تمھارے حساس دماغ کو کتنا گہرا گھاؤ لگا ہے، مگر بھگوان کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو، اور اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرو۔'

وہ جواب دیتا:

'ہاں بھول ہی جانا چاہیے' اور وہ سوچتا۔ 'کون کون سے واقعات بھلانے کی کوشش کروں؟'

نرمل کمار قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل اور دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں، مضامین، انشائے لطیف اور افسانے ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔

امیر باپ کی بیٹی بھارتی اس کی ادبی قابلیت کی قدرداں اور مداح تھی، اس کا بس چلتا تو نرل کے لیے کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوب صورت بنگلہ بنوا دیتی، جہاں وہ سکون سے اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہتا مگر وہ تو ایک روزانہ اخبار میں رپورٹر تھا۔ بھارتی اکثر کہتی کہ اس جیسے ادیب کے لیے جرنلزم اختیار کرنا سراسر ظلم تھا۔

نرل کہتا موجودہ ہندوستان میں ادبی تخلیق صرف دماغی تعیش ہے اور لکھنے والے کے لیے اخبار نویسی ہی پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹر کی حیثیت سے وہ زندگی کے ڈرامائی عناصر سے دوچار رہتا۔ عدالت کے مقدموں، تھانے کوتوالی کی وارداتوں مزدوروں کی ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں میں اس کو انسانی سیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا اور یہی مشاہدات اس کے تخلیقی سانچے میں ڈھل کر ایسے مضامین، افسانے اور نظمیں بن جاتے تھے جن میں زندگی کی سچائی زندگی کی تڑپ اور زندگی کی روح نظر آتی تھی۔

رپورٹر کی حیثیت سے نرل کو فساد کے زمانے میں بھی سارے شہر میں گھومنا پڑتا تھا۔ سینڈھرسٹ روڈ، بھنڈی بازار، پائیدھونی، بائیکلہ، پریل، دادر، سارا شہر میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر محاذ پر خون اور قتل کے واقعات ہو رہے تھے۔ یہاں ایک مسلمان ڈبل روٹی والا مارا گیا۔ وہاں ایک ہندو دودھ والے کو کسی مسلمان نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ یہاں ایک پٹھان کا خون ہوا۔ وہاں ایک پوربی بھیّا قتل ہوا۔ یہاں ایک دس برس کے بچّے کو کسی نے ذبح کر دیا۔ وہاں ایک گیارہ برس کے بچّے نے ایک راہ چلتے آدمی کی پسلیوں میں چاقو بھونک دیا۔

سارا شہر 'ہندو بمبئی' اور 'مسلمان بمبئی' میں منقسم ہوگیا۔ کسی ہندو کی جرأت نہ تھی کہ بھنڈی بازار میں قدم دھر سکے۔ کسی مسلمان کی ہمت نہ تھی کہ پائیدھونی سے گزر سکے۔ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان قائم ہوگئے تھے۔ نرل اور دوسرے رپورٹروں کو اکثر پولیس یا فوج کے ساتھ لاریوں میں گشت کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن ایک گورے سارجنٹ نے نرل سے کہا۔

'تم کانگریسی پاکستان نہیں چاہتے، پھر بھی اس وقت بمبئی میں پاکستان قائم ہے یا نہیں؟'

اگلے دن ایک انگریز ٹامی نے نرل اور اس کے ساتھی رپورٹروں سے کہا۔

'تم لوگ تو کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگاتے تھے نا؟ ہم سے کہتے تھے نکل جاؤ ہندوستان چھوڑ دو۔

اب ہم چھوڑنے کو تیار ہیں تو کیوں ہماری خوشامد کرتے ہیں، کیوں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو؟ ہماری حفاظت کا مطالبہ کرتے ہو؟ ہندو کہتے ہیں ہمیں مسلمانوں سے بچاؤ، مسلمان کہتے ہیں، ہمیں ہندوؤں سے بچاؤ، پر دونوں ہماری حفاظت، ہماری توپوں اور بندوقوں کے محتاج ہیں۔ دونوں کہتے ہیں DONT QUIT INDIA اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہندوستان کی آزادی کا محل اڑااڑا دھم گر پڑا ہو۔ جیسے پچھلے سو برس کی تمام قومی روایتیں ایک لمحے میں مٹی میں مل گئی ہوں...... ترک موالات اور تحریک خلافت، سودیشی اور بائیکاٹ، جلیان والا باغ کی قربانی، گاندھی جی اور علی برادران، بھگت سنگھ، ستیا گرہ اور سِول نافرمانی...... تمام نعرے اور قومی گیت، ہندوستان کا اتحاد اور ہندوستان کی عزت اور آبرو...... آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری...... ہر چیز مٹی میں مل گئی ہو۔

'مٹی میں مل کر بھی اس کندن کی چمک نہیں گئی، گائیڈ بک رہا تھا۔

'اجنتا ہندوستان کے آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری کا لافانی شاہ کار ہے، بھارتی کہہ رہی تھی۔

مگر نرمل کو اس اندھیرے غار میں بجلی کی پیلی پیلی روشنی کے گھیرے میں بھی سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ حسن، نہ آرٹ، نہ معنی، نہ مقصد۔ بجائے احساس حسن کے اس کا دل ایک عمیق غصے، ایک بے پناہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چلا اٹھتا۔

'یہ سب کیوں؟...... یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت کیوں؟ اور کس لیے؟...... یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری— کیوں؟ اور کس لیے؟...... بے کار ہیں یہ سب۔ یہ ساری محنت بے کار تھی۔ دنیا کے لاکھوں برس کے ارتقاء میں ایک لغو اور مضحکہ خیز لمحہ...... بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تا کہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے...... اجنتا سے ہندوستان نے نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ سیکھے گا۔ یہ غار دنیا سے! اصلیت سے سچائی سے فرار کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اجنتا نہ صرف بے کار ہے بلکہ ایک زبردست جھوٹ

ہے۔ دھوکا ہے، فریب ہے.....

گائیڈ، نرمل کے خوف ناک خیالات کی رو سے بے خبر اپنی روں روں کیے جا رہا تھا۔

''یہ دیکھیے مہاتما بدھ گھوڑے پر چڑھے بازار میں سے گزر رہے ہیں ان کے چہرے پر کتنی شانتی ہے۔ اور دیکھیے یہ عورتیں اپنے اپنے گھروں پر سے ان کو کتنی معتقدانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔

اور بھارتی کہہ رہی تھی۔

''نرمل دیکھو، ان عورتوں کے چہرے پر کتنی حسین وجدانیت طاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت اور ان کی ماتا کو کچھ اجنتا کے آرٹسٹ ہی سمجھے ہیں.....''

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت، ان کی ماتا! نرمل کا دل چاہا کہ قہقہہ مار کر اتنے زور سے ہنسے کہ غاروں کی پتھریلی دیواریں لرز اٹھیں، یہ چٹانیں تھرا جائیں، یہ غاروں کا سلسلہ اس کے نعرۂ حقارت سے گونج اٹھے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ماتا!

جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ دھوکا۔ خود فریبی۔

نرمل نہ کیمونسٹ تھا اور نہ کیمونسٹوں سے ہمدردی رکھتا۔ مگر ایک دن وہ کیمونسٹ پارٹی کے دفتر میں پارٹی سکریٹری پورن چندر جوشی کا بیان لینے گیا تھا کہ یکا یک سڑک کی طرف سے کچھ شور کی آواز آئی اور سب کھڑکیوں کی طرف بھاگے۔ جھانک کر دیکھا تو ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بوری مسلمان اپنے خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا اور ساتھ کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی نچلی منزل کی دہلیز پر مرہٹہ عورتوں کا ایک گروہ کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دلچسپ اور مزے دار تماشا ہو رہا ہو۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!!! ان کی ماتا!!!!

ایک ریڈ کراس کی موٹر آئی، اور بوڑھے بوری مسلمان کی لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ اور سامنے والے مکان میں سے ایک مرہٹہ عورت بالٹی ہاتھ میں لٹکائے نکلی اور جہاں بوڑھے کا خون گرا تھا

وہاں نہایت اطمینان سے پانی بہا کر سڑک کو دھو گئی اور کئی روز زتل کے کانوں میں اُن عورتوں کے قہقہے ایک خوف ناک شور بن کر گونجتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس بوڑھے کی سفید داڑھی جو خود کے خون سے رنگین ہوگئی تھی، ایک بھیانک بگولہ بن کر پھڑ پھڑاتی رہی۔ اور اسے ایسے معلوم ہوا کہ تمام ہندوستان کی عورتیں کسی ایسے خوف ناک اور خونیں مذاق پر ہنس رہی ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!!! ان کی نزاکت!!! ان کی ماتما!!!!

زتل کے بہت سے دوست مسلمان تھے مگر فساد کے دنوں میں وہ ان کے محلوں میں نہیں جاسکتا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی رپورٹر اور دوست حنیف کو سخت بخار اور سرسام ہوگیا ہے۔ زتل سے نہ رہا گیا اور بھنڈی بازار پہنچ ہی گیا۔ جہاں ایک چال میں حنیف اکیلا رہتا تھا۔

کرافورڈ مارکیٹ پر سوائے زتل کے تمام ہندو بس سے اتر گئے۔ وہ خود کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کی وضع قطع سے یہ ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے بعض تو اسے پارسی ہی سمجھتے تھے مگر پھر بھی جوں جوں بس بمبئی کے "پاکستانی" علاقے میں جارہی تھی اس کا دل خوف اور پریشانی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے ایسا معلوم کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا "غنڈہ نما" مسلمان نوجوان اس کے دل کی دھڑکن سن کر سمجھ جائے گا کہ وہ ہندو ہے اور اپنی جیکیٹ میں سے چھرا نکال کر اس کی کمر میں گھونپ دے گا۔ اُسی طرح جیسے چرنی روڈ پر اس دُبلے پتلے نوجوان کو ایک ہندو غنڈے نے "مشٹیک" سے مار ڈالا تھا۔ اور دفعتاً نہ جانے کیوں اس کی کمر کی ریڑھ کی ہڈی کے پاس کھجلی سی محسوس ہونے لگی اور ایک خیالی چاقو کا تیز پھل اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتا گیا۔

ہاٹلی والا اسپتال کے پاس وہ بس سے اتر کر پٹری چلا تو اسے چاروں طرف سے قاتل ہی قاتل نظر آئے۔ وہ چھابڑی والا جو کیلے اور موسمبیاں بیچ رہا تھا نہ جانے وہ کس وقت اپنا ترکاری کاٹنے کا چاقو ایک ہندو کی کمر میں پیوست کر دے۔ وہ خوف ناک لال داڑھی والا پٹھان تو ضرور ایک "کافر بچے" کی تلاش میں ہوگا۔ پشت سے پتھریلی سڑک پر کھٹ کھٹ قدم قریب آتے ہوئے سنائی دیتے۔" زتل نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ ایک لمحے کے لیے

اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس برقعہ میں کوئی ''غنڈہ'' نہ چھپا ہوا ہو اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا حنیف کی چال کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

حنیف سرسامی کیفیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ نرمل کو اس کے پاس شام تک ٹھہرنا پڑا۔ جب حنیف کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی اور اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت ایک سپاہی ''بھونپوں'' میں پکارتا ہوا وہاں سے گزرا کہ شام کے پانچ بجے سے کئی علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا ہے کوئی گھر سے نہ نکلے کیونکہ گشتی فوجیوں کو سرراہ چلنے والوں پر گولی چلانے کے احکامات دے دیے گئے ہیں۔ نرمل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس منٹ تھے اتنی دیر میں اس کا شیواجی پارک پہنچنا ناممکن تھا۔ چار و ناچار اس نے رات حنیف کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

حنیف کا کمرہ کنارے پر تھا۔ ایک کھڑکی میں سے بڑی سڑک نظر آتی تھی، دوسری ایک گلی میں کھلتی تھی۔ سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ ایک پوربی دودھ والا بھیا' جس کی لمبی چوٹی دور دور سے پکار کر کہتی ہے کہ ''میں ہندو ہوں'' کندھے پر بہنگی جس میں دودھ کی گڑویاں رکھی ہوئی ہیں۔ سراسیمہ نظروں سے ادھر اُدھر آگے پیچھے دیکھتا ہوا چلا آرہا ہے اور اس چرنی روڈ والے واقعہ کی طرح نرمل کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ چلا کر ''دودھ والے بھیا'' کو خطرے سے آگاہ کر دے۔ مگر اس بار پھر الفاظ اس کی زبان پر جم کر رہ گئے اور چشم زدن میں تین تگڑے تہبند بند جوانوں نے اس دُبلے پتلے کالے پوربی کو گھیر لیا۔

''کہاں جاتا ہے بے کافر کے بچے؟

دودھ والے بھیا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید اسے ان تینوں کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ وہ واپس مڑا۔ اُدھر بھی غنیم کا ایک گروہ کھڑا ہوا اُس کی طرف قاتلانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ہرن کی طرح جو ہر طرف شکاریوں سے گھر گیا ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مایوس آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دفعتاً وہ اس گلی کی طرف بھاگا اور اس کے تعاقب میں پانچ شکاری تھے—!

نرمل بھاگ کر گلی والی کھڑکی کی طرف گیا۔ مگر ابھی وہ ادھر پہنچ نہ پایا تھا کہ دودھ والے بھیا کے خود اپنی بہنگی میں الجھ کر گرنے کی آواز آئی۔ پیتل کی گڑویاں ایک جھنکار کے ساتھ سڑک پر اوندھ گئیں اور ان کا دودھ ایک سفید نہر بن کر بہہ نکلا۔ جب نرمل نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اس سفید دودھ میں پوربی کا سُرخ خون مل چکا تھا۔

''بھاگ کر جاتا تھا سالا''

اور پھر نرمل نے برابر کے کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنی۔

''اری او گل بانو۔ دیکھ تو سہی۔ ایک کافر ہماری گلی میں مارا گیا ہے''...... جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ اری او گل بانو! مبارک ہو، ہماری گلی والوں نے آج کتنی بہادری کا کام کیا ہے!''......اور پھر تین چار جوان، ادھیڑ، بوڑھی عورتوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں۔

''اری اس کی چٹیا تو دیکھ''

''اچھا ہوا۔ یہ سب پوربیے دودھ میں برابر کا پانی ملاتے ہیں۔ اب سزا ملی ہے۔''

''گرگام میں جو مسلمان مارے ہیں ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے۔

اور پھر ان ہی میں سے کوئی عورت اندر گئی اور گھر بھر کا کوڑا، ترکاری کے چھلکے، انڈوں کے خول، گوشت کے چھیچھڑے اور ہڈیاں گلی میں لوٹ دیا۔ عین وہاں جہاں مکھیوں نے پوربی بھیا کے دودھ اور خون پر بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی آتما!!! ان کی نزاکت!!!! ان کا ممتا!!!!

سینڈھرسٹ روڈ والی عورتوں اور بھنڈی بازار والی عورتوں کے خونی قہقہے مل کر نرمل کے لاشعور پر ایک مہیب گونج بن کر چھائے ہوئے تھے۔ وہی گونج اسے اب تک اجنتا کے ان غاروں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ دھندلی پھیکی رنگ کی تصویروں میں اسے ہر دیوی ہر اپسرا، ہر راج نرتکی، ہر عورت کے چہرے پر ایک شیطانی خوشی اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک نظر آئی اور نرمل کا دل ایک عمیق نفرت سے بھر گیا۔

''میں ہر عورت سے نفرت کرتا ہوں۔'' وہ سوچ رہا تھا۔ ''ہر عورت سے یہاں تک کہ

بھارتی سے بھی۔ بھارتی — جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس سے مدت سے وہ بھی محبت کرتا تھا۔ بھارتی جو نرمل کو اور اس کی حساس طبیعت کو اپنی دولت کی پناہ میں رکھنا چاہتی تھی۔ جو بمبئی اور اس کے کشت وخوں کے ماحول سے نرمل کو تقریباً زبردستی بھگا کر اجنتا لے آئی تھی۔ محبت، نفرت، نفرت محبت، ہم بھائی بھائی ہیں۔ ہم عاشق ومعشوق ہیں۔ ہم دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک ہیں، مگر ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کمر میں چھرا گھونپتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں......

''دیکھئے۔ یہ لاشیں دیکھیے۔ سر الگ اور دھڑ الگ''

گائیڈ اپنی رواں رُواں کیے جا رہا تھا۔ بولتے بولتے اس کو پسینہ آ گیا تھا مگر اس کی آواز نہ تھکتی تھی — اور بھارتی — نازک، نفاست پسند، حساس نرم دل بھارتی — غار کی دیوار پر تصویر ہی میں لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

''اس ظالم راجا نے سب کو قتل کرا دیا ہے۔ سر کٹوا کر لاشیں اس گڑھے میں پھنکوا دی ہیں چیلوں، گدھوں کے کھانے کے لیے...........''

اور نرمل کے دماغ میں یہ غیر متعلق خیال رینگتا ہوا چلا آیا کہ دراصل راجا ظالم نہیں تھا بلکہ شاید اسے گدھوں، چیلوں کا بڑا خیال تھا۔ ان کو خوراک بہم پہنچانے کے لیے اس نے ان سب لوگوں کو مروا کر ان کی لاشیں یہاں ڈلوائی تھیں۔ اس کے ظلم میں کم سے کم مردار خور جانوروں کا تو بھلا تھا......

لاشیں!......

ستائیس ٹھنڈی، مسخ شدہ کالی اور نیلی لاشیں، جو ٹھنڈے پتھر کے فرش پر اس طرح بکھری ہوئی پڑی تھیں جیسے فصل کٹنے کے وقت کسی کسان نے گیہوں کی بالیں کاٹ کر کھیت میں چھوڑ دی ہوں...... جیسے مذبح خانے میں ستائیس بکروں کی کھال اتار کر ایک قطار میں لگا رکھا ہو...... جیسے...... جیسے ستائیس انسانی لاشیں بکھری ہوئی ہوں!

نرمل اخبار کے لیے رپورٹ لینے اسپتال گیا تھا اور وہاں اسے پتہ چل گیا کہ کس کمرے

میں فساد کے مقتولین کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور کورونر کے فیصلے کے لیے رکھی گئی ہیں۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک بار ایک لاش میڈیکل کالج کے سرجری وارڈ میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ تب بھی تین وقت اس سے کھانا نہ کھایا گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی مردہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں مگر یہاں ایک لاش نہیں ستائیس لاشیں رکھی تھیں۔ بوڑھے، جوان، بچے سوکھے ہوئے جسم، کسی کی کمر میں گھاؤ۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی۔ کسی کی گردن سے سر جدا، دھڑ کے قریب رکھا ہوا۔ کسی کا بھیجا پھٹے ہوئے سر میں سے باہر ابلتا ہوا۔ ان میں سے کون ہندو تھا؟ اور کون مسلمان؟ موت کی برادری میں سب ایک تھے۔ قاتل کی چھری نے سب کو برابر برابر لٹا دیا تھا۔ ٹھنڈا پتھریلا فرش۔ یہ تھا ان کا پاکستان اور ان کا ہندوستان۔ یہ بیکار موت۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ یہ سناٹا، یہ بے چارگی — یہ تھی ان کی آزادی۔ یہ تھا ان کا اسلام اور یہ تھا ان کا ویدک دھرم — جے جے مہادیو — اللہ اکبر!

نرمل عملی سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ علاوہ اخبار کے کام کے جو وہ پیٹ کی خاطر کرتا تھا۔ وہ عمل کے میدان کا دھنی نہیں تھا۔ اس کی دنیا خیالات اور محسوسات کی دنیا تھی۔ پھر بھی فسادات شروع ہونے کے تیسرے دن ہی وہ اپنے محلے کے شانتی دَل میں شامل ہو گیا تھا اور شاید اس لیے کہ اس کا تعلق ایک اہم روزنامہ اخبار سے تھا اور شانتی دَل ہو یا سیوا سماج ہو یا خدامِ وطن، ہر پبلک جماعت کو پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کمیٹی کا ممبر بھی چن لیا گیا تھا نرمل کا دوست اور ہمسایہ احمد جو ایک دوسرے اخبار میں سب ایڈیٹر تھا۔ وہ بھی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا تھا۔ اس لیے کہ تمام شیوا جی پارک کے علاقے میں وہی صرف اکیلا مسلمان تھا جو شانتی دَل میں شامل ہوا تھا اور ایسی کمیٹیاں سرکاری منظوری نہیں حاصل کر سکتیں جب تک ان میں سب فرقوں کے نمائندے موجود نہ ہوں۔

چند روز تک نرمل شانتی دَل کی تنظیم کے کام میں مستغرق رہا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ فساد کے اثر سے اس پر جو ایک مہلک جمود اور گھٹے گھٹے غم اور بے بسی کی حالت طاری ہو گئی تھی وہ اب جاتی رہے گی۔ شانتی دَل میں شامل ہو کر اس کو وہی وجد آفریں مسرت حاصل ہوئی جو ایک سپاہی کو طبل جنگ سن کر ہوتی ہے۔ یہ جنگ تاریکی اور روشنی کے درمیان تھی۔ غارت گری اور امن

کے درمیان۔ وہ اس جنگ میں ایک سپاہی تھا۔ وہ شیطانی تعصبات اور درندگی کے خلاف جہاد میں شریک تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں کوئی کارہائے نمایاں نہ کر سکے مگر کم سے کم اس کو یہ تسلی تو تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے، کہ اس کی زندگی بالکل بے کار، بے معنی اور بے مقصد تو نہیں ہوگئی ہے۔

بھارتی نے کئی بار نرمل سے کہا۔

''چلو بمبئی سے باہر کہیں چلے چلیں۔ جب فساد ختم ہو جائے گا۔تب آ جائیں گے۔

آگرہ، دہلی، کشمیر، اجنتا، ایلورہ، میسور، سیلون نہ جانے کہاں کہاں جانے کا لالچ دلایا، مگر نرمل کو ایسے وقت بمبئی چھوڑ کر باہر جانا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بزدلی معلوم ہوئی۔ بھارتی نے لاکھ سمجھایا کہ اس جیسے حساس آرٹسٹ کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا، اس کی خداداد ذہانت کی تحقیر تھی مگر وہ نہ مانا اور سوائے دفتر کے اوقات کے سارے دن اور رات کا بیشتر حصہ شانتی دَل کے کام میں صرف کرتا رہا۔

شانتی دل کا کام؟ نرمل سمجھا تھا کہ اس کا کام واقعی شانتی کا پرچار ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ شانتی دَل کے ممبر گھر گھر جائیں گے اور لوگوں کو امن اور شانتی سے رہنے کی تلقین کریں گے آپس کی فرقہ وارانہ منافرت کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ شہر میں خود ان کے علاقے میں ہر دم ہر قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ماہم کے مسلمان شیواجی پارک کے ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شیواجی پارک کے ہندو ماہم کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہندو دودھ والے دودھ میں زہر ملا کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں، مسلمان ترکاری والے بینگنوں اور موسمبیوں میں زہر کے انجکشن دے کر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ایرانی ہوٹلوں کے چائے مت پیو، اس میں زہر ہے۔ ہندو حلوائی کی مٹھائی مت کھاؤ۔ اس میں زہر ہے جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ، اور تعصب اور نفرت کا ایک طوفان جس میں تمام شہر ڈوبا جا رہا تھا۔ نرمل اور اس کے دوست احمد کو امید تھی کہ شانتی دَل کا پہلا کام ہوگا اس خونی سیلاب کو روکنا مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

شانتی دل کا پہلا کام چندہ جمع کرنا...... احمد کے ساتھ نرمل ہر کسی کے ہاں گیا۔ گنتی کے جو

چند مسلمان تھے انھوں نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ شانتی دَل کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں...... ہم نے بھی اپنی حفاظت کے لیے پٹھان رکھ لیے ہیں......"

بعض ہندوؤں نے کہا۔

"آپ کے نہتے والینٹر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں؟ ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں اور پھر رازدارانہ لہجے میں۔" سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں، کیا سمجھے۔"

خیر — چندہ جمع کیا گیا۔ بیس پہرے دار پچاس پچاس روپے ماہوار پر ملازم رکھے گئے۔ کمیٹی میں مسئلہ درپیش ہوا کہ ان کو کہاں کہاں ڈیوٹی پر لگایا جائے۔"

"ایک ایک آدمی ہر سڑک کے ناکے پر لگایا جائے۔"

"نہیں، یہ حماقت ہوگی۔ حملہ صرف تین طرف سے ہو سکتا ہے، یا ماہم کی طرف سے، یا ورلی کی طرف سے یا سمندر کی طرف سے، صرف ان ناکوں پر پہرہ لگانا چاہیے۔"

"حملہ؟ — کس کا حملہ"

"مسلمان اگر حملہ کریں گے تو اور کدھر سے حملہ کریں گے؟"

"پر ان پہرے داروں کا کام کیا ہوگا؟"

"ان سے کہہ دیا جائے کہ جیسے ہی کسی مسلمان غنڈے کو دیکھیں سیٹی بجا دیں تا کہ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو جائیں۔

"صرف مسلمان غنڈے؟ اور اگر ہندو غنڈے ہوں تو؟"

نرل نے یہ سوال کیا تو، مگر وہ احمد سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

کمیٹی کے جلسے کے بعد اس نے احمد سے کہا۔

"یہ تمھاری ہی ہمت ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتے ہو مجھے تو یہ سب مہاسبھائی معلوم ہوتے ہیں۔

احمد نے کہا۔

"ایسے بیوقوفوں اور جاہلوں کی کمی دونوں طرف نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ماہم کے

مسلمانوں میں کیا کیا افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہے کہ شیواجی پارک میں شانتی دَل ے نام سے ہندوؤں کی ایک فوج تیار کی جا رہی ہے۔ جو بہت جلد ماہم کے مسلمانوں پر شب خون مارے گی۔''

چندہ۔ والنٹیر، محافظ، وردیاں، سیٹیاں، جلسے، رزولیوشن، پولس کمشنر کے نام عرضیاں، مگر شانتی کا پرچار؟ اتحاد کا پروپیگنڈہ؟ ان کا نام نہیں تو پھر شانتی دل کا مقصد؟ اس دوڑ دھوپ سے فائدہ؟ مسلمان غنڈے— ہندو غنڈے— گھروں میں پتھر جمع کر کے رکھو۔ میں نے تو دس لاٹھیاں چھپا رکھی ہیں۔ میرے ہمسائے کے پاس پستول ہے۔'' شانتی! شانتی!! شانتی!!!

'یہ شانتی کا مہا ساگر ہے، نرمل بھارتی کہہ رہی تھی۔' اگر ہم آٹھ دس دن تک روز یہاں آ کر کئی گھنٹے گزارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمھارے بے چین دل کو ضرور شانتی ملے گی۔

اور گائیڈ کہہ رہا تھا۔

'آپ نے سب غار دیکھ لیے ہیں۔ اب ایک باقی رہ گیا ہے۔ مگر اس میں آپ کو دوسرے غاروں کی طرح سنگتراشی اور مصوری کے نادر اور حسین نمونے نہیں ملیں گے۔ چھت، ستون، فرش، ہر چیز نامکمل ہے۔ اس غار کا کام ادھورا رہ گیا ہے.....'

'ادھورا کام! وہ— نرمل— بھی تو بمبئی میں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ بلکہ ادھورے سے بھی کم— ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ہار مان لی تھی۔

شانتی دَل کمیٹی کا آخری جلسہ۔

نرمل نے شروع ہی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بجائے معمولی ان پڑھ اور اجڈ دربانوں اور چوکیداروں کے آزاد ہند فوج کے سابق سپاہیوں کو معقول مشاہرے پر حفاظت کے لیے رکھا جائے کیونکہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک اور بالا تھے۔ ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا اور وہ اپنی پرانی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے مدد کے مستحق تھے۔ شانتی دَل کے سکریٹری نے اس جلسے میں بیان کیا کہ پرانے تمام پہرے دار علیحدہ کر دیے گئے ہیں اور ان کی بجائے چودہ آزاد ہند فوج کے سابق سپاہی رکھ لیے گئے ہیں۔ یہ سن کر نرمل کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اب شانتی دَل کا کام صحیح طریقے پر ہوگا۔ مگر ایک لمحے ہی میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

ایک بوڑھے مرہٹہ وکیل نے سوال کیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ آزاد ہند فوج کے ان سپاہیوں میں مسلمان بھی ہیں؟''

سکریٹری نے کہا۔

''ہاں، مگر صرف ایک''

ایک موٹے گجرات سیٹھ نے کہا۔

میرے حلقے میں اس بات پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

ایک دُبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

''یہ تو گجب (غضب) کی بات ہے۔''

بوڑھے وکیل نے اونچی آواز میں کہا۔

میں سکریٹری صاحب سے اس معاملہ میں جواب طلب کرتا ہوں کہ کیوں ایک مسلمان کو رکھا گیا۔

گجراتی سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''اگر ایسا ہوگا تو ہم لوگ ایک پیسہ چندہ نہیں دیں گے۔''

ایک پستہ قد ڈاکٹر نے کہا۔

میرے حلقے کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان......

دُبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

''یہ ہماری استریوں کی ابتت (عزت) کا سوال ہے۔''

بوڑھے وکیل نے کہا۔

''میں جواب طلب کرتا ہوں......''

پریسی ڈینٹ نے کہا۔

''خاموش، خاموش''

سکریٹری نے کہا۔

میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آزاد ہند فوج میں ہندو مسلمان کی تفریق نہیں کی جاتی

لیکن اگر کمیٹی کی رائے یہی ہے تو ہم کسی بہانے سے اس مسلمان سپاہی کو علیحدہ کر سکتے ہیں۔

سب نے بیک وقت شور مچایا۔

'ہاں ہاں۔'فوراً' ایک دم'۔ اس کو رکھا ہی کیوں؟' صرف احمد خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں احمد کو اطمینان سے مسکراتے دیکھ کر نرمل کے صبر کا پیمانہ دفعتاً لبریز ہو گیا۔

اس کے دماغ کے اندر کی کوئی کلی دفعتاً تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

'نہیں۔ نہیں!!' وہ غیر معمولی جوش سے چلایا۔ سکریٹری جو جلسے کی روداد میں یہ الفاظ لکھنے میں مصروف تھا کہ 'یہ تجویز بلا مخالفت پاس کی گئی کہ آزاد ہند فوج کے جن سابق سپاہیوں کو حفاظت کے لیے رکھا جائے، ان میں کوئی مسلمان نہ ہو......اپنی کرسی سے تقریباً اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ سے قلم گر پڑا اور سفید کاغذ پر جہاں اس تجویز کے الفاظ لکھے گئے تھے وہاں روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑ گیا......'

'نہیں! نہیں!! نہیں!!! جیسے اس ایک لفظ کے دس بار دہرانے سے باقی دس ممبروں کی رائے منسوخ ہو جائے گی، میں ایسی تجویز کی کبھی کسی حالت میں بھی موافقت نہیں کر سکتا۔

نرمل کے الفاظ کی والہانہ شدت نے چند لمحوں کے لیے سب کو خاموش کر دیا۔ مگر اس خاموشی میں اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہوئی۔ ایسی تجویز ہمارے لیے باعث شرم ہوگی۔ ہم شانتی اور اتحاد کے نام لیوا ہیں۔ مگر ہم خود بدترین فرقہ وارانہ تعصب کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ تجویز پاس ہوئی تو میں اس معاملہ کو پریس اور پبلک کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھوں گا۔

اور احمد مسکرائے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

''شاباش، بچے۔ مگر یہ سب بے کار ہے۔''

دُبلے مارواڑی نے مخالف کی حیثیت سے کہنا شروع کیا۔

مسٹر نرمل کو نہیں معلوم کہ ہم ہندو کتنے کھترے (خطرے) میں ہیں......

گجراتی سیٹھ نے کہا۔

''ہم تو صاف بولیں گے۔ اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے۔''

پستہ قد سیٹھ نے کہا۔

ہم استعفیٰ دے کر ہندو مہا سبھا کے سور کھشن دَل میں مل جائیں گے۔

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے دوسروں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے ہوئے نرل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مسٹر نرل ایک بات بتائیے، یہ ہندو علاقہ ہے۔ اگر یہاں پہرہ دیتے ہوئے اس بے چارے مسلمان سپاہی کو کچھ ایسا ہو گیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟ آپ — اور یہ کہہ کر اس نے گجراتی سیٹھ اور پستہ قد ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری، گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھا میرا قانونی پینترا ایسے ایسے لونڈے میں نے بہت دیکھے ہیں......

احمد نے مسکرا کر نرل کی طرف دیکھا اور نظروں میں کہا۔

"میں نے کہاں نہیں تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے......"

تجویز پاس ہو گئی۔ نرل بھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ دعوے، دلائل، منطق، سیاست۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس تعصب اور جہالت کی دیوار پر سر پٹکنا لاحاصل ہے۔ اس کے چاروں طرف آوازوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ تجویزیں پاس ہوتی رہیں۔ بحث مباحثہ ہوتے رہے۔ حسب معمول مختلف ممبروں اور عہدے داروں میں سخت کلامی بھی ہوتی رہی۔ مگر نرل نے نہ کچھ کہا نہ سنا۔

اس کا دماغ خوف ناک خیالات اور مناظر کا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، نواکھالی۔ بہار، قتل خون، خون کی ندیاں، خون کے دریا، خون کا سمندر، نفرت اور تشدد، تعصب اور نفرت، عورتوں کی بے حرمتی، بچوں کی لاشیں، لاشوں کے پہاڑ۔ ایک خونیں آسمان کی طرف لپکتے ہوئے ہزاروں شعلے......اور ایک کلدار ہتھوڑے کی طرح یہ خیال اس کے دماغ پر چوٹ لگاتا رہا کہ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ شیواجی پارک شانتی دَل کے ممبر آزاد ہند فوج کے ایک مسلمان سپاہی کو اپنی حفاظت کے لیے رکھنے کو تیار نہیں ہیں......

اور اسے معلوم ہوا کہ آزاد ہند فوج کے شاندار تاریخی کارنامے بے کار تھے۔ تمام جنگ آزادی بے کار تھی۔ تمام دیش بھگتوں اور شہیدانِ وطن کی قربانیاں بے کار تھیں، تمام قومی نعرے،

تمام قومی تحریکیں، تمام قومی لیڈر، ہر شخص بے کار تھا۔ ہر چیز بے کار تھی۔ شیواجی پارک شانتی دَل بے کار تھا۔ اس سلسلے میں نرل کا کام بے کار تھا۔ اس کا بمبئی میں رہنا بے کار تھا۔ اس کی زندگی ہی بیکار تھی...... اس لیے کہ ہندو اور مسلمان کے تھپتے آزادی اور ہندوستان سے زیادہ اہم ثابت ہوئے تھے۔

اسے شانتی دَل کمیٹی کے وہ سب ممبر اس وقت تعصب اور نفرت اور خطرناک جہالت کے دیوتا معلوم ہوئے جو اپنی آتشیں آنکھوں سے اس کو گھور رہے تھے۔ جو اسے بھسم کر لینے کے لیے اس کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ وہی دس نہیں بلکہ ہر طرف سے لاکھوں راکھششوں کے دَل کے دَل اس کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ ان میں چوٹی والے بھی تھے اور داڑھی والے بھی۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی، بنگالی، بہاری، مرہٹہ، گجراتی، پنجابی، پوربی پٹھان اور سب اس کے خون کے پیاسے۔

'بھاگ'

نرل کے دھڑکتے ہوئے دل نے اسے للکارا

''بھاگ''

اور نرل نہ صرف جلسے کے ختم ہونے سے پہلے ہی شانتی دَل کے دفتر سے بھاگا بلکہ اسی دن بھارتی کے ساتھ بمبئی سے بھی بھاگ آیا۔

''کہاں چلیں؟'' بھارتی نے پوچھا۔

''جہاں یہ قتل و خون نہ ہو، جہاں اخبار نہ ہو، ریڈیو نہ ہو، جہاں ہندو نہ ہوں۔ مسلمان نہ ہوں، جہاں چاقو چھریاں، برچھے، بھالے، تیزاب، غنڈے، موالی نہ ہوں۔ دور — دنیا اور زندگی سے دور —!

اور بھارتی نے سوچ کر کہا۔

''اجنتا؟''

احمد نرل کو چھوڑنے اسٹیشن پر آیا۔ گاڑی چلنے لگی تو اس نے کہا۔

'اچھا ہے، چند روز کے لیے تبدیل آب و ہوا کر آؤ۔ مگر اگلے اتوار کو شانتی دل کا جلسہ ہے

جس میں چند تجویزیں پیش کرنے والا ہوں، اس میں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔'
اور جب نرمل نے کہا۔
'میں اب شانتی دَل کے جلسے میں کبھی نہ جاؤں گا۔'
تو احمد نے چلتی ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا تھا۔
''تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے، نرمل''
'ادھورا کام!'

ہنہ۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصوّر۔ یہ بھی تو اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں۔ کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟

''تمھارا کیا خیال ہے، بھارتی......''

پر، بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں پر سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آ کر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی ہے وہ کالی پڑ چکی تھی، شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا...... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لیے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لیے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے

ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے منڈے ہوئے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لیے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آرہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتھوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہو گئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار اُکھڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پُر حیرت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

معاف کیجیے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے اور ادھوری ہی رہے گا۔''

''دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے۔ مگر ان کی تکمیل ہونی چاہیے'' اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

''آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟''

''نو سو برس سے''

''نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر......''

''میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔

''آپ کا نام؟'' نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

''میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں''
اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصوّر کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

''پھر آپ کس لیے اتنا کام کرتے ہیں؟''

''کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے''

''تو یہ کام کب ختم ہوگا؟''

''کون جانتا ہے؟''

''اس غار کو......''

''پورا ہونے میں دوسو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا غار اور اس کے بعد تیسرا......''

''تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟''

''ہوگی ــ جب انسان کی تکمیل ہوگی''

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی، اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

''مہربانی کر کے مجھے سمجھایئے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لیے؟ یہ پہاڑ کی گود سے ترشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لیے؟

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصّہ آتا گیا۔

''بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گل کاری کرنے کے بجائے، انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔ آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لیے بنائے ہیں۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے سچائی سے فرار سکھانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

سنگتراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پُرسکون مسکراہٹ تھی۔ جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا، صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

''نہیں''

نرل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اُس کے صبر وسکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے چلاّ کر کہا۔

''تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟''

''سنو۔'' اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

''تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام......؟'' مگر دفعتاً نرل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ یہی تھا اجنتا کا پیغام، جسے وہ بھکشو نرل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرایا، اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور نرل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آبِ حیات، اکسیر۔ اس قیمتی نسخے کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر پر پڑتی تھی، نرل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

عمل! عمل!! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح پچھلا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔ عمل خود عمل کا انعام ہے......

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، یہ پتھر ضرور چھل کر، ترش کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کی منزل کمالِ فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، انسان کی فطرت کے پتھر چھل کر، ترش کر، حسن اور خوب صورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلی فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں۔ ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ، کتنے شاداب تھے ان کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنی جیتی جاگتی ہیں۔ جب ہی ان میں اتنی زندگی ہے......

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا، تو غار طلوع آفتاب کی دھیمی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے۔ نہ مصور۔ نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟............شاید............کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

"ہاں۔ خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے

ایک کیفیت پیدا کردی ہو۔"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گذرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا، اور اسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لیے پہنچنا ضروری تھی۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے، کوئی فرار نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"

اور نرمل نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

O

اندھیرا اور اجالا

(پرتھوی راج کپور کے نام)

پہلا ریل

(جس میں آپ ہیرو سے متعارف ہوتے ہیں)

کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔

''بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ''

''لائٹس آن۔ لائٹس آف''

''نمبر چوبیس''

''نمبر سترہ''

''مس شکنتلا کو ایک بے بی اور دو''

''چودہ نمبر اوپر لو''

''ستائیس نمبر کو ہارڈ کرو''

''ہارڈ اور ہارڈ۔ بس۔ بس۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ۔ بس!''

''نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو۔ نہیں نہیں شیشے کا ڈفیوزر''

''ریہرسل''

ایک کیفیت پیدا کر دی ہو۔"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گذرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا، اور اسے شانتی دَل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لیے پہنچنا ضروری تھی۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے، کوئی فرار نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"

اور نرل نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

O

اندھیرا اور اجالا

(پرتھوی راج کپور کے نام)

پہلا ریل

(جس میں آپ ہیرو سے متعارف ہوتے ہیں)

کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔

''بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ''

''لائٹس آن۔ لائٹس آف''

''نمبر چوبیس''

''نمبر سترہ''

''مس شکنتلا کو ایک بے بی اور دو''

''چودہ نمبر اوپر لو''

''ستائیس نمبر کو ہارڈ کرو''

''ہارڈ اور ہارڈ۔ بس۔ بس۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ۔ بس!''

''نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو۔ نہیں نہیں شیشے کا ڈفیوزر''

''ریہرسل''

''کیمرہ ریڈی فور ریہرسل؟''

''یس ریڈی۔ او کے''

''آل لائٹس''

اندھیرے کے سمندر میں سے روشنیاں بیک وقت لپک کر باہر آئیں اور رات کا دن بن گیا۔ نہ صرف سیٹ کی تین دیواریں (بغیر چھت کی) بلکہ اسٹوڈیو کا کونا کونا جگمگا اٹھا۔

''ریہرسل''

ساؤنڈ ٹریک کی سیٹی۔ ''خاموش! خاموش!!''

ڈائرکٹر کی آواز۔ ''یس مس شکنتلا؟ ریڈی دیپ کمار؟''

''تو تم سچ مجھے جیون ساتھی بنانے کے لیے تیار ہو، رادھا؟''

''یہ بھی پوچھنے کی بات ہے، سندر؟''

''ہاں رادھا۔ میں جیون کے جس راستے پر چل رہا ہوں وہ بڑا کٹھن اور بھیانک ہے۔ اس خارزارِ زندگی میں قدم قدم پر کانٹے ہیں۔ کیا اس راستے پر تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟''

''ہاں، سندر۔ تمھارے ساتھ چلوں گی تو راستے کے کانٹے بھی پھول بن جائیں گے۔''

''رادھا!''

''سندر!''

''ہاؤ از دیٹ؟'' (HOW IS THAT?)

ساؤنڈ ٹریک سے دو سیٹیاں،

''او کے۔ لائٹس آف''

''او کے۔'' ''لائٹس آف''

''او کے''۔ ''ریڈی فار ٹیک''

''میک اپ''

''مس شکنتلا کی لپ اسٹک ٹھیک کرو''

''دیپ کمار کی ناک چمک رہی ہے''

''ریڈی فار ٹیک''

''او۔کے''

''فوکس''

''پانچ فٹ ساڑھے گیارہ انچ''

''لینس بدلو۔سیونٹی فائیو لگاؤ''

''ساؤنڈ ریڈی؟''

''خاموش! خاموش! وی آر شوٹنگ!''

''آل لائٹس!''......

بتی جلاؤ۔

بتی بجھاؤ۔

اسٹوڈیو کے فرش سے چالیس فٹ کی اونچائی پر لوہے کے گاڈروں کے ایک کھانچے میں ایک فٹ بھر چوڑے لکڑی کے تختے کے سہارے لٹکا ہوا، ایک ہاتھ سے من بھر وزنی لائٹ کو سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے رسی کو مضبوطی سے پکڑے، کندن کمار سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی قسمت میں کبھی دیپ کمار کی طرح تین ہزار روپے ماہوار پانے والا ہیرو بننا نہ ہوگا۔ کیا اس کے 'سہانے سپنے' 'ادھورے خواب' بن کر ہی رہ جائیں گے؟ (اسے فلمی زبان میں نہ صرف بولنے بلکہ سوچنے کی بھی عادت پڑ گئی تھی) کیا وہ ہمیشہ بائیس روپے ماہوار پر لائٹ قلی کا کام ہی کرتا رہے گا؟۔

کندن کمار!

یہ اس کا پیدائشی نام نہیں تھا۔ اس کے باپ نے تو ٹکو والے جوتشی جی کی صلاح سے اس کا نام سورج مل رکھا تھا۔ کیونکہ زائچے کے بموجب اس کی پیدائش کے وقت سورج برج حمل سے نکل کر بُرج سرطان میں داخل ہو رہا تھا۔

کندن کمار!

یہ نام تو اپنے لیے اس نے خود تجویز کیا تھا۔ ایسے ہی نہیں۔ سوچ بچار کے بعد۔ ہندستان کے دو مشہور ترین فلمی ستاروں یعنی کندن لال سہگل اور اشوک کمار کے ناموں کا مرکب کہ شاید

اس نام کی برکت ہی سے اس کی قسمت چمک اٹھے۔

کتنے سال سے ہیرو بننے کی خواہش اس کے سینے میں سلگ رہی تھی وہ چھ یا شاید سات سال کا تھا اور پاٹھ شالا میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس کے قصبے کرنال میں پہلی بار ایک ''ٹورنگ سنیما'' آیا۔ اب تو اسے فلم کا نام بھی یاد نہ تھا۔ ایڈی پولو کا کوئی ''مار دھاڑ، مکہ بازی اور سنسنی خیز واقعات سے لبریز فلم'' تھا۔ ہالی ووڈ سے چل کر نہ جانے کہاں کہاں ہوتا ہوا شاید دس بارہ برس میں کرنال پہنچا تھا۔ ''ٹاکی'' ایجاد ہو چکے تھے مگر یہ فلم خاموش ہی تھا۔ اور کیونکہ سب ٹائٹل انگریزی میں لکھے ہوئے تھے۔ اس لیے ایک چرب زبان آدمی ساتھ ساتھ سمجھاتا جاتا تھا بہ آواز بلند۔ ''دیکھو۔ دیکھو۔ سفید گھوڑے پر سوار یہ ایڈی پولو چلا آ رہا ہے ..... اب یہ اکیلا ان سب ڈاکوؤں کا مقابلہ کرے گا..... شاباش، بہادر۔ شاباش۔ مار... سالے کو۔ اک اور دے.. ...وہ مارا!...'' اور جب پردے پر ایک پھولے پھولے گالوں والی میم کا بڑا سا چہرہ نظر آیا۔ اس وقت اس نے جوش میں آ کر کہنا شروع کیا، ''دیکھو دیکھو۔ کیا مزے دار لونڈیا ہے۔ پٹاخہ ہے پٹاخہ''۔ اس وقت کندن کمار (بلکہ کہنا چاہیے سورج مل) کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کوئی لونڈیا ''پٹاخہ'' کیسے ہو سکتی ہے۔ اور مزے دار تو کوئی کھانے کی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ جیسے کلو حلوائی کی بنائی ہوئی گلاب جامن یا قلفی والے کے ہنڈے میں سے نکلی ہوئی ملائی کی برف، یا نواب صاحب کے باغ میں سے چرائے ہوئے کھٹ مٹھے چوسنے کے آم۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایڈی پولو اس لڑکی کے ڈبل روٹی جیسے پھولے گالوں کو چکھ رہا ہے اور شاید اُسے بھی یہ لڑکی ''مزے دار'' ہی لگی ہوگی کہ فوراً ہی اس نے اس کے ہونٹوں کو چوسنا شروع کر دیا... ...بالکل ایسے ہی جیسے برسات میں زرد زرد آموں کو چوستے ہیں!

یوں تو شہر کے سب بچے ہی سنیما دیکھ کر پڑھائی لکھائی، کھیل کود سب بھول بیٹھے مگر سورج مل تو اس نئے تماشے پر بالکل ہی مر مٹا۔ سات دن جب تک سنیما کرنال میں رہا۔ وہ روزانہ کسی نہ کسی بہانے سے وہاں جاتا رہا۔ کیا جادو بھرا تماشہ تھا۔ روز نیا کھیل۔ کبھی گھوڑے دوڑ رہے ہیں، کبھی بندوقیں اور پستول چل رہے ہیں، کبھی صاحب اور میمیں ناچ رہی ہیں، کبھی ڈاکو چلتی ریل کی چھت پر چڑھے ہوئے ایک دوسرے سے گھونسہ بازی کر رہے ہیں۔ کبھی ایک ناٹا سا، دبلا سا،

چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا مسخرہ ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں سے چل کر ہنسا رہا ہے۔ کچھ عجیب تنوع۔ عجیب حرکت، عجیب سنسنی، عجیب جادو تھا اس تماشے میں۔

"ٹورنگ سنیما" اپنا تنبو اور مشین اٹھا کر کسی اور شہر روانہ ہو گیا۔ پاٹھ شالہ میں آ۔آ۔اب۔ با۔پ سے پیڑ کی گردان پھر شروع ہو گئی۔ بچوں نے پھر گلی ڈنڈے، کبڈی اور گولیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ رام لیلا کے سوانگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مگر سورج کے ننھے دماغ پر سنیما کا جادو مسلط رہا۔ "کاش میں بھی ایکٹر بن جاؤں۔" وہ سوچتا۔ "اور پھر ایک سفید گھوڑے پر چڑھ کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کروں، چلتی ریل سے دریا میں چھلانگ لگاؤں، صاحبوں، میموں کی طرح ناچوں... اور...اور...اگر کبھی کوئی پھولے پھولے گالوں والی لونڈیا مل جائے تو اس کو چکھ کر دیکھوں کہ وہ مزے میں کلو حلوائی کی گلاب جامن کی طرح میٹھی ہے یا کچی ناشپاتیوں کی طرح کھٹی!.....

"لائٹس آف"

اور بغیر اپنے خیالات کے بہاؤ کو روکے کندن نے بٹن دبا کر اپنی لائٹ کو بجھا دیا۔ اُسے اس لائٹ اور اس کام سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہمیشہ "بتی بجھاؤ۔ بتی جلاؤ" کے احکامات سننے والا لائٹ قلی ہی رہنا چاہتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ہیرو بننا تھا اور وہ ضرور ہیرو بن کر رہے گا۔ مگر فی الحال یہ کیا کم تھا کہ وہ ایک اسٹوڈیو میں آ جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے مشہور فلم ستاروں کو قریب سے دیکھ سکتا تھا، چپکا بیٹھا ایکٹنگ اور فلم سازی کے سب گر سیکھ سکتا تھا۔ اور پھر اس کام میں دماغ پر تو زور ڈالنا ہی نہیں پڑتا تھا۔ "بتی جلاؤ" بٹن دبا دیا۔ "بتی بجھاؤ" بٹن دبا دیا۔ "ہارڈ کرو"۔ ایک چرخی کو سیدھی طرف گھما دیا۔ "سوفٹ کرو" چرخی کو الٹی طرف گھما دیا۔...
...اور اس تمام عرصہ جو چاہو، سوچو...وہ دس یا گیارہ برس کا تھا اور میونسپل بورڈ اسکول کے چوتھے درجے میں پڑھتا تھا جب ٹین کی چھت اور پکی دیواروں کا ایک مستقل سنیما کرنال میں بن گیا اور سورج کو باقاعدہ فلم دیکھنے کا موقعہ آخر کار نصیب ہو ہی گیا۔ ہفتے میں کم سے کم ایک بار وہ سنیما ضرور جاتا۔ اور فلم اچھا ہوتا یا برا اس کے جذبۂ شوق کی تسکین بہر حال ہو جاتی۔ بلکہ ہر فلم اس کے بڑھتے ہوئے دماغ پر نئے نئے محسوسات کے نقوش چھوڑ جاتا۔

کئی برس تک سنیما کا جادو اس پر اثر کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس روپہلی پردے کی چلتی

پھرتی تصویروں میں ایک عجیب کشش ہے۔ مگر ابھی تک اس میں متحرک سایوں میں تمیز کرنے کی سمجھ بوجھ نہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ کسی خاص قسم کا فلم، کسی خاص کمپنی کا فلم، کسی خاص اسٹار کا فلم دیکھنے نہیں جاتا تھا۔ وہ صرف فلم دیکھنے جاتا تھا۔ کیسا بھی ہو، کسی کا بھی ہو، ''جو کچھ ملے، جہاں بھی ملے، جس قدر ملے۔''

مگر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اور اس کا شوق تیز تر ہوتا گیا، سنیما کی کشش ایک مبہم اور بے نام جذبے کی حد سے نکل کر مخصوص اور معلوم شکلیں اختیار کرتی گئی۔

گوہر کا گداز جسم۔

ماسٹر وٹھل کی پھرتی اور شہسواری اور اس کا کسرتی بدن۔

سلوچنا کی گوری رنگت، چمکیلے سیاہ بال اور بڑی بڑی آنکھیں، بلیموریا کی باریک اور نکیلی مونچھیں۔

مادھوری کی تیزی اور طراری۔ ارلین کا چلبلا پن۔

چارلی غوری ڈکشٹ کی دھما چوکڑی جس کو دیکھ کر پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ جاتے تھے۔

خوب صورت آنکھوں والی زبیدہ ''اف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی!''

اور پھر ہندستانی فلم بول پڑے۔ اور 'جنت نگاہ' اب 'فردوس گوش' بھی بن گئی۔ نہ صرف آنکھ کے راستے بلکہ کان کے راستے بھی یہ چلتی پھرتی تصویریں دلوں میں گھر کرنے لگیں۔

اف وہ کجن کی نقرئی آواز۔

ماسٹر نثار کی سریلی تانیں۔

آغا حشر کے لکھے ہوئے پر رعب مکالمے

اور پھر سہگل۔ جادو بھری آواز والا سہگل۔

اور زبیدہ کا وہ ایک انوکھے انداز سے تتلا تتلا کر بولنا!

سورج نے کسی نہ کسی طرح مڈل پاس کر لیا۔ اس کا باپ جو پنساری کی دکان کرتا تھا، چاہتا تھا کہ اب بیٹا پڑھائی چھوڑ کر اس کا ہاتھ بٹائے۔ مگر سورج کا دل سنیما کی رومانی رنگینیوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس کو کب گوارا تھا کہ اپنی زندگی سونف، کالی مرچ، ہلدی اور نمک کی پڑیاں

باندھنے میں گزار دے اور ایک بار اسکول چھٹ گیا اور دوکان پر بیٹھنے کا معمول بن گیا تو پھر سینما دیکھنے کی مہلت بھی کب ملنے والی تھی! حالانکہ اس کا دل پڑھائی میں بھی نہیں لگتا تھا، مگر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ باپ کو سمجھا بجھا کر دو سال اور ہائی اسکول میں گزارنے کی مہلت حاصل کر لے اور اس عرصے میں کوئی ایسی ترکیب نکالے جس سے وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں قدم رکھ سکے۔

اب اس کی عمر سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ خاصا کھلتا ہوا رنگ، ناک نقشہ برا نہیں، قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ زیادہ ہی، لمبے بال جو بڑی محنت سے گھونگھر والے بنائے گئے تھے۔ ہر بار جب وہ آئینہ دیکھتا اس کو یقین ہو جاتا کہ ایک بار کوئی ڈائرکٹر اس کو دیکھ لے تو پھر ہر اسٹوڈیو کے دروازے اس کے لیے کھل جائیں گے۔

اس سال رام لیلا کا میلا لگا تو اس میں دلی کے ایک فوٹو گرافر نے دکان جمائی۔ "ایک روپیہ میں آٹھ فوٹو۔" اور مزا یہ کہ پانچ منٹ میں تیار۔ سورج سب سے پہلے پہنچا۔ باپ سے چھپا کر ایک ٹائی "ہر مال ملے گا ساڑھے نو آنے میں۔" لی تھی۔ وہ کالر دار قمیص میں لگائی۔ اوپر وہی اسکول والا کوٹ۔ نیا دھلا اور استری کیا ہوا۔ فوٹو میں تو صرف گردن سے ذرا نیچے تک آنے والا تھا۔ معلوم ہوگا سوٹ پہنے ہے۔ فوٹو کھینچے شروع ہوئے۔ سورج نے فلمی رسالوں میں ایکٹروں کی تصویروں کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ وہی "پوز شروع کیے۔ فرنٹ ویو۔ سائڈ ویو۔ پروفائل۔ تھری فورتھ۔ فوٹو گرافر نے دو چار قسم کی ٹوپیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ ان میں سے بڑے بڑے چارخانوں کی ایک "نائٹ کیپ" سر پر جما کر ایک فوٹو امریکن ایکٹروں کی وضع کا۔ پھر ٹوپی اور ٹائی اور کوٹ اتار ڈالا۔ قمیض کا کالر اوپر چڑھ گیا۔ بال بکھر گئے۔ آنکھوں میں حسرت اور یاس اور عشق کا جنون۔ یہ ہوا 'ناکام عاشق'۔ پھر بال اور بکھر گئے اور آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔ فوٹو گرافر نے بیئر کی خالی بوتل میں کاغذ کے پھول رکھ چھوڑے تھے لپک کر اُسے اٹھا لیا۔ تو یہ ہوا، آنکھ کا نشہ"۔ اب ایک فوٹو رہ گیا۔ اس میں کیا کیا جائے۔ فوٹو گرافر کو شاید ایکٹر بننے کے خواہش مند نوجوانوں کے فوٹو لینے ہی میں مہارت حاصل کی تھی۔ اس نے فوراً ایک بنی بنائی داڑھی مونچھ پیش کی۔ سورج نے عینک جیسی کمانیوں کو کان میں اٹکا کر داڑھی "پہن" لی اور بغیر میک اپ کے اپنے چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمودار کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہوا 'یہودی کی لڑکی' کا 'بوڑھا باپ'

یا 'بدنصیب قیدی'۔ تاکہ ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں پر آشکار ہو جائے کہ وہ کیریکٹر ایکٹنگ کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔

اس رات کو کندن کمار نے جنم لیا۔ جب وہ فلم کمپنیوں کے نام خط لکھنے بیٹھا تو دفعتاً اُسے خیال آیا کہ سورج مل ایک نہایت غیر رومانی اور بنیا قسم کا نام ہے۔ اس نام کے لڑکے کو کوئی ہیرو نہیں بنائے گا۔ پھر کون سا نام اختیار کیا جائے؟ جب سے کمار نے، پورن بھگت' میں نام پیدا کیا تھا 'کمار' تو ایکٹر کے نام کا ایک لازمی جزو ہو گیا تھا۔ اشوک کمار۔ سوشیل کمار۔ انیل کمار۔ سونیل کمار۔ دلیپ کمار۔ یہ کمار وہ کمار۔ اور پھر ان میں سے کسی کا اصلی نام بھی تو کمار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اشوک کمار کا اصلی نام گنگولی تھا اور خود کمار کا نام میر علی۔ تو پھر سورج مل بھی کیوں نہ سہگل سے اس کے نام کا پہلا حصہ مانگ کر کندن کمار بن جائے؟...... غرض خطوط اور فوٹو فلم کمپنیوں کے نام روانہ کر دیے گئے اور خواب میں ایک کے بعد ایک کریڈٹ ٹائٹل نظر آتے رہے۔

بمبئی ٹاکیز پریزنٹس

کندن کمار

اِن

سپوت

بمبئی ٹاکیز پریزنٹس... ...

نیو تھیٹرز پریزنٹس ... ...

پربھات فلم کمپنی پریزنٹس ... ...

منروا مووی ٹون پریزنٹس ... ...

رنجیت فلم کمپنی پریزنٹس ... ...

اور پھر بیک گراؤنڈ میوزک کی جھنکار کے ساتھ پردے پر ایک نام چمکتا ہوا......

کندن کمار!

کندن کمار!!

کندن کمار!!!

کندن کمار!!!!

کندن کمار!!!!!

کندن!

''ابے او کندن! سوتا ہے کیا؟'' ''نمبر ستائیس آف''

ایک لمحے کے لیے لائٹ قلی، کندن فلم اسٹار، کندن کمار کے سپنوں میں کھو گیا تھا۔ اسسٹنٹ کیمرہ مین کی پکار پر وہ ہڑبڑا اٹھا۔

شاٹ ختم ہو گیا تھا اور سب روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ صرف کندن کی نمبر ستائیس کی روشنی ایک پیلے دائرے میں مس شکنتلا پر پڑ رہی تھی جس نے ابھی ابھی فلم کے آخری شاٹ کے ڈائیلاگ بولے تھے۔ چالیس فٹ۔ نیچے سیٹ کی ہر چیز۔ دیواریں جو لکڑی کے ٹیکوں کے سہارے کھڑی تھیں۔ اسٹینڈز پر لگی ہوئی لائٹس، کیمرہ، اس کے پیچھے رکھی ہوئی کرسیاں۔ کھلونا معلوم ہوتی تھیں اور ہر شخص گڑیا معلوم ہوتا تھا۔ مس شکنتلا، دیپ کمار، ڈائرکٹر باسو جو ابھی تک طے نہ کر پایا تھا کہ شاٹ کو ''او کے'' کہے یا ''این جی'' اور برابر بڑبڑائے جا رہا تھا۔ ''ٹھیک تھا... ٹھیک تھا۔ مگر یہ پکچر کا لاسٹ شاٹ ہے۔ اپنے کو کچھ اور مانگتا... کوئی پکچوریل ایفکٹ...'' اور پھر اس نے نہ جانے کیا دیکھا یا سوچا اور اپنی مخصوص جوشیلی آواز میں چلا اٹھا۔''

''آئی گیٹ اِٹ۔ دس از وہاٹ آئی وانٹ!''

اور اسی وقت کندن نے اپنی لائٹ کو بجھا دیا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے ٹمٹماتی ہوئی ''ہاؤس لائٹ'' میں سیٹ کی کوئی چیز نظر نہ آئی مگر ڈائرکٹر باسو کی آواز سنائی دی۔

''ایڈیٹ! وہی لائٹ تو اپنے کو مانگتا''۔

اور پھر اسسٹنٹ کیمرہ مین کی دہاڑتی ہوئی آواز۔

''نمبر ستائیس۔ آن کرو''

بتی بجھاؤ!

بتی جلاؤ!

اندھیرا اور اجالا۔ اجالا اور اندھیرا۔

کندن نے لائٹ جلادی۔

اب اس نے دیکھا کہ ڈائریکٹر باسو مس شکنتلا کو اس لائٹ کے دائرے میں مختلف زاویوں سے کھڑا کرکے دیکھ رہے ہیں اور کہتے جارہے ہیں۔ ''اب کچھ بنا یہ شاٹ''

اور پھر ڈائرکٹر اور موٹے کیمرہ مین چندو بھائی کی ایک کانا پھوسی کانفرنس ہوئی جس میں وہ صرف بار بار ''نمبر ستائیس'' کا ذکر سن رہا تھا اور کندن سوچنے لگا۔ ''آج تو میری لائٹ کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے''

کیمرہ مین گجراتی اور ڈائرکٹر بنگالی اور مشترکہ زبان ہندستانی۔ بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی اور آوازیں بتدریج بلند ہوتی گئیں۔

''ہم بولتا، چندو بھائی، ہم کو یہ لائٹ مانگتا''

''وہ ٹھیک ہے صاحب۔ پر اتنے اونچے سے صرف ایک لائٹ دیں گے تو ایک دم پکچر ڈارک ہو جائے گی۔ کم سے کم دو سن سپاٹ اور دو تین بے بینر دیں تو......''

''نو۔نو۔ یو ڈونٹ انڈر اسٹینڈ، چندو بھائی۔ اپنے کو ایک لائٹ کا سرکل مانگتا۔ بس جب کیمرہ کرین پر اوپر لانگ شارٹ میں جائے گا اس لائٹ کے سرکل میں ہیروئن کھڑی ہوگی... اوپر دیکھتی ہوئی... لائٹ اس کی آنکھوں میں...''

پر باسو صاحب۔ چالیس فٹ اوپر سے لائٹ ماریں گے تو اس کا سرکل بہت بڑا بنے گا اور لائٹ اتنی ڈفیوز DIFFUSE ہوگی کہ کچھ رجسٹر REGISTER نہیں ہوگا''

''ہم نہیں جانتے۔ تم کیمرہ مین ہے۔ کوئی ترکیب نکالو۔''

کندن چھ مہینے سے اس انتظار میں تھا کہ اسے اپنی کارگزاری دکھانے اور انفرادیت جتانے کا کوئی موقع ملے۔ وہ اوپر ہی سے چلایا۔ ''چندو بھائی۔ اگر لائٹ چالیس فٹ کے بجائے بیس فٹ پر آجائے تو چلے گا؟''

ایک لائٹ قلی کو دخل در معقولات کرتے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ چندو بھائی کا جی چاہا کہ اسے جھڑک دے مگر پھر اُسے خیال آیا کہ کندن کی تجویز کچھ بری نہیں ہے۔

ڈائرکٹر باسو تو کھل گئے۔ ''یس۔ یس۔ دیٹ از رائٹ۔ لائٹ نیچے آجائے گا تو سرکل

چھوٹا ہو جائے گا اور ڈفیوز DIFFUSE بھی نہیں ہوگا''

''پر بیس فٹ پر نیا تختہ لگانے اور لائٹ فکس کرنے میں تین چار گھنٹے لگ جائیں گے''۔ چندو بھائی نے پہلے سے معاملہ صاف کر دینا مناسب سمجھا کیونکہ ہمیشہ فلم مکمل ہونے میں جو دیر لگتی تھی اس کا ذمے دار اسی کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

''کوئی پرواہ نہیں''۔ ڈائرکٹر باسو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''مگر شاٹ بھی تو کیا شوندر ہوگا''۔

''نہیں نہیں۔ یہ کیا شوندر دوندر لگا رکھا ہے۔'' یہ سیٹھ جی تھے۔ اسٹوڈیو کے مالک۔ ''پکچر ویسے ہی لیٹ ہوگئی ہے۔ اور تم لوگ ری ٹیک پر ری ٹیک کیے جاتے ہو۔ میرا پیسہ حرام کا نہیں ہے۔ اگر دوسرا شاٹ آدھ گھنٹے میں لے سکتے ہو تو لو، نہیں تو پہلے شاٹ کو او کے کرو۔''

اسٹوڈیو کی سماج میں سیٹھ جی کا درجہ بادشاہ بلکہ ڈکٹیٹر کا تھا۔ کندن جانتا تھا کہ اسٹوڈیو کے ان لکھے قانون کی رو سے ہر لائٹ قلی کو اسسٹنٹ کیمرہ مین کی گالیاں کھانا پڑتی ہیں، اسسٹنٹ کیمرہ مین خود کیمرہ مین کی گالیاں کھاتا ہے، کیمرہ مین ڈائرکٹر کی ڈانٹ سنتا ہے۔ پر اگر کوئی ڈائرکٹر کو بھی سخت سست کہنے کا اختیار رکھتا ہے تو وہ سیٹھ جی ہیں۔ ان کے سامنے کسی اور کو بولنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ پر آج وہ ہر خطرے میں پڑنے کے لیے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بغیر اس کو ترقی کرنے کا کوئی موقع نہ ملے گا،

''سیٹھ جی!'' وہ چلّایا۔ ''میں پانچ منٹ میں لائٹ نیچے کیے دیتا ہوں۔''

اسٹوڈیو کے کھوکھلے خول میں اتنے اوپر سے اس کی آواز خوفناک طریقے سے گونجی۔ اس کی جرأت بلکہ بے ادبی پر سب دنگ رہ گئے۔ اس کے ساتھی دوسرے قلی تو سمجھے کہ آج کندن کی خیریت نہیں۔ یہ ضرور اسٹوڈیو سے نکالا جائے گا۔ پر سب کو حیرت ہوئی جب سیٹھ جی اوپر دیکھ کر بولے۔

''کیسے کرے گا؟''

''ابھی دکھاتا ہوں''۔ اور یہ کہہ کر کندن نے پٹرے کے دونوں طرف مزید مضبوطی کے لیے جو فالتو رسی کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے انھیں نکال لیا۔ اب پٹرا گاڈر میں اکہری رسی سے لٹکا ہوا رہ گیا۔ مگر رسی مضبوط تھی اور کندن کا وزن کچھ زیادہ نہیں تھا (سستے ہوٹلوں میں کھاتے کھاتے دس سیر کم ہو چکا تھا) اس نے رسی کے ٹکڑوں کو مضبوط گرہیں باندھ باندھ کر بیس فٹ لمبا

کر لیا اور ایک سرا پٹرے میں باندھ کر اور دوسرا سرا لائٹ کے کٹرے میں ڈال کر لائٹ نیچے لٹکا دی۔ سب اس کی سمجھ اور پھرتی کے قائل ہو گئے۔ خود سیٹھ جی نے "چلے گا۔ چلے گا" کہہ کر اس کی داد دی۔

"لائٹ آن"

"روشنی کا گھیرا مس شکنتلا پر پڑا۔ بالکل ٹھیک۔ نہ ایک فٹ اِدھر نہ ایک فٹ اُدھر۔ مگر چندو بھائی کبھی کسی لائٹ سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کو ایک دفعہ پورا ہارڈ کرا کے پھر پورا سوفٹ نہ کرا دے۔

"ٹھیک ہے۔ پر ذرا اور نیچے ہو جائے تو اچھا رہے گا"

اب مشکل یہ تھی کہ رسی اتنی ہی تھی۔ لائٹ کو نیچے کیا جائے تو کیسے۔

مگر آج کندن ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے رسی کو پٹرے میں سے کھول لیا۔ بائیں ہاتھ سے پٹرے کو مضبوطی سے پکڑا اور داہنے ہاتھ میں رسی کے سرے کو تھام کر لائٹ کو دو فٹ اور نیچے لٹکا دیا۔

"ٹھیک ہے"

"ریہرسل!"

"ساونڈ ریڈی فور ریہرسل"

"یس مس شکنتلا"؟

"بھگوان۔ مجھے سندر کے راستے پر..." اور مس شکنتلا اٹک گئیں کیونکہ جب انھوں نے اوپر بھگوان کی طرف دیکھا تو ایک من وزنی لائٹ کو عین اپنے سر پر لٹکا پایا۔

"یہ لائٹ میرے اوپر گر پڑی تو کون ذمہ دار ہوگا"

اور اب کندن کو اس کا ذمہ بھی لینا پڑا۔ "گھبرایئے مت، مس شکنتلا۔ آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔" اور وہ دل ہی دل میں خوش تھا "آج پہلی بار اتنی مشہور ہیروئن سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ کون جانتا ہے کل اس کے ساتھ دیپ کمار کے بجائے شاید میں خود ہی پارٹ کر رہا ہوں"

خیر مس شکنتلا نے حامی بھری۔ ریہرسل "او کے" ہوا، سیٹیاں بجیں۔ دروازے بند ہوئے

اور شاٹ شروع ہوا۔

''ساؤنڈ شارٹ''

دو سیٹیاں

''کیمرہ! کلیپ!''

کیمرہ کرین پر چڑھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ شکنتلا کے کلوز اپ سے کیمرہ پیچھے اور اونچا ہوتا چلا گیا۔

اور چالیس فٹ اونچے، ایک پتلے تختے پر ٹنگا ہوا، ایک ہاتھ سے سہارا لیے ہوئے اور دوسرے میں ایک وزنی لائٹ لٹکائے ہوئے کندن سوچ رہا تھا۔

''یہ شاٹ میرا ہے۔ میں نہ ہوتا تو کبھی اس طرح نہ لیا جاتا''۔ پر اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ بوجھ سے اس کے دائیں ہاتھ کی رگیں کھنچ رہی تھیں اور بایاں ہاتھ سن ہوا جا رہا تھا اور اس کے کانوں میں مس شکنتلا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''یہ لائٹ میرے اوپر گر پڑی تو کون ذمہ دار ہوگا؟'' نیچے کی طرف نظر کی تو سیٹ پر ہر چیز۔ کیمرہ، کرسیاں، لائٹس۔ گھومتی نظر آئی۔

آہستہ آہستہ مس شکنتلا نے اپنی نظر اوپر اٹھائی۔ بھگوان کی طرف۔ کندن کی طرف۔ روشنی عین اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ کندن کو نہیں دیکھ سکتی تھی مگر وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے حسین چہرے کو جو سفید ساڑی کے آنچل میں نورانی معلوم ہو رہا تھا...

اور کندن ایک لمحے کے لیے بھول گیا کہ وہ ایک ہاتھ میں وزنی لائٹ سنبھالے ہوئے ہے۔ پتلے تختے کا توازن بگڑ گیا اور رسیاں ٹوٹی نہیں مگر ایک طرف کی دفعتاً اس طرح کھنچ گئی کہ کندن کو سخت جھٹکا لگا، اگر اس کا بایاں ہاتھ رسی سے پھسل کر تختے پر نہ لگتا اور وہاں اس کی انگلیاں مضبوطی سے نہ جم جاتیں اور اگر لائٹ والی رسی پر اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی پڑ جاتی تو لائٹ اور کندن دونوں چالیس فٹ نیچے مس شکنتلا کو چکنا چور کرتے ہوئے اسٹوڈیو کے سیمنٹ کے فرش پر آ رہتے۔ موت کے خوف کی سنسناہٹ اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ پر اس وقت اپنی جان سے بھی زیادہ اُسے اپنے وعدے کی فکر تھی جو اس نے مس شکنتلا سے کیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں رسی میں گڑ گئیں اور اس نے لائٹ کو ہلنے تک نہ دیا۔

شاٹ جاری رہا۔اس ڈرامے سے بے خبر مس شکنتلا اپنا ڈائیلاگ بولتی رہیں۔

''اے بھگوان! مجھے سندر کے راستے پر چلنے کی شکتی دے!'' اور سوائے چند دوسرے لائٹ قلیوں کے جن کے منہ سے تقریباً چیخ نکل گئی تھی اور سیٹھ جی کے جو کونے میں کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ اس شاٹ کی خاطر کندن نے تقریباً اپنی جان ہی دے دی۔

شاٹ ختم ہو گیا۔

''ہاؤاز دیٹ فور ساؤنڈ؟''

''اوکے''

''اوکے''

''اوکے''

ڈائرکٹر بہاسو خوش تھے۔مس شکنتلا کو مبارکباد دے رہے تھے۔چندو بھائی خوش تھے۔اپنے اسسٹنٹ کو بتا رہے تھے کہ اس قسم کے لائٹ ایفکٹ میں کوئی دوسرا کیمرہ مین ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔مس شکنتلا خوش تھیں اور دیپ کمار کو بتا رہی تھیں کہ ایسے شاٹ میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایکٹنگ کرتی ہیں۔اگر مجھ پر اوپر سے وہ لائٹ گر بھی پڑتی تو مجھے پتہ نہ چلتا۔اور انھیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی موت ان کے کتنے قریب سے گزر گئی تھی۔

یہ آخری شاٹ تھا۔سب رخصت ہونے لگے۔کندن نیچے اتر آیا اور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ سیٹھ جی اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔

''اے کیا نام ہے تیرا؟''

''کندن، سیٹھ جی''

''شاباش۔تو بڑے جگرے کا آدمی ہے۔ہم نے دیکھا تو نے مس شکنتلا کا جان بچالیا۔''

''یہ تو میرا فرض تھا، سیٹھ جی...''

''بول کیا انعام چاہیے؟''

کب سے وہ اس لمحے، اسی موقع کے انتظار میں تھا۔میں یہ کہوں گا۔میں یہ کہوں گا۔

''سیٹھ جی مجھے ایکٹنگ کا چانس چاہیے۔میں ہیرو بننا چاہتا ہوں۔ایک بار۔بس ایک بار۔موقع

دیجیے" مگر اس وقت اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ سوسیٹھ جی ہی بولے۔

"اچھا کل آفس میں ملو۔ ہم تم کو کوئی انعام بھی دے گا اور کوئی اسپیشل کام بھی دے گا"

اور جب کندن اسٹوڈیو سے باہر آیا تو سب کی نظریں اس پر تھیں اور اس کے قدم زمین پر نہیں ہوا پر پڑ رہے تھے۔

دوسرا ریل

(جس میں آپ ہیروئن کو پہلی بار دیکھتے ہیں)

کندن سو کر اٹھا تو سروپ اور مرزا دونوں نہا دھو مانگ پٹی کر کے باہر جانے کو تیار کھڑے تھے۔ ان تینوں نے دادر مین روڈ پر رنجیت اسٹوڈیو کے قریب کی ایک چال میں ایک مشترکہ کھولی کرائے پر لے رکھی تھی۔ تینوں اپنے اپنے گھر سے بھاگ کر بمبئی آئے تھے۔ تینوں فلم اسٹار بننے کی حسرت دل میں رکھتے تھے۔

مرزا بولا:

"کیوں بے کندن، چل آج تجھے بھی کام دلوا دیں، مغل اعظم، کا بڑا گرینڈ سیٹ لگا ہوا ہے بمبئی ٹاکیز میں۔ وہاں تین چار سو آدمیوں کی ضرورت ہے دربار سین کے واسطے۔" مرزا جو ایف اے فیل تھا اور شمالی پنجاب کا رہنے والا تھا اور جس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور جو ایک وقت میں بیس پچیس چپاتیاں کھا سکتا تھا اور جس پر اکسٹرا لڑکیاں جان دیتی تھیں ڈیڑھ برس سے فلمی قلعہ کو سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر سوائے موہن کی ایک اسٹنٹ فلم کے جس میں اس نے چار خانے کی قمیض اور برجیس پہن کر ایک ولایتی قسم کے گنڈے کا پارٹ کیا تھا اس کو کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اکسٹرا کی حیثیت سے آٹھ دس دن بھیڑ کے کسی سین میں کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ آج رنجیت میں ڈاکو بنا ہوا ہے تو کل راج کمل میں سادھو۔ پرسوں منروا میں مغل درباری تو اس سے اگلے دن پرکاش میں بکرماجیت کا سپاہی۔ وہ بمبئی میں اکسٹرا کا کام کرنے نہیں اسٹار بننے آیا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس کو بھوک بہت لگتی تھی اور اتنا بڑا جسم ایندھن بھی بہت مانگتا تھا اس لیے جب چھ ماہ تک ہر اسٹوڈیو کا چکر لگانے کے بعد اس کو کہیں

جگہ نہ ملی تو اس نے بھی شرم کو بالائے طاق رکھ کر داداگنجا اکسٹرا اسپلائر کے ہاں اپنا نام لکھوا دیا۔

ہاں تو جب مرزا نے کہا:

''کیوں بے کندن، چل آج تجھے بھی کام دلوا دیں'' تو سروپ بولا چھوڑ دیار۔ یہ لاٹ صاحب تو جب تک ہیرو کا پارٹ نہیں ملے گا کیمرے کے سامنے نہیں آئیں گے''

''یہ میں نے کبھی نہیں کہا'' کندن نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اکسٹرا کا گونگا کام نہیں کروں گا۔ ویسے ایک لائن بھی بولنے کے لیے مل جائے تو میں تیار ہوں۔

''بڑے نخرے ہیں تمھارے۔ مگر یہ لائٹ قلی کا کام کرتے شرم نہیں آتی تمھیں۔''

یہ سروپ کا مستقل تکیہ کلام تھا۔ اپنے دوست اور ساتھی کو یہ ''نیچ'' کام کرتے دیکھ کر اُسے واقعی شرم آتی تھی۔ اور اس مسئلے پر روز اس کی اور کندن کی بحث ہوتی تھی۔ سروپ کانپور میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ جب وہ اپنی سوتیلی ماں کے ظلم سے چھٹکارا پانے کے لیے بمبئی چلا آیا تھا۔ رنگ گورا اور صورت شکل اچھی تھی۔ گانا بھی تھوڑا بہت جانتا تھا۔ یار لوگوں نے صلاح دی کہ فلموں میں قسمت آزمائی کرو۔ دس مہینے سے کر رہا تھا۔ قد کسی قدر چھوٹا تھا۔ پھر بھی وہ کرن دیوان سے دو انچ لانبا ہی تھا اور ایسے موتی لال ہی کون سا چھ فٹا ہے! مگر پروڈیوسروں ڈائرکٹروں کو اُسے نہ لینے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ایک جگہ سنا کسی ''نئے چہرے'' کو ہیرو کے لیے لینا چاہتے ہیں وہاں کوشش کی۔ کامیابی کی امید معلوم ہوتی تھی کہ پروڈیوسر صاحب کو خیال آیا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ وینا کے ساتھ جوڑی نہیں ملے گی... سروپ واپس آیا اور اگلے دن مرزا کو بھیجا کہ شاید اس کی طویل قامت پروڈیوسر صاحب کو پسند آ جائے مگر مرزا کو دیکھ کر وہ بولے۔

''ہم تو سنیہ پربھا یا للیتی جیونت کو ہیروئن بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ تم تو بہت لمبے ہو۔ جوڑی نہیں ملے گی۔'' (یہ اور بات ہے کہ یہی پروڈوسر صاحب اپنی پچھلی فلم میں پرتھوی راج اور ثریا کی جوڑی پیش کر چکے تھے۔) یہ سن کر سروپ بے چارہ بھاگا بھاگا ہوا گیا کہ آپ اگر وینا کے بجائے سنیہ پربھا یا للیتی جیونت کو لے رہے ہیں تو مجھے ہیرو کا پارٹ دے دیجیے۔ پروڈیوسر صاحب بولے وہ افواہ غلط تھی۔ وہ واقعی وینا ہی کو لے رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے سالے کو لے لیا ہے اور ساتھ میں ہیروئن شانتارن کو بتایا ہے۔

سو اس پر مرزا نے (جو فقرے بازی کا ماہر تھا) ایک لطیفہ گھڑا جو ہر اسٹوڈیو میں دہرایا جا رہا تھا۔ پروڈیوسر ایک بڑے اور اہم فلم کی مہورت سے پہلے تمام مشہور ایکٹروں کو انٹرویو کے لیے بلاتا ہے تا کہ ان میں سے ایک کو ہیرو چنا جائے۔

سب سے پہلے اشوک کمار آتا ہے مگر اس کو اس بنا پر نامنظور کر دیا جاتا ہے کہ وہ موٹا ہوتا جا رہا ہے۔

پھر موتی لال آتا ہے اور اس کو گنجا ہونے کی بنا پر نامنظور کر دیا جاتا ہے۔

پھر کرن دیوان آتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نازک اندام ہے۔

پھر شیخ ممتاز آتا ہے اور اس کو ضرورت سے زیادہ پہلوان ہونے پر "ان فٹ" کر دیا جاتا ہے۔

پھر سریندر آتا ہے مگر پروڈیوسر صاحب کا خیال ہے کہ وہ بے سرا گاتا ہے۔

پھر دیو آنند۔ مگر وہ بہت دبلا ہے

پھر جینت۔ مگر وہ بہت موٹا ہے

پھر واسطی۔ مگر وہ مسخرا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ سنجیدہ کردار نہیں کر سکتا۔

پھر بھارت بھوشن۔ مگر وہ سادھو معلوم ہوتا ہے اس لیے مزاحیہ کام نہیں کر سکتا۔

اخیر میں پروڈیوسر کا سکریٹری پوچھتا ہے۔ "سیٹھ جی۔ آپ نے تو ہر ہیرو کو 'ناپاس' کر دیا۔ آخر پھر لیں گے کسے؟"

وہ تو میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں" سیٹھ جی بولے۔ "اپنی بیوی کے بھائی کے داماد کے سالے کو لوں گا"

"آؤ، دادا، آؤ"۔ مرزا نے ایک نو وارد کا استقبال کرتے ہوئے کہا: "بس ہم بھی چلنے کے لیے تیار ہی ہیں۔"

"کیوں دادا، کچھ سوڈا لیمن؟" سروپ کے لہجے میں کچھ خوشامد کا پہلو تھا۔

"نہیں۔ سوڈا ووڈا کچھ نہیں چاہیے۔ ... ٹائم ہو گیا ہے۔ اب چلنا چاہیے۔ نو بجے جو ملاڈ پہنچنا ہے"

دادا گنجا، جس کو فلمی دنیا کا ہر آدمی 'دادا' کے نام سے پکارتا تھا۔ ایک اکسٹرا سپلائر تھا یعنی

کمیشن پر فلم کمپنیوں کے لیے اکسٹرا مہیا کرتا تھا۔

ہر اکسٹرا کو جو کچھ اسٹوڈیو سے ملتا اس میں سے آدھا دادا کی جیب میں جاتا۔ سینکڑوں نوجوان اور فلمی شہرت کے شوقین لڑکے اور لڑکیوں کا وہ 'دادا' نہیں بلکہ 'ان داتا' تھا۔ جن سے وہ خوش رہتا تھا ان کو مہینے میں دو سو تین سو روپے تک کی آمدنی ہو جاتی تھی اور جن سے ناراض ہوتا تھا ان کو دوسرے اکسٹرا سپلائر بھی کام دلواتے گھبراتے تھے کہ کہیں دادا کو معلوم ہو جائے اور اس کا غصہ ان پر اترے۔ مرزا اور سروپ نے مدت تک دادا کے وسیلے کے بغیر کام ملنے کی کوشش کی تھی مگر ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد انھوں نے بھی اس کی خوشامد شروع کر دی تھی۔ یہ دونوں پڑھے لکھے، خوش پوش اور اچھے گھرانوں کے لڑکے تھے۔ ایسے اکسٹرا مہیا کرنے سے اسٹوڈیوز میں دادا کی ساکھ بڑھتی تھی اس لیے وہ بھی ان پر خاص عنایت رکھتا تھا اور دور جانا ہو تو اکثر اپنی کھٹارا قسم کی موٹر میں ساتھ ہی لے جاتا تھا۔

پر نہ جانے کیوں کندن کو دادا کی شکل سے وحشت ہوتی تھی۔ اول تو اس کی شکل تھی ہی خوفناک۔ گہرا سانولا رنگ، چہرے پر پچاس سالہ عیاشی کی زندگی کے گہرے نقوش۔ اس پر داڑھی ہمیشہ تین چار دن کی بڑھی ہوئی۔ سر پر گنج اور ایک داد کی پپڑی جمی ہوئی جس میں سے کبھی کبھی پیلا پیلا پانی بھی بہتا رہتا تھا۔ بائیں گال سے لے کر پیشانی تک ایک پرانے زخم کا نشان۔ کہتے ہیں فارس روڈ کی کسی طوائف کے کوٹھے پر دادا کا کسی دوسرے موالی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے چاقو چلے۔ دادا کو گہرا زخم آیا دس دن بعد اسپتال سے گھر آ گیا۔ مگر اس کے رقیب کی لاش راتوں رات کوٹھے سے سیدھی شمشان لے جائی گئی۔ دادا گنجا اس زخم کے نشان کو بڑے فخر سے دکھاتا تھا۔ وہ اکثر کہتا اسے دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ دادا گنجا کے مقابلے میں آنا کتنا خطرناک ہے اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نشے کے لال لال ڈورے ہوتے تھے اور منہ سے ٹھرّے اور تاڑی کی بو آتی تھی۔

باوجود اس حلیے کے دادا گنجا اپنے آپ کو بڑا رنگیلا سمجھتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ہر رات ایک نئی عورت اس کے پہلو میں ہوتی ہے۔ سینکڑوں اکسٹرا لڑکیوں سے وہ اپنی عنایت کی قیمت وصول کر چکا تھا۔ اس کی ہوس کی پیاس بجھائے بغیر کسی اکسٹرا لڑکی کو کام ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور

تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ایک لڑکی نے انکار کر دیا تھا تو دادا نے رات کے اندھیرے میں اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا اور وہ بے چاری عمر بھر کے لیے منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

ان سب قصوں کو سن کر کندن کو دادا کی شکل سے گھن آنے لگی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ بغیر ایسے خوفناک آدمی کو دشمن بنائے اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ دور سڑک پر سے آتا دیکھتا تو راستہ کاٹ جاتا۔ مگر دادا اس پر خاص نظرِ عنایت رکھتا تھا۔ اسے شکایت تھی کہ کندن بھی اس کے رجسٹر پر اپنا نام کیوں نہیں لکھوالیتا اور جب بھی وہ ملتا وہ اس بات کی یاددہانی ضرور کرتا۔

"کیوں کندن بابو!" آج بھی اس نے آتے ہی پرانا قصہ چھیڑ دیا۔

"تم تو بڑے آدمی ہو، اکسٹرا کا کام کیوں کرنے لگے پر یاد رکھو۔ میں نے درجنوں کو ہیرو ہیروئن بنا دیا ہے درجنوں کو۔ اگر سال بھر میں تمھیں لیڈنگ رول نہ دلوادوں تو میرا نام بھی دادا گنجا نہیں۔" اور پھر اپنا منہ اتنے قریب لے جا کر کہتا کہ کندن کو تاڑی کے بھبکے آنے لگے۔ "لونڈیاں جو ملیں گی وہ الگ۔ تمھارے جیسے لونڈے کے پیچھے تو کتیوں کی طرح بھاگیں گی۔ کیوں کیا کہتے ہو؟"

کندن نے بات ٹالنے کی غرض سے گفتگو کو مزاحیہ رخ میں پھیرنے کی کوشش کی۔ "جاؤ بھی دادا۔ بس دیکھ رکھا ہے تمہاری اکسٹرا لڑکیوں کو۔ نہ جانے کہاں کا کوڑا کرکٹ اٹھالاتے ہو۔ ایک کی بھی تو ڈھنگ کی صورت شکل نہیں ہے۔"

اس قسم کے مذاق سے دادا بڑا خوش ہوتا تھا کیونکہ وہ ہر شخص سے اسی سطح پر بات چیت کرنے کا عادی تھا۔ فلم انڈسٹری میں اُسے اگر چڑ تھی تو ان لوگوں سے جو پارسا بنتے تھے یا شریف خاندانوں کی روایات کا رونا روتے تھے۔ پڑھے لکھے ایکٹروں اور اچھے خاندان کی ایکٹروں کا وہ ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا یا ان کو بدنام کرتا پھرتا۔ اس لیے کہ وہ اس کو منہ نہ لگاتے تھے اور ان کے سامنے اسے اپنی کمتری اور ذلت کا شدید احساس ہونے لگتا تھا۔ اس لیے اسے جب کبھی بھی موقعہ ملتا وہ پڑھے لکھے اکسٹرا لڑکوں کو مفت شراب پلا پلا کر اور آوارہ اکسٹرا لڑکیوں سے میل ملاقات کرا کے ان کو اپنی ٹولی میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ سروپ اور مرزا ابھی تک اس کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ تو نہیں ہوئے تھے مگر اس کی خوشامد ضرور شروع کر دی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد مکمل طور سے "راہ راست" پر آجائیں گے۔ اگر کوئی اب تک اس کے جال میں نہیں

پھنسا تھا تو وہ کندن تھا۔ اس لیے دادا اس تاک میں تھا کہ اس سر پھرے لونڈے کو رام کرنے کے لیے کون سی چال چلے۔ جیسے ہی کندن نے ایکسٹرا لڑکیوں کی بدصورتی کا طعنہ دیا وہ خوشی سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''لونڈے ہو کندن بابو۔ لونڈے۔ تم کیا جانو کام کی لونڈیا کیسی ہوتی ہے۔ عورت کی شکل سے کیا لینا۔ رات کے اندھیرے میں کالی گوری سب ایک جیسی دکھتی ہیں۔ اصل چیز تو کچھ اور ہی ہے، مسٹر''۔ یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ایک مکروہ نشان بنایا جس کو دیکھ کر کندن کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ دادا اس کے مذاق کو کہاں سے کہاں لے جائے گا۔

''اچھا خیر'' دادا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا آؤ تمھیں ایک تحفہ کا مال دکھاتا ہوں۔ تم بھی قائل نہ ہو جاؤ تو دادا گنجا نام نہیں، آؤ جی مرزا اور سروپ۔ تم بھی کیا کہو گے کہ دادا کی پہنچ کہاں تک ہے''

یہ کہہ کر وہ ان سب کو سڑک کی طرف والی کھڑکی تک لے گیا اور باہر اشارہ کیا جہاں اس کی موٹر کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کندن سمجھا تھا دادا گنجا کی مستقل کانی کھدری بھدی لڑکیوں میں سے کوئی ہوگی۔ سیاہ منہ پر پاؤڈر کی تہہ جمائے۔ نیلے ہونٹوں پر لال لپ اسٹک ملے۔ کانوں میں پیتل کے لمبے لمبے جھولتے ہوئے بندے، اور تنگ بلاؤز میں سے ابلتا ہوا سینہ مگر یہ تو کوئی اور ہی قسم کی لڑکی تھی۔ اول تو وہ بہت ہی کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ شاید سترہ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کے گیہواں چہرے پر میک اپ کا نام نہیں تھا۔ ململ کی سی سفید ساڑی جس کا پلو سر پر تھا۔ موٹر کا سہارا لیے نیچی نظریں کیے کھڑی تھی۔ کسی طرح سے فلمی ایکسٹرا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر کندن کو خیال ہوا شاید یہ معصومیت بھی ایک فریب ہو۔ ورنہ کسی شریف لڑکی کا دادا گنجا سے کیا تعلق؟

''کیوں کیا کہتے ہو؟ ہے مال بڑھیا؟''

''لونڈیا ہے زوردار'' مرزا نے تجربہ کار ''لڑکی باز'' کی حیثیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''شکل وصورت سے کافی سیدھی معلوم ہوتی ہے'' سروپ نے کہا۔ ''گھر سے بھاگ کر تو نہیں آئی ہے۔ کبھی اس کے گھر والوں کے ساتھ مقدمہ بازی میں نہ پھنس جاؤ، دادا۔''

دادا نے جواب میں ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ دادا کچی گولیاں نہیں کھیلا، مسٹر۔ اور اس لڑکی کا تو باپ خود میرے سپرد کر گیا ہے۔ نہ جانے کہاں سے نام سن کر پوچھتا پوچھتا آج ہی صبح پہنچ گیا میرے کمرے پر۔ کہنے لگا، جی میری لڑکی کو فلم کمپنی میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے اسے کہیں نوکر کروا دو، میں نے کہا دیکھو بھئی کوشش کروں گا۔ ویسے تمہاری لڑکی کی شکل صورت بھی معمولی ہی ہے۔ خیر ایکسٹرا میں چل جائے گی۔ آج بومبے ٹاکیز لیے جاتا ہوں ساتھ، قسمت اچھی ہوگی تو کام مل جائے گا۔ اس پر وہ بڈھا کہتا ہے تو میں اسے چھوڑے جاتا ہوں۔ ہاں ایک پانچ روپے پیشگی مل جائیں تو بڑی مہربانی ہو۔ سو تین روپے دے کر اُسے رخصت کیا تو جاتے جاتے کہتا ہے دادا۔ ذرا میری لڑکی کا خیال رکھنا۔ میں نے کہا فکر نہ کرو ایسا خیال رکھوں گا کہ یاد ہی تو کرو گے۔

مرزا ذرا زیادہ بے تکلف تھا۔ بولا۔ ''کیوں دادا تو پھر کچھ ریہرسل وغیرہ ہوا ابھی...؟''

دادا کے جواب میں اتنی گرمجوشی نہ تھی۔ ''ہاں... ہوا... مگر ابھی ذرا بدکتی ہے۔ خیر۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ میں نے اس کے باپ سے کہہ دیا ہے کہ رات کو دیر ہو جایا کرے گی تو میں خود پہنچا دیا کروں گا''

''بڑے استاد ہو تم بھی دادا۔ کیا دیکھو نہ پکا مال ہڑپ کر جاتے ہو'' مرزا نے کہا اور ان الفاظ میں اپنی ''مردانگی'' کی تعریف سن کر دادا کھل گیا۔ بڑے انکسار سے بولا۔ ''ہاں، بھیا، کچھ دال دلیا تو ہونا ہی چاہیے، نہیں تو ہم بے چارے تو بھوکے ہی مر جائیں'' اور پھر کھڑکی کی طرف دیکھ کر ''کیوں، کندن بابو، کیا سوچ رہے ہو؟... بولو کیا رائے ہے؟''

کندن کی نظریں ابھی تک کھڑکی کے باہر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''یہ لڑکی کسی شریف گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں اس کا باپ اسے دادا گنجا جیسے انسانی بھیڑیے کے سپرد کر گیا ہے۔ اب اس کی خیریت نہیں۔ یہ اسے خراب کیے بغیر چین نہ لے گا۔ اگر مجھ میں اتنی ہمت ہو، اگر میں فلمی ہیرو کی طرح دل گردے والا ہوں، تو اسی وقت نیچے جا کر اس لڑکی سے صاف کہہ دوں، جا اپنے گھر جا۔ کیوں غلاظت اور آوارگی کے اس سمندر میں ڈوبنے آئی ہے۔ دادا گنجا سے خبردار رہ۔ سینکڑوں کی عصمت دری کر چکا ہے۔ تجھے خراب کرنے میں یہ دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا۔ پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو میں اسے زبردستی اس کے گھر لے جاؤں گا۔ اس کے ماں باپ

سے مل کر ان سے کہوں گا کہ اپنی لڑکی کو تباہی سے بچائیں۔'' وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا مگر جب دادا گنجا نے اس سے سوال کیا تو اس نے کھڑکی کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔''ہاں۔ بُری نہیں ہے''

''اچھا اب چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہوگئی'' دادا گنجا نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی سونے کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس گھڑی پر اُسے بڑا ناز تھا۔ ایک بار اس نے نیپین سی روڈ پر ایک راجا کے محل میں رات بھر ننگا ناچنے کے لیے دس ایکسٹرا لڑکیوں کا انتظام کیا تھا۔ لڑکیوں کو سو روپے فی کس معاوضہ ملا تھا اور اسے پانچ سو روپے اور یہ سونے کی گھڑی انعام میں۔

دادا گنجا، سروپ اور مرزا کھٹ کھٹ کرتے زینہ اترتے ہوئے نیچے چلے گئے اور کندن پھر کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ لڑکی ابھی تک زمین پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ مگر جب دادا گنجا موٹر کے قریب پہنچا تو لڑکی نے نظر اٹھا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھا، صرف ایک لمحے کے لیے دو بڑی بڑی آنکھیں بے پردہ ہوئیں اور پھر لانبی پلکوں میں چھپ گئیں۔ پر نہ جانے کیوں کندن کو ان آنکھوں میں، سر اور گردن کے خم میں اس خاموشی میں، ایک عجیب اور عمیق مایوسی نظر آئی، جیسے ایک بکری لاچاری سے قصائی کی چھری کی طرف دیکھتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔

دادا گنجا کی موٹر روانہ ہوگئی۔ چند ایکسٹرا لڑکیاں، سینوں کو نمایاں کیے ہوئے۔ ٹوٹے چپل پہنے، کھوکھلی سی ہنسی ہنستی ہوئی رنجیت اسٹوڈیو سے نکلیں اور شری ساؤنڈ اسٹوڈیو کی طرف چلی گئیں۔ ایک پروڈیوسر کی شاندار کار زن سے گزر گئی۔ ایک لنگڑا کتا چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا بھاگا۔ ایک مکالمہ نویس ''منشی جی'' موٹے شیشوں کی عینک لگائے۔ کاغذوں کا پلندہ دبائے ایرانی ہوٹل میں چائے پی کر باہر نکلے اور پھر کچھ سوچ کر امر اسٹوڈیو کی طرف چل دیئے۔ ایک مشہور ہیروئن کی کھلی ہوئی سبز موٹر سینٹ کی خوشبو بکھیرتی گزر گئی۔ دادر مین روڈ پر جس کو ہندستان کا ہالی وڈ کہا جاتا ہے فلمی کارواں گزرتا رہا۔ مگر کندن کو اپنے کمرے میں دادا گنجا کی بو آتی رہی۔ جس میں تاڑی، ٹھرّا، پسینہ، پائیریا، داد کا پیلا پانی، عیاشی، گناہ اور نہ جانے کتنی جنسی بیماریاں سب کا سب تھا۔

تیسرا ریل

(جس میں ہیرو کو امید کے کئی جگمگاتے ہوئے چراغ نظر آتے ہیں)

ابھی دس نہیں بجے تھے کہ کندن، سیٹھ صاحب کے دفتر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ عام طور سے سیٹھ گیارہ بارہ سے پہلے کبھی نہیں آتا مگر کون جانتا ہے آج سویرے ہی آ جائے۔ آخر کمپنی کا مالک ٹھہرا۔ جب چاہے آئے جب چاہے جائے اور آج کندن اس بات پر تلا ہوا تھا کہ جب بھی آئے سب سے پہلے سیٹھ کی نظر اسی پر پڑے۔

اسٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں حسب معمول چہل پہل تھی، ڈائریکٹر ہنڈا کی شوٹنگ کا 'بورڈ' 9 بجے کا لگا تھا۔ مگر ان کی ہیروئن مس نازنین ابھی نہیں آئی تھیں اس لیے کام رکا ہوا تھا۔ املی کے پیڑ کے نیچے دو اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ایک اسسٹنٹ کیمرہ مین کھڑے چند ایکسٹرا لڑکیوں سے مذاق کر رہے تھے۔ دو کیمرہ قلی بھاری بھاری لائٹوں کو اسٹوڈیو نمبر ایک سے اٹھا کر اسٹوڈیو نمبر دو میں لے جا رہے تھے۔ چکنے اور سیاہ اور گٹھے ہوئے بدن کی گھاٹنیں لکڑی کے بھاری بھاری تختے اٹھائے ''آرٹ ڈپارٹمنٹ'' میں لے جا رہی تھیں۔ اور ایک سوکھے ہوئے جسم اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے ''منشی جی'' موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے ان مزدور عورتوں کی سڈول ٹانگوں اور ان کے کولھوں کے ابھار کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔

ساڑھے دس بجے ہی تھے کہ مس نازنین کی شاندار پیلی پیکارڈ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی۔ ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے لپک کر موٹر کا دروازہ کھولا۔ دوسرے نے مس نازنین کا میک اپ بکس سنبھالا اور خود ڈائرکٹر ہنڈا جب اپنی ہیروئن کا خیر مقدم کرنے آگے بڑھے تو ان کو مس نازنین کی والدہ نے اپنا نہایت بھاری پاندان تھمادیا۔ ہمیشہ کے معمول کی طرح سب سے پہلے موٹر سے مس نازنین کی نانی یعنی چنیا بائی اتریں، ان کے بعد مس نازنین خود اور عقب میں ان کی والدہ منی جان۔ اِس طرح یہ جلوس اسٹوڈیو کی طرف چلا لیکن موڑ پر غائب ہونے سے پہلے کندن نے سنا کہ چنیا بائی اپنے پوپلے، بن دانتوں کے منہ سے ڈائرکٹر ہنڈا کو نہایت ''روح افزا'' قسم کی گالیاں سنا رہی ہیں کیونکہ ''موئڑی کاٹے'' پبلسٹی منیجر نے کسی اشتہار میں مس نازنین کا نام

ہیرو یعنی کمل راج کے بعد لکھ دیا تھا!

تھوڑی دیر کے لیے اسٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں سناٹا چھایا رہا۔ مس نازنین کا ڈرائیور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا موٹر سے اترا اور ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ سیٹھ کے دفتر کے سامنے برآمدے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور دیر تک بجتی رہی۔ کندن کا ارادہ ہوا کہ پوچھے کس کا فون ہے مگر وہ جھجک کر رہ گیا کہ شاید سیٹھ جی کے لیے ہو اور اس جرأت پر اس کو ڈانٹ پڑے۔ آخرکار اندر کے دفتر سے ایک کلرک نکلا اور فون اٹھایا۔

''ہیلو... گریٹ آرٹ پکچرز... کون چاہیے؟... مس نازنین؟... وہ شوٹنگ میں ہے۔ ہم بلا نہیں سکتے... تمھارا نام؟... نام نہیں بتا سکتے؟... نمبر بولو تو ہم لکھ کر بھیج دے گا... نہ نام بتاتا ہے نہ نمبر تو ہم کیا کرے گا۔ جاؤ بھاڑ میں'' ۔ یہ کہا اور فون کو دھڑ سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ اور کندن سوچتا رہا یہ کس نے مس نازنین کو فون کیا تھا۔ شاید اس کا کوئی عاشق ہو اور اسی لیے نام بتانے سے انکار کر رہا ہو۔ کتنا خوش نصیب ہوگا وہ جس سے نازنین جیسی حسین لڑکی محبت کرتی ہو! ویسے تو کندن کا نوجوان اور ناتجربہ کار دل ہر ایک اسٹار کو دیکھ کر پھسل پڑتا تھا مگر نازنین کی وہ مدت سے پرستش کرتا تھا۔ گو یہ لڑکی طوائفوں کے خاندان سے تھی مگر اسے اسکول میں تعلیم دلائی گئی تھی اور اس کے بات چیت کرنے کا ڈھنگ بازاری بالکل نہ تھا۔ اسٹوڈیو میں ہر ایک سے وہ خوش خلقی سے پیش آتی تھی۔ (یہ اور بات ہے کہ ماں اور نانی کی پہرے داری میں کسی سے زیادہ بات کرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا تھا کہ کہیں کسی ایسے ویسے ٹٹ پونجیے نوجوان سے محبت اور شادی ہو جائے اور ان دونوں خرانٹوں کے ہاتھ سے سونے کے انڈے دینے والی مرغی نکل جائے) اور پھر اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک عجیب دلکش قسم کی ہلکی سی افسردگی تھی جس سے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

کندن بنچ پر بیٹھا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے سامنے سے نازنین کو آتے دیکھا۔ اب اس نے اسٹوڈیو کی پوشاک پہن لی تھی۔ گھگھرے چولی میں وہ کتنی خوب صورت نظر آتی تھی۔ رعب حسن کے مارے کندن نے نظر ہٹالی۔ مگر وہ سیدھی اسی کی طرف آئی۔

''اے۔ چھوکرا...'' نازنین کی نقرئی آواز اس سے مخاطب ہوئی۔ ''میرا فون تو نہیں آیا تھا؟''

''جی۔جی۔جی۔'' کندن اپنی خوش قسمتی سے دوچار ہوکر ایسا گڑبڑایا کہ ہکلانے لگا۔آیا۔ تو۔تھا...

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''جی۔جی۔میں نے تو کچھ نہیں کہا مگر وہ دفتر والوں نے منع کر دیا کہ نہیں بلا سکتے۔''

''گدھے کہیں کے'' اور کندن نے دیکھا کہ وہ غصے سے اپنا نچلا یاقوتی ہونٹ موتیوں جیسے دانتوں سے دبا رہی ہے۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر دھیرے سے بولی: ''اچھا دیکھو اب فون آئے تو تم خود اٹھا لینا اور میرے لیے ہو تو مجھے اسٹوڈیو میں اشارہ کر دینا۔ چلاّ نا مت سب کے سامنے سمجھے نا''

ابھی وہ یہ بات کر ہی رہی تھی کہ ایک بوڑھے گلے کے کھانسنے کی آواز آئی۔ یہ نازنین کی نانی تھی جو جھومتی جھامتی چلی آ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں کمزور تھیں اور اُسے سوائے قریب کی چیزوں کے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ نازنین نے کندن کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا اور غڑاپ سے سیٹھ جی کے کمرے میں۔ اس کمرے کا ایک دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا۔ عین اسٹوڈیو کے سامنے۔

پوپلی بڑھیا نے کندن کو اپنی دقیانوسی عینک کے شیشوں میں سے گھور کر دیکھا۔

''کیوں رے نازنین تو ادھر نہیں آئی؟''

''نہیں، بائی جی۔ وہ تو نہیں آئیں''

نا جانے کہاں مر گئی'' بڑبڑاتی ہوئی بڑھیا واپس چلی گئی اور کندن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بھی کتنا خوش قسمت تھا کہ مس نازنین نے اُسے اپنا ہم راز بنایا تھا۔ جان جائے پر اس بھید کو وہ کسی پر کبھی ظاہر نہ کرے گا!

ابھی وہ اس انتظار میں تھا کہ شاید نازنین کے لیے پھر فون آئے کہ ایک ٹیکسی آئی اور اس میں سے عجیب ہیئت کذائی کا ایک نوجوان ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا لیے اترا۔ گہرے رنگ کی پتلون، کھلے گلے کی قمیض، ننگے سر، موٹے موٹے گول شیشوں کی عینک، سر کے بال خشک بے ترتیب اور کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے۔ ٹیکسی والے کو ایک روپیہ دیا اور سات آنے واپس لے کر احتیاط سے جیب میں رکھے۔ ظاہر ہے کہ ٹیکسی کہیں قریب ہی سے لی تھی کہ میل بھر سے کم کا ہی کرایہ دینا پڑا۔ ٹیکسی واپس چلی گئی اور نووارد کندن کی طرف آیا۔

''کیوں بھئی سیٹھ صاحب ہیں اندر؟''

بمبئی کے کرخت ماحول میں اتنی شستہ زبان سن کر کندن متعجب ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نو وارد شمالی ہندستان کا رہنے والا ہے۔

''جی میں خود انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی تو نہیں آئے مگر آنے والے ہی ہیں۔ بیٹھیے''

نو وارد کندن کے برابر بیٹھ گیا اور بولا: ''تب تو خواہ مخواہ ہی ٹیکسی پر پیسے برباد کیے''

زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ کندن خوب جانتا تھا کہ اسٹوڈیو میں نوکری تلاش کرنے والے دور سے ریل یا ٹرام یا بس سے، یا پیدل آ کر دادر اسٹیشن یا خداداد سرکل سے ٹیکسی لے لیا کرتے ہیں تا کہ اسٹوڈیو والوں پر ذرا رعب پڑ جائے۔

''تو آپ بھی کام کے لیے آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا

''آیا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں... سیٹھ صاحب کا خط گیا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے بمبئی آ کر ملیے۔ سو میں چلا آ رہا ہوں''

کندن نے غور سے نو وارد کو دیکھا ''ہیرو'' قسم کی شکل ہرگز نہیں تھی اور نہ وضع قطع ''ایکٹرانہ'' تھی۔ اس نے سوچا ''شاید کوئی کیریکٹر ایکٹر ہو''

''آپ کو میں نے کسی فلم میں دیکھا نہیں ابھی تک، شاید ابھی آپ کی فلم نکلی نہیں...''

''میں تو آج پہلی بار کسی اسٹوڈیو کے دروازے میں داخل ہوا ہوں''

''تو آپ کسی پکچر میں رول کے لیے...''

''نہیں، نہیں، بھئی میں ایکٹر نہیں ہوں۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں''

''کون کون سی کہانیاں فلم ہوئی ہیں آپ کی؟''

''کوئی بھی نہیں، میری کہانیاں اب تک چھپتی رہی ہیں۔ فلمائی نہیں گئیں۔''

''آپ کا نام؟''

''میرا نام تو مادھو سنگھ ہے، مگر میں نرمل کے نام سے لکھتا ہوں''

نرمل؟ نرمل؟... نرمل!

تو یہی اردو اور ہندی کا مشہور مصنف نرمل تھا۔ جس کے افسانوں ناولوں اور ریڈیو ڈراموں

کی تمام ملک میں دھوم تھی، جس کے رومانی انداز بیان نے ہزاروں لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں اور ہزاروں لڑکیوں کی راتوں کی نیندیں اچاٹ کر دی تھیں۔ کندن خود کب سے نرمل کے مداحوں اور نادیدہ پرستاروں میں سے تھا۔

نرمل؟ مگر نرمل تو ایک باغی ادیب تھا۔ اپنی انقلابی تحریروں کی وجہ سے دو بار جیل جا چکا تھا۔ اپنے ناول ''جنت میں جہنم'' کی وجہ سے ریاست کشمیر میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی کئی کتابیں ضبط ہو چکی تھیں اور ان میں سے دو ایک کو تو قومی حکومت بھی خطرناک سمجھتی تھی کیونکہ ان میں مزدوروں اور کسانوں کو انقلاب کی ترغیب دلائی گئی تھی۔

نرمل؟ بھلا نرمل کا گریٹ آرٹ پکچرز کے اسٹوڈیو میں کیا کام؟ کندن کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ''ہائے جانی'' اور ''ظالم جوانی'' جیسی فلمیں بنانے والے سیٹھ جی، نرمل کی کسی کہانی کو بھی فلمانے کے لیے تیار ہو جائیں۔

''تو، نرمل جی، آپ فلم کے لیے کہانی لکھیں گے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لکھوں گا نہیں بلکہ لکھ چکا ہوں۔ وہی تو آج سیٹھ جی کو سنانے آیا ہوں۔''

''کیا نام ہے آپ کی کہانی کا؟''

''سرخ سویرا؟''

''سرخ سویرا؟ بڑا اچھا نام ہے!... ایک بات پوچھوں، نرمل جی اگر آپ بُرا نہ مانیں؟''

''ہاں، ہاں۔ پوچھو، بھئی''

''اس کہانی میں میرے جیسے لڑکے کے لیے کوئی کام نکل سکتا ہے؟''

نرمل نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں کندن کے چہرے پر گاڑ دیں اور کندن کو ایسا معلوم ہوا کہ باغی ادیب کی نظر اس کے دل اور دماغ کے کونے کونے کو ٹٹول رہی ہے۔ مڈل کے امتحان میں جب وہ شریک ہوا تھا تب بھی اُسے اتنی گھبراہٹ نہ ہوئی تھی۔

''کسی فلم میں کام کیا ہے؟'' نرمل نے دفعتاً سوال کیا۔

''جی... ابھی... تک... تو کسی نے چانس نہیں دیا''

کندن نے ڈرتے ڈرتے اقرار کیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ اگر کسی اور فلم میں کام نہیں کیا تو میری کہانی میں ضرور کام کر سکتے ہو... مجھے کاٹھ کے پتلے اور رنگین تتلیاں نہیں انسان چاہئیں انسان''

''تو پھر مجھے کون سا پارٹ مل جائے گا؟''

اور وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ کاش مجھے کسی نوکر کا نہیں بلکہ ہیرو کے دوست کا پارٹ مل جائے!

مگر نرمل نے جو جواب دیا اس کے لیے کندن بالکل تیار نہ تھا۔

''میرے خیال میں میری کہانی کے ہیرو کے لیے تمھارے جیسا ہی لڑکا چاہیے''

مسرت کی ایک سنسناہٹ بھری لہر کندن کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ کیا زندگی کے سارے خواب ایک ہی دن میں سچے ہو سکتے ہیں؟ پہلے مس نازنین کی میٹھی میٹھی باتیں اور اب نرمل جیسے مشہور ادیب کی یہ نوازش!

ابھی وہ اپنے نئے محسن اور کرم فرما کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پایا تھا کہ سیٹھ جی کی کار کا ہارن سنائی دیا اور وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی ساری امیدوں کا دارومدار سیٹھ جی کی نظر عنایت پر ہی تھا۔

سفید ریشمی کوٹ (جس میں سونے اور ہیرے کے بٹن لگے ہوئے تھے) سفید دھوتی اور سیاہ ٹوپی پہنے سیٹھ جی کار سے اترے برامدے کی سیڑھیوں پر پان کی پیک تھوکی اور بغیر کندن یا نرمل کی طرف دیکھے سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دفتر سے دو تین کلرک اور چپراسی، فائلیں، خطوط کے پلندے وغیرہ لیے دوڑے۔ سیٹھ جی کی ایک گونجتی ہوئی ڈکار سنائی دی اور اس کے بعد ٹیلیفون کی چرخی گھمانے کی گرگراہٹ، سیٹھ جی نے اپنے ذاتی ٹیلیفون پر اپنے اسٹاک بروکر سے سٹے کی بات چیت شروع کر دی۔ کوئی کوئی لفظ باہر بھی سنائی دیتا تھا''...تیجی منڈی...خریدو...بیچو...ایک سوانیس...نیویارک کاٹن...کور COVER کرو کور COVER ...''

نرمل نے کندن کی طرف دیکھا اور کندن نے نرمل کی طرف۔

باغی ادیب نے ''سرخ سویرا'' کا پلندا جو اپنے تھیلے سے آدھا باہر نکال لیا تھا پھر اندر ٹھونس دیا۔

ایک چپراسی باہر آیا تو کندن نے اُسے روک کر کہا۔ ''دیکھو یہ نرمل جی بڑے لیکھک ہیں۔ سیٹھ جی کے بلانے سے آئے ہیں، ان کا نام تو اندر پہنچاؤ''

چپراسی نے نرمل پر اوپر سے نیچے تک پریشاں بالوں سے لے کر پیوند لگے ہوئے چپلوں تک اس طرح حقارت سے نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو۔

''بہت دیکھے ہیں ایسے ایسے منشی!''

''کارڈ ہے تمھارے پاس؟''

''کارڈ تو نہیں...''

''ہنہ!... یہ لو، نام لکھو''

نرمل نے پرچی پر نام لکھ کر چپراسی کو دیا اور پھر بینچ پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے بعد چپراسی آیا اور اس بار کسی قدر کم بدتمیزی سے بولا۔

''بلاتے ہیں سیٹھ جی''

نرمل اندر گیا تو چپراسی نے کندن سے پوچھا:

''تم کو کیا چاہیے؟''

''میں تو اسٹوڈیو ہی کا آدمی ہوں، بھئی۔ لائٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔ رات سیٹھ جی نے سیٹ SET پر کہا تھا سویرے ہمیں آفس میں ملو۔''

''ہنہ!۔ لائٹ قلی!'' چپراسی نے اس طرح کہا جیسے کسی مکوڑے کو ایک بھاری جوتے تلے دبا کر مسل دیا جائے اور بیڑی سلگاتا ہوا ہوٹل کی طرف چل دیا۔

پر کندن نے اس کی پرواہ نہ کی بلکہ یہ سوچ کر مسکرایا۔ ''کل اسی چپراسی کو مجھے جھک کر سلام کرنا پڑے گا۔ اس بیوقوف کو نہیں معلوم کہ میں اس کمپنی کی اگلی فلم کا ہیرو ہوں۔ ہیرو!''

چوتھا ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کو چھوڑ کر ایک سنہری تتلی کی طرف بھاگتا ہے)

اندر کمرے میں سیٹھ جی نرمل سے سوال جواب کر رہے تھے۔

''ہاں تو تمھاری اسٹوری کا کیا نام ہے، منشی جی؟''

''دیکھیے میں منشی نہیں ہوں...''

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اپنے ہاں بڑا بڑا منشی کام کر چکا ہے۔ منشی کھنجر، منشی مستانہ، منشی پریمی، منشی پردیسی...... ہاں تو کیا نام ہے اسٹوری کا؟''

''سرخ سویرا''

''سرکھ سیرا؟''

''جی ہاں سرخ سویرا۔ مطلب ہے کہ آزادی اور انقلاب کی صبح نو......''

سیٹھ صاحب کچھ نہیں سمجھے۔ بات کاٹ کر بولے۔ ''نا۔ نا۔ یہ نہیں چلے گا۔ سرکھ سیرا یہ تو ریڈ سگنل جیسا نام ہے۔ کوئی سمجھے گا ہم نے اسٹنٹ پکچر بنایا ہے''

''سیٹھ صاحب، یہ دوسری قسم کا ریڈ سگنل ہے۔ یہ سرخی خون کی سرخی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کا خون... خونی شفق''

''خونی عاشق!'' سیٹھ صاحب چونک کر بولے۔ ''یہ فلم تو ہم دس برس ہوئے بنا چکا ہے۔ دیکھو، منشی جی...''

''میں نے آپ سے کہا نہیں، کہ میں منشی نہیں...''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ وہ منشی کھنجر بھی یہی بولتا تھا۔ ہاں تو تم نے نیو تھیٹر کا فلم ''ہمراہی'' دیکھا ہے۔ پہلے یہ فلم بنگالی میں اتارا تھا، نیا ہیرو، نیا ہیروئن، نہ گانا، نہ ڈانس۔ سب بولتا دو چار ویک بھی چلے تو بہت ہے۔ پر جانتے ہو کلکتے میں کتنا چلا سال بھر۔ پورے سال بھر۔ ابھی بوبے میں ہندستانی میں چلتا ہے، ہم بھی دیکھنے گیا۔ بالکل بنڈل ہے ہیرو ایک دم کالا کلوٹا دیہاتی دکھتا ہے۔ بالکل رومانٹک نہیں۔ ہیروئن گھوڑی جیسی دِکھتی ہے۔ اس سے تو اپنی شانتارن زیادہ سندر ہے۔ گانا اپنے مدھوک بابو جیسا ایک بھی نہیں۔ پھر بھی کیا رش لے رہا ہے۔ جب دیکھو، ہاؤس فل،... نا جانے پبلک کیوں اتنا تالی مارتا ہے، ہمارا ڈائرکٹر باسو بولتا ہے اس میں سیٹھ لوگوں اور پیسے والوں کو گالی دی ہے سو پبلک تالی مارتا ہے۔ سو اپنے کو بھی ایسی ہی اسٹوری مانگتا۔ ہم بھی سیٹھ ہے پر تم سیٹھ لوگوں کو جتنی چاہے گالی دو۔ ہاں دس گانے مانگتا اور پکچر کم سے کم سلور جوبلی ہٹ ہونا چاہیے''

سیٹھ صاحب کی تقریر سن کر بے چارہ افسانہ نگار لاجواب بلکہ مبہوت ہو چکا تھا۔ ڈرتے

ڈرتے بولا۔ ''دیکھیے۔ میں کہانی لکھتے وقت کسی کی نقل نہیں کرتا۔ ہمراہی، میں نے دیکھا ہے۔ اچھا خاصا فلم ہے مگر نفسیاتی لحاظ سے اس میں چند بنیادی کمزوریاں...''

''ہوگا۔ ہوگا'' سیٹھ صاحب نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی اسٹوری ہی لکھو۔ ہم سنتا تم سوشلسٹ لیکھک ہو۔ سیٹھ لوگوں کو ایک دم گالی دیتے ہو...''

''میں گالی نہیں دیتا ہوں، سیٹھ صاحب۔ میں سماج کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہوں...''

''اور دیکھو اتنا کٹھن ڈائیلاگ نہیں چلے گا۔ اپنے کو ایسا ڈائیلاگ چاہیے جو کشمیر سے لے کر مدراس تک سب ایک دم سمجھ جائیں''

''پہلے کہانی تو سن لیجیے، پھر ڈائیلاگ کی بات کیجیے گا''

سیٹھ صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا اور کھڑے ہوگئے، دیکھو، آج تو اپنے کو ٹائم نہیں ہے۔ جراشیٹر باجار جانا ہے۔ پھر کسی دن سنے گا، آج تم ڈائرکٹر باسو کو اسٹوری سناؤ۔ جیسا وہ بولے ویسا چینج کر کے پھر ہمیں سنانا۔'' بیسو۔ بیسو۔ تمی بیسو''۔ بیساختہ گجراتی بولتے ہوئے سیٹھ صاحب کمرے سے باہر نکل آئے۔

کندن جو اسی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا سیٹھ صاحب کی طرف لپکا۔

''سیٹھ جی۔ نمستے''

''نمستے، نمستے۔ کیا ہے؟''

''آپ نے بلایا تھا نا۔ رات سیٹ پر آپ بولے سویرے ہمیں ملو''

''اچھا اچھا۔ تم وہ لائٹ والا چھوکرا ہے۔ تم اچھا کام کرتا ہے...''

کندن کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

''وہ لائٹ قلی کا کام اچھا نہیں ہے۔ تم کو کوئی دوسرا اچھا کام دے گا''

نرمل کو ہیرو بننے کا خواب سچا ہوتا نظر آیا اور پھر ایک لمحے میں امیدوں کے اونچے سنہری محل مٹی میں مل گئے۔

''آج سے تم یہاں کام کرو۔ آفس کا ایک سپاہی ہے اِدھر، پر اپنے کو ایک اپنا پرائیوٹ چپراسی چاہیے...اور پھر جاتے جاتے ''ہاں، دیکھو۔ ڈائرکٹر باسو کو بولو وہ لیکھک نرمل جس کو ہم نے

بلایا تھا اِدھر بیٹھا ہے۔اس کی اسٹوری سن لیں۔'' یہ کہا اور موٹر میں بیٹھ، سیٹھ جی چل دیے۔

لائٹ قلی سے چپراسی!... تو یہ ہوئی اس کی ترقی!... پھر بھی ڈائرکٹر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کندن نے سوچا کم سے کم روز سیٹھ اور دوسرے ڈائرکٹروں کے سامنے آنے کا موقعہ تو ملے گا۔ شاید کسی دن کسی کی نظر پڑ جائے اور وہ اپنے فلم کے کسی رول کے لیے منتخب کر لے۔

ڈائرکٹر باسو آرام کرسی پر لیٹے ایک امریکن فلمی میگزین پڑھ رہے تھے۔ ان کو اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل آدمی سمجھا جاتا تھا۔ بی۔ اے میں پڑھتے تھے جب گھر سے بھاگ کر فلم لائن میں آئے تھے۔ امریکن اور انگریزی فلمیں باقاعدگی سے دیکھتے تھے اور ''ربیکا'' یا ''گون وِد دی وِنڈ'' جیسے ناول بھی پڑھ لیتے تھے۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے، ٹیگور یا شرت چندر چٹرجی کی ایک آدھ کتاب ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کی ادب شناسی کا سکہ سب پر بیٹھ جائے۔ ہمیشہ سلک کا کرتا اور ململ کی دھوتی اور اوپر ایک کشمیری شال میں ملبوس نظر آتے تھے تاکہ لمبے بالوں کے ساتھ اس لباس سے بھی فنکارانہ ماحول بنا رہے۔

نرمل نے سیٹھ صاحب کا پیغام ڈائرکٹر باسو کو پہنچا دیا اور پھر ایک پیالی چائے پینے کے لیے ہوٹل کی طرف چلا۔ ہوٹل کے سامنے ایک درخت کے نیچے گول چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر اکثر ایکسٹرا لڑکیاں بیٹھی رہتی تھیں۔ نرمل عام طور سے اِدھر سے کترا کر ہی نکل جاتا تھا کیونکہ اس نے سنا تھا کہ یہ لڑکیاں بڑی آوارہ اور بدمعاش ہوتی ہیں، فلموں میں کام ملنے کے عوض اپنا جسم فروخت کرتی پھرتی ہیں اور کتنے ہی جنسی امراض کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود ہیرو بننے اور شکنتلا یا نازنین جیسی ہیروئن سے عشق کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اسسٹنٹ کیمرہ مینوں اور اسسٹنٹ ڈائرکٹروں کی طرح ایکسٹرا لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر اپنی آئندہ ترقی کو کیوں خطرے میں ڈالنے لگا۔

آج ہوٹل میں بھیڑ اتنی تھی کہ بیٹھنے کو ایک کرسی بھی نہ تھی اور پھر سابق لائٹ قلی اور حال چپراسی نرمل کے لیے بھلا کون کرسی خالی کرتا۔ مجبور ہو کر وہ باہر نکل آیا اور سوچا چند منٹ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی جگہ خالی ہوگی تو پھر اندر چلا جائے گا۔ درخت کے نیچے حسب معمول

چند ایکسٹرا لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ نرمل نے جان بوجھ کر اُدھر پیٹھ کر لی اور سیٹھ جی کے دفتر کی چھت پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ پر اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی بہانے سے ایک بار اُدھر "نگاہ غلط انداز" ڈال لے شاید اتفاق سے کوئی اچھا چہرہ ہی نظر آ جائے۔ کان اس کے اُدھر ہی لگے رہے۔

دو لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں

"تو بوہے تا کیز میں کام نہیں چلا"؟... یہ آواز چنچل اور شوخ اور پنجابی تھی۔

"نہیں۔ اگلے ہفتے پھر بلایا ہے"... یہ آواز دھیمی اور مغموم تھی۔

"تعجب ہے کہ تم دادا گنجا کے ساتھ گئیں اور تمھارا کام نہ بنا"

"جب ان کو ضرورت ہی نہ ہو تو وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"یہ تو نہ کہو۔ جس لڑکی سے اس کا تعلق ہو جائے اس کے لیے جان لڑا دیتا ہے"

"میرا اس کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ یہ الفاظ بھی اس نامعلوم لڑکی کی زبان سے جھجکتے ہوئے نکلے اور نہ جانے کیوں نرمل کو اس آواز میں وہی معصومیت، وہی حیا سنائی دی جو سویرے اس لڑکی کے چہرے پر دکھائی دی تھی جو دادا گنجا کی موٹر کے پاس کھڑی تھی۔

چنچل اور شوخ ہنس کر بولی۔ "بہن ابھی نئی ہو۔ جب ہی ایسی باتیں کرتی ہو"

پھر تھوڑی دیر خاموشی!

"کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟"

"کون جانتا ہے۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور ڈائریکٹر صاحب کو ایکسٹرا لڑکیوں کا چناؤ کرنے کی فرصت نہیں ملتی"

"بھوک لگی ہے۔ بس صبح ایک پیالی چائے پی تھی"

"مجھے خود۔ پر پتہ نہیں پیسے بھی ہیں یا نہیں۔ یہاں تو ایک توس بھی دو آنے کا ملتا ہے"

پھر بٹوؤں سے پیسے نکالنے اور گننے کی آواز۔

"دس آنے ہیں، چار آنے واپسی کے لیے چاہئیں۔ چھ آنے میں کیا ملے گا۔" اور اس بار نرمل نے محسوس کیا کہ چنچل اور شوخ آواز اتنی چنچل اور شوخ نہ رہی تھی۔

''میرے پاس تو بس چھ آنے ہیں۔ ٹرام میں بھی گئی تو گھر پہنچنے کے لیے چھ پیسے چاہئیں''

''تو کوئی بات نہیں۔ ایک ایک آملیٹ کھا لیتے ہیں''... اور پھر آواز کا نشانہ نرمل کی طرف۔

''اے مسٹر!''

اب تو نرمل کو مڑ کر دیکھنا ہی پڑا۔ چنچل اور شوخ آواز والی، جس نے اُسے پکارا تھا، خاصی قبول صورت مگر کسی قدر چھوٹی آنکھوں والی نکلی۔ اس نے میک اپ، بالوں کے سنگھار، ساڑی باندھنے کے انداز اور گردن کے خم سے شانتارن سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ساتھ والی وہی لڑکی تھی، جسے نرمل نے صبح اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔ قریب سے وہ اور بھی بھلی نظر آئی اور باوجودیکہ نہ اس کے چہرے پر چینٹ پاؤڈر تھا، نہ کوئی زیور، ساڑی بھی معمولی سوتی گھر کی دھلی ہوئی، پھر بھی اس کا معصوم اور قدرتی حسن نہایت دلکش تھا۔

نرمل کو یاد آیا کہ اکثر لڑکیاں نوجوانوں کو ''پھانسنے'' کے نت نئے طریقے اختیار کرتی ہیں۔ اس لیے اُس نے کافی درشتی سے جواب دیا:

''کیوں کیا ہے؟''

نقلی شانتارن نے بناوٹی ناز و انداز سے منہ بنا کر کہا ''اجی سرکار اتنے بگڑتے کیوں ہیں۔ آپ سے بس اتنا پوچھنا ہے کہ اس ہوٹل میں آملیٹ کتنا کا ملتا ہے''

''میں کوئی ہوٹل کا چھوکرا ہوں؟'' نرمل نے اپنی سفید قمیض اور پتلون کو جتاتے ہوئے سختی سے کہا۔ اور پھر گڑبڑا کر بے ساختہ، بارہ آنے کا ملتا ہے'' اور اس پر مغموم حسن کے چہرے پر بھی ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

نرمل نے پھر منہ پھیر لیا۔ دونوں لڑکیوں میں آملیٹ کے اقتصادی مسئلے پر بات چیت شروع ہوگئی۔ طے یہ ہوا کہ دونوں مل کر ایک آملیٹ ہی منگا کر کھالیں اور کمی پوری کرنے کے لیے دونوں بس کے بجائے ٹرام میں گھر واپس جائیں۔ ہوٹل کے چھوکرے کو آرڈر دے دیا گیا۔

''کیوں بہن تمھارا نام کیا ہے؟ شوخ اور چنچل نے پوچھا

''اندرا۔ اور تمھارا؟''

''ماں باپ تو کمو کمو پکارتے تھے پر اب میں کویتا کماری کہلاتی ہوں''

''اندرا!'' ''اچھا شریفانہ نام ہے'' کندن نے سوچا ''اچھی بھلی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ملاقات بڑھائی جائے تو کیسا رہے؟ مگر اسٹوڈیو والے تو یہی کہیں گے کہ ایک اکسٹرا لڑکی کو پھانس...''

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سیٹھ کے کمرے کی طرف سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور کندن بے تحاشہ بھاگا۔ یہ ضرور نازنین کا فون ہوگا۔

مگر اس کا قیاس غلط نکلا۔ یہ تو مگن لال ڈریس والا کی دوکان سے پروڈکشن منیجر کے لیے پیغام آیا تھا کہ دس ناچنے والیوں کے گھگھرے سِل کر تیار ہو گئے ہیں مگر چولیاں کیسے سِل سکتی ہیں جب تک سب اکسٹرا لڑکیاں اپنا ناپ دینے خود نہ آئیں۔

کندن نے یہ پیغام پروڈکشن منیجر کو پہنچا دیا جو بیٹھا ہوا لڑکیوں کی تصویروں کے گڈے سے تاش کی طرح کھیل رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''لڑکیوں کو ناپ دینے کے لیے کہاں سے بھیج دوں جب ابھی تک اُن کا چناؤ ہی نہیں ہوا، آج کل ڈھنگ کی صورت وشکل کی لڑکی کہاں ملتی ہے، اور پھر ڈانس کے واسطے بدن بھی تو چاہیے۔ یہاں تو جسے دیکھو، سوکھا، چُسا ہوا آم یا موٹی پھوپس، کہہ دو اپنی مرضی سے جس ناپ کی چاہے بنا دیں۔ بعد میں ٹھیک کر والیں گے اور کچھ نہیں تو روئی بھر دیں گے''

کندن نے جاتے جاتے پروڈکشن منیجر کے کان میں یہ بات ڈال دی۔ ''اچھی صورت وشکل کی لڑکیاں چاہئیں تو دونوں آپ کے دفتر کے باہر ہی بیٹھی ہیں''

مگن لال ڈریس والا کو جواب دے کر فون بند ہی کیا تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔

دیکھو مس نازنین سے کہہ دو کہ ان کی سہیلی کملا نے انھیں شوٹنگ کے بعد چھ بجے چائے پر بلایا ہے۔ ''تاج محل ہوٹل میں، بھول نہ جائیں''

''بہت اچھا۔ میں ابھی کہہ دیتا ہوں''

''اور سنو۔ یہ بات ذرا ان سے علیحدگی میں کہنا۔ اُن کی ماں یا نانی کے سامنے نہیں''۔

اس سے پہلے کہ کندن سوال کر سکتا کہ مس نازنین کی سہیلی کملا چھپا کر دعوت کیوں کر رہی تھی، فون کٹ گیا اور وہ دل ہی دل میں اِس مسئلے پر غور کرتا ہوا اسٹوڈیو کی طرف گیا جہاں ڈائرکٹر

ہنڈا کے فلم ''تتلی'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

''ریہرسل!'' ڈائرکٹر رام پرشاد ہنڈا شمال مغربی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اس کی آواز میں پٹھانی قسم کا کرخت رعب داب تھا۔

نازنین کا کلوزاپ لیا جانے والا تھا۔ وہ درجنوں روشنیوں کے جھرمٹ میں کھڑی کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔ ''میں تمھارے پریم کے لیے دنیا کی ہر چیز بلیدان کر سکتی ہوں، منگو۔ دھن دولت۔ ماں باپ گھر بار۔''

اور نازنین کی نانی چنیا بائی دور کرسی پر بیٹھی پان چباتے ہوئے منشی پردیسی سے کہہ رہی تھیں (جو فلمی مکالمہ نویس بننے سے پہلے درزی کا کام کرتا تھا) ''واہ منشی جی۔ کیا ڈائیلاگ لکھو ہو۔ بس طبیعت پھڑک جاوے ہے سن کے''

''او کے فار ساؤنڈ''

''میک اَپ''

نازنین کا میک اَپ درست ہو رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ کندن اس سے کچھ کہنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اُس نے میک اَپ والے سے کہا ''ذرا ڈریسنگ روم سے میرا بیگ تو اٹھا لانا'' حالانکہ بیگ تو وہیں اسٹوڈیو میں اس کی ماں کے پاس تھا۔ جیسے ہی میک اپ والا ٹلا نازنین نے ہلکی آواز میں کندن سے پوچھا۔ ''کیوں کوئی فون آیا؟

''جی ہاں۔ آپ کی سہیلی کملا نے چھ بجے آپ کو چائے پر بلایا ہے۔ تاج محل ہوٹل میں۔ تاکید کی ہے کہ بھول نہ جائیں''

''چھ بجے!'' اور کندن نے نازنین کے چہرے پر کچھ ایسے آثار دیکھے جیسے وہ دل ہی دل میں کوئی حساب لگا رہی ہو یا شاید کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر وہ بولی۔ ''شاباش کسی اور سے مت ذکر کرنا''

ابھی کندن جواب میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ اس کی جان بھی چلی جائے تو مس نازنین کا کوئی راز اس کی زبان سے نہیں نکل سکتا کہ میک اپ والا واپس آ گیا۔ ''اجی وہاں تو آپ کا بیگ نہیں ملا......'' کندن واپس چلا آیا۔

سیٹھ صاحب کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو نرمل اپنی کہانی پڑھ رہا تھا اور ڈائرکٹر باسو سرپرستانا انداز میں "ہاں۔ ہوں۔ یس۔ ناٹ بیڈ" وغیرہ کہتے جا رہے تھے

نرمل ایک سین سنا رہا تھا۔

"کلو مفلس ہے مگر وہ بھیک نہیں مانگتا۔ وہ چوری بھی نہیں کرتا، وہ اپنا حق مانگتا ہے۔ مزدوروں کو جمع کر کے وہ کہتا ہے۔ 'بھائیو!

ہم اپنے خون پسینے سے...'"

وہ اتنا ہی سن پایا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی اور وہ اُدھر بھاگا۔ یہ وہی مس نازنین کی مردانہ آواز والی، 'سہیلی' کملا تھی۔ "کیوں مس نازنین سے کہہ دیا نا"۔

کندن نے اطمینان دلایا کہ پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ "کسی اور کے سامنے تو نہیں کہا؟" نہ جانے یہ مردانہ سہیلی نازنین کی دعوت اتنے خفیہ طریقے سے کیوں کر رہی تھی! خیر کندن کو اس سے کیا غرض۔ اُس نے پھر یقین دلایا "نہیں جی میں ایسا بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔ بالکل اکیلے میں کہا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں"

پھر وہ مردانہ آواز کملا کا جواب سن کر دنگ رہ گیا۔ "تو پھر جیو میری جان!" اور فون کا سلسلہ کٹ گیا۔

پروڈکشن منیجر کے کمرے سے ایک نرم سی پہچانی ہوئی سی آواز آئی۔ کندن نے اُدھر جھانکا تو دیکھا کہ وہی معصوم اور مغموم آنکھوں والی اندرا ہے وہ کہہ رہی تھی "آپ سوچ لیجیے۔ کام کرنے کو میں تیار ہوں۔ مگر مجھے تجربہ بالکل نہیں ہے، اور ناچنا تو مجھے ذرا بھی نہیں آتا..."

اور پروڈکشن منیجر کہہ رہا تھا۔ "آپ کیا بات کرتی ہیں، مس اندرا۔ آپ تو بہت جلد ہیروئن ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے اگلی ہی پکچر میں۔ صرف..." اور یہ کہہ کر وہ ٹھہرا، معنی خیز انداز سے اندرا کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "صرف ذرا محنت کی ضرورت ہوگی۔

محنت تو میں جتنی کہیے اُتنی کرنے کو تیار ہوں۔" وہ محنت کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بولی۔" چاہے دس بار ریہرسل کرا لیجیے۔ ڈائیلاگ تو میں چند منٹ میں یاد کر کے سنا سکتی ہوں...

پروڈکشن منیجر نے نہایت تھکی ہوئی آواز میں کہا "اچھا تو جاؤ۔ کل ملنا"۔ اور جب اندرا نمسکار

کر کے جانے لگی۔ ''ابھی بہت ناتجربہ کار ہو تم!''

اندرا باہر نکلی تو کندن سے تقریباً ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ شاید اُسے وہ آملیٹ والی بات اور کندن کی بوکھلاہٹ یاد آگئی اور وہ مسکرادی۔

کندن کو بات کرنے کی ہمت ہوئی۔ '' کہیے کنٹریکٹ ہوگیا آپ کا؟''

''نہیں ابھی کنٹریکٹ کی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر پروڈکشن منیجر صاحب نے امید بہت دلائی ہے۔ کہتے ہیں شاید اگلی پکچر میں مجھے ہیروئن کا کام مل جائے اور پہلی بار کندن نے اُن غمگین آنکھوں میں امید کی جھلک دیکھی اور اس کا جی نہ چاہا کہ یہ کہہ کر کہ پروڈکشن منیجر تو یہی بات تقریباً ہر روز کسی نہ کسی ایکسٹرا لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے اس سے کہا کرتا ہے۔ امید کی جھلک کو بھی ختم کردے۔ اس نے صرف اتنا کہا: ''بھگوان کرے ایسا ہی ہو''

اسٹوڈیو کی گھنٹی دیر تک بجی۔ کام ختم۔ چھٹی۔ اب نازنین نکلے گی شاید اس سے کچھ بات کرے۔ کندن ایکسٹرا لڑکی کو چھوڑ ہیروئن کی زبان سے دو لفظ سننے کی آرزو میں اسٹوڈیو کی طرف بھاگا۔ نازنین کی ماں اور نائی ڈائرکٹر ہنڈا کو گھیرے کھڑی تھیں اور ''مونڈی کاٹے'' پبلسٹی منیجر کی حجامت اب تک ہو رہی تھی۔ نازنین اپنا بیگ ہاتھ میں لٹکائے ڈریسنگ روم میں داخل ہوا ہی چاہتی تھی کہ کندن پہنچ گیا۔

''کوئی اور کام تو نہیں ہے آپ کو؟'' اُس نے ہکلا کر پوچھا۔ کاش اس وقت وہ کہے کہ آسمان کے تارے توڑ لاؤ! مگر خیر اگر وہ یہ بھی کہے کہ میرے جوتے پر سے گرد صاف کردو تو وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔

''تو بڑا سمجھ دار چھوکرا ہے، نازنین نے کہا۔ اور گو کندن اپنے آپ کو ''چھوکرا'' نہیں پورا آدمی سمجھتا تھا وہ اپنی یہ تعریف سن کر پھولا نہ سمایا۔ اب اسے یقین ہو چلا کہ نازنین اُسے اپنا دوست اور ہم راز سمجھتی ہے۔

مگر اگلے لمحے وہ آرزوؤں کے آسمان سے حقیقت کی زمین پر آ رہا دھماکے کے ساتھ بلکہ جھنکار کے ساتھ۔ اس چاندی کے روپے کی جھنکار کے ساتھ جو نازنین نے اس کی طرف ایسے پھینکے۔ جیسے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔

ایک کار آمد قلی کو معقول انعام دے کر وہ اندر چلی گئی اور کندن لاجواب اور گونگا ہو کر کئی منٹ تک زمین پر پڑے ہوئے اس چاندی کے روپے کو دیکھتا رہا جس پر بادشاہ کا چہرہ گویا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

پانچواں ریل

(جس میں ہیروئن ہیرو کو اپنے کاشانۂ عشرت میں بلاتی ہے)

اگلے دن کندن اسٹوڈیو پہنچا تو دو گرما گرم خبریں ملیں۔ نرمل کمار کی کہانی "سرخ سویرا" پانچ ہزار میں خرید لی گئی اور اب وہ ڈائرکٹر باسو کے ساتھ مل کر سینیریو SCENARIO اور مکالمہ لکھنے والا تھا۔ اب تو شاید سچ مچ کندن کو ہیرو بننے کا موقع مل جائے! مگر دوسری خبر اس سے کہیں زیادہ سنسنی خیز تھی۔

نازنین کی ماں نے سیٹھ جی کو فون کیا تھا۔ سیٹھ جی نے گھر میں واویلا مچایا تھا۔ سیٹھ جی کے ڈرائیور نے پروڈکشن منیجر کو خبر پہنچائی تھی۔ پروڈکشن منیجر نے ڈائریکٹر ہنڈا سے کہا تھا کہ آج اس وجہ سے شوٹنگ نہیں ہوگی۔ ڈائرکٹر ہنڈا نے اپنے دو اسسٹنٹ ڈائرکٹروں رام اور چوپڑا سے کہا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ چوپڑا نے میک اپ والے کو راز دار بنایا تھا۔ میک اپ والے نے ایک اکسٹرا لڑکی کو جس سے اُس کی آشنائی تھی اس لڑکی نے چار دوسری اکسٹرا لڑکیوں کے کانوں میں یہ بات گھس پُھسائی تھی۔ غرض چند ہی گھنٹے میں نہ صرف گریٹ آرٹ پکچرز بلکہ رنجیت، سپریم شری ساؤنڈ اور دادر کے ہر اسٹوڈیو میں یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ نازنین بھاگ گئی ہے۔

نازنین بھاگ گئی ہے!

نازنین بھاگ گئی ہے!!

مگر کس کے ساتھ؟ کسی کا بیان تھا کہ حیدر آباد کے کسی جاگیردار کے بیٹے کے ساتھ۔ کسی کا کہنا تھا، اپنے ڈرائیور کے ساتھ، کوئی ایک مشہور فلمی ہیرو کا نام لیتا تھا۔ کوئی ایک مقامی مسلم لیگ لیڈر کو ذمے دار ٹھہراتا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ تمام اسٹوڈیو میں کھلبلی مچی ہوئی تھی گو دبی ہوئی آواز میں۔

مردانہ آواز والی سہیلی کملا۔ تاج محل ہوٹل۔ شام کے چھ بجے، اُف! اس نے اپنے ہاتھ سے پیر پر کلہاڑی ماری تھی اور کندن کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے ساتھ دغا کی گئی ہو۔ اس کے جذبات کو مٹی... نہیں نہیں کیچڑ... میں مسل دیا گیا ہو۔ جیسے ... جیسے ہیروئن ہیرو کو چھوڑ کر بدمعاش ویلین کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ اُف بے وفا دنیا! اُف دغا باز عورت!!... وغیرہ وغیرہ تمام فلمی مکالمے اس کے دماغ میں آتے رہے۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد اس نے سوچا ممکن ہے اس کے رومانی فلم کی ہیروئن نازنین نہ ہو کوئی اور ہو اور نازنین صرف ''سائڈ ہیروئن'' یا ممکن ہے بس اکسٹرا ہی ہو۔ تو پھر اس کی ہیروئن کون ہے؟

''میں نے کہا نمستے کندن جی''

یہ اندرا تھی۔ وہی خاموش اور حیادار آنکھوں والی اندرا۔ نہیں نہیں یہ گھر کی دھلی ہوئی سوتی ساڑی پہننے والی اکسٹرا لڑکی کندن کمار (ہونے والے فلم اسٹار) کی ہیروئن کیسے ہو سکتی ہے؟ اس نے جواب میں سوکھا سا ''نمستے جی نمستے'' کہہ کر ٹالنا چاہا۔

''کہیے آج بھی پروڈکشن منیجر صاحب کے درشن ہو سکیں گے یا نہیں؟'' لو یہ تو پیچھے ہی پڑ گئی۔ یہی تو ان اکسٹرا لڑکیوں کی حرکتیں ہیں، جن سے وہ اپنا شکار پھانستی ہیں۔

''آج تمھیں اسٹوڈیو میں کسی سے ملنے کا موقع نہ ملے گا۔ سب پریشان ہیں''

''کیوں کیا ہوا، کندن جی؟''

کندن جی! کندن جی! کمبخت اس بے چارے کے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی! مگر اس کی آواز میں اتنی ملائمیت، اتنی التجا، اتنی معصومیت تھی کہ کندن کسی درشت جملے سے گفتگو کے سلسلے کو نہ کاٹ سکا۔

کسی سے کہیے گا نہیں۔ معاملہ بڑا پرائیویٹ ہے...'' اور یہ کہہ کر نازنین کے بھاگ جانے کا واقعہ سنا دیا۔

''اتنی بڑی اور مشہور ایکٹرس بھاگ گئی اور کوئی نہیں جانتا کس کے ساتھ؟ کتنے تعجب کی بات ہے۔''

اب کندن کو اپنی اہمیت جتانے کا موقع ہاتھ آیا۔'' کوئی نہیں جانتا سوائے ایک آدمی کے۔

''وہ کون؟''

''وہ میں''

اور پھر رازدارانہ انداز میں اس نے ٹیلی فون کا واقعہ بھی سناڈالا، مردانہ آواز والی سہیلی مس کملا۔ تاج محل ہوٹل میں چائے کی دعوت وغیرہ اور یہ سن کر اندرا، مغموم اور عمیق آنکھوں والی اندرا، ہنس دی، کھلکھلا کر جیسے نازنین کا بھاگ جانا ایک ٹریجیڈی نہیں بلکہ کامیڈی ہو۔

''سب پریشان ہیں اور تم ہنس رہی ہو؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''معاف کرنا کندن جی۔ میں مس نازنین کی ماں اور نانی کا خیال کر کے ہنس رہی تھی۔ کتنی محنت سے انھوں نے اس سونا بنانے کی مشین کو تیار کیا تھا اور وہ مشین ایک آدمی کے ساتھ بھاگ گئی''

اور پوتلی چنیا بائی کا خیال کر کے کندن بھی ہنس پڑا۔ ماں اور نانی دونوں کی بری حالت ہوگی۔ نازنین بھاگ گئی تو ان کھوسٹوں کو کون پوچھے گا۔ فاقوں کی نوبت آجائے گی۔ کندن کو ان دونوں زہریلی شہد کی مکھیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ نازنین کی اس نازیبا حرکت کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا رہا۔ ''پھر بھی اسے ماں، نانی، اسٹوڈیو، پکچر سب کو اس طرح چھوڑ کر نہ بھاگنا چاہیے تھا''

کندن جی''۔ اندرا بولی اور پہلی بار اس کی معصوم اور میٹھی آواز میں زہر کی ہلکی سی تلخی تھی۔

''عورت کی زندگی میں ماں اور نانی، اسٹوڈیو اور پکچر سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ محبت''

فون کی گھنٹی بجی اور وہ ادھر بھاگا۔

''گریٹ آرٹ پکچرز۔ آپ کو کون چاہیے؟''

وہ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح میکانیکی طریقے سے جواب دیتا رہا مگر اس کے دماغ میں اندرا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''سیٹھ صاحب اسٹوڈیو میں نہیں ہیں۔ گھر فون کیجیے''

''کیا کہا؟ نمبر؟... مگر نمبر نہیں دیا جاسکتا۔ پرائیویٹ ہے''۔

''آپ فلمی ہندستان کے ایڈیٹر نہیں اگر لاٹ صاحب بھی ہوں تو سیٹھ صاحب کا پرائیویٹ

نمبر نہیں دے سکتے''

''ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے کہ مس نازنین بھاگ گئی ہیں'' فون کی پھر گھنٹی بجی۔

''نہیں مس نازنین شوٹنگ کو آج نہیں آئی ہیں''

''جی نہیں ان کے گھر کا نمبر بھی نہیں دے سکتا۔ بہت افسوس ہے اور کوئی بات پوچھئے''

''ان کی ماں کا نام؟ نہیں معلوم۔ سب انھیں نازنین کی اماں کہتے ہیں۔ نانی کا نام؟ چنیا جان۔ جس پکچر میں کام کر رہی ہیں اس کا نام ہے 'تتلی'...... مگر سنیے۔ عورت کو زندگی میں ماں اور نانی، اسٹوڈیو اور پکچر سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے! وہ کیا ہوتی ہے؟۔ یہ آپ خود سوچیے''

فون کا چونگا اٹھا کر الگ رکھ دیا تا کہ گھنٹی نہ بج سکے۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام بمبئی کے اخباروں کے ایڈیٹروں کو اس وقت صرف مس نازنین کی خیریت کی فکر پڑی ہوئی تھی۔

''آپ تو فلسفی معلوم ہوتی ہیں'' کندن نے پھر اندرا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''زندگی سب کچھ بنا دیتی ہے''

اب تو کندن کی اس عجیب وغریب، معصوم شکل اور فلسفیانہ دماغ والی ایکسٹرا لڑکی میں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا یہ پہلی لڑکی تھی جس نے اس سے سیدھے منہ بات کی تھی۔ پچھلی شام کا خیال کر کے اس کے کان لال ہو گئے۔ ''چھوکرا!'' کیا نازنین اسے کسی اور لفظ سے مخاطب نہ کر سکتی تھی؟ خیر لعنت بھیجو نازنین پر۔ اگر جارجیٹ اور بروکیڈ نہیں میسر تو سوتی ساڑی ہی پر کیوں نہ اکتفا کی جائے۔ خصوصاً جب وہ اتنی اچھی دھلی ہوئی ہو!

''سنئے ایک بات کہوں اگر آپ بُرا نہ مانیں''

''کہیے''

''آج اسٹوڈیو میں تو کوئی آنے والا نہیں ہے۔ سب شکاری کتوں کی طرح بھاگے پھر رہے ہیں''

''ٹھیک ہے۔ مگر اس میں میرے برا ماننے کی کیا بات ہے''

''نہیں نہیں۔ وہ بات تو میں نے ابھی کہی ہی نہیں۔ میرا کہنا ہے کہ آج یہاں کام وام تو کچھ ہوگا ہی نہیں اس لیے ہم... میرا مطلب ہے آپ میرے ساتھ سینما چلیں گی؟''

''چلی چلوں گی۔مگر ایک شرط پر''

''وہ کیا؟''

''آپ مجھے میرے گھر پر چھوڑ کر آئیں گے''

''بڑی خوشی سے''

اس فلمی SITUAUTION کا کندن نے کتنی مدت سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ ہیرو ہیروئن کو دعوت دیتا ہے۔ وہ منظور کر لیتی ہے۔ وہ دونوں تاج جا کر دیکھتے ہیں۔ وہ کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرتے ہیں۔ ہوا سے ہیروئن کے بال اڑ رہے ہیں اور اس کے گورے بیضوی چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوئے ہیں۔ اُس کی ریشمی ساڑی کا آنچل، ہوا میں ایک انقلابی پرچم کی طرح اڑ رہا ہے۔ ہیرو اپنی صبا رفتار موٹر میں بٹھا کر ہیروئن کو جوہو لے جاتا ہے۔ ناریل کے اونچے اونچے درخت چاندنی رات میں ستاروں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ فضا میں ایک رومانی نشہ۔ میں اور تو۔ تو اور میں.... وغیرہ وغیرہ۔

دفعتاً دماغ کی فلم گویا تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اور ٹٹول کر حساب لگایا کہ اس کے پاس صرف دو روپے تھے اس میں تو سنیما بھی نو آنے والے ٹکٹوں میں دیکھنا پڑے گا۔ مگر خیر کوئی پرواہ نہیں۔ ہیرو غریب ہے۔ پھر بھی ہیروئن کو ایک بڑے ریستوران میں لے جاتا ہے۔ ہیروئن کو معلوم ہے کہ اس کے پاس دام نہیں ہیں۔ اس لیے بیرے کے بل لانے سے پہلے وہ اپنے پلاسٹک کے بیگ سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر ہیرو کی جیب میں چپکے سے ڈال دیتی ہے۔.... ....

امیر ہیرو غریب ہیروئن!

غریب ہیرو امیر ہیروئن!

مگر یہاں تو وہ دونوں غریب تھے۔ یہ SITUATION فلمی ڈھرے پر نہ چل سکے گی۔

''آیئے تو پہلے کہیں چائے پی لیں''

ایرانی کی دکان۔ کنارے ٹوٹی ہوئی پیالیاں۔ ''گورنمنٹ کے دودھ'' یعنی پاوڈر کی چائے۔ چاروں طرف میلے میلے کپڑے، میلے میلے چہرے اور سب ان دونوں کو نہایت غیر

مہذب طریقے سے گھورتے ہوئے۔

''آپ کو چنے پسند ہیں؟''

''جی ہاں۔ کیک پیسٹری ہیچ ہیں، خستہ بھنے ہوئے چنوں کے سامنے''

''ایک آنے کے چنے دینا، بھائی۔ ذرا گرما گرم''

دادر سے لیمنگٹن روڈ کیسے جایا جائے؟...

''کہیے بس سے چلیں یا ریل سے یا ٹرام سے؟''

''ٹرام ہی سے چلیے۔ ابھی تو سنیما شروع ہونے میں بہت وقت ہے''

دو منزلہ ٹرام کی چھت پر آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے۔ تمام شہر پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔ سنیما سے زیادہ مزیدار تماشہ اور کوئی دلچسپ ہستی ساتھ ہو تو چنے چبانا بھی ایک رومانی فعل ہو جاتا ہے۔

ہنستے، باتیں کرتے (نہایت غیر فلمی اور غیر رومانی قسم کی باتیں مثلاً یہ کہ ہمارے کرنال میں تو ایک پیسے میں اس سے ڈگنے چنے ملتے تھے یا یہ کہ راشن کی دوکان سے چاول اور گیہوں کس بھاؤ ملتے ہیں!) وہ لیمنگٹن روڈ پر پہنچے۔

''کون سا فلم دیکھیں؟''

''کوئی سا بھی۔ مجھے فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے''

پھر بھی آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں

''پیٹ جو پالنا ہوا''

''آپ تو فلسفی معلوم ہوتی ہیں''

''یہ آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں''

خیر چلیے۔ کلپنا دیکھیں

''چلیے۔ میں نے اودے شنکر کی بہت تعریف سنی ہے''

پانچ آنے کے ٹکٹ ختم، دس آنے کے ٹکٹ ختم۔ سوا روپے کے ٹکٹ ختم۔ صرف ڈھائی روپے والے ٹکٹ مل سکتے تھے۔

بلیک مارکٹ! دس آنے کا ٹکٹ ایک روپے میں! اور کندن کی جیب میں اب صرف ایک

روپیہ آٹھ آنے۔

''چھوڑیے۔ پھر کسی دن دیکھ لیں گے''

''مالا بار ہل ہینگنگ گارڈن دیکھنے چلتی ہیں آپ؟ سیر ہی ہو جائے گی اس نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔

''چلیے۔ بجائے بند سنیما میں دھوئیں اور زہریلے سانسوں کے سمندر کی تازہ ہوا کھائیں''

کتنی سمجھ دار تھی یہ لڑکی! کوئی دوسری ہوتی تو سنیما نہ دیکھنے پر ناک بھوں چڑھاتی اور نہ جانے کتنے نخرے کرتی۔

رج روڈ کے گھنے سائے دار درختوں کی چھاؤں میں پیدل چلتے ہوئے وہ ہینگنگ گارڈن پہنچ گئے۔ مغربی کنارے پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا منظر دیکھا۔ سماں اس قدر دلفریب تھا کہ کئی منٹ تک دونوں چپ چاپ کھڑے سمندر کی جانب دیکھتے رہے اور کندن کو معلوم ہوا کہ کبھی کبھی خاموشی بھی بامعنی اور شیریں ہوتی ہے۔

واپسی پر اندھیرا ہو گیا اور سڑک کی روشنیاں چمک اٹھیں۔

''اب آپ کو مجھے گھر چھوڑ کر آنا ہوگا''

''کہاں رہتی ہیں آپ؟''

بوری بندر کے قریب

کندن نے سوچا وہ تو بڑھیا علاقہ ہے۔ شاید کسی اچھے فلیٹ میں رہتی ہوگی اور اس کے تحت الشعور نے ایک اوباش کی طرح کھنکھار کر اور آنکھ مار کر کہا: ''شکار پھنس گیا''

بھلا اور کیوں ایک کنواری لڑکی ایک نوجوان مرد کو رات کے وقت اپنے کاشانۂ عشرت میں آنے کی دعوت دینے لگی؟ ''کاشانۂ عشرت'' نہ جانے کسی شاعر کی نظم میں اس نے یہ جملہ پڑھا تھا۔ کاشانۂ عشرت! ریشمی گلابی لیمپ شیڈ، دھیمی دھیمی روشنی، فرش پر ایک نرم قیمتی قالین، دیوار پر چند خوب صورت عورتوں کی روغنی تصویریں، کونے میں ایک بڑا پلنگ، سفید چادریں، سفید تکیے، ریشمی مسہری، نہ جانے کتنے ناولوں، افسانوں اور نظموں کو پڑھ کر اور کتنے فلموں کو دیکھ کر اس کے دماغ نے یہ کاشانۂ عشرت سجایا تھا!

ہاں تو بھلا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک کنواری لڑکی ایک نوجوان مرد کو رات کے وقت اپنے کاشانۂ عشرت میں آنے کی دعوت دے؟

کندن کی مردانگی نے اُسے فتح کی مبارکباد پیش کی۔ کندن نے اپنے گالوں کو تمتمایا ہوا پایا۔ اپنے تمام بدن میں ایک سنسنی سی محسوس کی۔ جس گھڑی کا اسے کئی برس سے انتظار تھا، آرزو تھی، وہ آن پہنچی تھی۔ مگر مسرت کے ساتھ ایک ہلکی سی اُداسی بھی، جیسے ایک طویل سفر ختم ہونے پر منزل اتنی خوش آئند نہ ثابت ہو جیسی امید تھی۔!

چھٹا ریل

(جس میں ہیروئن ہیرو کو گو کی چائے پلاتی ہے)

پوری بندر!

ٹرام سے اترے تو ان کے سامنے ایک نہ دو چھ سات راستے تھے۔ ایک تو بڑی سڑک جو ایک طرف سیدھی ریگل سنیما، اپالو بندر اور تاج محل ہوٹل کی طرف جارہی تھی اور دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا کے دفتر کے سامنے سے ہوتی ہوئی کرافورڈ مارکیٹ۔ ایک سڑک دھوبی تلاؤ جاتی تھی مگر اس راستے سے تو وہ ابھی آئے ہی تھے۔ ایک اور کیپٹل سنیما کے برابر سے خالص ولایتی بمبئی جم خانہ کو اور دوسری وکٹوریا ٹرمنس اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی سینٹ جارج ہسپتال کو۔ مگر جس راستے پر اندرا اسے ساتھ لے کر چلی وہ کچھ اور ہی تھا۔

جنرل پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرتے ہوئے فریز ررروڈ۔ جہاں مشتبہ قسم کے ہوٹل، پنجابی نانبائیوں کی دکانیں اور شرابی ملاح پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں بندرگاہ میں آئے ہوئے جہازوں کا انسانی کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

''تم اس سڑک پر رہتی ہو؟''

''سڑک پر نہیں اس اگلی گلی میں!''

اور کسی نے جیسے کندن کے ''کاشانۂ عشرت'' کو متزلزل کر ڈالا ہو۔ گلی میں صرف ایک زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اندھیری اونچی عمارتیں شرابیوں کی طرح ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔

مچھلی، تیل، ڈالڈا کے بگھار، بیئر، تاڑی، فنائل اور نہ جانے کتنی غیر معلوم اور مکروہ چیزوں کی ملی جلی بسائند جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کتنے ہی چوہے چھچھوندروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک کالی بلی اپنی سبز آنکھیں چمکاتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ ایک مریل خارش زدہ کتے میں الجھ کر کندن تقریباً گر پڑا۔

تو یہاں رہتی تھی اندرا! کندن کے رومانی خوابوں کی تعبیر کتنی خوفناک نکلی۔

ایک مکان کے سامنے ٹھہرا کر اندرا نے کہا۔ ''یہاں رہتے ہیں ہم۔ تیسرے مالے پر۔

کندن نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ''اچھا تو میں چلا۔ نمستے۔

''نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ اتنی دور تکلیف کر کے آئے ہیں۔ میری ماتا جی کیا کہیں گی کہ ایک پیالی چائے کو بھی نہیں پوچھا''

زینے پر گھپ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہر منزل پر گیلری میں لوگ سوئے ہوئے۔ اندرا کو اس زینے پر چڑھنے کی عادت تھی، وہ کٹہرے کے سہارے چڑھتی چلی گئی۔ مگر کندن کو بڑی مشکل پڑی۔ لکڑی کی سیڑھیاں برسوں کے استعمال سے گھس چکی تھیں۔ ایک جگہ پاؤں اوچھا پڑا اور وہ گرتے گرتے بچا۔

''لائیے اپنا ہاتھ، نہیں تو آپ گر پڑیں گے''

اور کندن کو محسوس ہوا کہ اندھیرے، بوسیدہ، غلیظ مکان میں بھی دو ہاتھوں کے ملنے سے ایک نرم رو بدن میں کوند جاتی ہے۔ کتنا نرم اور معصوم تھا وہ ہاتھ۔ کتنا بھروسہ تھا اس میں۔ دوستی، رفاقت، پیار... مگر وہ ''کاشانۂ عشرت'' والا پیار نہیں!۔

جلد ہی وہ تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اندرا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی۔ آ گئی اندو؟'' اور دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں ایک مریل بلب کی روشنی دھوئیں کی وجہ سے اور بھی مدھم ہوگئی تھی۔ یہ کمرہ ہی سارا گھر تھا۔ ایک کونے میں بچھونے کا ڈھیر تھا، دوسرے میں چولھا تھا جہاں سے دھواں اٹھ کر سارے کمرے میں پھیل رہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، ایک ٹین کا صندوق، الگنی پر دو بوسیدہ ساڑیاں دھو کر سوکھنے کے لیے لٹکائی ہوئی تھیں۔ یہ تھا اندرا کا ''کاشانۂ عشرت'' جہاں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔

''کندن جی! یہ ہیں میری ماتا جی۔ اور ماں! یہ ہیں کندن بابو۔ بس سارے اسٹوڈیو میں یہی ایک شریف آدمی ہیں۔ بڑی کرپا کر کے مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے ہیں''

''نمستے''

''جیتے رہو بیٹا''

دلی یا آگرے کی آواز! کندن نے غور سے اندرا کی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس کی تمام زندگی کی کہانی جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ غربت، محنت، مشقت، دکھ، بیماری، دھوئیں سے بھری ہوئی کوٹھری ایک ظالم، شرابی شوہر۔ جوان بیٹی کی شادی نہ کر سکنے کا غم، فاقے، ان جھریوں میں کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔ اس کا چہرہ ایک کھنڈر کی مانند تھا۔ گری ہوئی چھت، ٹوٹی ہوئی دیواریں، ملبے کا ڈھیر۔ پھر بھی کندن کو اس میں ایک جانی بوجھی جھلک نظر آئی۔ آنکھوں میں وہی معصومیت، وہی بھولا پن، وہی متانت جو اندرا کی آنکھوں میں تھی اور جسے عمر بھر کی مصیبتیں اور مشقتیں بھی فنا نہ کر سکی تھیں۔

اندرا کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر کندن نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ دادا گنجا کی باتیں سن کر اس کے بارے میں کچھ اچھا خیال نہ قائم ہوا تھا۔

ایک کونے میں چند خالی بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور تاڑی کی کھٹی کھٹی بو آ رہی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو تین روپے پیشگی کے عوض دادا گنجا کے ہاتھ بیچ آیا تھا۔

اندرا نے بغیر پوچھے چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔ اس کی ماں نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے کہا۔ ''گڑ کی چائے پینا کیا آپ پسند کریں گے؟''

کندن جو اس گھرانے کی بابت سوچ رہا تھا چونک پڑا۔ ''جی کیا کہا گڑ کی چائے؟ ہاں ہاں کیوں نہ پیوں گا۔ بازار ہی میں کون سی اصلی شکر کی چائے ملتی ہے۔ اور پھر پاؤڈر کا دودھ۔ دور سے بو آتی ہے''

راشن کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر اندرا کی ماں نے اپنے وطن میرٹھ کا ذکر شروع کر دیا۔ بے تکلفی سے۔ جیسے کسی گھر والے سے بات کرتے ہیں۔ وہ لوگ ذات کے کائستھ تھے۔ کندن نے نہ جانے کیوں زور دے کر کہا 'میں بھی کائستھ ہی ہوں' اندرا کا باپ چھاؤنی میں

دکان کرتا تھا۔ وہاں فوجیوں کی دیکھا دیکھی شراب کی لت لگ گئی۔ ساری پونجی بوتلوں کی نذر ہوگئی۔ جنگ کے زمانے میں ایک جہاز پر نوکری کر لی۔ وہاں شراب کی عادت اور بھی پکی ہوگئی۔ کام رسد خریدنے کا تھا۔ سرکاری مال کی چوری کے جرم میں نکالا گیا۔ اب چھ مہینے سے بے کار تھا۔

اور کندن نے سوچا۔ اِن چھ مہینوں میں اندرا کی ماں کے چہرے پر کتنی جھریاں پڑی ہوں گی۔ گھر کی کون کون سی چیزیں بکی ہوں گی کہ نوبت بیٹی تک آ گئی تھی۔

چائے تیار کر کے اندرا کندن کے لیے بے پرچ کی پیالی میں لائی۔ خود اس نے ایک کنڈا ٹوٹی پیالی میں پی اور ماں کو کٹورے میں دی۔ چائے اچھی تھی۔ گرم اور میٹھی۔ پی کر کندن اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا اب میں جاتا ہوں''

''جیتے رہو بیٹا! تم سے مل کر بڑا اطمینان ہوگیا۔ ذرا اندرا کا خیال رکھنا۔ زمانہ برا ہے''۔ کاش کندن اسے بتا سکتا کہ زمانہ کتنا برا تھا! اسے یہ خیال کر کے شرم آ گئی کہ وہ خود جسے اتنا شریف سمجھا جا رہا تھا کس قسم کے ارادوں اور امیدوں سے وہاں آیا تھا۔

''ٹھہریئے میں آپ کو روشنی دکھاتی ہوں۔ نہیں تو آپ پھر گر پڑیں گے'' یہ کہہ کر اندرا نے ایک ٹین کا چراغ جلایا اور لے کر باہر آئی۔

''نمستے ماتا جی!'' نہ جانے اس کی زبان سے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ شاید اس کے دل کی کسی تہہ میں اُسے اپنی ماں یاد آئی تھی جسے وہ کرنال میں چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔

چراغ کی روشنی میں زینے پر اترتے ہوئے اس نے اندرا سے کہا ''چائے کا شکریہ''

''شرمندہ کرتے ہیں آپ؟''

کندن نے نیچے سے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ چراغ ہاتھ میں لیے اندرا کٹہرے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ جھلملاتی ہوئی لو کی پیلی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو اس وقت پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور معصوم نظر آتا تھا اور اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس میں وعدہ، شکریہ، رحم، دوستی، دل لگی اور دُکھ سب کچھ تھا۔

کندن ایک لمحے کے لیے مبہوت ہوگیا اور اس کے فلم زدہ دماغ نے سوچا۔ کاش میری آنکھیں کیمرے کا لینس LENS ہوتیں اور میں اس خوب صورت منظر کو ہمیشہ کے لیے قلم بند کر سکتا۔

جوں جوں وہ زینہ اترتا گیا، اندرا کے چراغ کی روشنی کم ہوتی گئی۔ مگر نیچے اتر کر جب اس نے زینے کے اندھیرے کنوئیں کی تہہ سے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہی میں ایک ننھی سی لو چمکتی ہوئی نظر آئی۔ بہت دور۔ بہت اونچائی پر!

وہ گیلری میں راستہ ٹٹول کر باہر جا رہا تھا کہ تاڑی کی بدبو کے بھپکے کے ساتھ ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا۔ باہر سڑک کی پیلی روشنی کے خلاف دروازے میں کھڑا ہوا وہ ایک سیاہ اور عجیب دو ٹانگ کا جانور معلوم ہوتا تھا۔

''اندرا کا باپ'' اس نے سوچا اور بچنے کے لیے دیوار کے سائے میں دبک گیا۔ شرابی لڑکھڑاتا، گالیاں بکتا، ٹھوکر کھاتا زینے پر چڑھتا گیا۔ اور کندن دروازے کی طرف بھاگا۔

باہر گلی میں کھڑے ہو کر ایک بار پھر اس نے اندرا کے مکان پر نظر ڈالی۔ اندھیرا، ڈراؤنا، مہیب مگر اس میں کتنی ہی ننھی ننھی کھڑکیاں چمک رہی تھیں اور کندن نے سوچا کہ ان میں سے ایک ننھی سی روشنی اندرا ہے اور اسے وہ گلی اتنی متعفن اور غلیظ نہ معلوم ہوئی جتنی آدھ گھنٹہ پہلے تھی۔

سیٹی بجاتا ہوا وہ پوری بندر کی طرف چلا۔ یہاں تک کہ اندھیرے میں فیڈ آؤٹ ہو گیا۔

(انٹرول)

(پان، بیڑی، چائے، لیمن، سوڈا، رس بھری، مونگ پھلی، کھارا پستہ، آئس کریم..... .....)

ساتواں ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کی خاطر اپنا فیصلہ تبدیل کرتا ہے)

نرمل غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

''دیکھیے باسو صاحب۔ اگر آپ کو میری کہانی پسند نہیں ہے تو پھر آپ نے خریدی ہی کیوں؟ اتنی تبدیلیاں کرنے سے تو بہتر ہوگا کہ آپ میری کہانی واپس کر دیں اور خود لکھ لیں۔ آخر مجھے پانچ ہزار کس لیے دے رہے ہیں''

ڈائرکٹر باسو نے نہایت ملائمیت سے سمجھایا۔ پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں آپ کے نام کے۔ ساہتیہ میں آپ نے اتنا نام بنایا ہے تو کس لیے؟ پھر آپ کی کہانی کا نام۔ سرکھ سپرا۔ اچھا

نام ہے۔ ذرا REVOLUTIONARY COLOUR ہے اس میں۔ آج کل ایسے نام اچھے چلتے ہیں اور آپ کی کہانی میں کئی INCIDENT بھی اچھی ہیں۔ ہیرو کا کیریکٹر بھی ہم نے وہی رکھا ہے۔ آپ نے مل مزدور دکھایا تھا ہم نے ریڈیو سنگر بنادیا ہے۔ گانا بھی تو ہونا ہے۔ اور گانا ایک دم REVOLUTIONARY لگائیے گا۔ سارے دیش میں آگ لگا دے گا۔"

کندن یہ سب گفتگو باہر برآمدے میں کھڑا سن رہا تھا۔ نرمل سے زیادہ اُسے غصہ آ رہا تھا۔ آخر ان ڈائرکٹروں کو یہ کیا مرض تھا کہ اچھی خاصی کہانی کا ستیاناس کرنے پر تلے رہتے تھے۔ نرمل ہندستان کا اتنا مشہور لیکھک تھا۔ کندن نے کہیں پڑھا تھا کہ اس کی کہانیاں نہ صرف انگریزی میں ترجمہ ہو کر انگلستان اور امریکہ کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئی تھیں بلکہ فرنچ اور جرمن میں بھی چھپی تھیں۔ ایسے لیکھک کی کہانی میں ڈائرکٹر باسو جیسا جاہل رد و بدل کرے، یہ کہاں کا انصاف تھا! مگر آئے دن اسٹوڈیو میں یہی ہوتا رہتا تھا۔ ایک ڈائرکٹر نے منشی پریم چند جی کے ایک مشہور ناول کو کند چھری سے قتل کیا تھا، ایک اور نے کرشن چندر کی کہانی میں صرف اتنی تبدیلی کی تھی کہ ہیرو کو ایک کشمیری کسان کے بجائے راجپوتانہ کا ایک نوجوان زمین دار بنادیا گیا تھا اور ہیروئن کو ہاتو کی بیٹی کے بجائے شاہی محل کے مالی کی بیٹی۔ جو آخری ریل میں ایک زمیندار کی لڑکی ہی ثابت ہوتی ہے (پیدا ہوتے ہی لڑکی محل سے ہٹالی گئی تھی اور اس کے بدلے میں مالی کا بیٹا وہاں رکھ دیا گیا تھا)

...مگر کندن کو یقین تھا کہ نرمل جیسا انقلابی مصنف باسو کی ایک نہ سنے گا بلکہ ایسی کھری کھری سنائے گا کہ ڈائرکٹر صاحب بھی یاد کریں گے۔ کیا نرمل نے اپنے افسانوں کے مجموعے "خون اور پسینہ" کے مقدمے میں نہیں لکھا تھا کہ دنیا کی ہر نعمت خریدی جاسکتی ہے، دولت، عزت، مکان، لباس، بہترین غذا، یہاں تک کہ عورت کا جسم بھی خریدا جاسکتا ہے۔ ووٹ خریدے جاسکتے ہیں۔ سیاست داں اور لیڈر خریدے جاسکتے ہیں مگر فن کار کا قلم نہیں خریدا جاسکتا۔"

کندن نے دروازے کی طرف کان لگادیے۔ اس انتظار میں کہ کب نرمل اپنی زبان کی ایک جنبش سے ڈائرکٹر باسو کے تمام دلائل کو چکنا چور کرتا ہے۔

باسو کہہ رہا تھا۔ "دیکھیے نرمل جی، یہ فلم اسٹوڈیو ہے۔ یہاں بڑے بڑے لیکھکوں کی کہانیاں بدل دی جاتی ہیں۔ ساہتیہ اور چیز ہے سنیما اور۔ ہمیں باکس آفس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سیٹھ جی کے

تین لاکھ روپے اس پکچر پر لگنے والے ہیں۔ اگر اس میں ہم نے دس بارہ گانوں کی SITUATIONS نہ رکھیں تو کوئی ڈسٹری بیوٹر ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔"

کندن نے سوچا۔ اب نرمل کہے گا۔"بھاڑ میں جائیں آپ، آپ کے سیٹھ جی اور آپ کا باکس آفس۔ میں اپنی کہانی کو بدلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

مگر نرمل خاموش رہا۔ اور باسو کا پارہ اوپر چڑھتا رہا۔ اور اس کی آواز بھی۔

"اگر آپ کہانی بدلنا نہیں چاہتے تو آپ کو ہزار روپے جو اڈوانس دیے گئے ہیں وہ واپس کر دیجیے اور کنٹریکٹ پھاڑ ڈالیے۔ ہم منشی پردیسی سے دوسری کہانی لکھوا لیتے ہیں"

"یہ لیجیے اپنے روپے۔ میں اپنے قلم کو کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا" مگر یہ الفاظ نرمل کی زبان سے نہیں نکلے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے مری ہوئی سی آواز میں کہا۔"نہیں" باسو صاحب۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ فلموں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ تبدیلیاں ضروری ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں ڈائیلاگ دوسرے لکھ لاؤں گا۔ رات بھر کی مہلت دیجیے تاکہ میں اس نئی لائن پر غور کرسکوں"

کاغذات جمع کرنے اور چمڑے کے تھیلے میں ٹھونسنے کی آواز آئی۔ اور ڈائرکٹر باسو کی آواز، ملائم مگر زہریلے طنز سے بھری ہوئی۔"ہم تو آپ ایسے لیکھکوں کی مدد کرنا چاہتا ہے، نرمل جی۔ نہیں تو کہانی ڈائیلاگ تو دو ہزار میں دس رائٹر لکھنے کو تیار ہیں"

"نمستے، باسو صاحب" کل حاضر ہوں گا"

"نمستے"

کندن، نرمل کے باہر نکل آنے سے پہلے ہی کھسک آیا۔ اس کے دماغی مندر کا ایک اور بُت آج ٹوٹ گیا تھا۔ نرمل۔ انقلابی، باغی نرمل نے ہزار روپے کے خاطر وہ قلم بیچ دیا تھا جو آج تک کبھی نہ بکا تھا

جب نرمل برآمدے میں باہر نکلا تو کندن نے ایک نظر میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اُس نے کندن سے بات نہیں کی بلکہ جلدی سے منہ پھیر کر سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اسٹوڈیو سے باہر چلا گیا۔

کندن کو اس اخلاقی شکست پر زیادہ دیر غور کرنے کی مہلت نہ ملی۔ ڈائرکٹر ہنڈا کے دونوں اسسٹنٹ چوپڑا اور رام ہوٹل کی طرف سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ کندن کو دیکھ کر انھوں نے اُسے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور املی کے درخت کے نیچے والے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

''نمستے رام جی، نمستے چوپڑا جی۔ کیا حکم ہے؟''

''کندن۔ آج شام کو یونین کی میٹنگ ہے۔ تمھیں بھی چلنا چاہیئے''

''یونین؟ کیسی یونین''

فلم ورکرس یونین۔ ہم سب اُس کے ممبر ہیں۔ تمھیں بھی ممبر بننا چاہیے چوپڑہ نے کہا۔

''پر چوپڑہ جی یونین تو مزدوروں کی ہوتی ہے''

''تو کیا ہم اسٹوڈیو میں کام کرنے والے مزدور نہیں ہیں'' رام نے جواب دیا۔ کیا سیٹھ اور سرمایہ دار ہم کو بھوکا نہیں مارتے؟ مجھے پانچ برس ہوگئے ہیں اسسٹنٹی کرتے، ستر روپے تنخواہ ملتی ہے۔ تمہاری کیا تنخواہ ہے؟''

''تیس روپے ماہوار'' کندن نے جھجکتے ہوئے اقرار کیا۔

''اور جانتے ہوٹل کے مزدور کو کیا ملتا ہے؟ ساٹھ ستر روپے ماہوار'' رام نے کہا اور چوپڑہ نے لقمہ دیا۔ ''تم سے کہیں زیادہ تو میونسپلٹی کے بھنگیوں کو تنخواہ ملتی ہے۔''

کندن کو ہرگز یہ اچھا نہیں لگا کہ اس کا مقابلہ بھنگیوں اور کارخانے کے مزدوروں سے کیا جائے، مگر رام نے اسے بولنے کا موقعہ ہی نہیں دیا اور جانتے ہو، کیوں مل کے مزدور اور بھنگی ہم سے بہتر حالت میں ہیں؟ اس لیے کہ ان کی اپنی اپنی یونین ہے جو مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔''

ٹالنے کی خاطر کندن نے وعدہ کرلیا کہ وہ جلسے میں آجائے گا مگر اس کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ کون یونین وونین کے جھگڑوں میں پڑے! آج اُسے تنخواہ ملی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ کوئی فلم دیکھے گا۔ پروڈکشن منیجر کے کمرے سے سروپ کو نکلتے دیکھا تو سوچا اسے بھی ساتھ لے جائے۔

''چلو سَروپ کیا یاد کروگے کسی رئیس سے پالا پڑا تھا تمھیں آج سنیما دکھلائیں۔'' مگر سَروپ نے اُس کی دعوت کو منظور نہیں کیا۔ ''تم جاؤ، میں تو میٹنگ میں جارہا ہوں''

''تمہاری مرضی!'' اور پھر میٹنگ کے ذکر سے کھٹک کر۔ کیسی میٹنگ؟''

''یونین کی میٹنگ''

''تم بھی یونین میں ہو؟''

''ہاں اور کیا؟''

''اور مرزا؟''

''وہ بھی آج ہی ممبر بنا ہے۔ تم بھی کیوں نہیں چلتے''

نہ جانے کیوں کندن کو اس یونین سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ جس کو دیکھو یونین ہی کا ذکر! اس کے علاوہ اس نے دور سے اندرا کو آتے دیکھا تو سوچا ''آج ہم ضرور اکٹھے سنیما جائیں گے۔ چاہے ڈھائی ڈھائی روپے کے ٹکٹ ہی کیوں نہ خریدنے پڑیں۔ سو اُس نے سروپ کو بھی ٹال دیا۔ ''اچھا تم چلو۔ موقعہ لگے گا تو میں بھی آؤں گا''

سُروپ جلدی میں تھا اُس نے اپنا راستہ لیا اور کندن اندرا کی طرف مخاطب ہوا۔ وہ حسب معمول سوتی دھلی ساڑی میں ملبوس تھی مگر نہ جانے کیوں کندن کو وہ اور دنوں سے زیادہ خوب صورت نظر آئی۔

''میں نے کہا، جی نمستے'' اس نے تپاک سے کہا۔

''نمستے کندن جی'' اندرا نے اپنے نازک ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے جواب دیا۔ اور ان ہاتھوں کو دیکھ کر کندن کو اس رات کا زینے پر چڑھنا یاد آ گیا جب چند لمحوں کے لیے ان کے ہاتھوں نے ایک دوسرے کو چھوا تھا۔

آج ہم ضرور سنیما جائیں گے'' بجائے دعوت دینے کے اس نے فیصلہ ہی سنا دیا۔

آٹھواں ریل

(جس میں ہیروئن بجائے مغموم غزل گانے کے ایک انقلابی نعرہ بلند کرتی ہے)

فلم ورکرس یونین کا جلسہ بجائے چھ بجے کے پونے سات بجے شروع ہوا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً چھ سو کے قریب تھی۔ کندن کو امید تھی کہ شاید جلسے کے بہانے بڑے اور مشہور فلمی 'ستاروں' کے درشن ہو جائیں گے مگر اُسے مایوسی ہوئی جب اُس نے سوائے کھدر پوش پرتھوی

راج کے ایک بھی نام والے ایکٹر یا ایکٹرس کو وہاں نہ پایا۔ مگر چھوٹے درجے کے ایکٹر، ایکسٹرا مرد وعورتیں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ کیمرہ مین لائٹ قلی وغیرہ کافی تعداد میں موجود تھے۔

کندن کے لیے کسی یونین کے جلسے میں شرکت کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا اور دراصل وہ آیا بھی تھا اندرا کی خاطر نہ کہ فلمی مزدوروں کے اقتصادی تحفظ کی خاطر۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اندرا کو بھی اس جلسے میں صرف تفریحی دلچسپی ہوگی۔ مگر جس انہماک سے وہ ہر تقریر کو سن رہی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ایسے جلسوں میں وہ پہلے بھی شریک ہوئی ہے۔ شراب میں اپنے آپ کو ڈبونے سے پہلے میرے پتا جی بھی سی مینز یونین کے ممبر تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی یونین کے جلسوں میں جایا کرتی تھی۔ اس نے فخریہ لہجے میں کندن کو بتایا اور کندن کو یہ سوچ کر کافی شرم محسوس ہوئی کہ فلمی فنکار اور اداکار بھی اب ملاحوں اور خلاصوں کے درجے پر آ گئے ہیں۔

تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے میں نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر گمنام ایکٹر، ہر ایکسٹرا، ہر اسٹوڈیو قلی اپنی زباندانی کی دھاک بٹھانے پر تلا ہوا ہے۔ مگر سوائے پرتھوی راج کے کسی ایک کو بھی تقریر کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ کوئی گھبراہٹ کے مارے ہکلا رہا تھا، کوئی اٹک اٹک کر کاغذ پر لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہا تھا، کوئی مالکوں کے خلاف الزامات لگاتے وقت مڑ مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا کہ شاید سیٹھ کا کوئی جاسوس چھپا بیٹھا ہو۔ کندن کو پہلے ان تقریروں کو سن کر ہنسی آئی، پھر غصہ آیا۔ مگر کچھ عرصے بعد آہستہ آہستہ فلمی اقتصادیات کے موٹے موٹے نکتے اس کے دماغ میں اترتے چلے گئے۔

مالک اور سیٹھ بعض فلموں پر پچاس فی صدی سے لے کر تین سو فی صدی تک منافع کماتے ہیں لیکن جن کام کرنے والوں کے گاڑھے پسینے سے یہ منافع حاصل ہوتا ہے ان کو اس میں سے ایک پائی بھی نہیں ملتی۔

کالج کے پڑھے اور تجربہ کار ٹکنیشینز TECHNICIANS مثلاً کیمرہ مین، ساؤنڈ رکارڈسٹ اور لیبارٹری والوں کو اتنی کم تنخواہ ملتی ہے کہ اس سے زیادہ تو اوسط درجے کی ایکسٹرا لڑکیاں مہینے میں آٹھ دس دن کام کر کے کما لیتی ہیں۔

کسی اسٹوڈیو میں بھی ملازموں کو وہ حقوق اور رعایات حاصل نہیں ہیں جو ہر کارخانے کے

مزدوروں کو ملی ہوئی ہیں۔ نہ پنشن، نہ پراویڈنٹ فنڈ نہ انشورنس، نہ بندھی ہوئی ترقی، نہ قاعدے نہ قانون۔ جب سیٹھ جی کی مرضی ہو کان پکڑ کر نکال دیں۔ نہ داد نہ فریاد۔

چھوٹے درجے کے اسٹاف سے ایک دن میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ گھنٹے تک بلا اوور ٹائم OVER TIME دیے کام کرایا جاتا ہے اور کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ دبی زبان سے شکایت کرو تو پروڈکشن منیجر اور مالک کے دوسرے گرگے صاف کہہ دیتے ہیں۔ ''اگر ان شرائط پر کام نہیں کرنا ہے تو کوئی اور کام ڈھونڈ لو۔''

بجلی کا کام کرنے والے قلیوں کو اپنی جان ہتھیلی پر لے کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر سال دو ایک مر بھی جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کے پسماندہ خاندانوں کے لیے مالی مدد کا کوئی انتظام نہیں تھا (کندن کو اپنا بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ'' والا کام اور اس کے خطرات یاد آ گئے)

مگر کندن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مرزا نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اکسٹراز کی طرف سے ایک زوردار تقریر کی اور دادا گنجا جیسے اکسٹرا اسپلائرس کا پول کھول دیا کہ کس طرح اکسٹراز کی آمدنی کا بیشتر حصہ ہر حالت میں ان کی جیب ہی میں پہنچتا ہے۔ خود ایک ایکسٹرا کی یہ ہمت کہ وہ بھرے جلسے میں دادا گنجا اور اس کی برادری پر حملہ کرے! اور تو اور دبلے پتلے سروپ نے بھی جوش میں آ کر اسی سلسلے میں تقریر کر ڈالی جو کسی نے سنی اور اکثر نے نہیں سنی۔ کیونکہ اس وقت حاضرین میں سے تقریباً ہر ایک تقریر کرنے کے لیے تیار تھا اور بہت سے بغیر اسٹیج پر آئے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تقریر کر بھی رہے تھے!

کندن نے اسٹوڈیو میں کام کرنے والوں کو اس انقلابی روپ میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہی تقریریں جن کو سن کر وہ شروع میں ہنس رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں ایک نشہ، ایک جنون کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اس کے نوجوان دل کی دھڑکن پکار پکار کر اُس سے کہہ رہی تھی! ''کیا تجھ میں احساس خودداری بالکل نہیں ہے؟ کیا تو ہمیشہ مالکوں کی ٹھوکریں کھانے پر قانع رہے گا؟ کیا تو انصاف اور اپنی جماعت کے اقتصادی مفاد کی خاطر اپنی آواز نہیں اٹھائے گا؟''

''آپ بھی کیوں نہیں بولتے؟''

جوں جوں جلسے کی کارروائی میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی تھی وہ برابر میں بیٹھی ہوئی اندرا کو بھول ہی گیا تھا۔ شور اور ہڑبونگ میں اس کی سریلی ہلکی آواز ایسی معلوم ہوئی، جیسے کسی زوردار شور مچاتے ہوئے آرکسٹرا میں دفعتاً ایک بانسری کی لے شروع ہوجائے مگر ہو وہ بھی آرکسٹرا کی دھن سے ہم آہنگ!۔

''آپ بھی کیوں نہیں بولتے؟''

ان الفاظ میں اشارہ تھا، دعوت تھی، درخواست تھی، حکم تھا۔ اس کے علاوہ خود کندن کے اپنے دل کی آواز بازگشت بھی تھی۔

اگلے مقرر نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی کندن لپک کر اسٹیج پر چڑھ گیا۔ مرزا، سروپ اور اس کے اسٹوڈیو کے چند آدمیوں نے اُسے پہچان کر تالیاں بجائیں۔ اور صدر نے اُس کا نام پوچھ کر اعلان کردیا کہ ''اب مسٹر کندن کمار اسٹوڈیو میں کام کرنے والوں کی حالت کے بارے میں کچھ کہیں گے''

کہیں گے! کیا کہیں گے؟ چند لمحوں کے لیے کندن جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ سب بھول گیا۔ ہال میں اس کی نظروں کے سامنے کئی سو چہروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک لامتناہی، بے معنی سمندر، سانسوں کی لہریں، سگریٹ کے دھوئیں کے بادل اور ان بادلوں میں ایک چہرہ پہلے سے خوب صورت سے چاند کی طرح چمکتا ہوا۔ اندرا کا چہرہ! اور نہ جانے کیسے اس مجمع میں اندرا کو دیکھتے ہی اس کی گھبراہٹ دور ہوگئی جیسے طوفانی سمندر کو ایک دم سکون آجائے اور اُسے یاد آ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

اس نے اوروں کی طرح دھواں دھار تقریر نہیں کی۔ انقلابی جملے نہیں دہرائے۔ نہ جذبات کو ابھارا اور نہ دھمکیاں دیں۔ دھیمی آواز اور دوستانہ بات چیت کے انداز میں اس نے بولنا شروع کیا۔ اور جوں جوں وہ بولتا گیا سننے والوں نے اپنے آپ کو ایک اسٹوڈیو میں پایا جہاں شوٹنگ ہورہی تھی۔ نظر کو خیرہ کرنے والی سینکڑوں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ''لائٹس آن۔ لائٹس آف۔ بتی جلاؤ بتی بجھاؤ'' کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی اندھیرا۔ کبھی اجالا۔ اور چالیس پچاس فٹ اونچائی پر، اسٹوڈیو کی چھت میں لگے ہوئے گارڈوں اور کھانچوں سے کتنے ہی 'لائٹ قلی'

چمگادڑوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ ''لائٹس آن۔ لائٹس آف'' اندھیرے اجالے کا یہ سارا کھیل اُن کے دم سے ہے۔ دن یا رات کے دس دس بارہ بارہ گھنٹے وہ اسی طرح چھت میں لٹکے رہتے ہیں۔ اُن کو چائے پانی بھی رسیوں کے جھولے کے ذریعے وہیں اوپر پہنچایا جاتا ہے۔ ہر لمحے ان کی جان خطرے میں رہتی ہے۔ اگر کوئی رسی ٹوٹ جائے! اگر کوئی قدم تختہ پر پھسل جائے، اگر تھکان اور نیند سے چور ہوکر کوئی بے چارہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی اونگھ جائے! اگر کسی بوسیدہ بجلی کے تار کو ہاتھ لگ کر خوفناک برقی رو بدن میں دوڑ جائے! اگر کوئی من بھر وزنی لائٹ سر پر گر پڑے! ہر سال دو چار! ایسے ''حادثے'' تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور اس پر بھی ان لائٹ قلیوں کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کا صلہ پچیس تیس روپے ماہوار ملتا ہے اگر کل میں اپنی ڈیوٹی کے وقت اوپر سے گر کر مرجاؤں تو یقین ہے کہ میری جیب سے یا میرے سامان کو بیچ کر بھی میرے کریا کرم کے لیے کافی رقم نہ مل سکے گی''

ہر شخص چپ چاپ کندن کی تقریر سن رہا تھا۔ کئی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اندرا اس انداز سے کندن کو دیکھ رہی تھی جس میں فخر بھی تھا اور رحم بھی!

تو میں پوچھتا ہوں، کندن کی آواز بالآخر گونجی کہ ''کیا ہم ہمیشہ یوں ہی بار برداری کے گدھوں کی طرح یہ ظلم برداشت کرتے رہیں گے؟ کیا ہم متحد ہوکر ان سیٹھوں اور مالکوں کا مقابلہ نہ کریں گے جو ہمارے گوشت پوست ہماری ہڈیوں اور خون سے اپنے رنگ محل بناتے ہیں؟... میں کہتا ہوں کہ تقریروں اور تجویز کا وقت گزر گیا ہے۔ عمل کی گھڑی آن پہنچی ہے میں چاہتا ہوں کہ آج ہم سب مل کر یہ طے کرلیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ بولیے کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے؟''

ہال میں خاموشی! خود کندن کو نہیں معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اگر حاضرین میں سے کسی نے اُس کے سوال کا جواب نہ دیا تو اس کے لیے مشکل پڑ جائے گی۔

جواب سوچنے کے لیے تھوڑی مہلت پانے کی خاطر کندن اپنے سوالات کو دہراتا رہا۔ ''بولیے بولیے۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ کس طرح اپنی متحدہ مانگوں کو منوانا ہے؟... کس ہتھیار سے اس انیائے اور ظلم کا مقابلہ کرنا ہے؟''

اور خاموش، ساکن ہال میں سے ایک مہین سی آواز آئی 'اسٹرائیک' اندرا کی آواز۔ ایک انقلابی نعرہ۔ طبل جنگ۔

اسٹرائیک!

اسٹرائیک!!

اسٹرائیک!!!

اور فوراً یہ طے ہو گیا کہ ایک اسٹرائیک کمیٹی بنائی جائے اور وہ تیاریاں شروع کر دے اور جو مالکان اپنے اسٹوڈیو کے ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اُن کو اسٹرائک کی دھمکی دی جائے۔ اس کمیٹی میں کندن کو بھی رکھ لیا گیا اور اس کے کامیاب اور بلا مقابلہ چناؤ پر خوب تالیاں بجیں۔ مرزا اور سروپ کو بھی اس کمیٹی پر اکسٹراز کے نمائندوں کی حیثیت سے لے لیا گیا۔

جب کندن اپنی جگہ واپس پہنچا تو اس نے اندرا کی آنکھوں کو خوشی اور جوش سے چمکتا پایا۔ ''آپ تو بڑے اچھے اسپیکر نکلے'' اس نے کہا اور کندن کے ہاتھ کو نہایت تپاک اور گرمجوشی سے دبایا۔ اس نرم لمس میں مبارک باد بھی تھی اور محبت کا اقرار بھی۔ وہ 'کاشانہ عشرت' والی جنسی محبت نہیں بلکہ وہ محبت جو دوست کو دوست سے اور ساتھی کو ساتھی سے ہوتی ہے۔

نواں ریل

(جس میں زہر عشق تنگچر آئیڈین ثابت ہوتا ہے)

تمام اسٹوڈیو میں کھلبلی۔

نازنین واپس آ گئی۔ اپنے عاشق کے ساتھ جوہو کے ایک ہوٹل میں پکڑی گئی۔

نازنین واپس آ گئی۔ سنا ہے شادی کر لی تھی۔

نازنین واپس آ گئی اور بھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ ایک فوجی لفٹنٹ کے ساتھ......

نازنین واپس آ گئی۔ اس کی نانی چٹیا پکڑ کر لے آئی۔

نازنین واپس آ گئی۔ سنا ہے اُس کی ماں نے بہت مارا۔

نازنین واپس آ گئی۔ لفٹنٹ اسحاق نے نازنین کی ماں سے پچیس ہزار روپے لے کر

طلاق دے دی۔

نازنین واپس آ گئی۔ ماں اور نانی نے اس پر پہرہ لگا رکھا ہے

نازنین واپس آ گئی۔ سیٹھ صاحب نے اسے ڈائرکٹر باسو کے فلم ''سرخ سویرا'' کے لیے منتخب کیا ہے۔

نازنین واپس آ گئی! نازنین واپس آ گئی!! نازنین واپس آ گئی!!!

نازنین آج اسٹوڈیو آ رہی ہے۔

کندن دل ہی دل میں نازنین سے خفا تھا۔ اس نے طے کرلیا کہ میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ جائے اپنے لطفت کے پاس۔ وہی مردانہ آواز والی ''کملا'' جس نے پچیس ہزار کے عوض اپنی محبت کو نازنین کو، بیچ ڈالا!... اس کے علاوہ وہ یونین کی کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے ساتھ اسٹرائک کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ مالکوں کی انجمن نے نہایت حقارت سے ان کی مانگوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ گریٹ آرٹ پکچرز کے سیٹھ سونا مل چاندی والے کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا۔ ''میرے اسٹوڈیو میں کوئی کیمونسٹ، سوشلسٹ مزدوروں کو بھڑکا کر دیکھے۔ سیدھا کر دوں گا سالوں کو''

کندن کو ہنسی آئی جب اُس نے اگلے دن ہی یہ اشتہار فلمی ہندستان کے سرورق پر پڑھا:

سیٹھ سونا مل چاندی والے

کی انقلابی پیش کش

'سرخ سویرا'

انصاف اور جمہوریت کی صبح نو

آزادی کا پیغام

مزدوروں اور کسانوں کے لیے نوید جاں فزا

خاص اداکار

نازک حسینہ نازنین (''تجلی'' فیم)

خوبرو دیپ کمار

اور اب اندر ہی اندر اسٹرائک کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔

ممبر بنائے جا رہے تھے۔ وعدے لیے جا رہے تھے جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کے لیے دلوں کو مضبوط بنایا جا رہا تھا۔ کندن ہر ایک سے کہتا تھا۔"اگر ہم اڑے رہیں اور اپنی یونین سے غداری نہ کریں تو ہمارا اسٹرائک ضرور کامیاب ہو سکتا ہے"

اندرا (جس کو اس عرصے میں یہاں وہاں اکسٹرا کا کام ملنے لگا تھا) بھی اس کام میں پورا پورا حصہ لے رہی تھی۔ اکثر وقت جب ان کو اسٹوڈیو کا کام نہ ہوتا تو وہ دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ یونین کی تنظیم کے سلسلے میں اسٹوڈیو اسٹوڈیو پھرتے۔ دادر سے پریل۔ تاردیو۔ اندھیری۔ گورے گاؤں۔ ملاڈ، اندرا کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سینکڑوں اکسٹرا لڑکیاں یونین کی ممبر بن گئی تھیں اور جوش وخروش سے اسٹرائک کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھیں بیس بائیس اس کے لیے بھی تیار تھیں کہ جب اسٹرائک شروع ہو تو اسٹوڈیوز کے دروازوں پر لیٹ جائیں گی تاکہ کوئی غدار کام پر نہ جا سکے۔

کندن نے جو کچھ سنا تھا، پڑھا تھا، فلموں میں دیکھا تھا اس کی بنا پر اس کا خیال تھا کہ محبت اس طرح ہوتی ہے، جیسے بجلی گرتی ہے۔ اچانک دل پر چوٹ لگتی ہے اور عاشق دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آنکھیں معشوق کے جلوے سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ایک تیر جگر کے آر پار ہو جاتا ہے۔ اگر محبت ایسی ہوتی ہے تو یہ جذبہ کیا تھا جو اس کے اور اندرا کے درمیان پروان چڑھ رہا تھا؟ اس میں نہ شراب کی تندی تھی اور نہ دنیا کو فراموش کرنے والا نشہ۔ رفاقت کی چاشنی تھی۔ دوستی کا مزا تھا۔ مشترکہ دلچسپیوں اور مشترکہ خیالات کا بندھن تھا۔ ایک ناقابل بیان ہلکی ہلکی سی کسک تھی۔ کیا محبت اسی کا نام ہے؟

رات کو کبھی کبھی، کچھ دیر پہلے نیند سے" یہ سوال کندن کے دماغ میں ابھرتا تھا لیکن دن کی مصروفیات میں وہ اسے بالکل بھول جاتا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اندرا کے ساتھ ہونے پر بھی اس کو محبت نہیں ستاتی تھی۔ کبھی کبھار وہ سوچتا "آج اندرا کی پیشانی پر بندی کتنی خوشنما لگ رہی ہے، یا" آج اندرا کی باغیانہ زلفیں ہوا میں اڑ کر اس کے بیضوی چہرے کے گرد کتنا خوب صورت ہالہ بنائے ہوئے ہیں"۔ مگر جلدی ہی ان باتوں کو بھول کر وہ اسٹرائک کا ذکر کرنے لگتے۔ یونین کی سیاست پر بحث ہونے لگتی اور محبت دماغ کے پچھلے کونے میں دبک جاتی مگر پھر بھی وہ بڑھتی رہی،

پروان چڑھتی رہی!

جب سے مرزا، سروپ، کندن اور اندرا یونین میں شامل ہوئے تھے دادا گنجا نے ان سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ بلکہ سروپ، کندن یا اندرا کوئی قریب سے گزرتا تو وہ کوئی گندہ فقرہ ان پر کستا۔ سالے بڑے کمیونسٹ بنتے ہیں ساری سوشلزم کے راستے نکل جائے گی یہ یونین بھی مرد پھنسانے کا اچھا چکلہ بنایا ہے ان اکسٹرا لونڈیوں نے۔ مگر مرزا کے سامنے اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ایسی باتیں کرے کیونکہ مرزا کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور اس کے مگدر جیسے ہاتھوں کا ایک لپڑ کافی تھا دادا گنجا کو شمشان بھومی پہنچانے کے لیے! مرزا، دادا کے سامنے اکڑتے ہوئے نکلتا اور زور سے کہتا ہے۔ ''کون سالا ہے جو یونین کو گالیاں دیتا ہے۔ آئے نا میدان میں سامنے''۔ اور دادا منہ پھیر کر ان سنی کر دیتا اور خاموش رہتا مگر اب ان سب کو اور خصوصاً مرزا کو فلموں میں کام ملنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ہر جگہ دادا گنجا نے پروپگنڈا کر رکھا تھا کہ یہ لوگ سوشلسٹ ہیں، کام کرنے والوں کو بھڑکانے کی غرض سے اسٹوڈیو میں کام کرنے آتے ہیں، اس لیے انھیں کام نہ دیا جائے۔

جب نازنین کی پہلی پیکارڈ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو کندن برآمدے میں کھڑا اندرا کا انتظار کر رہا تھا جو اب تک نہ آئی تھی۔ تقریباً ہر شخص کی نگاہیں نازنین کے استقبال کو اُدھر گھوم گئیں۔ آج وہ ایک فلم اسٹار ہی نہیں بلکہ زندگی کے ایک اصلی ڈرامے کی ہیروئن بن کر آرہی تھی گھر سے فرار، شادی، طلاق، ماں اور نانی کی مار لعن طعن، رسوائی، آج وہ ان تمام منزلوں سے گزر کر آرہی تھی۔ کندن نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے، آنکھیں سوجی ہوئی ہیں جیسے روتی رہی ہو اور ان کے گرد کالے حلقے پڑے ہوئے ہیں، جیسے کئی راتوں سے سوئی نہ ہو۔ موٹر سے گزر کر وہ نیچی نظریں کیے سیدھی اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور اس کے پیچھے پیچھے ماں اور نانی کا باڈی گارڈ!

سیٹھ صاحب کی گھنٹی بجی اور کندن اندر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹرائیک کے سلسلے میں شاید ڈانٹ پڑے۔ مگر سیٹھ سونا ل چاندی والے نے کندن کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ موری کے کیڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ''ڈائرکٹر باسو کو یہاں بھیجو...اور چنیا بائی اور منّی جان کو بلاؤ''۔ کندن سمجھ گیا کہ آج 'سرخ سویرا' کے کنٹریکٹ کی بات چیت ہونے والی ہے۔ ڈائرکٹر باسو کو سیٹھ جی کا پیغام پہنچا کر وہ نازنین کے ڈریسنگ روم پہنچا اور دونوں بوڑھیوں کو یہ مژدہ سنایا

کہ سیٹھ جی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ جسے سن کر خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دریائی گھوڑوں کی طرح انھوں نے اپنے موٹے چربی چڑھے ہوئے جسموں کو نہایت مشکل سے گدے دار کرسیوں پر سے اٹھایا اور سیٹھ جی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ نازنین دیوار پر لگے ہوئے آئینے کی طرف منہ کیے ہوئے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کندن کو یہ کیسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ چند قدم جا کر لوٹ آیا۔

''آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں''

''ہاں۔ میرے پاؤں میں چوٹ لگ گئی ہے۔ ٹنکچر آئیڈین چاہیے، ذرا مہربانی کر کے مجھے دفتر سے فرسٹ ایڈ باکس لا دیجیے''

کندن بھاگ کر فرسٹ ایڈ باکس لے آیا۔ نہ جانے کیوں نازنین کا اُداس، پیلا چہرہ دیکھ کر اس کا دل ہمدردی اور رحم سے بھر آیا تھا۔ بیچاری! محبت کی پہلی ہی منزل میں ٹھوکر کھا آئی۔ اُس نے کہا ''کہیے تو میں دوا لگا کر پٹی باندھ دوں''

''نہیں میں خود لگا لوں گی۔ آپ یہ بکس یہیں چھوڑ جائیں'' اور جب کندن جانے لگا۔ ''شکریہ۔ آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی!''

کتنا فرق تھا اُس چاندی کے روپے کی حقارت بھری جھنکار میں اور اس درد بھری، درد آشنا آواز میں! مگر کندن یہ نہ سمجھ سکا کہ اتنے معمولی سے کام کا اتنا زبردست شکریہ کیوں؟

سیٹھ جی چنیا بائی سے کنٹریکٹ کی شرائط پر بحث کر رہے تھے۔ ''ساٹھ ہزار!۔ چنیا بائی ہم سے ایسی باتیں کرتی ہو۔ ابھی 'تتلی' میں چالیس ہزار پر کام کر چکی ہو۔ اُس کے بعد یہ سب بدنامی۔ سب پیپرس میں کتنا برا لکلا ہے۔ میں تو سوچتا تھا نہ لوں پھر سوچا اپنی پرانی اسٹار ہے پھر آپ لوگوں سے بھی پرانا سمبندھ ہے۔ 'تتلی' والی رقم ہی سہی۔ اس سے زیادہ تو...''

''اب تو اس سے زیادہ ہی دینا پڑے گا، سیٹھ صاحب۔ جسے آپ بدنامی کہتے ہیں یہ تو پبلسٹی ہے۔ کیا سمجھے؟ سارے ملک کا کوئی ایسا اخبار نہیں ہے جس میں پچھلے دس دن میں نازنین کا نام نہ چھپا ہو''

''مگر بدنامی...'' سیٹھ نے چنیا بائی کے الفاظ کے بہاؤ کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔

''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟'' منی جان نے لقمہ دیا۔ ''پچپن ہزار سے تو ہم ایک کوڑی کم نہ لیں گے۔ کل ہی چندو لال شاہ کا ٹیلیفون...''

''اچھا چلو تمھاری خاطر پچاس کیے دیتا ہوں میں'' سیٹھ نے جلدی سے کہا۔

اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے چیاباؤ بولی ''خیر تمھارا پکچر ہے، سو منظور کیے لیتے ہیں مگر ٹیکس تمھیں ہی بھرنا پڑے گا''

'وہ تو میں ہمیشہ ہی بھرتا ہوں۔ اچھا بلاؤ نازنین کو کنٹریکٹ پر دستخط ہو جائیں'

'ڈریسنگ روم میں ہے۔ کسی کو بھیج دو'

گھنٹی۔ 'کندن مس نازنین کو بلاؤ'

کندن ڈریسنگ روم پہنچا تو اندر سے کواڑ بند پائے۔ کھٹ کھٹایا کوئی جواب نہیں۔ پھر کھٹ کھٹایا۔ دھڑ دھڑایا۔ اور کئی آدمی جمع ہو گئے۔

آخر نازنین کو کیا ہوا کہ دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

جب پانچ منٹ تک کوئی جواب نہ ملا تو سیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کے دو مستریوں نے دروازے پر شانے لگا کر زور سے دھکا دیا۔ پتلی لکڑی کے پٹ کھل گئے۔

اندر نازنین بے ہوش پڑی تھی۔ ہاتھ صوفے پر سے فرش پر آ رہا تھا اور ہاتھ کے قریب ٹنچر آئیڈین کی شیشی خالی پڑی تھی۔

کندن کے کان میں ایک درد بھری، درد آشنا آواز آئی۔ ''شکریہ آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی''۔

دسواں ریل

(جس میں ہیرو ہیروئین کی شادی طے ہو جاتی ہے مگر)

''آپ کو ماتا جی نے ملنے کے لیے بلایا ہے''۔ اندرا نے کسی قدر شرما کر کندن سے کہا۔

''کیوں کوئی خاص بات ہے؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم''

شام کو اسٹرائیک کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں طے ہوا کہ چار دن بعد یعنی اگلے سوموار سے ہر اسٹوڈیو میں اسٹرائیک کر دیا جائے گا۔ اس سے فراغت پا کر کندن اندرا کے گھر پہنچا۔ اب یہ تاریک گلی اس کے لیے غیر معروف نہ رہی تھی۔ اندھیرے میں بھی وہ راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ آج وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا۔ چند مہینے پہلے کیا معلوم تھا کہ میرے رومانی خوابوں کی تعبیر ایسے ماحول میں پائی جائے گی۔ کہاں نازنین کا میرین ڈرائیو والا محل نما مکان اور کہاں اندرا کی کال کوٹھری! مگر عجیب بات یہ تھی کہ پھر بھی کندن کو کوئی افسوس نہ تھا۔ اس کی زندگی میں، اس کے جذبات اور محسوسات میں، اس کی امیدوں اور آرزوؤں میں اندرا اس طرح سما گئی تھی کہ اس کے بغیر رہنا اور کام کرنا کندن کو ناممکن نہیں تو مشکل اور بے مزا ضرور معلوم ہوتا تھا۔

اندرا اور اس کی ماں انتظار کر رہی تھیں۔ گڑ کی چائے تیار تھی، چائے پی کر کندن نے پوچھا۔ ''کیوں ماتا جی کیا بات ہے؟'' اندرا کی ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی۔ مگر کوئی جگہ ایسی نہ پائی جہاں اندرا جا کر بیٹھ جائے تاکہ اس کی ماں وہ بات کندن سے کر سکے جو ہندستانی گھرانوں میں بیٹی کی موجودگی میں نہیں کی جاتی۔ اندرا خود اٹھ کر کونے میں چلی گئی جہاں دال کی ہنڈیا چولھے پر چڑھی ہوئی تھی اور بے ضرورت ڈوئی چلانے لگی حالانکہ اس کے شرم سے تمتمائے ہوئے کان ماں اور کندن کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

''بیٹا، شرم آتی ہے تم سے یہ بات اس طرح کرتے ہوئے''۔ اندرا کی ماں نے بات کرنی شروع کی۔ ''مگر کیا کریں۔ حالت ایسی ہے کہ کہنا ہی پڑتا ہے''

''کہو، ماتا جی، جو کہنا ہے مجھے گھر کا آدمی ہی سمجھو''

''بیٹا تم تو فلم کمپنی کا حال مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ سنا ہے وہ ایکٹریس جو ہے نازنین، اس نے زہر کھا لیا تھا''

''ہاں مگر ڈاکٹروں نے اُسے بچا لیا ہے۔ تین چار مہینے میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی''

''یہی میں نے بھی سنا ہے۔ اندرا کہتی ہے کہ سیٹھ نازنین کی جگہ وہ کسی دوسری ایکٹرس کی تلاش کر رہا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو، اندرا وہ کام کر سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں۔ میک اپ کے بعد اندرا بھی نازنین جیسی خوب صورت نظر آئے گی اور سمجھ

بوجھ اندرا میں زیادہ ہے اس لیے بہت جلد ایکٹنگ سیکھ سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سیٹھ کسی نئی لڑکی کو ہیروئن کا پارٹ نہیں دے گا"

"مگر سیٹھ تیار ہے"

کندن کو یقین نہ آیا۔ ناممکن ہے کہ سیٹھ سونا مل چاندی والا ایک مشہور اسٹار کا پارٹ ایک گمنام لڑکی کو دے دے" تم سے کس نے کہا ماں؟"

"وہ دادا گنجا ہے نا۔ وہ آیا تھا اندرا کے باپ کے پاس۔ کہنے لگا سیٹھ نے اندرا کو دیکھا ہے اور اسے اپنی نئی فلم میں نازنین کی جگہ ہیروئن کا پارٹ دینے کو تیار ہے..."

دادا گنجا کا نام سن کر کندن کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر یہ خبر اتنی شاندار اور سنسنی خیز تھی کہ چند لمحوں کے لیے وہ اس ذلیل ایکسٹرا سپلائر اور اس کی رکیک چالوں کو بھول گیا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، ماں۔ اندرا اسٹار بن جائے گی، ہزاروں روپے ماہوار کمائے گی"

"نہیں، بیٹا، شریفوں کے لیے یہ مرجانے والی بات ہے۔ سیٹھ اندرا کو یوں ہی پارٹ نہیں دے گا۔ دادا گنجا تو صاف کہہ گیا ہے کہ یہ پارٹ لینا ہے تو اندرا کو سیٹھ کی..."

"ماں!"

"ہاں بیٹا۔ تم فلم کمپنی میں کام کرتے ہو مگر خود شریف ہو اس لیے ان سیٹھوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتے۔ مرنا تو اس کا ہے کہ اندرا کے باپ نے دادا گنجا سے وعدہ کر لیا ہے اور اندرا کہتی ہے میں زہر کھالوں گی پر اپنی عزت نہ بیچوں گی"

کندن کی نگاہ اس کونے کی طرف گئی جہاں اندرا چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ آگ کی روشنی میں اُس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ شرم سے سر جھکائے تھی اور شاید اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کندن کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک شرابی باپ اور ایک غریب مدقوق ماں کی بیٹی اندرا نہیں بلکہ سیتا تھی، ساوتری تھی، دمنی تھی۔ ہندستانی عورت کی عفت و عصمت کی مقدس روح تھی۔ وہ ہرگز اس کے قابل نہیں تھا۔

"تو بیٹا اب اندرا کی لاج تمھارے ہی ہاتھ ہے۔ میں نے تو جس دن تمھیں پہلی بار دیکھا تھا اُسی دن بیٹا بنالیا تھا۔ اندرا نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا ہے، پر میں جانتی ہوں وہ بھی تمھیں

پسند کرتی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے لو تو میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں"

شادی کی تجویز! پریم بندھن! بیاہ! گرہستی! دو دل ایک ہو جائیں گے! لیکن اس وقت کندن کے دماغ میں اس تجویز کا کوئی رومانی پہلو نہ آیا۔ روپے آنے پائی کا مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

تیس روپے ماہوار۔ بمبئی میں مکان عنقا۔ میاں بیوی رہیں تو کہاں۔ "پگڑی" کی رقم کہاں سے آئے؟۔ اسٹوڈیو میں اسٹرائیک۔ شاید تیس روپے ماہوار بھی نہ ملیں۔ بے کاری، بھوک، بیوی، بچے... کسی صورت سے ایک رومانی تصویر بنتی نظر نہ آتی تھی۔

"مگر ماں میری کوئی آمدنی نہیں ہے..." اس نے کہنا شروع کیا۔ "اندرا کو تکلیف ہوگی"

"بیٹا۔ لاج بیچنے سے زیادہ عورت کو اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی"

کندن لاجواب ہو گیا۔

"اچھا، ماں، میں کل جواب دوں گا۔ پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری حالت بہتر ہوتی تو یہ بات میں خود کرتا۔ میں اسی لیے چپ تھا کہ آمدنی کی کوئی صورت ہو جائے تو کہوں گا۔ اب تم نے بات کی ہے تو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا"

اٹھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک بار پھر اندرا پر پڑی جو ابھی تک چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی اور شعلوں کی پرچھائیں اس کی آنکھوں میں امید بن کر چمک رہی تھی۔ آج وہ اسے چھوڑنے اور چراغ دکھانے زینے تک نہ آئی اور پھر بھی کندن کو یہ اچھا لگا۔ آج وہ دلہن بن گئی تھی۔

اُس رات اسے نیند نہ آئی۔ اُس رات اس نے اسٹرائیک کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ پلنگ پر لیٹا وہ اندرا کا تصور کرتا رہا۔ اندرا، سمجھ دار اندرا، نرم و نازک اندرا، مہربان اندرا، محبت کرنے والی اندرا، محبت کرنے کے قابل اندرا، ایک ذہین دماغ، ایک ہمدرد دل، ایک دل پسند جسم، کتنی آرزوؤں اور حسرتوں کا گہوارہ۔

اور صبح جب وہ اسٹوڈیو گیا تب بھی وہ اسٹرائیک کے بارے میں نہیں اندرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہیں سے اسے ہزار دو ہزار روپے مل جائیں۔ کوئی اسے سو دو سو روپے کی نوکری دے دے تو وہ فوراً اندرا کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ اس کی اندھیری زندگی میں اجالا ہو جائے مگر

کہاں سے اور کون؟

سَروپ نے پوچھا: ''آج اسٹرائیک کمیٹی کا جلسہ کے بجے ہے'' اور کندن نے غیر حاضر دماغ سے جواب دیا۔ ''ہاں ہے تو شاید''

مرزا نے کہا۔ ''پرکاش ہو آنا چاہیے۔ سنا ہے وہاں کے کام کرنے والے اسٹرائیک کے بارے میں ڈھل مل ہو رہے ہیں۔'' کندن نے غیر ضروری ترشی سے جواب دیا۔ ''تو کیا میرے ہی سر پر سب کام کی ذمہ داری ہے۔ تم لوگ کیوں نہیں ہو آتے؟''

رام ملا تو اس نے کہا۔ ''دیکھو، کندن، ذرا خبردار رہنا۔ ہمارے اسٹوڈیو ہی میں سیٹھ کا پانچواں دستہ کام کر رہا ہے۔ اسٹرائیک کو ناکام کرانے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔''

کندن نے جواب دیا: ''کیوں خواہ مخواہ گھبرائے جاتے ہو۔ میں دیکھ لوں گا'' مگر اس کی توجہ کہیں اور تھی، اُس نے یہ سنا ہی نہیں تھا کہ رام نے کیا کہا۔

اس دن اندرا اسٹوڈیو میں نظر نہ آئی اور کندن کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ آج وہ گھر سے نہ نکلے گی۔ جب تک وہ جواب لے کر نہ جائے گا وہ گھر بیٹھی رہے گی۔

ساڑھے دس بجے سیٹھ آیا۔ کندن سے کہا۔ ڈائرکٹر باسو کو بلاؤ۔ کندن روز انتظار کرتا تھا کہ کب سیٹھ اس سے اسٹرائیک کے بارے میں کچھ کہے گا۔ بُرا بھلا کہے گا۔ گالیاں دے گا۔ شاید مارے پیٹے۔ اسٹوڈیو سے نکال دے۔ مگر سیٹھ نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ کئی گھنٹے تک بند کمرے میں باسو سے مسکوٹ MESS-COVET ہوتی رہی۔ کندن جانتا تھا کہ وہ ''سرخ سویرا'' کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں کہ نازنین کی جگہ کون سی ہیروئن لی جائے اور دادا گنجا کی گندی تجویز کا خیال کر کے کندن کا چہرہ غصے اور شرم کے مارے سرخ ہو گیا۔

ایک بجے سے کچھ پہلے باسو نکل کر اپنے کمرے میں گیا۔ گھنٹی بجی اور کندن سیٹھ کے کمرے میں داخل ہوا۔

''کندن!''

''جی سیٹھ صاحب''

''بیٹھ جا''

کندن بیٹھ گیا۔ اب سیٹھ اسٹرائیک کے بارے میں کچھ کہے گا۔ کندن بھی تیار تھا۔ ''تم سیٹھ لوگ اپنی پروڈیوسرز ایسوسی ایشن بنا سکتے ہو تو ہم مزدور بھی اپنی یونین بنائیں گے۔ تم ہمارا خون چوستے ہو۔ ہماری محنت سے لاکھوں کروڑوں بناتے ہو اور ہمیں چاندی کے چند ٹکڑے دیتے ہوئے تمھیں موت آتی ہے۔ ہم نہتے ہیں، کمزور ہیں، مفلس ہیں۔ مگر اتحاد میں ہماری قوت ہے، اسٹرائیک ہمارا اعلان جنگ ہے'' کندن نے اپنی تقریر سوچ رکھی تھی۔

مگر سیٹھ نے اسٹرائیک کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ایک لفظ نہیں

''کندن!''

''جی سیٹھ صاحب''

''کہاں تک پڑھا ہے''

''میٹرک تک''

''انگریزی آتی ہے''

''آتی ہے جی مگر زیادہ نہیں''

''سیٹ پر کنٹینوٹی CONTINUITY لکھ سکتا ہے؟''

''ایک دو دن میں سیکھ سکتا ہوں۔'' مگر یہ سب سوال کیوں؟ کندن کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''باسو صاحب کو ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔

''جی؟''

''میرے خیال میں تم کام کر سکتے ہو''

''جی۔ پوری کوشش کروں گا''

''ہمیں ایسے ہی نوجوان چاہئیں۔ جو محنت کریں اور کسی گڑبڑ میں پارٹ نہ لیں۔''

کندن چند لمحوں کے لیے ''گڑبڑ'' کا مطلب نہ سمجھا۔

''پگار ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہوگی۔''

اسسٹنٹ ڈائرکٹر! ڈیڑھ سو روپے ماہوار! اب وہ اندرا سے شادی کر سکے گا۔ کندن کی آنکھوں کے سامنے رنگین نظارے گھومنے لگے۔

''پرسوں سوموار سے کام شروع ہو جائے گا''

''بہت اچھا''

''اب تم جا سکتے ہو۔ کل سے تم چپراسی نہیں ہو۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو۔''

کندن دفتر سے باہر نکلا تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عمر بھر کی امیدیں آرزوئیں ایک بار ہی میں پوری ہو گئی ہوں۔ وہ مسرت کی فضا میں اڑ رہا تھا۔ مگر دفعتاً وہ دھماکے کے ساتھ زمین پر آ رہا۔

منگو، ایک سیٹنگ قلی نے آ کر کہا: ''کندن بابو۔ رات کو نو بجے میٹنگ ہے اسٹرائیک کمیٹی کی۔ رام صاحب نے کہا تھا آپ سے کہہ دوں''

اسٹرائیک!

اسٹرائیک کو تو وہ بھول ہی گیا تھا!

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ ''گڑبڑ'' سے سیٹھ کا کیا مطلب تھا۔

اب اُسے معلوم ہوا کہ ایک سابق لائٹ قلی اور حالیہ چپراسی کو یک لخت اسسٹنٹ ڈائرکٹر کیوں بنایا جا رہا تھا۔

اب اُسے یاد آیا کہ وہ ابھی ابھی ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر اپنا ضمیر بیچ آیا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سیٹھ نے سوموار سے کام کرنے کو کیوں کہا ہے!

اُس کا جی چاہا فوراً واپس جا کر سیٹھ کی ذلیل رشوت اُس کے منہ پر دے مارے۔ کیا سمجھتا ہے، وہ ایک خوددار مزدور کی عزت چاندی کے ٹکڑوں سے خرید سکتا ہے۔

مگر اُس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اندرا! اگر اُس نے سیٹھ سے لڑائی کر لی تو پھر اندرا سے شادی کیسے کر سکے گا؟ نوکری، روپے، شادی، مسرت ہر چیز کا دارومدار سیٹھ کی خوشنودی پر تھا۔

اُس نے منگو سے کہا۔

''کہہ دینا، مجھے رات کو کام ہے۔ میں میٹنگ میں نہ آ سکوں گا''

وہ اسٹوڈیو سے باہر نکل کر ٹرام اسٹیشن کی طرف چلا۔ دور سے اُس نے رام اور مرزا کو باتیں کرتے ہوئے آتے دیکھا اور پان والے کی دکان کے برابر میں دبک گیا تا کہ وہ اسے نہ دیکھ پائیں۔

جب وہ گزر گئے تو وہ نکلا اور جب تک ٹرام میں سوار نہ ہو گیا دھڑکتے ہوئے دل سے اِدھر اُدھر مڑ مڑ کر دیکھتا رہا... جیسے چور۔

گیارھواں ریل

(جس میں آخر کار ہیرو اور ہیروئین مل جاتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے)

سوموار

آج گریٹ آرٹ پکچرز کے تازہ ترین شاہکار 'سرخ سویرا' کی مہورت تھی۔ پروہت نے ستاروں سے دریافت کر کے دس بج کر انتیس 29 منٹ کا وقت مقرر کیا تھا۔

اسٹوڈیو میں چہل پہل تھی۔ کیمرے پر ہار پھول چڑھے ہوئے تھے۔ سیٹ پر ایک کونے میں برہمن بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ سیٹھ صاحب شارک اسکن کا کوٹ پہنے ماتھے پر چندن لگائے خوش خوش گھوم رہے تھے۔ ڈائرکٹر باسو کے تمام دانت باہر نکلے پڑ رہے تھے اور سب سے زیادہ خوش کندن تھا۔ آج وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ چند سال میں ڈائرکٹر ہوگا۔

مگر اسٹوڈیو میں بعض چہرے مغموم بھی تھے۔ بڑھئی، قلی، میک اپ کرنے والے اور چند جانے بوجھے چہرے غائب بھی تھے۔ رام اور چوپڑہ کو نکال دیا گیا تھا۔ مرزا اور سروپ کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اسٹرائیک فیل ہو گیا تھا۔ کندن کے استعفٰی کے بعد یونین کے کتنے ہی ممبروں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اتحاد کی عمارت اڑاڑا دھم کر کے گر پڑی تھی۔ مالکوں کی فتح ہوئی تھی اور مزدوروں کی شکست۔

کندن خوشی خوشی مہورت کا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے فراغت پاتے ہی وہ اندرا کے ہاں جائے گا۔ اُسے مہورت کے پیڑے کھلائے گا۔ آج نہ صرف، سرخ سویرا کی مہورت تھی بلکہ کندن کی نئی زندگی کا بھی افتتاح تھا۔ آج وہ ماں سے بیاہ کی تاریخ مقرر کرائے گا۔ اور پھر وہ اور اندرا دو سے ایک ہو جائیں گے۔ خوشی کے اس لمحے میں اُسے دادا گنجا کا گھناؤنا چہرا نہایت نامبارک معلوم ہوا۔ یہ کم بخت آج کیوں ٹپک پڑا تھا مگر دادا اس شان سے اسٹوڈیو میں پھر رہا تھا جیسے آج کا ہیرو وہی ہو، سیٹھ کو کونے میں لے جا کر نہایت بے تکلفی سے باتیں کیں اور پھر ساتھ لے کر

سیٹھ کے پرائیویٹ دروازے سے اس کے دفتر میں چلا گیا۔

جتنے لوگ موجود تھے سب کی زبان پر ایک ہی مضمون تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہیروئین کون سی منتخب کی ہے۔ سنا تھا کوئی بالکل 'نیا چہرہ' ہے۔ کوئی کہتا ایک بڑے گھرانے کی 'سوسائٹی گرل' ہے۔ کسی کا بیان تھا ایک رجواڑے کی شہزادی ہے۔ دو چار کا خیال تھا نازنین اب اچھی ہوگئی ہے اور ڈرامائی انداز میں آخری لمحے پر مہورت کے لیے آجائے گی۔ سیٹھ صاحب نے اپنے سکریٹری تک کو اس راز میں شریک نہ کیا تھا۔

مہورت کے وقت میں پندرہ منٹ رہ گئے۔ برہمن اشلوک زور زور سے پڑھنے لگے۔ اتنے میں دروازے کے قریب کچھ شور ہوا تو کندن اُدھر بھاگا۔ وہاں دیکھا کہ نرمل کو تین چار آدمی پکڑے ہوئے ہیں اور وہ اُن سے اکیلا لڑ رہا ہے۔ باغی ادیب کی حالت عجیب تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی، جیسے وہ نشہ میں ہو یا روتا رہا ہو اور وہ چلّا رہا تھا۔ ''یہ فلم نہیں بنے گا۔ میں اپنے نام کو چاندی کے ٹکڑوں کے عوض نہیں بیچوں گا۔ یہ میری کہانی نہیں ہے یہ میری کہانی نہیں ہے 'سرخ سویرا' مزدوروں کے خون کی شفق ہے، سرمایہ داری کے گھناؤنے چہرے کا غازہ نہیں ہے''

'بیچارہ پاگل ہوگیا ہے' کندن نے سوچا اور اُسے بچانے کی غرض سے آگے بڑھا۔ مگر ڈائرکٹر باسو اُس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔

''اے نرمل بابو یہ کیا گول مال ہے''

''خونی۔ تو نے ہی میری کہانی کا قتل کیا ہے۔ میرے خیالات اور جذبات کا گلا گھونٹا ہے۔ میری کہانی واپس کرو...''

''نرمل بابو۔ مت بھولو کہ تمھیں ہزار روپے اڈوانس دیئے جاچکے ہیں۔ اب کہانی ہماری ہوچکی ہے''

'یہ لو اپنے ہزار روپے' اور یہ کہہ کر نرمل نے اپنے کوٹ کی جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کا ایک پلندا نکال کر ہوا میں اڑا دیا اور بہت سے لوگ انھیں اٹھانے کے لیے دوڑے۔

''یہ کیا؟'' باسو حیران اور ششدر رہ گیا۔ روپے کی یہ تحقیر، یہ کسی پاگل ہی کا کام ہوسکتا

ہے۔ نرمل بابو۔ کیا پاگل ہو گئے ہو۔ روپے کو اس طرح پھینکتے ہو...؛

'روپیہ مردے کو زندہ نہیں کرسکتا' نرمل نے دھیمی، آنسوؤں سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''روپیہ میری بیوی مجھے واپس نہیں دلاسکتا۔ میں نے روپے کی خاطر اپنا ضمیر، اپنا آرٹ بیچ دیا۔ اس لیے وہ خفا ہو کر چلی گئی''

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور باسو کے اشارے سے چند قلی اُسے پکڑ کر اسٹوڈیو کے باہر کر آئے۔

''ہیروئین آ رہی ہے۔ ہیروئین آ رہی ہے!'' تمام اسٹوڈیو کی توجہ اب پاگل ادیب سے نئی ہیروئن کی طرف مبذول ہو گئی۔

سیٹھ صاحب کے کمرے کا پرائیویٹ دروازہ کھلا اور پہلے دادا گنجا فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہوا نکلا۔ اُس کے بعد سیٹھ۔ وہ بھی مسکراتا اپنے زرد دانتوں کی نمائش کرتا ہوا اور اُن کے بعد ایک قیمتی بھڑک دار بنارسی ساڑی میں ملبوس۔ اندرا!

کندن کے دماغ میں اچانک اور غیر متوقع حادثے کا وہ جھانج بجا جو ایسے فلمی موقعوں پر بیک گراؤنڈ میوزک والے بجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ سوچنے، سمجھنے، بولنے کے لائق نہیں رہا۔ جب اندرا اُس کے قریب سے گزری تو اُس نے دیکھا کہ اُس نے اپنے چہرے پر پاؤڈر اور پینٹ کی ایک نقاب ڈال لی ہے۔ جس کے نیچے اس کے جذبات چھپے ہوئے تھے۔ بغیر کندن کو پہچانے وہ قریب سے گزر گئی۔

''کندن!'' ڈائرکٹر باسو چلایا' یہ ڈائیلاگ لو اور لکشمی دیوی کو یاد کرادو۔ مہورت شاٹ میں بولنا ہوگا''

''لکشمی دیوی؟'' کندن نے یہ نام آج ہی سنا تھا۔

''ہاں ہاں۔ نئی ہیروئین۔ جلدی کرو۔ دس منٹ رہ گئے ہیں۔''

کاغذ پر یہ مکالمہ لکھا ہوا تھا۔'' یاد رکھو، امر، نئی دنیا بلیدان دیے بغیر نہیں بن سکتی۔ سرخ سویرا دیکھنے کے لیے ہمیں اپنے خون کی لالی دینی پڑے گی۔'' اور کندن کو یاد آیا کہ تمام کہانی میں نرمل کا لکھا ہوا صرف یہی ایک مکالمہ باقی رہ گیا تھا اور آج مہورت شاٹ کے لیے اس وجہ سے

رکھا گیا تھا کہ اس میں 'سرخ سویرا' تھا۔

''اندرا!'' وہ اکیلی بیٹھی تھی اپنی زرق برق ساڑی میں ایک شہزادی کی طرح۔ اور وہ ڈائلاگ سکھانے کے بہانے سے اُس سے بات کرسکتا تھا۔ 'اندرا! تم نے یہ کیا کیا؟ پیسے، نام، ریشمی ساڑیوں کی خاطر اپنی لاج بیچ ڈالی''۔

اندرا کا جواب سن کر کندن کے دل اور دماغ پر بجلی گر پڑی۔

''لاج بیچنے کا گر تم ہی نے مجھے سکھایا ہے''

''اندرا!''

''ہاں۔ جو اسٹرائیک تمہاری غداری کی وجہ سے فیل ہو گیا۔ وہ ہمارا آخری موقعہ تھا کہ اس فلمی دنیا میں ہم عزت کے ساتھ رہ سکیں...اب کوئی امید نہیں ہے''

کندن اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کا کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اندرا کی ذلت کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اور یہ سوچ کر کندن کا جی چاہا کہ وہ پاگلوں کی طرح ہنسے کہ اُس نے اپنے خیال میں یہ غداری اندرا کی خاطر کی تھی۔

''کندن! ٹائم ہو گیا' ڈائرکٹر باسو چلایا۔ اندرا اٹھی اور کیمرے کے سامنے چلی گئی۔

''بتی جلاؤ''

''بتی بجھاؤ''

''لائٹس آن۔ لائٹس آف''

''نمبر چوبیس''

''نمبر اٹھارہ''

''سولہ نمبر اوپر لو''

''ستائیس نمبر یارڈ کرو''

''ساؤنڈ ریہرسل''

''او کے فار ساؤنڈ''

''ریڈی فار ٹیک''

اور پھر باسو کی آواز۔

''چندو بھائی۔ اپنے کو وہ لائٹ لفلکٹ مانگتا۔ وہی لائٹ کا سرکل جیسا پچھلی پکچر کے لاسٹ شاٹ میں لیا تھا''

''اس کے لیے ٹائم نہیں ہے، صاحب۔ ٹاپ لائٹ کو نیچے کرنا پڑے گا''

''اُس وقت بھی تو کیا تھا۔ کندن!''

''جی، باسو صاحب'' کندن کی آواز چالیس فٹ اونچائی سے آئی۔ وہ لوہے کے گاڈروں کے ایک کھانچے میں، ایک فٹ بھر چوڑے لکڑی کے تختے کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔

باسو کے لیے وقت نہیں تھا کہ پوچھے اس کا اسسٹنٹ وہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ چلایا۔

''لائٹ کو نیچے کر سکتے ہو؟''

''کر سکتا ہوں، صاحب''۔ یہ کہہ کر اُس نے رسی کھول کر لائٹ کو اپنے ہاتھ کے سہارے نیچے لٹکا دیا۔

''او۔کے''

''ریڈی فار ٹیک''

''ساؤنڈ اسٹارٹ''

دو سیٹیاں۔

''گو''

کندن کو اتنی اونچائی پر سے تمام اسٹوڈیو ایسا نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ آسمان کی بلندی سے دنیا کو دیکھ رہا ہو۔ کہیں اندھیرا کہیں اجالا۔ اندھیرا زیادہ تھا اور روشنیاں کم مگر پھر بھی وہ چمک رہی تھیں ہنس رہی تھیں۔ گویا اُسے اپنی طرف بلا رہی ہوں۔

دور، بہت دور سے آواز آئی۔ کسی کی جانی بوجھی آواز۔

''یاد رکھو، کندن، نئی دنیا بلیدان دیئے بغیر نہیں بن سکتی، سرخ سویرا دیکھنے کے لیے ہمیں اپنے خون کی لالی دینی پڑے گی''

یاد رکھو کندن! یاد رکھو، امر، اُس نے کیا کہا تھا؟ یا یہ کندن کے کانوں کا قصور تھا؟۔ یا اس کا

دماغ ٹھیک نہیں رہا تھا؟

دور، بہت دور سے آواز آئی۔

"کٹ"

اور دفعتاً تمام زمین کی روشنیاں بجلی کی تیزی سے کندن کی طرف لپکیں اور اجالے کا ایک سورج اتنی ہی تیزی سے اندرا کی طرف۔ اور ایک لمحے میں وہ دونوں اکٹھے اندھیرے اجالے کے سمندر میں ڈوب گئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

ڈائرکٹر باسو کی آواز اسٹوڈیو میں گونجی۔

"لائٹس آف!"

O

میں کون ہوں

چوتھا افسانوی مجموعہ جو نو ہند پبلشر لمیٹڈ بمبئی سے پہلی بار جولائی 1949 میں شائع ہوا

اوپندر ناتھ اشک

(ایک صحت مند مریض جس کا پھیپھڑا کمزور اور دل مضبوط ہے)

کے نام

چڑے چڑیا کی کہانی

ایک تھا چڑیا۔ ایک تھی چڑا۔ چڑا لایا چاول کا ایک دانہ چڑیا لائی دال کا دانہ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔

کھانے بیٹھے تو چڑے نے کھچڑی کے نوالے کا چونگا چڑیا کے منہ میں دیا۔ چڑیا نے شرما کر نوالہ کھالیا اور پھر اس نے اپنی چونچ میں ایک نوالہ لے کر چڑے کی طرف بڑھایا چڑے نے نوالہ منہ میں لینے کے بہانے سے چڑیا کی چونچ چوم لیا۔

چڑا بولا۔ چوں چوں چوں یعنی میری جان چڑیا تو مجھے کتنی پیاری ہے؟"

چڑیا بولی: چوں چوں چوں یعنی یہی چونچلے تو مجھے نہیں بھاتے۔"

کھا پی کر خدا کا شکر ادا کر کے دونوں اپنے گھونسلے میں سو گئے۔ سویرے جب چڑیا کی آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ مگر جنگل بے رونق اور سنسان معلوم ہوتا تھا جیسے فضا میں ایک عجیب خوف طاری ہو۔ چڑیا نے سہم کر چڑے کو اٹھایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا" کیا مشکل ہے دو گھڑی چین سے سونے بھی نہیں دیتیں۔" مگر جلد ہی اسے بھی جنگل کے گہرے سناٹے کا احساس ہو گیا

"بات کیا ہے؟ کیا سب چڑیوں کو سانپ سونگھ گیا ہے؟"

"ش ش ش" ہمسائے کے گھونسلے سے دبی ہوئی آواز آئی۔" آہستہ بولو! چڑیمار آیا ہوا ہے۔"

چڑیمار کے ڈر سے سارا جنگل سہا ہوا تھا۔ ہر پرندہ اپنے پروں میں سر چھپائے دبکا بیٹھا تھا۔

''کیسا لگتا ہے چڑیمار؟ بہت خوفناک ہوگا۔'' چڑیا نے ہمسائی سے پوچھا۔ وہاں سے جواب ملا''ہم نے تو دیکھا نہیں مگر ضرور بھیانک ہی ہوگا۔''

''ہو۔ ہو'' ایک نو وارد الّو اوپر کی ڈالی سے بولا:

''یہ سب تو تمھارا خیال ہی خیال ہے۔ وہ تو بڑا دھرم سیوک سورج بنسی سامراٹ ہے۔ وہ چڑیمار نہیں ہے۔ چڑیوں کا دوست ہے۔ اس نے ہمارے لیے سونے کے اتنے خوب صورت پنجرے بنوائے ہیں کہ تم دیکھو تو آنکھیں چکا چوندھ ہو جائیں۔

''پنجرے!'' چڑے کے دماغ میں جیسے خطرے کی گھنٹی بجی ہو۔'' تو کیا اب ہمیں پنجرے میں رہنا ہوگا؟ یعنی قید میں غلام انسانوں کی طرح؟''

الّو بولا: تم تو کوئی ناستک، ادھرمی باغی معلوم ہوتے ہو۔ یہ پنجرے ہمیں قید رکھنے کے لیے نہیں ہماری حفاظت کے لیے بنائے گئے ہیں۔''ذرا سوچو تو سہی۔ ان تنکوں کے گھونسلے کے بجائے سونے کی تیلیوں کا پنجرہ رہنے کو ملے گا۔ وہاں تم اور تمھارے بچے باز، شکروں، چیلوں، گدھوں، عقابوں کے حملوں سے محفوظ رہو گے۔ ان میں سے کوئی پر نہ مار سکے گا۔ تم اطمینان کی نیند سو سکو گے، بڑے سے بڑا خوفناک سے خوفناک پرندہ بھی تمھارے پنجروں کی تیلیوں کو توڑ نہ سکے گا۔ اگر جنگل کی تباہیوں سے بچنا ہے۔ اگر دھرم اور شانتی کا جیون بتانا ہے تو ان تنکوں اور پتوں کے گندے گھونسلوں کو چھوڑ کر ان شاندار پنجروں میں آجاؤ۔''

اور اسی وقت جیسے جادو ہو گیا ہو۔ ہر درخت کی ڈالیوں میں سنہری پنجرے لٹکے نظر آئے۔ مندروں کی طرح ان پر سونے کے کلس جڑے ہوئے تھے اور ان کی دیواریں راجا مہاراجاؤں کے محلوں کی طرح سنہری تھیں۔

''جے سنہری پنجروں کی! جے سنہری پنجروں کی!'' ان نعروں سے سارا جنگل گونج اٹھا اور ایک ایک کر کے سب پرندے ان پنجروں میں آگئے۔

چڑے نے چڑیا کی طرف دیکھا اور چڑیا نے چڑے کی طرف۔ چڑے نے کہا چوں چوں چوں یعنی جب سب ہی پنجروں میں رہنے کو جا رہے ہیں تو پھر ہم ہی کیا کر سکتے ہیں۔ چڑیا بولی۔

"چوں چوں یعنی جیسی تمہاری مرضی۔" یہ دونوں بھی پھدک کر اپنے سنہری پنجرے میں آ گئے۔

مگر یہ پنجرہ دراصل سونے کا نہیں تھا۔ صرف دھرم کا سنہری طلع کیا ہوا تھا۔ چند ہی روز میں طلع اتر گیا اور نیچے سے لوہے کی مضبوط کالی کالی سلاخیں نکل آئیں۔

چڑا لایا چاول کا دانہ۔ چڑیا لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی تو ایک بیچ بیچ کے سنہری پنجرے میں چڑھاوا چڑھایا گیا جس میں بھگوان کی مورتی بھی سب پرندوں کی طرح بند تھی۔ اور باقی کھچڑی چڑیمار کے گھر چلی گئی۔ چڑے چڑیا کے حصے میں ذرا سی جلی ہوئی کھرچن آئی۔ پھر بھی دونوں نے کہا بھگوان تیری کرپا ہے اور بھوکے پیٹ سو گئے۔

دن گزرتے گئے، چڑے اور چڑیا دونوں شروع میں تو پنجرے کی قید سے پریشان رہے مگر آہستہ آہستہ انھیں اس کی عادت پڑ گئی اور گو انھیں اب آزاد فضا میں اڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور گو ان کی کھچڑی کا زیادہ حصہ بھگوان کی مورتی اور چڑیمار کی نذر ہو جاتا تھا۔ پھر بھی وہ سوچتے قید میں ہیں تو کیا ہے محفوظ تو ہیں۔ مانا کہ پنجرے میں رہتے رہتے ان کے بازوؤں اور پروں میں اڑنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ مانا کہ یہ لوہے کا پنجرہ برسات میں ٹپکتا تھا۔ گرمی میں تپتا تھا اور سردی میں یخ بستہ ہوائیں اس کی تیلیوں میں سے آتی تھیں اور ان کو اپنے سیدھے سادے مگر آرام دہ گھونسلے کی یاد اکثر ستاتی مگر پھر وہ پنجرے کا شاندار کلس دیکھتے جس پر تھوڑا سا سنہری ملمع باقی رہ گیا تھا۔ پھر اس شاندار سنہری پنجرے کی طرف دیکھنے لگے جس میں بھگوان کی سنہری مورتی بند تھی اور اس رحم دل منصف مزاج چڑیمار کا خیال کرتے جو سنا تھا ایک محل میں رہتا ہے جس کی دیواریں ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی ہیں اور ان کے دل فخر سے بھر جاتے ہیں اور وہ اپنی بھوک اور قید کو بھول کر اس سنہری سنسکرتی اور تمدن کے بارے میں سوچنے لگتے جو ان کے جنگل کو تمام دنیا کے جنگلوں میں ممتاز کرتا تھا............

دن گزرتے گئے۔ برسات کے بعد لوہے کے پنجروں پر زنگ لگ گیا بھگوان کے سنہری پنجرے کی بھی ان وہ شان نہ رہی۔ پھر سنا کہ چڑیمار بدل گیا اور ان کے لیے اب نئے پنجرے آئیں گے۔ وہی چاپلوس الو پھر آیا اور سب پرندوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ایک عجیب سی بولی میں جو اس نے حال ہی میں سیکھی تھی۔ ہاں تو وہ کہنے لگا:

''برادرانِ وطن مژدہ ہو کہ وہ پرانا، جاہل، ظالم چڑیمار چلا گیا۔ اب ہمارے جنگل پر ایک ایسے سلطان کی حکومت ہے جو ظل اللہ ہے۔ شاہنشاہ نے حکم دیا ہے کہ تمام پرانے زنگ آلود پنجرے پھینک دیے جائیں ان کے بدلے آپ کو رہنے کے لیے نئے پنجرے ملیں گے جو خالص چاندی کے بنے ہوئے ہیں............''

اب ہر درخت کی ڈالی میں چاندی کے چمکتے ہوئے پنجرے لٹکے نظر آئے۔ ان کے اوپر مندر نما کلسوں کے بجائے مسجد نما گنبد تھے اور ان کی مضبوط سلاخوں کو محراب کی شکل دی گئی تھی۔

''روپہلی پنجرے زندہ باد! روپہلی پنجرے زندہ باد!!'' چاپلوس الو نے نعرہ بلند کیا اور سب پرندوں نے اس کا ساتھ دیا۔ سوائے چند کے۔ سب پرانے سنہری پنجروں کو چھوڑ کر نئے روپہلی پنجروں میں آ گئے۔

جس پنجرے میں بھگوان کی مورتی رکھی جاتی تھی اس کے بجائے ایک خوب صورت سا چاندی کا پنجرہ لٹکا دیا گیا۔ جو اندر سے خالی تھا۔ کہتے تھے کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ مگر چڑے چڑیا کو وہ خالی ہی نظر آتا تھا۔

روپہلی پنجروں کا دور بہت دنوں چلا۔ اس زمانہ میں بعض نہایت شاندار پنجرے بنائے گئے۔ سب سے خوب صورت پنجرا جو کئی برس کی محنت سے اور کئی کروڑ کی لاگت سے بنا، ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا اور اس میں جواہرات کی پچی کاری کی گئی تھی۔ اس پنجرے میں ایک نہایت خوب صورت فاختہ کی لاش رکھی گئی جو اپنی زندگی میں چڑیمار کو بہت پسند تھی۔ اس کو سب کہتے تھے 'پنجروں کا سرتاج'۔

چڑے چڑیا اب بھی پنجرے میں قید تھے۔ مذہبی چاندی کا ملمع اتر جانے کے بعد پنجرے کا پول کھل گیا تھا۔ دراصل یہ وہی پرانا لوہے کا پنجرا تھا۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ سونے کے بجائے اب اس پر چاندی کا ملمع ہو گیا تھا اور کلس توڑ کر اس کا گنبد بنا دیا گیا تھا۔ کھچڑی میں سے آدھے سے زیادہ حصہ اب بھی چڑیمار کے کارندے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ مگر جب چاندنی راتوں میں خوب صورت فاختہ کے مقبرہ والا پنجروں کا سرتاج اپنی نورانی شان سے چمکتا تو ہر پرندے کا دل فخر اور خوشی سے بھر جاتا۔ ہاتھی دانت کا یہ پنجرا ان کے تمدن کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھا کہ اس پر جتنا بھی

ناز کیا جاتا کم تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ رو پہلی پنجروں پر اب کچھ ویرانی ٹپکنے لگی۔ ایک بار پھر سنا کہ چڑیمار بدل گیا اور ان کے لیے اب نئے پنجرے سات سمندر پار سے آئیں گے۔ وہی چاپلوس الو پھر آیا اور سب پرندوں کو ایک غیر ملکی زبان میں مخاطب کر کے بولا۔

''پیپلز آف برڈ لینڈ! آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس پرانے چڑیمار کا راج ختم ہوگیا ہے۔ سات سمندر پار کے ایک منصف مزاج عادل اور رحم دل شہنشاہ نے آپ سب پرندوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ آج سے اس جنگل میں چڑیا اور عقاب ایک ہی گھاٹ پانی پئیں گے۔ میرا مطلب ہے ایک ہی پنجرے میں رہیں گے۔ ان پرانے فیشن کے ملمع کیے ہوئے پنجروں کو بھول جاؤ۔ آپ کے لیے ولایت سے ایلومینیم کے پنجرے آئے ہیں......

''تھری چیرز فار ایلومینیم کیجز! ہپ ہپ ہرّا''

نئے پنجرے واقعی دیکھنے کے قابل تھے۔ پالش کیا ہوا ایلومینیم میں آئینے کی طرح چہرہ نظر آجائے۔ اندر بجلی کے قمقمے لگے ہوئے، پردے لٹکے ہوئے، انڈے رکھنے کے لیے ریفریجریٹر۔ پروں کو دھونے اور صاف رکھنے کے لیے بجلی کی مشینیں، سنگھار میزیں۔ چڑیا کی چونچ پر لگانے کے لیے لپ اسٹک، چڑے کے سر کے بالوں میں لگانے کے لیے ولایتی تیل، بجلی کے باجے۔ جن میں سے نہایت سریلی چوں چوں چوں چوں سنائی دیتی تھی۔

سب پرندے ان عجائبات کو دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ جب چڑے نے کہا چوں چوں چوں چوں۔ یعنی اب زندگی کا مزہ آگیا۔ چڑیا نے کہا چوں چوں چوں چوں یعنی! یو سیڈ اٹ ڈارلنگ YOU SAID IT DARLING

مگر جب وہ پرانے پنجروں سے نکل کر ان نئے پنجروں میں داخل ہونے لگے تو وہ شاندار پنجرے آپ سے آپ پرے ہٹ گئے۔ وہ بڈھیا پنجرے الو اور ایسے ہی چند منحوس پرندوں کے لیے تھے۔ ان کی جگہ گھٹیا قسم کے پنجروں نے لے لی۔ قلعی کیا ہوا ایلومینیم کا اندر بجلی کی روشنی کے بجائے مٹی کے تیل کی لالٹینیں۔ خیر پھر بھی کچھ ٹیپ ٹاپ تھی ہی۔ چند روز تو لالٹینوں اور دیا سلائیوں کو حیرت سے دیکھتے گذر گئے۔

چڑا گیا چاول کا دانا لانے۔ چڑیا گئی دال کا دانہ لانے۔ مگر نہ اسے چاول کا دانہ ملا اور نہ اسے دال کا دانہ ملا۔ معلوم ہوا کہ سارے چاول اور ساری دال کو سات سمندر پار بھیج دیا گیا ہے۔ اب کھچڑی پکے تو کیسے؟............گھاس پوس پتے کھا کر کسی نہ کسی طرح گزارا کیا گیا.........مگر چند روز بعد کتنے ہی پرندے بھوک سے مرنے لگے۔ اس پر نئے پردیسی چڑیمار نے بدیشی زبان میں ایک اعلان نکالا کہ اس جنگل کے پرندے کھاتے زیادہ ہیں اس لیے ان کا پیٹ پھٹ کر مرنا لازی ہے۔ اس لیے پرندوں کو چاہیے کہ کم کھایا کریں۔

چڑیا نے کہا چوں چوں چوں یعنی سنا تم نے؟

چڑے نے کہا چوں چوں چوں۔ یعنی جھوٹے مکار کہیں کے! مگر اب کیا کیا جائے؟

''میں بتاتا ہوں'' ان کے ایک ہمسائے نے اپنے پنجرے سے آواز دی'' ہم چڑیمار کو مجبور کریں گے کہ ہماری کھچڑی ہمیں واپس ملے۔ یہی نہیں بلکہ ہم اسے پنجروں کے دروازے کھولنے پر بھی مجبور کر سکتے ہیں۔''

چڑے نے کہا'' چوں چوں چوں یعنی کیسے میرے بھائی؟ ہمیں بھی سمجھاؤ۔''

بڑوسی چڑے نے کہا'' تمام جنگل کی چڑیا کی کانفرنس بن گئی ہے۔ ہم سب اس کے ممبر ہیں۔ آج سے ہم اپنا انداز شروع کرتے ہیں۔ ہم اتنا شور مچائیں گے اتنا چلائیں گے کہ چڑیمار ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔

''چڑیا کانفرنس زندہ باد! چڑیا کانفرس زندہ باد!'' سب چلائے مگر چڑے نے پوچھا'' مگر بھائی! ہم کہیں گے کیا؟'' پڑوسی نے کہا'' نیتاؤں نے طے کرلیا ہے کہ ہمارا نعرہ آج سے یہی ہوگا'' ہمارا جنگل چھوڑ دو۔''

سو اس دن سے ہمارا جنگل چھوڑ دو کا اندولن شروع ہو گیا۔ لاکھوں چڑیوں کی چوں چوں مل کر ایک طوفانی آواز بن گئی۔ اس میں ہزاروں کوؤں کی کائیں کائیں۔ فاختاؤں کی کوکو۔ بدبد کی کھٹ کھٹ۔ الو کی ہو ہو۔ غرض تمام جنگل گونج اٹھا اور آخر کار چڑیمار کو ہار ماننی پڑی۔ اس نے چڑیا کانفرنس کے نیتاؤں سے سمجھوتہ کرلیا۔ چڑی مار نے پنجروں کے دروازے کھول دیے اور اعلان کردیا کہ میں جنگل چھوڑ کر جارہا ہوں............

سارے جنگل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آزاد جنگل زندہ باد! آزاد جنگل کی جے کے نعرے گونجنے لگے۔ پرندے پنجروں سے نکل کر ادھر ادھر اڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اڑنے کی عادت اور طاقت جاتی رہی تھی، پھدک پھدک کر رہ گئے——

ایک اور پتا یہ پڑی کہ طوطے جو اپنا رنگ سبز ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اور پرندوں سے الگ سمجھتے تھے انہوں نے ایک نیا نعرہ اٹھا دیا۔

"بٹ کے رہے گا جنگل تب ہو گا ہمارا منگل"

ان کا دعویٰ تھا کہ ایک چوتھائی جنگل۔ ہم طوطوں کو ملنا چاہیے تاکہ ہم اپنا آزاد طوطستان قائم کریں۔ اس پر کبوتر بگڑ بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی کبوتروں کو جہاں موقع ملا انھوں نے طوطوں کو چونچیں مار مار کر لہولہان کر دیا اور اسی طرح طوطوں کا جہاں بس چلا انھوں نے ٹھونگیں مار مار کر کبوتروں کا قلع قمع کر ڈالا۔ آخر کار اسی بدیشی چڑیمار نے بیچ بچاؤ کرایا اور کبوتروں کو بھی طوطستان قائم کرنے پر راضی کر لیا۔

جنگل کا بٹوارہ ہو گیا۔ طوطستان قائم ہو گیا۔ مگر اس سے کیا۔ پنجروں کے دروازے تو کھل گئے تھے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ابھی پرندوں کو اڑان کی عادت ہی نہ پڑی تھی۔ سوائے چند مَیناؤں کے جو نہایت صفائی سے پھر پھر اڑتے پھرتے تھے۔ اس پر مَیناؤں نے سب پرندوں کو سمجھایا کہ ابھی تمھیں آزاد فضا میں اڑنے کی عادت نہیں۔ کچھ دن اور پنجروں ہی میں رہو۔ اب یہ وہ پرانے غلامی کے پنجرے نہیں رہے۔ اب یہ آزاد پنجرے ہیں اور اس آزادی کا اعلان کرنے کے لیے انھوں نے حکم دیا کہ ہر پنجرے پر ایک ایک ترنگا لگا دیا جائے۔

چڑا گیا چاول کا دانا لینے مگر کہیں چاول نہ ملا، چڑیا گئی دال کا دانا لینے، مگر اس کو کہیں دال کا پتہ نہ ملا۔ سنا سارا اناج چند گدھوں اور چیلوں نے کالے پنجروں میں بند کر رکھا ہے۔ سب پرندے بھوکے مر رہے تھے اور کوئی کوئی تو کہتا اس سے تو وہ غلامی کا زمانہ ہی بہتر تھا۔ مگر چند تو آنکھیں بند کیے رٹ لگا رہے تھے۔ "بھوکے ہیں اگر تو کیا— آزاد تو ہیں۔"

چڑا بولا چوں چوں............... وہ کہنا چاہتا تھا "واہ ری آزادی" مگر چڑیا نے دبی آواز میں کہا۔ چوں چوں چوں یعنی چپ رہو نہیں تو کوئی پکڑ کر لے جائے گا۔ بات یہ تھی کہ چند لقا

کبوتروں نے جواب چڑی مار کا کام کر رہے تھے، یہ حکم لگا دیا تھا کہ چڑیوں کی چوں چوں بند کر دی جائے اور کسی کو چونچ کھولنے کی اجازت نہ دی جائے..........

اور اس طرح تمام جنگل پر سناٹا چھا گیا اور مدت تک چھایا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک باغی چڑے نے زور سے نعرہ لگایا۔ چوں چوں چوں چوں یعنی جنگل کے پرندو! ایک ہو جاؤ۔ پنجروں کے دروازے توڑ دو' اور پھر ایک لاکھ پرندوں کی ملی ہوئی آواز طوفان کی طرح اٹھی۔

انقلاب زندہ باد

پنجروں کے دروازے پرندوں کی چونچوں کی مار سے ٹوٹ گئے۔ ایک بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح پرندوں کا یہ دل بادل۔ ان گدھوں، الوؤں اور چیلوں پر ٹوٹ پڑا جو چڑی مار کے جان نشین بنے تھے اور سارے چاول اور ساری دال پر قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ جنگل میں چڑیا راج قائم ہو گیا۔

چڑا لایا چاول کا دانا۔ ایک نہیں بلکہ کئی دانے۔ چڑیا لائی دال کا دانا ایک نہیں کئی، مگر انھوں نے الگ کھچڑی نہیں پکائی، بلکہ سب چڑوں اور چڑیوں نے مل کر کھچڑی پکائی اور خوب ڈٹ کر کھائی اور مدت کے بعد چین آرام کی نیند سوئے۔

مگر اس جنگل کے آس پاس دوسرے جنگل بھی تو تھے۔ جہاں کے پرندے آزاد نہیں تھے، پنجروں میں بند تھے۔ وہاں اب بھی ظالم چڑی ماروں کا راج تھا یہ چڑی مار چڑیا راج کے سخت مخالف تھے۔ اس کو زک پہنچانے کے لیے انھوں نے ہر ممکن تدبیر کی۔ شکرے اور عقابوں کے دل بادل لے کر حملے کیے۔ گھونسوں اور چوہوں اور بجوؤں کو زمین کے نیچے نیچے بلوں کے راستے بھیجا کہ چڑیا راج کی جڑوں کو کھوکھلا کریں۔ ان کے الو ہو ہو کر کے چلائے" چڑیا راج مردہ باد" چڑیا راج مردہ باد"

چڑیا راج والے پریشان ہو گئے۔ پہلے تو انھوں نے یہ کہا کہ دشمنوں کو الوؤں سے بچنے کے لیے سخت قانون بنا دیے کہ کوئی چڑیا غیر قانونی چوں چوں نہ کر سکے نہ باہر جا سکے۔ اور بہت سے تیز نظر والے عقاب چھوڑ دیے کہ ہر چڑیا پر نگرانی رکھیں۔

چڑا بولا چوں چوں یعنی پھر تم نے یہ لال لپ اسٹک ہونٹوں پر ملی؟" چڑیا جلدی سے بولی

چوں چوں چوں یعنی آہستہ بولو۔کوئی سن نہ لے۔............'' چڑا خائف ہو کر خاموش ہو گیا۔.....

ان دشمنوں سے بچنے کے لیے چڑیا راج والوں نے اپنے جنگل کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر لیں تا کہ غیر نہ گھسنے پائیں نہ غیر کے الوؤں کی آواز ہی آپائے اور جب دشمنوں کے عقاب چڑیا راج کے اوپر منڈلانے لگے تو چڑیا راج کی حکومت نے دیواروں کے اوپر ایک چھت بھی ڈال دی۔............

اور غرض تمام چڑیا راج کا جنگل ایک عظیم الشان پنجرا بن کر رہ گیا۔جس کے اوپر ایک شاندار لال جھنڈا لہرا رہا تھا۔

چڑا بولا: چوں چوں چوں یعنی یہ پنجرا اور سب پنجروں سے بڑا اور بہتر ہے۔کھچڑی بھی کافی ملتی ہے۔مگر کیا چڑیوں کو ہمیشہ کسی نہ کسی چھوٹے یا بڑے پنجرے میں رہنا پڑے گا؟

چڑیا بولی چوں، چوں، چوں یعنی کھچڑی ملنا بہت ضروری ہے۔مگر چڑیوں کو چوں چوں کرنے کی اجازت بھی تو ہونی چاہیے۔............

چڑے چڑیا کی کہانی ختم ہو گئی۔یہ کہانی میں نے ایک فلسفی دوست کو سنائی۔سن کر بولے۔ اس خرافات کا مقصد! میں نے کہا'' آزادیٔ تحریر و تقریر کے سلسلے میں ایک جلسہ ہے اس میں سناؤں گا۔'' کہنے لگے'' آزادی؟ آزادی کس چڑیا کا نام ہے؟''

○

دھوئیں کی زنجیر

اس نے کہا ''عباس صاحب! یقین مانئے میں نے ڈھائی برس سے چکھی بھی نہیں ہے۔ مگر خیر آج آپ کی خاطر.........'' اور بیرے کو آواز دی:

''ایک بڑا پیگ لے آؤ۔ ہاں ہاں وہی انگریزی وہسکی کا اور کیا دیسی؟''

اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے ''اور آپ کیا پئیں گے؟''

''لیمن اسکواش''

''لاحول ولاقوۃ۔ آپ تو بالکل زاہد خشک نکلے۔ خیر آپ کی مرضی'' اور پھر بیرے کو حکم دینے کے بعد سگریٹ سلگاتے ہوئے ''آپ نہیں پیتے؟'' اچھا ہی کرتے ہیں۔'' ایک بار عادت پڑ جائے تو چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔'' یہ میرا ہی جگر تھا کہ دس برس پینے کے بعد ایک دم چھوڑ دی پورے ڈھائی سال ہو گئے ہیں......... بیرے نے گلاس سامنے لا کر رکھا اور سوڈا ڈالنے لگا۔ بس بس سوڈا نہیں چاہیے۔ جاؤ تم'' اور پھر گھونٹ لیتے ہوئے۔

''ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ اوہ خوب یاد آیا۔ ڈھائی برس ہو گئے ہیں اور ایک گھونٹ نہیں پیا۔ اسکاٹ لمیٹڈ اے سنگل بلڈی ڈراپ معاف کیجیے گا۔ بول چال میں انگریزی محاورے استعمال کرنے کی بڑی عادت پڑ گئی ہے۔ انگلش اسکول کا پڑھا ہوا ہوں نا.........

اس کے ایک ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا، اور دوسرے میں بلیک اینڈ وہائٹ کا سگریٹ اور میں نے دیکھا کہ دونوں ہاتھ رعشہ کی وجہ سے ہلکے ہلکے کانپ رہے ہیں اور ایک کانپتا ہوا ہاتھ منہ سے گلاس ہٹاتا ہے تو دوسرا ہاتھ سگریٹ کو منہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیال آتش حلق سے اترتے ہی دھواں بنتی جارہی ہے۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں سے ایسے کھیل رہا تھا جیسے کوئی سرکس کا مداری لوہے کے چھلوں یا رسّی کے گول گھیرے نے نکلتا ہے۔ کبھی ناک سے دھوئیں کی پچکاری چھوٹتی، کبھی گول کر کے دھوئیں کے حلقے چھوڑے جاتے اور جب یہ حلقے ایک دوسرے سے مل کر ایک طویل، لامتناہی دھوئیں کی زنجیر بن جاتے تو وہ اسے دیکھ کر اپنے کمال پر آپ ہی فخر یہ انداز میں مسکراتا۔

وہ لکھنؤ کے ایک بڑے تعلقہ دار کا منجھلا بیٹا تھا اور اس سے میری ملاقات اسی دن ہی ہوئی تھی۔ ملتے ہی اس نے کہا تھا" آپ...... آپ ہی ہیں عباس صاحب جنھوں نے وہ کتابیں لکھی ہیں؟ مجھے تو بڑی مدت سے آپ کی تلاش تھی۔ آج آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

اور پھر مجھے کمرے کے دوسرے کونے میں لے جا کر۔

"بھائی صاحب سنیں گے تو میرا مذاق اڑائیں گے۔ دراصل مجھے چند ادبی معاملات میں آپ کا مشورہ درکار ہے اور آپ کے سوا مجھے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا جو مجھے صحیح راستے پر لگا سکے۔ میری آئندہ زندگی کا دارومدار آپ کے مشورے پر ہے۔"

اس کے بہنوئی کا بھائی میرا دوست ہے۔ اس لیے انکار کرنا مشکل ہو گیا اور میں نے اس کی دعوت منظور کر لی کہ شام اکٹھی گذاریں گے۔ میں نے سوچا آج اس نوجوان تعلقہ دار کی صحبت میں یہ بھی دیکھ لیا کہ 'شام اودھ' کس قدر رنگین ہے۔

'شام اودھ' کی ابتدا ہوئی چینا بار سے۔

حضرت گنج میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں، ریشمی ساڑیاں جھلملا رہی تھیں، حسین چہروں کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ کافی ہاؤس میں طالب علموں شاعروں، اخبار نویسوں کا مجمع تھا۔ ایک سینما کے سامنے کھیل کود کے شوقین اولمپک کا فلم دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ ایک دوسرے سینما پر روسی فلم

TRIUMPH OF YOUTH دکھائی جارہی تھی۔ نوجوان جوڑے نکتہ چیں نگاہوں سے بچ کر سے فیئر ریستوراں میں خوش گپیوں کے چند لمحے گزارنے جارہے تھے۔ امین آباد میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دیوالی کی رنگا رنگ مٹھائیوں سے حلوائیوں کی دوکانیں سجی ہوئی تھیں۔ بچے کھلونوں کی دکانوں پر بھیڑ لگائے تھے مگر میرے نئے دوست کی مہربانی سے میری شام اودھ کی ابتداء ایک تنگ و تاریک وہسکی اور بیئر کی بو میں بسے ہوئے بار سے ہوئی۔

'عباس صاحب! ایک بات بتایئے'

'فرمایئے'

میرے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایئے کہ میری عمر کتنی ہے؟

میں نے غور سے دیکھا وہ اچھا خاصا خوب صورت جوان تھا۔ گورا رنگ، فلم اسٹاروں جیسی پتلی مونچھیں، گھونگر والے بال، مناسب ناک نقشہ مگر آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، داہنے ہاتھ کی دو انگلیاں سگریٹ کے دھوئیں سے سیاہی مائل زرد۔ میں نے ایسے ہی اٹل ٹپ جواب دیا۔

''کوئی اٹھائیس برس''

دیکھا! آپ بھی دھوکہ کھا گئے نا؟ میری عمر صرف ۲۴ سال کی ہے پچھلے سال ہی تو بی۔ اے کا امتحان دیا ہے۔ ہمارے امتحان کا بھی عجیب قصہ ہے جناب۔ اکنامکس میں ہم فیل مگر انگریزی میں نمبر اول۔ جس پروفیسر کے پاس انگریزی کا پرچہ تھا، وہ خود انگریز۔ میری کاپی دیکھ کر اس نے وائس چانسلر سے کہا ''میں اس لڑکے کا لکھا ہوا مضمون ولایت کے کسی رسالے میں چھپنے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ وہاں کے طالب علم دیکھیں کہ ہندوستانی لڑکے کتنی اچھی انگریزی لکھ سکتے ہیں۔ اب آپ سوچیں گے، اس کمبخت کو اتنی اچھی انگریزی لکھنا کیسے آ گیا؟ تو بات یہ ہے عباس صاحب کہ میں انگریزی اسکول کا پڑھا ہوا ہوں نا......''

پہلا پیگ ختم ہو چکا تھا۔ بیرے نے پوچھنا غیر ضروری سمجھا اور دوسرا پیگ گلاس میں ڈال گیا اور قریب سوڈے کی ایک بوتل رکھ کر چلا گیا۔

دیکھا آپ نے! پوچھا بھی نہیں اور دوسرا پیگ ڈال گیا۔ حالانکہ میں صرف ایک ہی پیگ پینے کے ارادے سے آیا تھا اور وہ بھی آپ کی خاطر۔ دراصل میں نے تو پینا چھوڑ ہی دیا ہے۔

بری بلا ہے۔ اچھے خاصے آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ ڈورین کہا کرتی تھی کہ نواب ڈارلنگ............اسکول میں مجھے سب نواب نواب ہی کہتے تھے............ہاں تو ڈورین کہا کرتی تھی نواب ڈارلنگ، تم پہلا پیگ پیتے ہو تو بڑے حسین نظر آتے ہو جب دوسرا پیگ پی لیتے ہو تو بڑے خونخوار نظر آتے ہو اور جب تیسرا پی لیتے ہو تو اُلّو معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے تم بس ایک ہی پیگ پیا کرو۔ عجیب لڑکی تھی وہ بھی۔ مجھے کبھی کبھی فیری پرنس............آپ مطلب سمجھے نا؟ پریوں کا شہزادہ............بھی کہا کرتی اور میں اسے کہتا مائی سوئٹ سنڈریلا۔ وہ ذرا غریب لڑکی تھی نا۔ ایک اینگلو انڈین ڈرائیور کی بیٹی۔ نینی تال میں ہمارے اسکول کے قریب ہی لڑکیوں کا کانونٹ تھا وہاں وہ پڑھتی تھی، میں اس وقت کوئی چودہ یا پندرہ برس کا تھا اور وہ شاید سولہ برس کی۔ ایک رات کو ڈانس میں ملاقات ہوگئی۔ خدا جانے کیوں پہلی ملاقات ہی میں وہ میری طرف کھنچی چلی آئی، نہ جانے مجھ میں کیا مقناطیسی کشش تھی عباس صاحب؟ ایمان سے بتایئے گا۔ ہے مجھ میں کوئی مقناطیسیت کہ لڑکیاں ہمیشہ کھنچی ہی چلی آتی ہیں؟............

میں نے کہا ”شاید آپ کے روپے میں کوئی مقناطیسیت ہو“

”آپ سچ کہتے ہیں۔ یہ اینگلو انڈین لڑکیاں ہوتی ہیں گولڈ ڈگرز مگر یقین مانئے ڈورین ایسی نہیں تھی۔ اسے مجھ سے سچی محبت تھی۔............“

”اور آپ کو؟“

”میں تو بچہ تھا بالکل۔ محبت وحبت جانتا ہی نہیں۔ خیر اب اس بے چاری کا کیا ذکر۔ تین برس ہوئے اس کی شادی ایک پولیس سارجنٹ سے ہوگئی مگر اب بھی ہر سال کرسمس کارڈ ضرور بھیجتی ہے اور جانتے ہیں اس پر کیا لکھا ہوتا ہے؟ لکھا ہوتا ہے ’ٹو مائی فیری پرنس۔‘“

دوسرا پیگ کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نظر خالی گلاس پر ڈالی اور پھر چلّایا ”بوائے، بوائے!!“

جب بیرا بھاگتا ہوا آیا تو اسے ڈانٹا ”اندھے ہو، دیکھتے نہیں گلاس کب سے خالی پڑا ہوا ہے؟“

بیرا بھاگ کر وہسکی کی بوتل لایا، ایک پیگ انڈیلا۔ سوڈا ڈالنے لگا تو بس بس کہہ کر روک دیا گیا۔

عباس صاحب، اچھا کرتے ہیں آپ پیتے نہیں۔ مگر کبھی پینے پلانے کا شوق کریں تو ایک بات یاد رکھیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ سُر ور ہو مگر نشہ نہ چڑھے اور اگلے روز ہینگ اوور نہ ہو تو وہسکی میں زیادہ سوڈا کبھی نہ ڈالیے گا۔ نشہ دراصل وہسکی سے نہیں اس کمبخت سوڈے سے ہوتا ہے یہ نسخہ خدا بخشے ہمارے چچا جان مرحوم نے بتایا تھا۔ پہلی بار شراب بھی انہوں نے ہی پلائی۔ میں اس وقت بارہ برس کا تھا۔ شراب کا نام سنا تھا مگر کبھی چکھی نہ تھی۔ چچا جان قبلہ یعنی نواب صاحب سکرام پور.................. آپ نے نام تو ضرور سنا ہوگا...... ہاں تو ان کے ہاں جلسہ تھا۔ درجنوں طائفے بلوائے گئے تھے۔ سارے محل میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ منی طوائف ان دنوں میں بڑی مشہور تھی۔ وہ نواب صاحب کے سامنے ناچ رہی تھی اور دو کنیزیں باری باری انھیں جام بھر بھر کر دے رہی تھیں۔ ہم لڑکے چھپ کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ منی کم بخت اپنی بھڑکیلی پشواز میں ایسی بھلی لگی کہ میں بے خیالی میں دروازے میں سے اندر آ گیا تا کہ اسے ناچتے ہوئے اچھی طرح سے دیکھ سکوں۔ شامت جو آئی تو نواب صاحب کی نظر کہیں مجھ پر پڑ گئی۔ وہیں سے آواز دی۔ ''منن بٹیا یہاں آؤ'' گھر میں سب مجھے منن منن ہی کہتے ہیں۔ ہاں تو انھوں نے آواز دی تو مجھے جانا ہی پڑا۔ دل ہی دل میں ڈرتا کانپتا ان کے پاس پہنچا، تو جام میری طرف بڑھا کے بولے ''لو پیو'' میری جھجک دیکھ کر سب ہنس پڑے۔ منی بھی گانا بند کر کے ہنسنے لگی۔ بولی ''نواب صاحب! اجازت ہو تو چھوٹے میاں کو میں اپنے ہاتھ سے پلاؤں۔'' نواب صاحب نے اشارہ کیا تو منی نے اپنے ہاتھوں سے پیگ انڈیلا۔ اس میں سوڈا ڈال ہی رہی تھی کہ نواب صاحب نے روک دیا ''بس بس زیادہ سوڈے سے نشہ چڑھ جاتا ہے۔ لے لو منن بہادر ہے تو اللہ کا نام لے کر پی جا اور یہ بات گرہ میں باندھ لے کہ جتنی وہسکی ہو اس سے زیادہ مقدار سوڈے کی نہ ہو تو کبھی نشہ نہ ہوگا اور منی نے میری طرف جام بڑھا کر بڑے پیار سے کہا'' لے بیٹا پہلا جام مبارک ہو'' میں چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ اب تو کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ آنکھ بند کر کے غٹ غٹ پی گیا......

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش رہا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے منہ سے سگریٹ کے دھوئیں سے حلقے نکلتے رہے۔ ایک دوسرے سے مل کر زنجیریں بناتے رہے اور وہ چپ چاپ بیٹھا

ایسے گھورتا رہا جیسے وہ اس دھوئیں کی زنجیر میں بندھا ہوا ہے اور اس سے چھٹکارا اس کے لیے ناممکن ہو۔

سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال کر جہاں پہلے ہی لاتعداد سگریٹوں کی لاشیں پڑی پانی میں گل رہی تھیں، وہ دوسرا سگریٹ جلانا بھول گیا اور اس کی نظر گلاس کی طرف بھی نہ گئی جو خالی رکھا ہوا چوتھے پیگ کا انتظار کر رہا تھا۔ دھوئیں کی زنجیر ٹوٹ کر ایک دھندلا سا غبار کمرے میں چھا گیا اور اس کی آواز جیسے اس دھند کی تہ میں سے آئی۔

''عباس صاحب! یہ سب سن کر آپ ضرور مجھ سے، میرے خاندان سے بلکہ تمام تعلقہ داری نظام سے نفرت کر رہے ہوں گے......مجھ میں ایک اچھا جرنلسٹ بننے کا مادہ موجود ہے۔ آپ اسے شاید شیخی اور خودستائی سمجھیں مگر میرا خیال ہے کہ کم سے کم یو۔ پی میں بہت تھوڑے لوگ ہیں جو مجھ سے بہتر انگریزی لکھ سکتے ہیں۔ پائنیر تو آپ ضرور پڑھتے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''بمبئی میں پائنیر'' نہیں پہنچتا۔''

اس نے چوتھے پیگ کا دوسرا گھونٹ پیتے ہوئے کہا تبھی تو آپ میرے نام سے ناواقف رہے۔ ورنہ 1945-46 میں کوئی دن نہیں گذرتا تھا جب میرا آرٹیکل ''پائنیر'' میں نہ چھپتا رہا ہو۔ ایڈیٹر کے نام خط ہوتے ہیں نا۔ بس اسی کالم میں روز میرا آرٹیکل دھرا رہتا تھا۔ کیلی صاحب.......... آپ تو جانتے ہوں گے ''پائنیر'' کے ایڈیٹر تھے۔ پارسال تک بڑا شریف انگریز تھا صاحب...... ہاں تو کیلی صاحب بڑی تعریف کرتے تھے میری لکھائی کی۔ کہتے تھے بڑا منجھا ہوا اسٹائل ہے تمھارا۔'' بات یہ ہے عباس صاحب کہ انگریزی میں ذرا اچھی لکھ لیتا ہوں۔ وہ انگلش اسکول کا پڑھا ہوا ہوں نا..........''

میں نے پوچھا عام طور پر کن کن موضوعات پر خط...... میرا مطلب ہے مضمون...... لکھتے تھے آپ؟

ایک ہو تو بتاؤں۔ چین، جاپان، پیلسطائن، لیگ آف نیشنز، اٹلانٹک چارٹر۔ زمیندارا بل۔ شریعت بل۔ ہندی اردو، ہندوستانی ایٹم بم، کوئی موضوع دے دیجیے اور پانچ گھنٹے میں مضمون تیار۔ میں آپ کو اپنے مضامین کا فائل دکھاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور پسند کریں گے۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ مریضوں سے کوئی نفرت نہیں کیا کرتا۔ خواہ وہ کیسے ہی خبیث مرض میں کیوں نہ گرفتار ہوں اور خصوصاً ایسے مریضوں سے جو قریب المرگ ہوں۔"

مگر وہ بولتا گیا۔

"اور واقعی ہم ہیں نفرت کے قابل۔ آخر ہمیں کیا حق ہے زندہ رہنے کا۔ ہم اس سماج کی جونکیں ہیں جونکیں۔ ہم خون چوستے ہیں۔ میں نے خود اپنی ریاست میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تعلقہ دار کسانوں پر کتنے ظلم ڈھاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، ہماری عیاشیوں کے لیے کہاں سے روپیہ آتا ہے؟ ہمارے سنگ مرمر کے محلوں کے لیے؟ ہمارے بڑھیا کپڑوں کے لیے؟ ناچ رنگ، رنڈیوں، طوائفوں، شراب.................."

سوالیہ نشان اس کے ہونٹوں پر بنے کا بنا رہا گیا۔ جیسے ہی اس کی نظر گلاس پر پڑی جو خالی تھا اور کب سے چوتھے پیگ کے لیے منتظر۔

'بوائے' سارے بار میں اس کی بلند آواز گونجی، ایک نیا سگریٹ جلا کر دھوئیں کی زنجیر کو اپنے گرد پھیلاتے ہوئے وہ بولا" عباس صاحب! اس ناپاک ماحول سے آپ ہی مجھے نکال سکتے ہیں۔ صرف آپ۔ میں گھر بار، تعلقہ داری، زمینداری چھوڑ کر بمبئی آنا چاہتا ہوں جرنلزم سے روزی کمانا چاہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں میں سمجھتا ہوں کہ آپ مدد کریں گے۔"

میں نے کہا' میں بڑے شوق سے اس کے مضامین پڑھوں گا۔"

"مگر عباس صاحب! ایک بات ہے۔ اس زمانے میں میں بڑا پکا مسلم لیگی ہوا کرتا تھا۔ اس لیے ان مضامین کے سیاسی نقطۂ نظر کو آپ پسند نہ کریں گے، مگر زبان اور اسٹائل کی داد ضرور دیں گے۔ میں نے خود لیگ ویگ کو چھوڑ دیا ہے۔ پاکستان بھی چند ہفتے کے لیے گیا تھا، بھائی صاحب کوئی بزنس شروع کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہمیں کچھ جچا نہیں۔ سو واپس چلا آیا۔ مگر سچ پوچھیے تو میرے خیالات میں سب سے بڑا انقلاب مہاتما گاندھی کی شہادت سے آیا ہے۔ جس وقت ان کے قتل کی خبر آئی ہے میں بالکل سن سے ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرے فرقہ وارانہ تعصبات کا محل اڑاڑا دھم کر کے گر گیا ہو۔ کیا عظیم الشان شہادت تھی ان کی۔ اس دن سے میں نے گاندھی کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جانتے ہیں وہ پڑھ کر میں کس نتیجے پر پہنچا؟"

اس عرصے میں نہ جانے کس وقت بیرا پانچواں پیگ گلاس میں ڈال گیا تھا۔ وہ وہسکی میں چند بوندیں سوڈے کی ڈالنے کے لیے ایک لمحے کے لیے رکا۔ سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا اور اپنا بیان جاری رکھا۔

گاندھی جی کی تحریریں پڑھنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میرے اندھیرے دماغ میں ایک دم روشنی ہوگئی ہو۔ میں نے سوچا اس دنیا میں بہت سی منحوس طاقتیں ہیں، سامراج ہے۔ سرمایہ داری ہے ظلم اور تشدد ہے۔ جنگ اور ایٹم بم ہے۔ مگر ایک اور طاقت بھی ہے جو ان سب پر بھاری ہے۔ بتایئے کون سی طاقت ہوگی؟''

میں نے کہا ''شاید آپ کا مطلب عوام کے ایکے اور اتحاد سے ہے۔''

نہیں نہیں، جس اٹل طاقت کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ محبت کی طاقت ہے۔ گاندھی جی نے مر کر ثابت کر دیا ہے کہ صرف محبت ہی نفرت اور تشدد، سامراج اور فرقہ پرستی کے تعصبات پر غالب آسکتی ہے۔ اس دن سے اگر میں کسی ازم کا قائل ہوں تو وہ محبت ازم ہے۔''

اور پھر دفعتاً عباس صاحب! ایک بات بتایئے۔

''فرمایئے''

''آپ نے کبھی محبت کی ہے؟''

میں نے اقرار کیا کہ 'میں اس جرم کا مرتکب ہو چکا ہوں'

اس نے چھٹے پیگ میں برابر کی مقدار میں سوڈا ملاتے ہوئے کہا.

چھوڑیے صاحب۔ آپ جیسے زاہد خشک نے کیا محبت کی ہوگی محبت کچھ ہم نے کی ہے۔

''میں نے کہا اس میں کیا شک ہے۔''

''پہلے تو صاحب آپ ہماری پہلی محبت کا افسانہ سنئے۔ وہ ڈورین والی نہیں۔ وہ تو یوں ہی بچوں کا کھیل تھا۔ یہ زیبو والی محبت تو کچھ اور ہی خوفناک چیز تھی۔ صاحب وہ معاملہ یوں ہوا کہ جاڑے کے موسم میں چند ہفتے کے لیے نئی دہلی ٹھہرا ہوا تھا۔ بھائی صاحب کے ایک دوست کے ہاں۔ ان کی ایک بڑی قالینوں کی دوکان تھی۔ ہمارے یہاں قالین انھیں کے ہاں سے آتے تھے۔ اسی طرح دوستی بھی ہوگئی تھی۔ ان کی دوکان کناٹ پلیس میں تھی۔ منظور اینڈ کمپنی۔ آپ نے

بورڈ تو دیکھا ہوگا۔ اب تو خیر پاکستان چلے گئے ہیں۔ یہ 1944 کا ذکر ہے، دوکان کے اوپر ہی ان کی فلیٹ تھی۔ جس میں ایک کمرہ مجھے دیا ہوا تھا کیونکہ ان کی بیوی اور بیٹی پردہ کرتی تھیں۔ اس لیے میں زیادہ تر وقت نیچے دوکان ہی میں گزارتا تھا۔ ایک دن منظور صاحب تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں اکیلا ہی دوکان پر بیٹھا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اوپر کی مہترانی چلی آرہی ہے۔ سیدھی میرے پاس آکر کہنے لگی ''میاں! آپ سے کچھ کہنا ہے۔ پاس دو چار آدمی اور بھی بیٹھے تھے، وہ ہنسنے لگے، میں بھی کھسیانا ہوگیا۔ آپ ہی سوچئے آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔ خیر میں وہاں سے ہٹ کر اسے الگ لے گیا تو وہ کہتی ہے ''میاں! صاحبزادی پر رحم کھایے ورنہ وہ جان دے دے گی۔'' میں نے کہا'' میں نے کیا ظلم کیا ہے؟ میں نے تو ان کی شکل بھی نہیں دیکھی۔'' وہ بولی یہ ان سے پوچھئے گا۔ مہربانی کر کے اوپر اپنے کمرے میں تشریف لے چلیے۔ ان کی اماں اس وقت باہر ہیں۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔ اوپر اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ موجود۔ شاید سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت جیسے میدہ اور شہاب۔ نرگسی آنکھیں دیکھتے ہی قدموں میں گر پڑی۔ کہنے لگی شادی نہ کیجیے، لونڈی بنا کر رکھ لیجیے مگر اپنے سے جدا نہ کیجیے۔'' یہ سن کر میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ سوچا اس کے باپ نے دیکھا تو خیر نہیں۔ وہ روئے جارہی تھی۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اسے چپ کرایا، اس دن سے تو صاحب جب موقع ملتا وہ میرے کمرے میں آجاتی۔ ایک دن کہنے لگی ''مجھے بھگا کر لے چلو'' میں نے کہا ''مجھ میں تو ہمت نہیں ہے۔ آپ ہی مجھے بھگا لے چلیں تو کام بنے...... عباس صاحب آپ ہی بتایے، آخر میری صورت میں ایسا کیا جادو ہے کہ وہ اس طرح لٹو ہوگئی۔

سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہ تھی، ساتواں پیگ سامنے موجود تھا، اس نے ایک گھونٹ پیتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا، مگر قسم لے لیجیے جو میں نے اسے بری نگاہ سے دیکھا ہو۔ حالانکہ وہ تھی بڑی خوب صورت۔ زبیدہ نام تھا مگر اسے زبو زبو کہتے تھے۔ بات یہ ہے کہ میں اس کے باپ سے ڈرتا تھا۔ اول تو پنجابی دوسرے بڑے بھائی کا دوست اور تیسرے یہ کہ بڑا چارسوبیس مشہور تھا۔ کوئی دس دن کے بعد میرے کمرے میں آئی تو مجھے قمیض اٹھا کر دکھایا کہ کمر پر نیل اور زخم پڑے ہوئے ہیں جہاں اس کے باپ نے اسے کوڑوں سے مارا تھا.......... اب آپ ہی بتایے کرتا تو کیا کرتا۔

'اس سے شادی'

'توبہ کیجیے صاحب، اس کے باپ کی صورت سے تو میں ڈرتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی بیٹی کی چمڑی ادھیڑ دی ہے تو میں نے سوچا میرے پیچھے پڑ گیا تو نہ جانے کیا حال بنائے گا۔ سو میں تو اسی رات کو سامان وہیں چھوڑ کر ریل میں سوار ہو کر لکھنؤ آ گیا، وہ دن اور آج کا دن۔ دہلی کا رخ نہیں کیا۔ عباس صاحب! سچ کہیے۔ اس واقعے کو افسانہ بنا کر لکھ دوں تو کیسا رہے۔ میرے خیال میں ایسا زوردار افسانہ آج تک تو ہندوستان میں لکھا نہیں گیا اور ایک یہی واقعہ تھوڑا ہی ہے۔ اپنی تو ساری زندگی ایک افسانہ رہی ہے آپ کو سنانے بیٹھوں تو ساری رات ختم ہو جائے گی مگر اب دل کھٹا ہو گیا ہے محبت بھی کر کے دیکھ لی اور عیاشی بھی کچھ کم نہیں کی، آپ سے جھوٹ کیوں بولوں جو کچھ زمیندار تعلقہ دار کرتے آئے ہیں سب کچھ کیا ہے۔ مگر ڈھائی برس ہوئے دل اس طرح ٹوٹا کہ دنیا سے بیزار ہو گیا۔ اس دن سے شراب تک چھوڑ دی۔ بس آج ہی آپ کی خاطر دو ایک پیگ پی لیے ہیں............

اس کے سامنے آٹھواں پیگ رکھا تھا، اس نے گلاس اٹھایا۔ اس میں سوڈا ملایا۔ چکھا، پھر رکھ دیا۔ ایک نیا سگریٹ جلایا۔ دھوئیں کی زنجیر پھر اس کے گرد پھیل گئی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا اور کسی فلمی مکالمے کو دہراتے ہوئے کہا:

''میں سمجھتا ہوں کہ دل پر چوٹ لگنے کے بعد ہی انسان انسان بنتا ہے اور اس کے بعد رائٹر تو بن ہی نہیں سکتا............ جب سے شکنتلا اور میری محبت کا رشتہ ٹوٹا ہے۔ پوچھیے مت، میرے دل پر کیا گزری ہے مگر اس دن سے حال یہ ہو گیا ہے کہ آج غزل دماغ میں آ رہی ہے تو کل افسانہ اور پرسوں مضمون............ دراصل سچی محبت میں نے عمر میں ایک بار صرف شکنتلا ہی سے کی ہے۔ آپ نے راجکماری شکنتلا آف دیونگر کو تو ضرور دیکھا ہوگا، تاج وغیرہ میں۔'

میں نے اسے بتایا کہ مجھے تاج وغیرہ میں جانے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔

'تو تصویر تو ضرور دیکھی ہوگی۔ ریس کورس۔ گورنمنٹ ہاؤس کی گارڈن پارٹی ہر جگہ ہی تو وہ موجود رہتی ہے اور ON LOOKER وغیرہ میں تصویریں برابر نکلتی رہتی ہیں۔ اپنی ملاقات بھی اس سے عجیب طرح ہوئی۔ اس سیزن میں ہم سب بھائی بہن مسوری میں ایک کوٹھی لے کر ٹھہرے

CABRET ہوئے تھے۔ مسوری کی زندگی تو آپ جانتے ہی ہیں۔ دن بھر تاش کھیلتے شام کو کیبرے رات کو ڈنر اور ڈانس۔ آج یہاں مدعو ہیں تو کل وہاں۔ بال روم ڈانس میں ذرا اچھا کر لیتا ہوں بچپن سے مشق کی ہے، وہ انگلش اسکول کا پڑھا ہوا ہوں نا——بیرے کو دیکھ کر وہ رک گیا۔

''اچھا ڈالو'' اس نے کہا'' تیسرا پیگ بھی پی لو''، حالانکہ بیرا اس کے گلاس میں نواں پیگ ڈال رہا تھا۔

''ہاں تو عباس صاحب! راج کماری شکنتلا ان دنوں ولایت سے پڑھ کر نئی نئی آئی تھی، اس کے ناچ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک دن مجھے ڈانس کرتے دیکھ لیا، بس اپنی سہیلیوں سے کہنے لگی ''سارے ہندوستان میں کوئی ڈانس کرنا جانتا ہے تو یہ لڑکا ہے۔ یہ کون ہے مجھ سے ملاؤ ذرا'' کسی دوست نے ہماری ملاقات کرادی۔ بس صاحب اس دن سے ہمارا ایسا جوڑا بنا کہ ہر ڈانس میں اکٹھے ہوتے۔ آہستہ آہستہ محبت بھی ہوگئی۔ شکنتلا تھی بھی محبت کے قابل۔ ایک تو خوب صورت پھر ولایت کی پڑھی ہوئی۔ انگریزی شاعری کا تو بڑا شوق تھا اسے۔ کسی دن اس کے خط دکھاؤں گا آپ کو۔ لٹریچر لکھتی تھی لٹریچر۔ آپ پڑھیں گے تو کہیں گے ان کو تو شائع کرنا چاہیے۔ میں کبھی ناول لکھوں گا تو ان خطوط کو اس میں ضرور استعمال کروں گا۔ آپ کے خیال میں ناول کتنے مہینوں میں لکھا جاسکتا ہے؟ میرا دعویٰ ہے کہ میں دو مہینے میں لکھ سکتا ہوں۔ پلاٹ تو آپ جانتے ہی ہیں بنا بنایا تیار ہے اور خدا کے فضل سے قلم میں روانی بھی ہے۔ بس آپ کی تھوڑی سی ایڈوائس کی ضرورت ہے۔..........

''آپ چند اچھے ناول نویسوں کے شاہکاروں کا مطالعہ کریں تو بہت مناسب ہوگا'' میں نے مشورہ دیا۔

''وہ تو سب میرے پڑھے ہوئے ہیں۔ موپاساں کو تو چاٹ گیا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ فرانسیسی مصنف نے عورت کے کردار کو جس طرح پیش کیا ہے، وہ اسی کا حصہ تھا۔ رہ گئے ہندوستانی مصنف تو صاف بات ہے کہ میں ان میں سے کسی کا قائل نہیں ہوں۔ مگر آپ کے کرشن چندر وغیرہ بس یوں ہی ہیں، ہاں! آپ کا میں کافی قائل ہوں، مگر آپ کے ہاں گہرے نفسیاتی تجربے کی بڑی کمی ہے اور وہ میں پوری کرسکتا ہوں۔ اگر میرے تجربے کو آپ کے قلم کی روانی مل جائے تو کوئی ہمارے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں آپ کو انسانوں

کے لیے مواد دیتا ہوں اور آپ افسانے لکھتے رہیں...............''

میں نے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ مواد تو آپ اس وقت بھی کافی سے زیادہ مہیا کر رہے ہیں۔

''عباس صاحب! سچ بات یہ ہے کہ دنیا سچی محبت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ شکنتلا کو مجھ سے کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ ہندو ہوتے ہوئے مجھ سے شادی کرنے کو تیار تھی۔ اور تو اور مجھے اپنے باپ یعنی راجہ صاحب کا اے۔ ڈی۔ سی مقرر کرا دیا۔ مگر دنیا کو یہ کب گوارا تھا چغلیاں، شکایتیں ہونے لگیں۔ میری کچھ تصویریں تھیں۔ ایک یہیں لکھنؤ کی بڑی حسین طوائف ہے، اس کے ساتھ، کیا نام ہے اس کا، بڑا اچھا سا نام ہے...... لاحول ولا قوۃ یاد ہی نہیں آتا۔ ہاں تو ایک زمانے میں ہمارا آنا جانا تھا اس کے ہاں۔ محبت ؤ حبت تو خیر رنڈیوں کے ساتھ کیا ہو سکتی ہے مگر ہاں، پسند تھی ہمیں وہ۔ مذاق مذاق میں اس کے ساتھ چند تصویریں کھنچوائی تھیں۔ رقیبوں نے وہ تصویریں شکنتلا کے پاس پہنچا دیں اور نہ جانے کیا کیا کان بھرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجا صاحب نے راتوں رات اسے مسوری سے پیرس بھجوا دیا اور میں لاکھ ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن ہمارے ابا نے ہمیں پیرس نہ جانے دیا...... بڑی بڑی چوٹیں کھائی ہیں صاحب محبت کے اس میدان میں......''

بار کے بند ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ بیرا بل لے آیا۔ وہ بگڑ گیا ''تمہاری یہ مجال کہ ہمیں بار سے نکالتے ہو۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟'' اس تو تو میں میں میں منیجر آ گیا۔ اس نے کہا مجھے سرکاری آرڈر ہے بارہ بجے بار بند کرنے کا ورنہ مجھ پر جرمانہ ہو جائے گا۔ اگر آپ نہیں جائیں گے تو مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔''

پولیس کا نام سن کر میرا دوست ٹھنڈا پڑ گیا۔ ''اچھا اچھا جاتے ہیں'' کہہ کر اس نے دسویں پیگ کا آخری گھونٹ چڑھایا۔ بل ادا کیا اور کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چل کھڑا ہوا۔

''معاف کیجیے گا عباس صاحب! مگر دنیا بدل رہی ہے۔ آج ہم تعلقہ داروں کی یہ نوبت آ گئی ہے کہ پولیس کا سپاہی ڈانٹ سکتا ہے۔ ورنہ ہمارے دادا کے وقت میں...... خیر پدرم سلطان بود۔ ہمیں کیا؟ اور سچ یہ ہے عباس صاحب کہ تعلقہ داری، زمینداری ختم ہو رہی ہے، اچھا ہی ہو رہا ہے۔ آخر کیوں ہمیں خون چوسنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ ہم نے رعیت کا خون چوسا کانگریس ہمیں ختم کر رہی ہے اور کل کانگریس

کو کمیونسٹ ختم کریں گے۔ چین میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس یہ کانگریس والے زیادہ سے زیادہ پانچ برس کے مہمان ہیں۔ مگر ان کے حق میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ معاوضہ برا نہیں دے رہے ہیں۔ بے کار زمین کے بدلے نقد روپیہ۔ میں نے تو سوچ لیا ہے۔ بیس تیس ہزار جو کچھ ملے گا وہ لے کر بمبئی آجاؤں گا اور ہم آپ مل کر جرنلزم کریں گے۔ میں اور آپ۔ آپ اور میں..........." اور یہ کہہ کر حضرت گنج کی سڑک کے بیچوں بیچ مجھ سے گلے ملنا شروع کردیا۔" میں اور آپ آپ اور میں۔"

"ارے غن میاں! یہاں آپ کیا کر رہے ہیں؟" یہ ایک میلی سی شیروانی پہنے ہوئے دبلا پتلا کالا سا نوجوان تھا۔

"کون؟ ارے تو پچن۔ تو کیا کر رہا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے مجھ چھوڑ کر اس نو وارد سے گلے ملنا شروع کردیا۔ وہ بھی چند پیگ پئے ہوئے تھا۔ کیونکہ معانقے میں دونوں طرف سے خوب گرم جوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"غن میاں چلتے ہو چوک میں؟"

"چوک ووک میں جانا چھوڑ دیا ہے۔ مگر یہ ہمارے دوست ہیں عباس صاحب۔ بمبئی سے آئے ہیں۔ چلو ان کو سیر کروادیں۔ میں تو مدت سے ادھر گیا ہی نہیں۔ کوئی ہے معقول صورت؟"

"ارے ہے کیوں نہیں چمپا کے یہاں لے چلتا ہوں۔ طبیعت پھڑک جائے گی غن میاں۔"

"چمپا چمپا!" اس نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے دہرایا" کوئی نئی ہوگی۔ چلو دیکھیں تو۔"

میری رائے کسی نے پوچھی نہیں اور موٹر چوک کی طرف روانہ ہوگئی راستے میں اس نے مجھ سے کہا" عباس صاحب! صرف آپ کی خاطر پھر اس کوچے میں قدم دھر رہا ہوں ورنہ میں نے تو یہ راستہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ سڑک کے کنارے موٹر روک کر گلیوں میں پیدل چلنا پڑا۔ اندھیری، تنگ بدبودار گلیاں، مگر میرے دوست کے قدم انگلیوں کے پیچ وخم سے آشنا تھے۔ راستے بھر وہ ہر بالا خانے کے بارے میں بیان کرتا رہا۔ یہ مجن کا کوٹھا ہے۔ ہمارے دادا نے یہاں سوا لاکھ روپیہ لٹایا ہے............ اور یہاں ہمارے چچا جان نے دو لاکھ مشتری پر نچھاور کر دیے............ شروع شروع میں میں یہاں آیا کرتا تھا مگر بڑی جلدی ہی موٹی ہوگئی............ اور مجھے موٹی عورتوں سے

نفرت ہے۔ میں تو کہتا ہوں عورت میں نزاکت نہیں تو کچھ نہیں............

منزل مقصود آ گئی، کوٹھے پر چڑھنے سے پہلے اس نے مجھے روک کر کہا۔ عباس صاحب! بھولیے گا نہیں............... بمبئی .... میں اور آپ............... ہم دونوں جرنلزم کریں گے جرنلزم۔ یہ شریفوں کا وعدہ ہے۔''

''ارے آؤ بھئی فن میاں! چھوڑو ان باتوں کو۔'' اس دبلے پتلے کالے لڑکے نے کہا'' اور ہم سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے بالا خانے پر پہنچ گئے۔

ایک کالی بھدی عورت نے ہمارا استقبال کیا اور فن کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم دونوں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔ دیوار پر ایک خوب صورت لڑکی کی بہت سی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر اکیلی۔ مگر چند میں وہ کسی خوش وضع جوان کے ساتھ تھی۔ تجسس کے مارے میں کھڑا ہو کر ان تصویروں کو دیکھنے لگا۔ وہ خوش وضع جوان میرا دوست ہی تھا۔ مجھے اس انکشاف سے کوئی خاص تعجب نہیں ہوا۔ میں اس سے اس کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ دیکھا کہ ایک دبلی پتلی نازک ناک نقشے کی لڑکی داخل ہو رہی ہے۔ میرا دوست دفعتاً کھڑا ہو گیا اور مجھے مخاطب کر کے چلّا پڑا۔''لو اب یاد آ گیا وہ نام۔ چمپا۔ چمپا ہی تو تھا۔

آپ نے تو ہمیں بھلا ہی دیا فن میاں۔

لڑکی نے بیٹھتے ہوئے بڑے انداز سے کہا''عید کا چاند بھی تو سال بھر میں ایک بار نکل آتا ہے۔ آپ تو دو سال سے غائب ہیں۔''

وہ بولا''لاحول ولاقوۃ۔ معاف کرنا۔ اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے!''

چمپا نقلی ٹھنڈی سانس بھر کر بولی'' آپ تو ہمیں بھول ہی گئے سرکار''

''کیا بات کرتی ہو۔ بھلا تمھیں بھول سکتا ہوں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تمھارا نام بھول گیا تھا۔''

لڑکی نے گانا شروع کیا۔ برا گاتی تھی۔ اس نے میرے کان میں کہا'' کہئے کیا رائے ہے؟''

میں نے جواب دیا''شکل صورت تو اچھی ہے۔''

''اچھی ہے؟ بس! اس پر آپ مصنف اور افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ غضب

ہے صاحب غضب۔ ذرا نزاکت تو ملاحظہ کیجیے سچ پوچھیے تو صاحب اس نزاکت پر ہی تو ہم لکھنؤ والے مرتے ہیں............''

لڑکی اپنی غیر سریلی آواز میں گاتی رہی۔ ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلتا رہا اور دھوئیں کے حلقوں کی زنجیر میں وہ پھر گرفتار ہو گیا۔

جب دو بجے تو میں نے کہا ''چلو بھائی مجھے صبح کی گاڑی سے جانا ہے۔

وہ بولا ''چھوڑ و یار گاڑی واڑی کو..................''

میں نے کہا ''مجھے پرسوں بمبئی پہنچنا ہے''

اس نے کہا ''گولی مارو بمبئی کو''

میں نے کہا ''مجھے ضروری کام ہے وہاں''

اس نے کہا ''اس سے بڑھ کر کوئی ضروری کام دنیا میں نہیں۔ زندگی ہے تو یہ ہے۔ آپ کو ہماری قسم۔ اس کی قاتل مسکراہٹ تو دیکھیے۔''

میں نے کہا ''میں جاتا ہوں''

اس نے کہا ''آپ کی مرضی بندہ تو یہیں ٹھہرنے والا ہے۔''

اور یہ کہہ کر اس نے دھوئیں کے حلقوں کی زنجیر کا ایک اور گھیرا اپنے گرد ڈال لیا۔

جاتے جاتے میں نے کہا ''اور وہ جرنلزم؟''

اس نے جیسے یہ لفظ آج پہلی بار سنا تھا۔

''جرنلزم؟ جرنلزم..........؟ جرنلزم کی ایسی کی تیسی۔''

زینے پر سے اترنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ نیم مدہوش حالت میں گاؤ تکیے کے سہارے پسرا پڑا تھا جیسے قریب المرگ ہو۔ قریب ہی ایش ٹرے کے پانی میں لاتعداد سگریٹوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔ لڑکی گا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دھوئیں کی زنجیر میں بندھے ہوئے تھے اور وہ بڑبڑا رہا تھا ''جرنلزم۔ ہنہہ۔ جرنلزم کی ایسی کی تیسی''

''ایسی تیسی'' تو میں نے سنسر کے ڈر سے لکھا ہے۔ ورنہ اس نے کچھ اور کہا تھا۔

○

جاگتے رہو

رات کے سناٹے میں دور گھڑیال نے بارہ بجائے۔

سیٹھ جی نے احاطے کا آہنی دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کیا۔ اس میں قفل لگایا۔ قفل کو تین بار کھینچ کر، ہلا کر، جھٹکا دے کر یقین کیا کہ کنجی پھرانے میں کوئی غلطی نہ ہوئی تھی۔ احاطے کی قد آدم دیوار پر نظر ڈالی جس کے اوپر ٹوٹے ہوئے کانچ کے نوکیلے ٹکڑوں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ اس طرف سے کسی کا آنا ناممکن۔ پھر چوکی دار کی طرف مخاطب ہوئے جو اُوور کوٹ پہنے، ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے میں لالٹین لیے کیل کانٹے سے لیس کھڑا تھا۔ بولے "کیوں جگّو! سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

ہر رات کے بارہ بجے وہ ہمیشہ یہی سوال کرتے تھے اور جگّو ہمیشہ یہی جواب دیتا تھا۔ تم پھکر (فکر) نہ کرو سیٹھ جی۔ جب تک جگّو کے دم میں دم ہے کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

سیٹھ جی نے جگّو کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر ایک لمحے کے لیے دیکھا یہ لو پوربیا ٹھیٹھ کا پہلوان تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا۔ بڑی بڑی خوفناک مونچھیں، سیاہ فام چہرے پر چمکیلی آنکھیں، جن میں بھنگ کے ہلکے نشے سے لال ڈورے پڑے رہتے تھے۔ پھر سیٹھ جی نے مطمئن نظروں سے جگّو کے لمبے ڈنڈے پر نظر ڈالی جس کو وہ روز پیار سے تیل پلایا کرتا تھا اور جس کے

دونوں سروں پر چھ انچ تک لو ہا چڑھا ہوا تھا۔ بھلا کس چور ڈاکو کی ہمت تھی کہ جگو کا مقابلہ کرے۔

پر اندر جاتے جاتے ایک بھیانک شبہ نے سیٹھ جی کے دل میں چٹکی لی، اور اگر یہ جگو ہی ڈاکو بن جائے؟" یہ بھیانک شبہ بھی ہر رات کو اسی وقت چٹکی لیتا تھا۔ پھر سیٹھ جی نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ جگو کو احاطے کا پہرہ دینے کے لیے باہر چھوڑ کر وہ مکان میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کر کے اس میں چابی گھما دی، اب نہ صرف جگو اندر نہ آسکتا تھا بلکہ وہ کمبخت کرائے دار جو نچلی منزل میں براجمان تھا اور کسی طرح مکان چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ وہ بھی رات کو باہر نہ جا سکتا تھا۔ سیٹھ جی کو شبہ نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ کمبخت کسی خاص اور خوفناک مقصد سے ہی وہاں ڈٹا ہوا ہے۔ ورنہ علاوہ قانونی دھمکیوں کے انہوں نے اسے دو ہزار نقد کا بھی لالچ دیا تھا کہ کسی طرح وہ ان کا مکان خالی کر دے تا کہ نیچے سے اوپر تک وہاں سیٹھ جی اور ان کا خاندان ہی رہے اور کسی قسم کی فکر یا ڈر نہ باقی رہے۔ مگر وہ بے حیا اب تک وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتا تھا، اور عدالت نے بھی فیصلہ اسی کے حق میں کر دیا تھا۔ سیٹھ جی کبھی بھی اوپر نیچے جاتے نچلی منزل سے گزرتے اور دروازے پر کندن لال جرنلسٹ کا بورڈ لگا دیکھتے تو وہ عدالت، مجسٹریٹ، گورنمنٹ سب کو دل ہی دل میں کوستے۔ کمبخت کہیں کے! کرائے داروں کو یہ حق دے رکھا ہے کہ وہ مالک مکان کے سینے پر مونگ دلتے رہیں۔

سیٹھ جی کو اس کندن لال کے جرنلسٹ ہونے میں بھی شبہ تھا۔ کیونکہ وہ کسی دفتر وفتر نہیں جاتا تھا بلکہ گھر بیٹھے ہی ٹائپ رائٹر پر کھٹ پٹ کیا کرتا تھا شاید یہ سب ایک ڈھونگ ہی تھا وہاں رہنے کے لیے۔ اور کون جانتا ہے یہ دبلا پتلا نوجوان ڈاکوؤں کی کسی ٹولی سے ملا ہوا ہو۔ اور اس کے ذریعے سے وہ سیٹھ جی کی دولت پر حملہ کرنے والے ہوں۔ اور مانو وہ واقعی جرنلسٹ ہی ہو تو بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ سیٹھ جی کی نظر میں جرنلسٹ اور ڈاکو میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ کیونکہ دونوں امیروں اور سیٹھوں کے دشمن تھے اور ان کی دولت کو ہڑپ کر جانا چاہتے تھے۔ کتنے ہی اخبار نویس کام ہی یہ کرتے تھے کہ شریف سیٹھوں کی پگڑی اچھالیں۔ اگر اس کمبخت کو پتہ چل گیا کہ سیٹھ جی کے کمرے کی تجوری میں ساڑھے تین کروڑ روپیہ نقد رکھا ہے تو کیا معلوم کسی اخبار میں چھپوا دے اور گورنمنٹ انکم ٹیکس لگا دے یا بلیک مارکٹ کا الزام لگا دے۔ آج کل کسی کا بھی تو

اعتبار نہیں تھا۔ اسی گورنمنٹ کو الیکشن میں کامیاب کرانے کے لیے سیٹھ جی نے پچاس ہزار روپے چندے میں دیے تھے، مگر کون جانتا ہے کب ان سوشلسٹوں، کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے کے اثر میں آ کر اچھے خاصے معقول منسٹر بھی سیٹھوں کی تجوریوں کے پیچھے پڑ جائیں۔

اس کے علاوہ اس کندن لال جرنلسٹ کے ہاں چند بڑے ہی مشتبہ قسم کے نوجوان بھی آیا جایا کرتے تھے۔ لمبے لمبے بال۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی۔ کوئی چپل پر خاکی پتلون پہنے ہے تو کوئی کھدر کا میلا کرتا پاجامہ پہنے چلا آ رہا ہے یہ لڑکے غنڈے نہیں تو کم سے کم کمیونسٹ ضرور تھے۔ ان میں سے کئی تو اکثر رات بھی کندن لال کے ہاں ہی گزارتے تھے۔ رات رات بھر نہ جانے کیا اوندھی سیدھی باتیں کرتے، قہقہے لگاتے، گاتے، چائے پیتے اور سگریٹ پھونکتے۔ آج بھی کچھ ایسا ہی چل رہا تھا۔ سیٹھ جی نے دروازے سے کان لگاتے ہوئے سوچا ''سنوں تو یہ لوگ کیا مسکوٹ کر رہے ہیں۔'' سنا تو سن رہ گئے۔ کندن لال کا کوئی دوست کہہ رہا تھا ''ارے کبھی سیدھی انگلیوں بھی گھی نکلا ہے۔ ان سیٹھوں کے جب تک ٹینٹوے نہ دبائے جائیں گے ان کی تجوریوں سے روپیہ نہیں نکل سکتا۔'' سیٹھ جی کو ایسا لگا جیسے ان کے ٹینٹوے کو کسی نے آ دبوچا ہو اور وہ فوراً دروازے سے علیحدہ ہو کر زینے کی طرف لپکے۔

''اچھا ہوا یہ میں نے لوہے کا جنگلہ اور دروازہ زینے میں لگوا لیا ہے'' سیٹھ جی نے قفل لگاتے ہوئے سوچا ''نہیں تو کسی رات کو یہ غنڈے ضرور دھم دھم کرتے اوپر چڑھ آتے۔ اب تو آ کر دیکھیں۔ بدمعاش کمینے کہیں کے۔ اس تالے یا دروازے کو ہاتھ تو لگائیں............'' یہ سوچ کر وہ آپ ہی آپ مسکرائے اور بجلی کا بٹن دبا دیا جس سے لوہے کے جنگلے، دروازے اور قفل سب میں بجلی دوڑ گئی۔ اب اگر کوئی ہاتھ لگائے گا تو سارے مکان میں گھنٹیاں بجنے لگیں گی اور ہاتھ لگانے والا بجلی کے جھٹکے سے مارا جائے گا۔ یہ ترکیب سیٹھ جی کے چھوٹے بیٹے منو نے سوچی تھی جو میٹرک تک پڑھا ہوا تھا اور انگریزی جاسوسی ناول پڑھا کرتا تھا تاکہ چوروں ڈاکوؤں کے سب ہتھکنڈوں سے واقف ہو جائے اور اپنے باپ کی دولت کی حفاظت اچھی طرح سے کر سکے۔ اپنے چھوٹے بیٹے کی ذہانت پر کتنا گھمنڈ تھا انھیں۔

زینے کو قفل لگا کر اب وہ دوسری منزل پر پہنچے، یہاں ان کا بڑا بیٹا اس کی بیوی اور بچے اور

سارے گھر کے نوکر چاکر رہتے تھے۔ نوکر سب پرانے اور قابل اعتبار تھے، مگر پھر بھی ساڑھے تین کروڑ روپیہ کسی کے دل میں بھی بے ایمانی ڈال سکتا ہے۔ اس معاملہ میں اور تو اور سیٹھ جی کو خود اپنے بڑے بیٹے پر اعتبار نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی بڑی فضول خرچ اور فیشن کی دیوانی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو کلب ریس اور نہ جانے کہاں کہاں روپیہ کھونے کی عادتیں ڈلوادی تھیں۔ کون جانتا ہے، وہ اس فکر میں ہو کہ کب بڈھے کا دم نکلے اور وہ پونے دو کروڑ پر قبضہ کر بیٹھے۔ اسی لیے سیٹھ جی نے دوسری اور تیسری منزل کے درمیان کے زینے میں بھی ایک لوہے کا جنگلہ اور دروازہ لگوا رکھا تھا۔ اس میں قفل لگا کر ہی ان کو پورے اطمینان کی نیند آتی تھی۔

سیٹھ جی کی بیوی بیچاری کب کی سورگ باش ہو چکی تھی۔ اس کی یاد سیٹھ جی کو اکثر ستاتی اور وہ سوچتے ''روپے اور نوٹ گننے میں کتنی ہوشیار تھی وہ۔ منٹوں میں لاکھوں کی گڈیوں اور تھیلیوں کی پڑتال کر ڈالتی تھی، مجھے تو گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ کاش وہ آج زندہ ہوتی! اوپر کی منزل میں اب وہ اور ان کا چھوٹا بیٹا منو، یہ دو ہی رہتے تھے یہاں نوکروں کو بھی آنے کی اجازت نہ تھی۔ سوائے منو کے سیٹھ کو کسی پر پورا بھروسہ ہی نہ تھا۔ اسی لیے اسے برابر کا کمرہ دے رکھا تھا۔ اس وقت اپنے کمرے میں جانے کے لیے منو کے کمرے میں سے گزرے تو دیکھا وہ چین سے سو رہا ہے گلے میں سیٹھ جی ہی جیسی سونے کی زنجیر پڑی تھی اور دائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی جو پچھلی دیوالی پر باپ نے بنوا کر دی تھی۔ نالائق بڑے بیٹے کو نہیں صرف اپنے چہیتے منو کو۔ اسے دیکھ کر سیٹھ جی کا دل کتنا خوش، کتنا مطمئن ہو گیا۔ بڑا بیٹا تو دو چار برس ہی میں ساری دولت لٹا دے گا۔ مگر منو ان کا نام روشن کرے گا۔ پونے دو کروڑ کے بیس کروڑ بنائے گا۔ بچپن ہی سے اس میں باپ کے نقش قدم پر چلنے کی عادت تھی۔ اسکول میں پڑھا تو آٹھ آنے روز کے جیب خرچ کو بچا کر رکھتا۔ پھر اس میں سے مہینے کے اخیر میں ایک ایک روپیہ دو دو روپے اپنے ساتھیوں کو قرض دیتا۔ ہفتہ بھر کے بعد ایک روپیہ کا ڈیڑھ روپیہ اور دو روپے کے تین روپے وصول کرتا۔ جب اسکول چھوڑا تو اس کے پاس نو سو روپے اپنے جمع تھے۔ جب سے وہ باپ کے کاروبار کے علاوہ اپنا روپیہ سود پر الگ بھی چلاتا تھا۔ اس کے ایجنٹ بلیک مارکٹ کے سگریٹوں کے ڈبے، فاؤنٹن پین، گھڑیاں گھر گھر لیے پھرتے اور دگنے تگنے داموں میں بیچتے۔

باپ نے دونوں بیٹوں کو موٹریں لے کر دی تھیں۔ بڑا بیٹا ہمیشہ بلیک مارکٹ سے کوپن خرید کر پٹرول کا خرچ پورا کرتا۔ مگر منو کی موٹر مہینے میں ایک آدھ ہی بار باہر نکلتی اور پٹرول کے سارے کوپن بلیک مارکیٹ میں بکتے اور کبھی کبھی بلیک مارکیٹ سے ہوتے ہوئے بڑے بھائی کے پاس آتے۔ ایک بار بھائی نے موٹر میں پٹرول ختم ہونے پر منو سے ایک کوپن مانگ لیا تو اس نے فوراً بلیک مارکیٹ کی قیمت نقد طلب کی اور وصول کیے بغیر کوپن نہ دیا۔ ان ہی باتوں سے سیٹھ جی کو یقین ہوگیا تھا کہ ان کا اصل جانشین منو ہی ہوگا۔ ہونہار، قابل فخر بیٹا بھی کتنی بڑی نعمت ہے! یہ سوچتے ہوئے سیٹھ جی اپنے کمرے میں آئے روشنی کی۔ حسب معمول پلنگ کے نیچے الماری کے پیچھے، پردوں کو ہٹا کر دیکھا۔ جب اطمینان ہوگیا کہ کوئی چور ڈاکو کہیں چھپا نہیں ہے تب تجوری کھولی۔ نوٹوں کے گڈوں اور روپے کی تھیلیوں کا جائزہ لیا، پھر تجوری بند کر کے، کمرے کی کھڑکیاں کھولیں۔

جاگتے رہو.......................''

جگو چوکی دار کی بھاری آواز فضا میں گونجی پھر اس کے لوہے کی موٹی موٹی کیلیں لگے ہوئے جوتوں کے پتھر کے فرش پر چلنے کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ ڈنڈے کی آہنی سرے کی زمین پر پڑنے کی جھنکار۔ جگو کی رعب دار کھنکھار کو سن کر ہی چور بھاگ جائے اور مکان کا چکر پورا ہونے پر ایک بار پھر 'جاگتے رہو!'

سیٹھ جی نے اطمینان کا سانس لیا اور روشنی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گئے۔ جب تک جگو کا 'جاگتے رہو' کا نعرہ سنائی دیتا رہے ان کو کوئی فکر نہ تھی۔ اطمینان تھا کہ جگو جاگ رہا ہے، چوروں ڈاکوؤں کو بھی معلوم ہے کہ جگو جاگ رہا ہے اور ان کا سر پھوڑنے کے لیے تیار ہے اور اس کے علاوہ یہ بھی اطمینان تھا کہ جگو اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر خود ڈاکہ ڈالنے کی فکر نہیں کر رہا ہے۔

سیٹھ جی کے کئی دوستوں نے ان کا مذاق اڑایا تھا کہ چوکی دار سے یہ پرانی چال کا 'جاگتے رہو' کا نعرہ لگوانے سے کیا فائدہ!'' اگر جاگتے ہی رہنا ہے تو چوکی دار رکھنے کا مطلب؟'' اور سیٹھ جی مسکرا کر خاموش ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ 'جاگتے رہو' کی پکار سیٹھ جی کے لیے لوری کا کام دیتی تھی۔ جب تک جگو کی آواز یکساں وقفے سے آتی رہے سیٹھ جی خراٹے لیتے

رہیں گے، لیکن ایک بار بھی خاموشی کا وقفہ زیادہ ہوا اور دو تین منٹ تک 'جاگتے رہو' کی آواز نہ آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''کیوں جگو! سو گیا کیا؟''

''نہیں سیٹھ جی، چلم بھر رہا تھا'' نیچے سے آواز آتی اور پھر ''جاگتے رہو'' ''جاگتے رہو'' کا ورد شروع ہو جاتا اور سیٹھ جی کو نیند آ جاتی۔

آج کی رات بھی جگو کی لوری سنتے سنتے سیٹھ جی کو نیند آ گئی۔ رات کو سوتے وقت وہ چابیوں کا گچھا اپنے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر میں ڈال لیتے تھے اور سوتے ہوئے بھی ان کا ہاتھ زنجیر پر رہتا کہ کوئی چھوئے بھی تو فوراً آنکھ کھل جائے۔

''جاگتے رہو''

''جاگتے رہو''

جگو کی آواز یکساں وقفے سے آتی رہی اور سیٹھ جی نیند کے دھارے میں بہ گئے۔ پر آج انھیں سکھ کی نیند نہ آئی۔ ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے رہے۔ کبھی جگو اپنا بھاری ڈنڈا لیے ان کی طرف لال لال آنکھوں سے گھور رہا ہے کبھی وہ کندن لال جرنلسٹ اور اس کے دوست لال جھنڈے لیے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور چلا چلا کر کہہ رہے ہیں۔ ''ان سیٹھوں کے ٹینٹوے دباؤ تب ہی ان کی تجوریوں سے روپیہ نکلے گا۔ ان کے ٹینٹوے دباؤ ٹینٹوے............دباؤ............'' اور کسی کی ٹھنڈی انگلیوں نے سچ مچ ان کا ٹینٹوا پکڑ لیا۔

گھبرا کر سیٹھ جی کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا بدن ڈر کے مارے پسینے میں شرابور تھا۔

''جاگتے رہو!'' جگو کی آواز آئی اور تب سیٹھ جی کو اطمینان ہوا کہ انہوں نے صرف ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ شاید بے خیالی میں سونے کی زنجیر ہاتھ سے کھنچ گئی تھی اور خواب میں اس کے سنہری حلقے کسی قاتل کی ٹھنڈی انگلیاں بن گئے تھے۔!

''جاگتے رہو''

جگو کی آواز آتی رہی اور اندھیرے کمرے میں لیٹے ہوئے سیٹھ جی اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے تمام انتظامات کی فہرست دہراتے رہے جو اپنے ساڑھے تین کروڑ کی حفاظت

کے لیے انھوں نے کرر کھے تھے۔

جگّو جاگ رہا ہے۔اور ''جاگتے رہو'' کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔

جگّو کے مضبوط ہاتھوں میں ایک لمبا ڈنڈا ہے جس کے دونوں سروں پر لوہا چڑھا ہوا ہے۔ اس کی ایک چوٹ کسی چور کا سر پھوڑنے کے لیے کافی ہے۔

احاطے کی دیوار کے اوپر نوکیلے کانچ کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔کوئی چڑھنے کی کوشش بھی کرے گا تو اس کے ہاتھ پاؤں لہولہان ہو جائیں گے۔

''احاطے کے پھاٹک پر مضبوط قفل لگا ہوا ہے۔''

مکان کا دروازہ مقفل ہے۔

نچلے زینے میں لوہے کا جنگلہ لگا ہے اور لوہے کے دروازے پر قفل پڑا ہے اور ان سب میں بجلی دوڑی ہوئی ہے۔کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو سارے مکان میں گھنٹیاں بجنے لگیں گی اور وہ کمبخت توو ہیں جل کر ڈھیر ہو جائے گا۔وہ کندن لال کے بدمعاش دوست ہاتھ لگا کر تو دیکھیں۔

دوسری منزل پر بھی زینے میں لوہے کا جنگلا اور دروازہ لگا ہے اگر بڑے بیٹے کی نیت بد ہو بھی تو وہ اوپر نہیں آسکتا۔

''تجوری میں تین قفل پڑے ہوئے ہیں۔چابیوں کا گچھا اس سونے کی زنجیر میں پڑا ہے۔ زنجیر میرے گلے میں ہے۔''

''میرا جوان بیٹا منو برابر کے کمرے میں سو رہا ہے۔ایک آواز دوں تو فوراً اپنا پستول لے کر آجائے گا اور کوئی چور ڈاکو یہاں ہوا تو اسے گولی سے اڑا دے گا...... بھلا منو کے ہوتے ہوئے میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟''

''جاگتے رہو۔''

''جگّو کی پکار اس بات کی ضامن تھی کہ سیٹھ جی کا روپیہ محفوظ ہے انھیں کوئی چنتا نہ ہونی چاہیے۔

''جاگتے رہو'' کی لوری سنتے سنتے ایک بار پھر وہ نیند کے نرم دھارے میں بہہ گیا۔

''جاگتے رہو۔''

"جاگتے رہو"

جگّو کی آواز جیسے ان کے دماغ کے پچھلے پھاٹک پر ہولے ہولے دستک دے رہی تھی۔ ان کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کو خطرے سے آگاہ کر رہی تھی............

"ٹھنڈی انگلیاں..................!"

"پھر وہی ڈراؤنا خواب؟.................."

"یہ زنجیر میرے گلے پر سے سرکی یا یہ بھی سپنا ہے......؟"

"یہ زنجیر اتنی تنگ کیوں ہوگئی یا شاید کروٹ لینے میں کہیں دب گئی ہے، یا شاید کوئی زنجیر کو ہلکے ہلکے مروڑی دے کر میرا گلا گھونٹ رہا ہے............؟

"میرا گلا!"

"منو! بیٹا منو!" سیٹھ جی نے چیخنا چاہا۔

مگر گلے سے آواز نہ نکلی۔ سونے کی پتلی زنجیر اب شہ رگ میں گڑتی جا رہی تھی۔

"جاگتے رہو"

جگّو کی آواز پورے زور سے گونجی۔ مگر اب کیا فائدہ؟ اب تو گھٹ کر دم نکلنے میں چند لمحوں ہی کی دیر تھی۔

"ان سیٹھوں کے ٹینٹوے جب تک نہ دبائے جائیں گے، ان کی تجوریوں سے روپیہ نہیں نکل سکتا" کندن لال کے دوست کی آواز سیٹھ جی کے کانوں میں گونجی۔ مگر یہ کمبخت اوپر آئے کیسے؟ اگر زینے کا دروازہ توڑا ہوتا تو گھنٹیاں ضرور بجتیں۔ بجلی بھی فیل ہوگئی ہوتی تو آواز تو ہوتی......

"یہ جگّو کیا کر رہا ہے؟"

"جاگتے رہو" عین کھڑکی کے نیچے سے جگّو کی آواز آئی۔

"جاگتے رہو"۔ "جاگتے رہو" چلا رہا ہے اور یہاں کوئی شیطان میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ وہ بھی میری ہی سونے کی زنجیر سے۔"

ساڑھے تین کروڑ روپیہ۔ کتنی محنت سے میں نے جمع کیا تھا چالیس برس تک سود در چکر چلایا۔ کمپنیاں کھڑی کیں۔ ان کا دیوالہ نکالا۔ اکال کے دنوں میں بنگال میں چاول کا!

کیا۔ جنگ ہوئی تو سرکاری ٹھیکے لیے۔ رشوتیں دیں۔ قومی کاموں میں چندے بھی دیے۔ بلیک مارکٹ میں کپڑا، اناج، پٹرول بیچا۔ سونے چاندی کا سٹہ کیا...... تب جا کر ساڑھے تین کروڑ جمع ہوئے اور شیطان میرا گلا گھونٹ کر سب لے جائے گا...... اے بھگوان کیا یہی تیرا نیائے ہے؟

منو! منو! کاش ایک سیکنڈ کے لیے یہ میرا گلا چھوڑ دے اور میں اپنے بیٹے کو آواز دے سکوں۔ برابر کے کمرے ہی میں تو ہے۔ یہاں سے چار گز بھی تو نہیں ہے اس کا پلنگ — میرا منو وہاں سو رہا ہے اور یہاں اس کے باپ کو یہ بدمعاش مارے ڈال رہے ہیں......

''جاگتے رہو''

جگو کی آواز جیسے دور سے آئی۔ ''شاید اب دم نکلنے والا ہی ہے۔ شاید کان اب جواب دے رہے ہیں............. مگر — سب تالوں کو کیا ہوا؟ وہ دیوار پر کانچ کے نکیلے ٹکڑے؟ زینے کے دونوں دروازے؟ میں نے تو کوئی کسر نہ اٹھا چھوڑی تھی؟ یہ ڈاکو آئے تو کیسے آئے؟

''جاگتے رہو'' جگو کی آواز بہت دور سے آئی۔

اس کا دم نکلنے ہی والا تھا۔ اس کا سانس بند ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔

منو! منو! کاش اب بھی وہ اپنے بیٹے کو آواز دے سکے!

گردن میں گڑی ہوئی زنجیر پر ایک آخری جھٹکا پڑا اور مرنے سے پہلے اس کی نگاہوں کے سامنے ایک چمک دار ستارہ بجلی کی طرح دفعتاً کوندا............. نہیں، نہیں.......... یہ ستارہ نہیں تھا............. کسی کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔

اور دور —— بہت دور —— اتنی دور جیسے کسی دوسری دنیا سے —— جگو کی آواز آئی ''جاگتے رہو۔''

○

رفیق

''میجر رفیق مارا گیا۔''

''میجر رفیق مارا گیا'' ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ ہندوستانی فوج کے افسر اور سپاہی۔ وادئ گریز کے رہنے والے کشمیری، چوروان گاؤں کے لٹے کھٹے مسلمان پناہ گزین، جو نام نہاد مجاہدین کے ہاتھوں اپنے گھر بار، مال اسباب اور اپنی عورتوں کی لاج کھو کر آئے تھے........... سب اسی خبر کا تذکرہ کر رہے تھے۔

''میجر رفیق مارا گیا!''

دو دن ہوئے ہندوستانی فوج کے ایک دستے نے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر دریا کے کنارے جا کر دشمن کی ایک پہاڑی چوکی پر شب خون مارا تھا۔ کئی حملہ آور ہلاک ہوئے تھے اور کئی زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جن میں ایک افسر بھی تھا۔ آج ایک بوڑھا کشمیری جو اس علاقے میں گھاس کاٹنے کے بہانے سے گیا تھا، یہ خبر لایا تھا کہ وہ افسر جو زخمی ہوا تھا، میجر رفیق ہی تھا اور زخمی ہونے کے چوبیس گھنٹے بعد مر گیا۔ یہ خبر اس نے حملہ آور فوج کے کئی سپاہیوں کی زبانی سنی تھی جو اپنے افسر کی موت پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

''میجر رفیق مارا گیا''

اس خبر سے سارے کیمپ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر افسر اور سپاہی خوش معلوم ہوتا تھا۔ شب خون امید سے زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ جن چھ جوانوں نے اس میں حصہ لیا تھا، ان میں سے جو پانچ زندہ آئے تھے، ان کو سب مبارکباد دے رہے تھے۔ چھٹا ایک پستول کی گولی ـــ شاید میجر رفیق کے پستول کی گولی ـــ کھا کر اپنی جان دے چکا تھا، مگر اس کی موت کا انتقام لے لیا گیا تھا۔ ایک معمولی سپاہی کے بجائے ایک افسر اور افسر بھی میجر رفیق جیسا ہوشیار اور چالاک۔ جو جنگ کے ہر گُر سے واقف تھا اور جس کے بارے میں اکثر کی یہ رائے تھی کہ پاکستانی فوج کے جتنے افسر کشمیر کے محاذ پر لڑ رہے ہیں ان میں وہ سب سے زیادہ قابل اور سب سے زیادہ خطرناک ـــ تھا۔

'میجر رفیق مارا گیا'

کیپٹن رام سنگھ نے کمانڈنگ افسر کے کمرے میں داخل ہو کر سلام کرتے ہوئے کہا۔ افسر اور سپاہی ملا کر وہ ستر ہواں فرد تھا جس نے یہ خبر اپنے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل راجندر کو سنائی تھی۔

سن چکا ہوں۔ کیا بٹالین کا ہر افسر اور ہر سپاہی یہ خبر الگ الگ مجھے سنائے گا؟ کرنل راجندر کا انداز بیان روکھا ہی نہیں خفگی سے بھرا ہوا تھا۔

معاف کیجیے جناب! غلطی ہوئی۔'' کیپٹن نے کھٹاک سے ایڑیاں ملاتے ہوئے سلام کیا اور جان بچا کر بھاگا۔ نہ جانے کرنل اتنے خراب موڈ میں کیوں تھا؟

''میجر رفیق مارا گیا! میجر رفیق مارا گیا!! میجر رفیق مارا گیا!!!'' کرنل راجندر دو گھنٹے سے یہی خبر سن رہا تھا۔ اس نے سوچا ـــ کیا یہ سب کہہ کہہ کر مجھے چڑا رہے ہیں؟ نہیں تو اس کو بار بار کے دہرانے سے کیا حاصل؟ آخر وہ چاہتے کیا ہیں۔ کیا میں ایک دوست کی موت کی خوشی میں کھڑا ہو کر ناچنے لگوں؟

دوست! ہاں میجر رفیق اس کا دوست تھا۔ نہیں نہیں ـــ اس نے سوچا ـــ میجر رفیق میرا دشمن تھا۔ درندہ صفت حملہ آوروں کو ساتھ لے کر کشمیر پر حملہ کرنے آیا تھا۔ ہندوستانی فوج کے مقابلے میں لڑ رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ کیا مجھے زندہ چھوڑ دیتا؟ اگر وہ مارا گیا تو کیا ہوا۔

اس نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ منہ پھلا کر بیٹھ رہوں۔ مجھے تو خوشی ہونی چاہیے۔ ہنسنا چاہیے۔ کم سے کم مسکرانا تو چاہیے......

مگر کوشش کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے کوئی آثار نہ پیدا ہوئے— تو کیا اس کے دل میں رفیق کی محبت اور دوستی کا جذبہ اب تک چوروں کی طرح چھپا بیٹھا تھا؟ اب تک؟ باوجود اس تمام قتل و غارت کے جو رفیق جیسے پاکستانی مسلمانوں نے معصوم اور مظلوم ہندوؤں پر روا رکھی تھیں؟ باوجود آگ کے ان شعلوں کے، جن میں راجندر کا گھر راولپنڈی میں جل کر خاک ہو گیا تھا؟ باوجود اس کے پاکستانی چھرے کے، جو راجندر کے بوڑھے باپ کی پیٹھ میں گھونپا گیا تھا؟ باوجود ان خون کی ندیوں کے جو مل کر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج بن گئی تھیں؟..........نہیں نہیں! رفیق اس کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت پر اسے کوئی افسوس نہ کرنا چاہیے۔ اسے خوش ہونا چاہیے، ہنسنا چاہیے۔ کم سے کم مسکرانا تو ضرور چاہیے مگر باوجود کوشش کے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے کوئی آثار نہ پیدا ہوئے۔

اپنے دل کی دھڑکن میں وہ برابر ایک ہی آواز سنتا رہا— رفیق، رفیق، رفیق، رفیق، اور یاد کے دھارے پر بہتا ہوا وہ دور بہت دور ماضی کے بھولے بچھڑے ہوئے زمانے میں کھو گیا۔

رفیق

یہ اس کا صرف نام ہی نہیں تھا بلکہ وہ سچ مچ راجندر کا رفیق تھا—بچپن کا ساتھی، ہمسایہ اور دوست۔ اس نام کے ساتھ بچپن کی کتنی خوش گوار یادیں وابستہ تھیں۔

راولپنڈی کے کالج روڈ پر ڈاکٹر مہندر ناتھ ساہنی کا بیٹا راجندر اور ریٹائرڈ صوبیدار میجر شفیع احمد خاں کا بیٹا رفیق ہمیشہ یکجا پائے جاتے تھے۔ جب وہ بالکل چھوٹے تھے تو اور بچوں کے ساتھ مل کر اپنی کوٹھیوں کے مشترکہ احاطے میں مٹی کے گھروندے بناتے، پھر انھیں ڈھاتے۔ رنگین تیتریوں کا پیچھا کرتے، کچے امرود توڑنے کے لیے درختوں پر چڑھتے، وہاں سے گرتے پھر روتے۔

رفیق اور راجندر۔ راجندر اور رفیق

رفیق اسلامیہ ہائی اسکول میں پڑھنے بھیجا گیا اور راجندر آریہ سماج ہائی اسکول میں۔ مگر اسکول کے علاوہ وہ سارا وقت ساتھ ہی گزارتے۔ سینما سیر و تفریح، پکنک، کھیل کود— ہر جگہ ساتھ

رہتے۔ راجندر کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا۔ صوبیدار میجر صاحب کے پاس ان کے پرانے انگریز افسروں کے خط آتے تو باپ لفافہ بھی کھولنے نہ پاتا کہ رفیق اپنے دوستوں کے لیے لفافہ جھپٹ لیتا اور ٹکٹ فوراً راجندر کو پہنچا دیتا۔ رفیق کو کبھی معمولی زکام اور کھانسی کی شکایت بھی ہو جاتی تو راجیندر فوراً باپ کو ساتھ لے کر پہنچ جاتا اور اسے مجبور کرتا کہ رفیق کو بجائے کڑوے مکسچر کے دو مزیدار اور بڑھیا والی کھانسی کی گولیاں دے جن میں سے کبھی کبھی وہ خود بھی ایک آدھ چکھ لیا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر بیس برس بعد بھی راجندر غیر ارادی طور سے مسکرا دیا۔

راجندر اور رفیق۔ رفیق اور راجندر

گورنمنٹ کالج میں دونوں پھر ساتھ ہو گئے۔ کرکٹ کا دونوں کو شوق تھا۔ دونوں کالج کی ٹیم میں تھے۔ راجندر کامیاب بولر تھا اور رفیق رن بنانے میں نمبر اول۔ میچ اور ٹورنامنٹ۔ ان دونوں کے بل بوتے پر ہی جیتے جاتے مگر وہ دونوں ایک دوسرے کو چھیڑتے۔ رفیق کہتا ''میں نے سنچری نہ بنائی ہوتی تو پٹ کر آتے تم۔'' اور راجندر نے جواب دیا۔ ''جی اور اگر میں نے ساٹھ رن میں پانچ وکٹ نہ لیے ہوتے تب دیکھتے اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑتے۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی۔

راجندر اور رفیق۔ رفیق اور راجندر۔

صوبیدار میجر صاحب کا تو شروع ہی سے رفیق کو فوج میں بھیجنے کا ارادہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ رفیق میٹرک تک پڑھ کر وائسرائے کمیشن کی درخواست دیدے مگر اس طرح راجندر کا ساتھ چھوٹتا تھا۔ اس لیے لڑ جھگڑ کر رفیق نے باپ کو کالج کی پڑھائی کے لیے راضی کر لیا۔ یہ بھی سمجھایا کہ بی۔ اے ہونے کے بعد شاہی کمیشن ملنے کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے اور بجائے جمعدار کے وہ لیفٹیننٹ کا درجہ پا سکے گا۔ یہ بات صوبیدار صاحب کی سمجھ میں بھی آ گئی اور رفیق کو راجندر کے ساتھ اور چند سال گزارنے کا موقع مل گیا۔

رفیق اور راجندر۔ راجندر اور رفیق۔

کالج کا زمانہ بھی کیا بے فکری کا تھا۔ سال بھر میں نو مہینے کرکٹ کھیلتے۔ ٹور پر جاتے۔ سیریں کرتے اور امتحان سے تین مہینے پہلے پڑھائی شروع کرتے۔ مضمون بھی دونوں نے ایک

ہی لیے تھے۔ رفیق ریاضی میں کمزور تھا۔ اس میں راجندر اس کی مدد کرتا۔ راجندر لٹریچر میں کمزور تھا اس لیے رفیق کو اسے شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی اہمیت بتانا پڑتی۔ گرمی کی چھٹیاں بھی ساتھ ہی گزارتے۔ کبھی شملہ راجندر کے ماموں کے یہاں تو کبھی رفیق کے پھوپھا کے یہاں کوہ مری۔ ایک بار دونوں مل کر کشمیر گئے، ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے۔ شکارے میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کی۔ گلمرگ اور کھن مرگ ہوتے ہوئے الپتر کی یخ بستہ جھیل دیکھنے چڑھے۔ واپسی پر رفیق نے کہا 'یار مرنے سے پہلے ایک بار اور آئیں گے۔'

بی۔اے کے امتحان کے بعد جب فوج کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا وقت آیا تو رفیق نے راجندر سے کہا۔" چھوڑ و یار۔ کون فوج میں لیفٹ رائٹ کرے گا۔ ہم تم لاہور جا کر ایم اے کریں گے۔" راجندر نے جواب دیا" گھاس کھا گیا ہے؟ میں نے تو تیری وجہ سے فوج میں داخلے کی درخواست دے رکھی ہے اور تو دُم دکھا رہا ہے۔" دونوں امتحان میں ساتھ ہی پاس ہوئے اور دہرہ دون میں ٹریننگ کے بعد سیکنڈ لیفٹیننٹ مقرر ہوئے۔

راجندر اور رفیق۔ رفیق اور راجندر۔

اور پھر کچھ دنوں کے لیے ساتھ چھوٹ گیا۔ راجندر کو پونا بھیجا گیا اور رفیق کو کوئٹہ۔ ہر سال گرمیوں میں دونوں کشمیر جانے کا ارادہ کرتے مگر دونوں الگ الگ رجمنٹوں میں تھے۔ کبھی ساتھ چھٹی ملنے کا موقع نہ ملا۔ رفیق چھٹی پاتا تو راجندر مصروف ہوتا۔ راجندر کو رخصت ملتی تو رفیق کو رجمنٹ میں واپس بلا لیا جاتا۔ رفیق لکھتا۔" یار تم اکیلے ہی ہو آؤ۔" راجندر جواب دیتا" چھوڑ و یار۔ کشمیر میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ چلے چلیں گے کسی اور سال۔

رفیق اور راجندر۔ راجندر اور رفیق۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ سے لیفٹیننٹ۔ لیفٹیننٹ سے کیپٹن۔ ترقی تقریباً ساتھ ہی ساتھ ملی مگر مدت تک ایک جگہ تعینات نہ ہو سکے۔ راجندر کی بدلی الہ آباد کی ہوئی تو رفیق کی رجمنٹ پونا بھیجی گئی۔ راجندر واپس پونا پہنچا تو رفیق سکندر آباد میں پایا گیا۔

رفیق کی بیوی پردہ کرتی تھی مگر رفیق نے ماں سے کہا:" اور کسی سے پردہ کرے یا نہ کرے۔ راجندر سے پردہ نہیں ہوسکتا۔" ماں نے اجازت دیدی" ہاں ہاں، دیور سے پردہ کیسا؟"

اور راجندر نے باہر سے چلا کر کہا" ماں جی! میں دیور نہیں جیٹھ ہوں جیٹھ۔ یہ رفیق تو لونڈا ہے ہمارے سامنے کا۔" سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ یہاں تک کہ سرخ دوشالہ میں لپٹی ہوئی دلہن کو بھی ہنسی آ گئی۔ جب راجندر نے منہ دیکھا تو ہاتھ پر منہ دکھائی کی ایک اشرفی رکھتے ہوئے بولا۔ "بے چاری بچی! افسوس ہے تیری قسمت بھی کسی جانگلو سے پھوڑی گئی۔" اور رفیق نے دھول جماتے ہوئے کہا۔" کیوں بے پروپیگنڈا کرتا ہے میرے خلاف!"

اور پھر دونوں دوستوں میں طے ہوا کہ رفیق کا ہنی مون اس وقت تک ملتوی رہے گا جب تک راجندر کی بھی شادی نہ ہو جائے۔ بات اس کی بھی پکی ہو چکی تھی اور ستمبر میں شادی ہونا طے پایا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی دونوں جوڑے ہنی مون کے لیے اکٹھے کشمیر جائیں گے۔" دیکھ لے میرے بغیر مت چل دینا" راجندر نے اگلے دن روانہ ہوتے وقت یاد دلایا اور رفیق نے کہا" نہیں یار" اکیلے جانے میں کیا مزہ ہے، مگر ستمبر میں مہینہ بھر کی چھٹی کا ابھی سے انتظام کر لینا چاہیے۔"

اور ستمبر میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ راجندر کو شادی ملتوی کرنا پڑی کیونکہ اس کی رجمنٹ کو فوراً ملایا بھیج دیا گیا۔ رفیق کو ٹریننگ کے کام پر لگا دیا گیا۔ جب برطانوی فوجیں ملایا میں پسپا ہوئیں تو راجندر برما فرنٹ پر پہنچا اس عرصہ میں رفیق افریقہ پہنچ چکا تھا۔ عالمی جنگ کے بعد رفیق میجر بنا دیا گیا۔ کوہیما کے پہاڑی مورچے پر راجندر کو میجر کا درجہ ملا۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ نام پایا۔ رفیق بریگیڈیر میجر کی حیثیت سے فوجی داؤ پیچ STRATEGY AND TACTICS کا ماہر مانا گیا۔ راجندر نے گولوں اور گولیوں کی بوچھار میں دشمن پر جوابی حملہ کر کے اپنے اچھے کمانڈر ہونے کا ثبوت دیا۔

جنگ ختم ہونے کے چند ہفتہ بعد اتفاقاً دونوں دوست دہلی کے اسٹیشن پر مل گئے۔ رفیق چند روز کے لیے راولپنڈی ہو کر آرہا تھا اور راجندر شادی کے لیے وہاں جا رہا تھا۔ باوجود کوشش کے رفیق کو شادی میں شریک ہونے کی چھٹی نہ مل سکی۔ کیونکہ اس کی رجمنٹ جاپان بھیجی جارہی تھی۔ خیر اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں دونوں دوست کئی برس کے بعد ملے تو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"کہو بیٹا، سنا جاپان جا رہے ہو۔ وہاں گیشا لڑکیوں سے ذرا بچ کے رہنا۔" راجندر نے رفیق کی کمر پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔

''کیوں! منہ میں پانی تو بھر آیا ہوگا۔ رفیق نے جواب دیا۔

ایک پرانے اور تجربے کار شوہر کی حیثیت سے رفیق نے راجندر کو شادی بیاہ کے باریک نکات سمجھائے اور ایک بار پھر یہ طے ہوا کہ جاپان سے واپسی پر دونوں دوست بیویوں کو ساتھ لے کر کشمیر جائیں گے۔

''اگر دسمبر میں بھی چھٹی ملی تو بھی جائیں گے۔'' راجندر نے کہا۔

اور رفیق بولا: ''ہاں ہاں برف کا مزہ رہے گا۔''

ساتھ ہی ریفرشمنٹ روم میں کھانا کھایا۔ وہسکی کے ساتھ ایک دوسرے کے ''جام صحت'' پیے گئے۔ دو تین پیگ کے بعد رفیق نے پوچھا: ''کیوں راجندر! سفید چمڑی والوں کے ساتھ کیسی گزری؟''

راجندر نے ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا: ''سچ بتاؤں! مجھے تو افسوس ہے کہ ایک دو موقع ملنے پر بھی میں کیوں نہ آزاد ہند فوج والوں کے ساتھ مل گیا۔ ہم لوگ کتنی ہی جان لڑا دیں، بریگیڈیر اور جنرل انگریزوں ہی کو بنایا جاتا ہے۔ تم سناؤ، تم پر کیا گزری؟''

''وہی جو تم پر گذری۔ جرمنوں سے لڑو۔ آندھی، طوفان، گرمی، ریگستان کا مقابلہ کرو اور پھر انگریز کی جوتیاں سیدھی کرو۔'' راجندر نے چوتھے پیگ کو ختم کرتے ہوئے کہا ''یار ہم ان سالوں کو نکال کر باہر کیوں نہیں کرتے؟''

رفیق پانچویں پیگ میں سوڈا ڈالتے ہوئے بولا ''خدا بھلا کرے ہمارے لیڈروں کا۔ اس کی امید کم نظر آتی ہے۔''

راجندر نے کچھ سوچ کر کہا ''یہ کام فوج کو کرنا پڑے گا۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہ مانیں گے۔ کیوں کیا کہتے ہو؟''

پانچویں پیگ کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے رفیق نے بات کے سلسلے کو ایک اور ہی رخ دیا۔ ''تمھیں قاہرہ کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب ہماری رجمنٹ فرنٹ سے دو ہفتہ کے لیے وہاں آرام کرنے کو بھیجی گئی تو ہمارا کیمپ شہر کے باہر اہرام مصر کے قریب لگا ہوا تھا۔ اچھا خاصا انتظام تھا۔ خیموں کی قطاریں دور تک لگی ہوئی تھیں اور ہر آٹھ خیموں کے درمیان پینے اور نہانے کے

لیے پانی کے دوٹل لگے ہوئے تھے سمجھے تم؟ دوٹل۔''

راجندر نے چھٹا پیگ انڈیلتے ہوئے کہا''ہاں سمجھ گیا۔دوٹل۔''

''تم خاک نہیں سمجھے۔دوٹل۔کیا سمجھے؟............دوٹل!............اور دونوں پر تختیاں لگی ہوئیں۔جانتے ہو اس پر کیا لکھا تھا؟ بتاؤ ان پر کیا لکھا تھا؟''

''مجھے کیا معلوم۔تم ہی بتاؤ نا''

''ایک پر لکھا ہوا تھا''ہندوؤں کے لیے۔''دوسری پر لکھا تھا''مسلمانوں کے لیے۔''کیا سمجھے؟''

راجندر نے جو چھ پیگ پی چکا تھا۔اپنے گلاس کو زمین پر دے مارا۔وہ پاش پاش ہو گیا ''بدمعاش کہیں کے۔سفید منہ کے بندر''

رفیق کیوں پیچھے رہتا اس نے بھی اپنا گلاس زمین پر دے مارا اور بولا۔اب سمجھے یہ کس طرح ہمیں الگ الگ رکھتے ہیں؟''

ریفرشمنٹ روم میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اور ویٹر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے مگر کسی کو ہمت نہ پڑی کہ فوجی افسروں سے جا کر الجھے۔

ویٹر نے چپکے سے دو اور گلاس سامنے لا کر رکھ دیے۔ساتواں پیگ دونوں میں انڈیل دیا گیا۔

''مگر جانتے ہو ہمارے ہندوستانی سپاہیوں نے۔ہندو، مسلمان، سکھ، راجپوت، پٹھان، اچھوت سپاہیوں نے کیا کیا؟ بتاؤ کیا کیا؟''رفیق نے اپنے دوست سے سوال کیا۔

''تم ہی بتاؤ یار''

''میں بتاتا ہوں۔انھوں نے ان تختیوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔کم سے کم اس کیمپ میں ہندو مسلمان کا سوال نہ آنے دیا۔''

شاباش۔ہندوستانی فوج زندہ باد!''راجندر چلّایا۔''آؤ ہم ان کا جام صحت پئیں۔

دونوں نے گلاس اٹھائے۔ایک دوسرے کے گلاس سے گلاس کھنکائے اور غٹ غٹ پی گئے مگر پھر دفعتاً رفیق مرجھا سا گیا۔

اس بار کسی قدر دھیمی آواز میں اس نے پوچھا''اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟''راجندر نے نفی

میں سر ہلایا اور رفیق نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''انگریز بڑے افسروں نے ان تختیوں کو پھر سے نلوں پر لگوا دیا۔ جب ہم ہندوستانی افسروں نے اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان کے مطابق ہندو مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا خیال رکھنا ان پر فرض ہے۔ اس لیے دھرم شاستروں اور شریعت پر عمل کرتے ہوئے ہندو مسلمان الگ الگ نلوں سے پانی پئیں گے۔

راجندر نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور تم لوگوں نے کیا کہا؟ کیا کیا؟

ہم نے کچھ نہیں کہا، کچھ نہیں کیا۔ چند روز میں سب الگ الگ نلوں سے پانی پینے کے عادی ہو گئے بلکہ ایک بار ایک مسلمان کا ہاتھ بھول سے کسی ہندو سپاہی کی بالٹی کو لگ گیا تو اس نے شور مچا دیا۔ کھانا پکانے کا انتظام تو پہلے ہی الگ الگ تھا۔ اب مسلمانوں نے اصرار کیا کہ چائے جو مشترکہ بنتی تھی وہ بھی ہندوؤں کے لیے الگ بنے اور مسلمانوں کے لیے الگ۔

اور پھر دونوں پر کئی منٹ تک ایک گہری افسردہ خاموشی طاری رہی۔

راجندر دانت بھینچ کر بولا۔ ''دو نل''

رفیق گویا نیند سے چونک کر بڑبڑایا۔ ''دو پانی کے نل۔''

راجندر نے کسی ان دیکھے انگریز کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہندوؤں کے لیے ہے۔''

رفیق نے نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا ''یہ مسلمانوں کے لیے ہے۔''

''دو نل'' راجندر نے گویا ایک اہم اعلان کیا۔

''دو پانی کے نل'' رفیق نے پانی پر زور دیتے ہوئے اس اعلان کی تصدیق کی۔

پھر دونوں نے آٹھواں پیگ پی کر بیرے کو آرڈر دیا کہ اور وہسکی لائے۔ اتنے میں ایک موٹا لال منہ کا انگریز آیا اور ان کے سامنے کی میز پر بیٹھ کر نہایت تحکمانہ لہجہ میں ''بوائے، بوائے'' چلّانے لگا۔ اس کو دیکھتے ہی دونوں کی آنکھیں نفرت اور غصے سے سرخ ہو گئیں۔

''دیکھتے ہو؟ راجندر بولا۔

''ہوں'' رفیق غرایا۔

''ہم کیوں انھیں نکال باہر نہیں کرتے؟''

''یہی کرنا پڑے گا۔ فوج کو یہ انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا۔''

اور پھر رفیق کی ٹرین کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ کلکتہ ہوتا ہوا جاپان چلا گیا تھا اور راجندر راولپنڈی۔ رخصت ہوتے وقت ایک بار دونوں دوستوں نے پھر وعدہ کیا تھا کہ پہلی چھٹی میں دونوں اپنی اپنی بیویوں کو لے کر کشمیر جائیں گے۔

راجندر کی شادی دھوم دھام سے ہوئی مگر اپنے دوست کی غیر حاضری میں اسے کوئی خاص مزہ نہ آیا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ رفیق وہاں ہو اور اسے اور اس کی نئی نویلی دلہن کو چھیڑے۔ پھیرے ختم ہوئے ہی تھے کہ تار آیا کلکتے سے۔ رومن حروف میں لکھا تھا۔ دولہا میاں، شادی مبارک تمھارا رفیق۔ یہ پڑھ کر راجندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کی بیوی نے اگلے دن پوچھا ''یہ آپ کے دوست رفیق مسلمان ہیں؟''

اور راجندر نے کسی قدر رنگ کر جواب دیا تھا ''وہ مسلمان نہیں ہے اور میں ہندو نہیں ہوں۔'' ہم صرف دوست ہیں۔

پھر وہ اپنی بیوی کو احاطے میں لے گیا تھا۔ یہ کہتا ہوا۔ ''ہم دونوں بچپن سے ساتھ کھیلے ہیں، ساتھ پڑھے ہیں، ساتھ شرارتیں کی ہیں۔ ہماری وجہ سے ہمارے بنگلوں کے درمیان کبھی احاطے کی دیوار نہیں بنی۔ ہم نے بننے ہی نہیں............''

اس کی زبان پر فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس نے دیکھا کہ نئی اینٹوں کی پانچ فٹ اونچی دیوار دونوں بنگلوں کے درمیان کھڑی گویا اس کا منہ چڑا رہی ہے۔

وہ دیوار آج بھی راجندر کے تخیل میں کھڑی ہوئی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ دیوار اونچی ہی ہوتی گئی تھی۔ دو بنگلوں ہی کے درمیان نہیں، دو قوموں دو مذہبوں کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی۔ اس دیوار نے ہندوستان کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کردیا تھا۔ پھر بھی راجندر کو یقین تھا کہ وہ اس کے اور رفیق کے درمیان کبھی حائل نہ ہو سکے گی۔ جب مارچ اپریل میں راولپنڈی کے ضلع میں فسادات ہوئے تو رفیق کا تار جاپان سے اپنے باپ کے پاس آیا کہ راجندر کے گھر والوں کی حفاظت ان کا فرض ہے۔ اور کئی راتیں بوڑھے صوبے دار میجر صاحب نے ڈاکٹر ساہنی کی کوٹھی کے گرد پہرہ دیتے ہوئے گزار دیں۔

3 جون کے اعلان کے چند روز کے بعد جب وہ پونا میں تھا۔ راجندر کو ایک کتاب ڈاک

میں ملی۔ یہ جنگی TACTICS AND STRATEGY کے بارے میں تھی جو رفیق نے اسٹاف کالج کے کورس کے لیے لکھی تھی۔ ڈیڈیکیشن اسی کے نام سے تھا۔ ''راجندر کے نام جو ایک قابل فوجی افسر ہونے کے علاوہ ایک انمول دوست بھی ہے۔'' راجندر جانتا تھا کہ رفیق جنگ کے فنی اصولوں کا ماہر ہے اس لیے اسی وقت ورق گردانی شروع کر دی۔ ایک صفحہ پر اس نے پڑھا......

''جنگ بھی پہلوانوں کی کشتی کی طرح ہوتی ہے۔ صرف طاقت اور زور ہی سے فتح نہیں حاصل ہو سکتی۔ دماغ بھی استعمال کرنا ہوتا ہے۔ چالاکی سے بھی کام لینا ہوتا ہے۔ آدھی جیت تو اسی میں ہے کہ دشمن کو اچنبھے میں ڈال دیا جائے۔ اسے یہ نہ معلوم ہو سکے کہ تمہاری اگلی حرکت کیا اور کدھر سے ہوگی۔ وہ یہ سوچتا ہی رہے کہ حملہ مشرق سے ہوگا یا مغرب سے اور اس عرصے میں تمھارا حملہ شمال سے ہو جائے..........'' تین ہفتے کے بعد رفیق کا خط جاپان سے آیا۔

''پیارے راجندر!

سو جس گھڑی کا خطرہ تھا وہ آن پہنچی۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ پاکستان قائم ہو گیا۔ فوج کا بھی بٹوارہ ہو رہا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں یا پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ مسلمان کی حیثیت سے مجھ سے امید کی جاتی ہے کہ میں پاکستان کی فوج میں شامل ہو جاؤں۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ تمھارا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ ادھر ماں باپ کا خیال ہے جو بوڑھے ہو چکے ہیں اور اس عمر میں چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاس ہی رہوں۔ تم ہی مشورہ دو کہ میں کیا کروں..........؟

راجندر رفیق کی دماغی الجھن کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے جواب لکھا—

''جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ تم ہندوستان ہی میں رہو۔ مگر میرے خیال میں پاکستان اور ہندوستان دونوں کا بھلا اس میں ہے کہ تمھارے جیسے اچھے افسر پاکستانی فوج میں رہیں۔ بظاہر دو الگ الگ ملکوں کی فوجوں میں رہ کر بھی ہماری دوستی اور محبت اگر برقرار رہی تو شاید اسی طرح ہندوستان اور پاکستان بھی دوست رہ سکیں۔ کون جانتا ہے دونوں فوجوں کو ایک دن متحد ہو کر کسی مشترکہ دشمن کے خلاف لڑنا پڑے..........اس دن والی بات یاد ہے نا۔ دہلی اسٹیشن کا ریفرشمنٹ روم..........''

پندرہ اگست یوم آزادی۔ مگر راجندر اپنے والدین کی طرف سے پریشان تھا۔ کیونکہ سارے پنجاب میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ نہ جانے ان پر راولپنڈی میں کیا گزر رہی تھی۔ پھر بھی کسی قدر اطمینان یہ تھا کہ رفیق کے باپ صوبیدار میجر صاحب ان پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ درجنوں تار دیے مگر کوئی جواب نہ دیا۔ جاننے والے جو فوجی افسر وہاں تعینات تھے ان کو لکھا کہ کسی طرح اس کے گھر والوں کو خیریت سے نکال کر دہلی یا ہندوستان کے کسی شہر میں ہوائی جہاز کے ذریعے بھیج دیا جائے۔ جواب آیا کہ تمھارے گھر والوں کو دہلی بھیج دیا گیا ہے۔ چھٹی لے کر دہلی پہنچا اور پتہ چلایا۔ ماں بیٹے کو گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی بیٹے نے پوچھا "اور پتا جی؟ پتا جی کہاں ہیں؟" تب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ایک فسادی کے چھرے کا شکار ہو چکے تھے۔

راجندر کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور رفیق کے باپ صوبیدار میجر صاحب؟ انھوں نے پتا جی کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

ماں نے دھیرے سے سمجھایا۔ "بیٹا انھوں نے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی ہماری جان اور لاج کو انھوں نے ہی بچایا مگر جب تیرے پتا پر حملہ ہوا ہے، انھیں آنے میں ایک منٹ کی دیر ہو گئی......"

"مگر کیوں؟" راجندر غم اور غصے سے چلایا

"وہ بڈھے آدمی ہیں بیٹا۔ نظر بھی کم آتا ہے۔ اس احاطے والی دیوار کو جلدی نہ پھلانگ سکے۔"

وہ دیوار! وہ ظالم دیوار، وہ قاتل دیوار! راجندر کا جی چاہا کہ فوراً جا کر اس دیوار کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ ڈالے مگر وہ راولپنڈی سے دور تھا بہت دور اور راستے میں اس سے بھی اونچی نہ دکھائی دینے والی دیوار حائل تھی۔

اس نے کوشش کر کے اپنی بدلی دہلی کرائی تا کہ ماں کے پاس رہ سکے۔

کراچی سے ایک تار پونا ہوتا ہوا آیا "میں جاپان سے واپس آ گیا ہوں اپنے گھر والوں کی خیریت سے مطلع کرو اور جالندھر جا کر اپنی بھاوج اور اس کے گھر والوں کو بچاؤ۔ اور یہاں بجھوا دو۔ 'رفیق'

راجندر کا پرانا برما والا بریگیڈیر جالندھر میں تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور جیپ لے کر رفیق کی سسرال پہنچا۔ مگر گھر میں مغربی پنجاب کے آئے ہوئے ہندو سنگھ شرنارتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سارے شہر میں کوئی مسلمان باقی نہیں تھا۔ پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ سب ایک قافلے

کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہیں یہی اطلاع اس نے رفیق کو بھیج دی۔ اس کو امید تھی کہ وہ خیریت سے پہنچ گئے ہوں گے۔

مگر چند روز کے بعد رفیق کا خط ملا۔ چند سطریں جلدی میں گھسیٹی ہوئی:

تمہاری بھاوج پاکستان نہیں پہنچ سکی۔ نہ جانے زندہ ہے یا ماری گئی۔ دعا کرو کہ زندہ ہو۔ تم پہلے ہی بچھڑ گئے۔ اب زندگی میں میرے لیے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ صرف پرانی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ تم بھی کبھی یاد کرلیا کرنا۔ یہ شاید میرا آخری خط ہو''

اگلے دن اخبار میں چھپا کہ پاکستان کی طرف سے قبائلی حملہ آوروں نے کشمیر پر حملہ کردیا ہے اور نہ جانے کیوں راجندر کو رفیق سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ کشمیر جائیں گے تو دونوں ساتھ ہی۔ ہفتہ بھر کے بعد راجندر کی رجمنٹ بھی کشمیر بھیج دی گئی۔

راجندر برما اور آسام کی سرحد پر بڑی دلیری سے لڑا تھا۔ مگر اس جنگ سے اسے یا دوسرے ہندوستانی افسروں کو کوئی خاص دلی لگاؤ نہیں تھا۔ صرف یہی لگن تھی '' کہ کسی طرح اپنی بہادری اور ہوشیاری سے دنیا پر ثابت کردیں کہ ہندوستانی فوجی افسر دنیا میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ مگر کشمیر آکر جب راجندر نے کشمیری عوام میں فرقہ وارانہ اتحاد کو دیکھا۔ ان کی قومی حکومت کے ترقی پسند نوجوان کارکنوں سے ملا تو اسے ایسا لگا کہ یہ جنگ وہ بڑے اونچے اصولوں کی خاطر لڑ رہا ہے۔ آزادی، جمہوریت، اتحاد کی خاطر۔ کبھی کبھی اسے ایسا لگتا کہ وہ سب مل کر اس اونچی مگر نہ نظر آنے والی دیوار کو ڈھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو نفرت اور مذہبی تعصب کی بنیادوں پر ہندوستان و پاکستان کے درمیان کھڑی کی گئی ہے۔

پٹن ——— بارامولا ——— مہورا

اوری ——— ٹیٹ وال ——— باندی پور ——— گریز

ہندوستانی فوجیں آگے بڑھتی جارہی تھیں اور وہ دیوار پیچھے ہٹتی جارہی تھی راجندر ہر محاذ پر ایسی بے جگری سے لڑا کہ بہت جلد میجر سے لیفٹیننٹ کرنل بنادیا گیا۔ آج وہ گریز کی وادی میں نہ صرف ہندوستانی فوج کا کمانڈنگ افسر بلکہ گریز کے غریب کشمیری عوام میں بھی نہایت ہردل عزیز تھا۔ اس کا کافی وقت ان کی دیکھ بھال میں گزرتا۔ ان کی خدمت کرکے ان سے دوستانہ تعلقات

قائم کرکے نہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس نفرت کی دیوار کو ڈھانے میں کامیاب ہورہا ہے۔ جو اس کے اور رفیق کے گھروں کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی۔ بہت جلد یہ دیوار ٹوٹ جائے گی اور دونوں دوست ایک بار پھر گلے مل جائیں گے۔

راجندر اور رفیق۔ رفیق اور راجندر

راجندر کو یہ تو معلوم تھا کہ حملہ آوروں کے ساتھ پاکستانی فوج کے بہت سے افسر اور سپاہی ہیں۔ وہ ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح تھے اور جنگی دستوں میں منظم ہوکر لڑ رہے تھے۔ گریز کی وادی سے ان کو بھگا دیا گیا تھا مگر وہ زیادہ دور نہ گئے تھے۔ اس کی اطلاعات کے بموجب ان کا ایک گروہ مشرق میں حبہ خاتون نامی پہاڑی کے پیچھے تھا اور دوسرا گروہ مغرب کی کشن گنگا کے پار۔ دونوں طرف سے فوجی نقل و حرکت کی خبریں آ رہی تھیں۔ راجندر نے دونوں طرف اپنی پہاڑی چوکیوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ رات دن وہ دشمن کی تاک میں رہتے تھے۔ ناممکن تھا کہ حملہ آور گریز کی وادی پر پھر سے قبضہ کرنے کے لیے ایک قدم بھی اٹھا سکیں......

اور پھر ایک رات اچانک شمال کی طرف ایک تیرہ ہزار فٹ اونچی پہاڑی پر سے حملہ آوروں کے ایک دستہ نے یورش کردی۔ رات بھر اسے خود اپنے سپاہیوں کا ہاتھ بٹانا پڑا اور چند گھنٹوں کے لیے تو ساری پوزیشن ہی خطرے میں پڑ گئی۔ حملہ آوروں کو پیچھے ہٹا دیا گیا۔ مگر راجندر کے کتنے ہی آدمی کام آئے۔ حفاظتی چوکیوں کا نقشہ سارے کا سارا بدلنا پڑا اور راجندر سوچ میں پڑ گیا کہ یہ حملہ شمال سے ہوا کیسے؟ جب وہ منتظر تھے مشرق یا مغرب کی طرف سے......

دفعتاً اس کے دماغ میں یاد کی ایک کرن چمکی اور اس نے اپنا سوٹ کیس کھول کر ایک کتاب نکالی جو کپڑوں کے نیچے رکھی تھی۔ ورق الٹنے پر یہ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے تھے:

آدھی جیت تو اسی میں ہے کہ دشمن کو اچنبھے میں ڈال دیا جائے۔ اسے یہ نہ معلوم ہوسکے کہ تمہاری اگلی حرکت کیا ہوگی؟ وہ یہ سوچتا ہی رہے کہ حملہ مشرق سے ہوگا یا مغرب سے اور اسی عرصے میں تمہارا حملہ شمال سے ہوجائے......

رفیق!

سوائے رفیق کے یہ کسی اور کا کام نہیں تھا۔

سو رفیق آج اس کا دشمن تھا۔ چند روز ہی میں اس کی تصدیق ہوگئی راجندر کا ایک کپتان دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں آیا اور بولا...........

''جناب! ہمارے وائرلس کی لائن دشمن کے وائرلس سے مل گئی ہے۔ ان کا افسر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے.........کوئی میجر رفیق..........''

ابھی اس نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ راجندر دوڑ کر وائرلس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''ہیلو ہیلو رفیق۔ 'اوور' یہ کہہ کر اس نے چکر کی گھما دی کہ ادھر سے آواز آسکے۔ ادھر سے ایک جانی پہچانی آواز آئی'' کیوں بے راجندر! بزرگوں کے سامنے آتا ہے؟ ابھی تو ایک ہی پینترا دکھایا ہے۔ ہوشیار رہنا اُوور''

''زبان سنبھال کر بولو۔ اب میں لیفٹیننٹ کرنل ہوں۔ کوئی گھٹیا میجر نہیں۔ کیا سمجھے؟ اُوور۔''

''اچھا تو پھر مبارکباد کے ساتھ ایک دوستانہ تحفہ قبول کرو۔''

ابھی رفیق نے اُوور بھی نہیں کہا تھا کہ دور سے ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی اور اس کے چند سیکنڈ بعد ان سے کوئی سو گز پر شمال مشرق کی طرف ایک پچیس پاؤنڈ کا گولہ گر کر پھٹا۔

راجندر وائرلس پر بولا ''اپنے تو چچی کو نشانہ تو سکھا پہلے۔ اوور''

رفیق کی آواز آئی۔ ''نشانہ ٹھیک تھا۔ تم سے سو گز شمال مشرق کی طرف گرا ہے نا؟ جا معاف کیا۔ تیری بیوی کا خیال آگیا۔ بیوہ ہو جائے گی بے چاری'' ایک جانی پہچانی ہنسی کی آواز 'اُوور' کے ساتھ سنائی دی اور پھر وائرلس کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

رفیق کی آواز اس کے دوست کی آواز ـــــ مگر نہیں وہ اس کا دوست نہیں ہوسکتا۔ اس کا دوست، اپنے سپاہیوں کو اس قتل و غارت کی کبھی اجازت نہ دیتا جو انہوں نے اپنے قبضے کے دوران میں گریز کی وادی میں کیا تھا اور اس کے بعد چند ہی روز ہوئے چوروان کے گاؤں میں

دبے گھر کر دیا تھا، نہیں۔ یہ اس کا دوست رفیق نہیں ہوسکتا۔

ب اس نے رفیق کے ہیڈ کوارٹر پر شب خون مارنے کے لیے اپنے چھ

ہٹ نہ ہوئی۔ اسے دشمن کو اس پہاڑی سے ضرور ہٹانا تھا۔ ورنہ اس کی

ہیں، گریز کے ہر باشندے کی جان خطرے میں تھی۔ کیونکہ وہاں سے

ہی دشمن کی ہلکی توپیں دن بھر برابر گولا برسا رہی تھیں۔

شب خون کامیاب رہا۔ رفیق مارا گیا تھا۔ اس نے اپنے کیے کی سزا پائی تھی۔ جنگ میں جذبات کا کیا کام، اگر تم چوک گئے تو مارے گئے۔ اسے رفیق کی موت کا کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے مگر اسے تھا کیونکہ یہ ایک دوست ہی کی موت نہیں تھی، دوستی کی موت تھی۔ بچپن اور جوانی کی خوش گوار یادوں کی موت تھی، اتحاد کی موت تھی۔ رفیق کے مرنے کے بعد راجندر کو ایسا معلوم ہو رہا تھا، گویا اب کوئی ہندو اور مسلمان آپس میں دوست نہ بن سکیں گے اور اس احساس نے اس کے دل میں ایک عجیب خلا پیدا کر دیا تھا۔ کیا یہ خلا کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ رفیق اور راجندر دونوں مل کر ایک بنے تھے۔ رفیق کے بغیر راجندر کی ہستی، اس کی زندگی ادھوری تھی۔ راجندر کا دل ایک اتھاہ یاس کے سمندر میں دھیرے دھیرے ڈوبتا جا رہا تھا۔

'جناب'

ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ڈوبنے سے بچا لیا۔

'جناب'

خاکی وردی پہنے ہوئے ایک نوجوان اسے فوجی سلام کر رہا تھا۔ ضرور یہ بھی اب 'میجر رفیق مارا گیا' کہہ کر اس کو چڑائے گا۔

''کیا ہے؟'' راجندر نے پھر لیفٹیننٹ کرنل راجندر بنتے ہوئے کسی قدر درشتی سے پوچھا۔

''جناب! میں ملیشیا کے ہیڈ کوارٹر سے بھیجا گیا ہوں۔ گریز میں ملیشیا کا ایک دستہ بنانے کے لیے۔''

'ملیشیا'

''جی جناب، کشمیر نیشنل ملیشیا۔'' نوجوان کی آواز میں ایک عجیب جوش تھا۔ ایک عجیب بے چینی۔ ''یہاں کے گاؤں والے اپنا ایک حفاظتی دستہ بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے بھیجا گیا ہے......''

ہاں ہاں میں سمجھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟

''جناب میرا نام ہے رفیق''

''کیا نام بتایا تم نے؟''

رفیق محمد رفیق۔ میں جناب سری نگر کالج میں پڑھتا تھا......

نوجوان اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ شال پر کڑھائی کا کام کرتا تھا اور نیشنل کانفرنس کا پرانا کارکن تھا۔ اس کا باپ دوبار جیل جاچکا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا باپ اسے کالج میں بھیجنے کا خرچ اٹھا سکا تھا۔ مگر قبائلی حملے کے بعد وہ کالج کی پڑھائی چھوڑ کر ملیشیا میں شامل ہو گیا تھا۔ تین بار محاذِ جنگ پر لڑ چکا تھا۔ ایک بار زخمی بھی ہوا تھا۔ مگر راجندر کے دماغ میں کوئی اور ہی آواز آرہی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو—

''میں رفیق ہوں رفیق۔ صوبے دار میجر شفیع خاں کا بیٹا۔ تمھارا دوست— تمھارا بچپن کا ساتھی— یاد ہے جب مجھے کھانسی ہوئی تھی تو تم اپنے پتا جی سے میرے لیے میٹھی میٹھی چورنے کی گولیاں لایا کرتے تھے۔...... یاد ہے ہم راولپنڈی میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ تم بہترین بولر تھے اور میں بیٹنگ میں نمبر اول لیکن اگر میں ہر میچ میں سنچری نہ بناتا تو تمہاری بولنگ کس کام آتی..........؟ پھر وہ دہرہ دون اکیڈمی کا زمانہ یاد ہے؟..........اور وہ میری شادی کا دن؟ سہرا باندھے ہوئے میں کیسا بدھو لگتا تھا؟ اور کتنی ہنسی ہوئی تھی۔ جب تم نے اپنی بھاوج کا منہ دیکھ کر کہا تھا بیچاری بچّی! افسوس ہے تیری قسمت بھی کس جانگلو سے پھوٹی گئی.......... پر یار مجھے افسوس ہے میں تمہاری شادی میں نہ آسکا ورنہ پورا بدلا اتارتا اور بھابی کو خوب خوب چھیڑتا..........اور وہ دہلی کے ریفرشمنٹ روم کا واقعہ یاد ہے؟...... بہت پی گئے تھے اس دن ہم— کتنی دھینگا مشتی مچائی، مگر اصل میں اس لال منہ والے انگریز کو دیکھ کر غصہ آگیا تھا— سالا— اس کا بس چلتا تو ہم دونوں کو شراب بھی الگ الگ ہندو مسلمان بوتلوں سے ملتی..........اور وہ میری کتاب تو مل گئی ہوگی؟ کتنی بار وعدہ کیا کہ دونوں اپنی اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر کشمیر چلیں گے اور تم آئے بھی تو اکیلے۔ بیوی کو کیوں نہیں ساتھ لائے—؟ میں تو ضرور لاتا مگر تم جانتے ہو......''

وہ کشمیری نوجوان بولے جارہا تھا ''جناب ہمیں یقین ہے کہ آپ جیسے بہادر افسروں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکیں گے اور کشمیر کی اپنی قومی جمہوری فوج بنائیں گے..........'' اور اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب لیفٹیننٹ کرنل نے کھڑے ہو کر نہایت تپاک سے ایک معمولی لیفٹیننٹ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: وہ سب ہو جائے گا مگر یہ بتاؤ کہ کالج میں تم کرکٹ میں کیسے تھے؟''

○

میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی؟

ایک دو نہیں، سری نگر کے ایس۔ پی کالج سے چار نوجوان دوست فرمائش لے کر آئے۔ کل ہماری بزم ادب کا جلسہ ہے۔ اس میں شرکت کرو، اور ایک کہانی پڑھو۔ اب کوئی انکار کرے بھی تو کیوں کر۔

''کون سی کہانی پڑھوں؟'' میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا جس کا نام بھی وہی ہے۔ جو میرا ہے اور جو میری ہی طرح گنجا اور پستہ قد ہے۔ غرض ہو بہو 'میں' ہے۔

''کشمیری نوجوانوں کی محفل میں کہانی پڑھنے والے ہو تو کشمیر پر کوئی کہانی پڑھو۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں نے تو کشمیر کے بارے میں ایک ہی کہانی لکھی ہے 'زعفران کے پھول' مگر وہ تو یہاں کی جنگ آزادی کے ایک دوسرے ہی دور کی عکاسی کرتی ہے۔ آج تو حالات بدل چکے ہیں......''

میں نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ بولا 'تو کوئی نئی کہانی لکھو۔'

''کہنا آسان ہے اور لکھنا مشکل ہے'' میں نے کہا 'چند گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں کیسے لکھ پاؤں گا؟''

مگر اس نے بچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔'' لکھنے والے چند گھنٹے میں بھی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ زعفران کے پھول تم ہی نے سری نگر سے راولپنڈی تک کے سفر میں لکھی تھی، ہاں اگر کوئی اپنی

سستی کے بہانے تلاش کرنا چاہیے تو............"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "اچھا بھئی اچھا۔ تم جیتے میں ہارا نئی کہانی لکھتا ہوں....."

کاغذ قلم لے کر میں بیٹھ گیا۔ چہرے پر انہماک بلکہ الہام کے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ آس پاس والے، سب جان جائیں کہ دماغ پر تخلیقی بھوت سوار ہے۔ کیا کہانی لکھوں؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

کہانی کے بارے میں اکثر کم سمجھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی اخبار کے مضمون کی طرح لکھی جاتی ہے، ناپ تول کر، یا غزل کی طرح قافیے ردیف کو گھڑ کر تیار کی جاتی ہے۔ درحقیقت کہانی لکھی نہیں جاتی بلکہ الہامی اشعار کی طرح نازل ہوتی ہے۔ کسی گجراتی افسانہ نگار نے کہانی کو ایک ہرنی سے تشبیہہ دی ہے۔ جو جنگل میں کلیلیں کرتی پھرتی ہے اور کوئی خوش قسمت اور چالاک شکاری ہی اس کو قابو میں کر پاتا ہے۔

عالم خیال کے جنگلوں اور میدانوں میں اسی ہرنی کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا مگر ہر بار وہ زقند بھر کر آگے نکل گئی اور میں نشانہ لگاتا ہی رہا۔ کشمیر کی ہر جنت نظیر وادی، ہر دامن کہسار، ہر جھیل اور دریا کی سیر میں نے کی ہے۔ شکارے پر بیٹھ کر میں ڈل میں گھوما۔ گھوڑے پر سوار ہو کر البتر ہو آیا۔ شالی مار میں گاتے ہوئے آبشاروں کے نغمے میں نے سنے مگر کہیں مجھے کہانی نہ ملی۔ میں ہر طبقے کے کشمیریوں سے ملا۔ ہانجی شکارے والے، دست کار، گوجر، پنڈت، پیر، لکڑہارے، بڑھئی، لہار، سنار، شالی کوٹتی ہوئی عورتیں، دھان کے کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ہوئے کسان۔ مگر یہ سب تو معمولی کام کرنے والے انسان تھے، بھلا ان کے بارے میں کہانی کیسے لکھی جا سکتی ہے؟ کہانی تو ہیرو ہیروئین کے بارے میں لکھی جاتی ہے اور ہیرو ہیروئین صرف ایک کام کرنا جانتے ہیں— عشق

غرض اس جنت نظیر ملک میں جہاں قدرت نے انسان اور اس کے قدرتی ماحول دونوں کو حسن بخشا ہے، جہاں کا ہر نظارہ رومان انگیز ہے جہاں حبہ خاتون عرفانی محبت سے سرشار رہی اور جہاں شہزادے اور لالہ رخ کا عشق پروان چڑھا۔ مجھے کہیں عاشق و معشوق کا جوڑا نہ ملا تا کہ میں ان کے بارے میں ایک رومانی افسانہ تصنیف کر سکوں۔ اب آپ ہی سوچیے کہیں میلے کچیلے کپڑے پہننے والے ہانجیوں اور کسانوں کے بارے میں کہانی لکھی جاتی ہے......

جیسا میں نے عرض کیا عالم خیال میں اسی طرح کہانی کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا کہ میں نہ جانے کس طرح پام پور جا نکلا۔ پام پور! اسی گاؤں کے بارے میں میں نے کتنی ہی رومانی داستانیں سنی تھیں۔ کرشن چندر نے کہیں لکھا ہے کہ جس نے پام پور کا چاند نہیں دیکھا وہ دنیا کے حسین ترین نظارے سے محروم رہا ہے۔ نہ معلوم پام پور میں کوئی الگ چاند نکلتا ہے یا وہی زرد روشنی کی ٹکیا جو ساری دنیا میں دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال اور دوستوں کی زبانی سنا تھا کہ زعفران کے موسم میں پام پور کے قریب زعفران کے کھیت چاندنی رات میں عجیب پر بہار کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ پام پور! زعفران اور شہد خوشبو اور مٹھاس، دریا کا کنارہ اور وہ مست چاند۔ میں نے سوچا پام پور میں ضرور رومان پلتے ہوں گے مگر جب میں نے گاؤں کے تنگ اور تاریک ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ سڑک پر بارش کی وجہ سے کیچڑ تھا اور مرد عورت سب اونچی اونچی لکڑی کے چبوترے نما کھڑاویں پہنے پھر رہے تھے۔ جہلم میں سیلاب آیا ہوا تھا اور وہ ایک رومانی مدھم بہنے والی ندی کے بجائے ایک بپھرا ہوا سمندر بنا ہوا تھا، چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں نہ رومان کا پتہ چلا اور نہ کوئی ہیرو ہیروئین ملے۔

پھر میں نے دور سے ایک لڑکی کو دیکھا جو گھڑا سر پر اٹھائے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ اس کی چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور جوان ہے جیسا آپ سب جانتے ہیں، سر پر گھڑا اٹھائے ہوئے پنگھٹ کی طرف جاتی ہوئی عورت ہمیشہ ایک خوب صورت اور رومانی منظر پیش کرتی ہے۔ پنگھٹ کا تصور ہی کس قدر دل فریب اور رومانی ہے۔ سکھیوں کی چُہل، پانی کے چھینٹے، عاشقوں کا چھپ چھپ کر دیکھنا، کسی مسافر کا پنگھٹ پر ٹھہر کر پانی مانگنا اور شربت دیدار کے گھونٹ پی کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے چلے جانا............

معاف کیجیے میں کسی فلم کا خیال کر رہا تھا۔

وہ لڑکی پنگھٹ پر جانے کے بجائے دریا کے کنارے پر گئی اور وہاں سے گھڑا بھر کر واپس ہوئی۔ میری نگاہ میں یہ ایک رومانی فعل نہیں بلکہ ایک نہایت غیر صحت مند فعل تھا۔ کیونکہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا پانی گدلا اور گندا تھا۔ نہ جانے کیا الا بلا بہا کر لا رہا تھا۔ بھلا کوئی کنوئیں کا صاف پانی چھوڑ کر اس گندے پانی کو کیوں پیئے۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا پانی رس رس کر کنوؤں

میں بھی پہنچ گیا ہے اور اس وقت نسبتاً دریا کا بہتا ہوا پانی کنوئیں کے ٹھہرے ہوئے پانی سے بہتر ہے۔

ہاں تو جب وہ لڑکی پانی بھر کر واپس ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان ہی تھی۔ گوری رنگت تھی مگر اس پر کچھ کیچڑ لگا ہوا تھا۔ بالوں میں دھول اٹی ہوئی تھی، پیراہن میلا تھا۔ ننگے پاؤں کیچڑ میں دھنسے جاتے تھے۔ میرے رومان زدہ دماغ نے فوراً کہانی کا عنوان طے کر لیا۔ 'کیچڑ کا کنول'

قریب کھڑے ہوئے ایک بڑے میاں سے میں نے پوچھا ''اس لڑکی کا نام کیا ہے؟''

جواب ملا ''نوراں''

نوراں کتنا اچھا نام ہے! کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو دونوں کی کہانیوں میں آ چکا ہے۔ یہ لڑکی ضرور ایک افسانے کی ہیروئین بن سکتی، اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور کسی سے عشق کرتی ہوگی۔ ایک اور آدمی سے میں نے پوچھا کیوں بھائی! یہ نوراں کسی سے عشق کرتی ہے؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''عشق! اس کی تو کئی برس ہوئے شادی ہو چکی ہے۔''

لاحول ولاقوۃ، میں نے سوچا جبھی تو ہندوستان اور کشمیر ترقی نہیں کر پاتے ابھی لڑکی جوان نہیں ہوتی، دو چار عشق نہیں کر پاتی کہ جھٹ سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ بھلا شادی شدہ لڑکی کے بارے میں بھی کوئی افسانہ لکھ سکتا ہے؟ جب تک وہ اپنے شوہر کے بجائے کسی دوسرے جوان کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے؟ اور نوراں کی چال ڈھال وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سیدھی سادی جاہل ہندوستانی لڑکیوں میں ہے جو شادی بیاہ ہی کو اپنے رومان کی معراج اور اس کا اختتام سمجھتی ہیں۔

خیر میں نے سوچا، اس نوراں کے شوہر سے تو ملا جائے شاید اسی میں رومانی جراثیم پائے جائیں۔ میں نے ایک راہ چلتے سے پوچھا، کیوں جی! اس نوراں کا شوہر کیا کرتا ہے؟

اس نے کہا ''نانبائی ہے۔'' میرے رومانی تخیل کو پھر ایک ٹھیس پہنچی۔ بھلا کوئی نانبائی بھی عشق و محبت کو سمجھ سکتا ہے؟ کیا اس کے دل میں بھی آٹے کی طرح خمیرہ اٹھ سکتا ہے؟ کیا وہ ایک خوب صورت حسینہ کو دیکھ کر یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ اس کے پھولے ہوئے گال بالکل میری نانوں کی طرح ہیں۔

پھر بھی میں نے سوچا چلو اسے دیکھ تو لوں۔ کیوں بھائی! اس کی دوکان کہاں ہے؟

''وہ کیا ہے سامنے''

''مگر وہ تو بند ہے''

''یا روہ محاذ پر گیا ہوا ہے''

''محاذ پر؟ تمھارا مطلب ہے جنگی محاذ پر!''

''ہاں ہاں فرنٹ پر''

یہ سن کر میں خوش ہوگیا۔ نوراں کا شوہر میدان جنگ پر دشمن کا مقابلہ کر رہا ہے۔ شاید درجنوں قبائلیوں کو مار چکا ہوگا۔ شاید اسے کوئی مڈل یا انعام ملا ہو۔ وہ ضرور ہیرو بننے کے قابل ہوگا۔ میں ضرور اس سے فرنٹ پر جا کر ملوں گا تب میرا افسانہ مکمل ہو جائے گا۔

میں نے پوچھا ''نیشنل ملیشیا'' میں ہے نا؟''

جواب سن کر میرے جوش وخروش پر پانی پڑ گیا۔

''نہیں جی! وہ تو بیچارہ قلی بن کر گیا ہے۔ ہندوستانی فوج کا سامان اٹھا کر لے جاتا ہے۔''

اب آپ ہی سوچیے ایک سپاہی کو تو ہیرو بنایا جا سکتا ہے مگر ایک قلی کو کیسے ہیرو بنایا جا سکتا ہے............؟

سپاہی خواہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو ایک رومانی ہستی ہوتا ہے مگر قلی............

خیر میں نے پوچھا ''نام کیا ہے اس کا؟''

''احمد و''

میں نے دماغ میں نام نوٹ کرلیا کہ شاید آئندہ کام آئے۔

پھر میں نوراں کے گھر پہنچا کہ ممکن ہے وہاں کوئی افسانوی مسالہ مل جائے مگر اس کا گھر جس کے آنگن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ نہایت غیر رومانی تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید نوراں اپنے شوہر کے فراق میں برہا کا کوئی درد بھرا، کوئی کشمیری گیت گا رہی ہو، مگر وہ نہایت غیر رومانی انہماک سے دھان کوٹ رہی تھی...... ہاں اسی کے پاس ہی اس کا ڈیڑھ دو برس کا بچہ گیلی زمین پر بیٹھا رو رہا تھا۔ غالباً اوکھلی میں سے جو گرد نکل رہی تھی وہ اس کی آنکھوں میں گر گئی تھی کیونکہ وہ بار بار آنکھیں مل رہا تھا۔

اس گھٹیا قسم کے گھریلو منظر میں مجھے کوئی رومانی یا افسانوی پہلو نظر نہیں آیا اس لیے میں وہاں سے چلنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ کل معافی مانگ لوں گا کہ کہانی مکمل نہیں ہو سکی............ مگر میں باہر نکلنے والا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ نوراں نے کام روک کر بچے کو گود میں اٹھالیا ہے اور اسے

پیار کرتی جا رہی ہے اور کچھ کہتی جاتی ہے اور اس کی آنکھیں دور، بہت دور سے کچھ دیکھ رہی ہیں اور بیک وقت ہنس بھی رہی اور رو بھی رہی ہیں۔ میں کشمیری نہیں سمجھ سکتا اس لیے میں نے ایک ہمسائے سے پوچھا "یہ نوراں اپنے بچے سے کیا کہہ رہی ہے؟" وہ بولا "یہ کہتی ہے کیوں روتا ہے رے تو؟ تجھے تو باپ کی طرح بہادر ہونا چاہیے۔

"بہادر!" یہ لفظ سن کر میں ٹھٹکا۔ میں نے سوچا اس احمدو کی ضرور تلاش کرنی چاہیے۔ شاید وہ سچ مچ افسانے کا ہیرو بننے کے قابل ہو۔ مگر احمدو کا پتہ کہاں ملتا؟ فرنٹ پر تو ہزاروں قلی کام کرتے ہیں۔ پھر بھی میں بارہ مولا ملیٹری ہیڈ کوارٹر میں پہنچا تو میں نے دریافت کیا کہ کیا قبائلیوں کے رجسٹر میں کہیں احمدو کا نام درج ہے؟ معلوم ہوا ایک نہیں درجن بھر احمدو لکھے ہوئے ہیں۔

اوڑی کے راستے میں میں ایک پکٹ پر ٹھہرا جہاں نیشنل ملیشیا کی ایک کمپنی تعینات تھی۔ ان سے باتیں کر رہا تھا کہ وہاں اوڑی سے واپس آئی ہوئی قلیوں کی ایک لاری ٹھہری۔ یہ وہ لوگ تھے جو فرنٹ پر چار پانچ ہفتہ کام کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ ملیشیا کے لڑکے لاری کی طرف دوڑے اور پوچھا "کیوں بھئی پام پور والا احمدو بھی ہے تم میں کیا؟

ایک بوڑھا قلی ہنس کر بولا اور...... احمدو واپس آسکتے ہیں مگر پام پور والا احمدو فرنٹ سے ٹلنے والا نہیں۔ میرے دماغ میں یادداشت کی ایک گھنٹی بجی۔ لاری روانہ ہوگئی۔ میں نے ملیشیا والوں سے پوچھا "کیوں بھئی! یہ پامپور والا احمدو کیوں مشہور ہے؟"

انھوں نے بتایا کہ "اس نے ملیشیا میں بھرتی ہونے کی تین بار کوشش کی تھی مگر ہر بار اسے نامنظور کر دیا گیا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ قابل اعتبار آدمی نہیں ہے؟"

قابل اعتبار کیوں نہیں، نیشنل کانفرنس کا پرانا کارکن ہے مگر اس کی آنکھیں نہایت کمزور ہیں اس لیے ڈاکٹری معائنے میں بے چارہ فیل ہو جاتا ہے۔ مگر وہ محاذ پر جانے کے لیے اتنا مصر تھا کہ چپکے سے قلیوں کے دستے میں بھرتی ہو گیا اور اب تین مہینے سے کام کر رہا ہے۔

سنا ہے کہ احمدو اوڑی کے محاذ پر ہے۔ میں اس سے ملنے اوڑی پہنچا وہیں معلوم ہوا کہ تیتھوال میں زیادہ خطرہ ہونے کی وجہ سے قلی وہاں جانے سے جھجکتے ہیں، اس لیے احمدو ان کو لے کر اس محاذ پر

چلا گیا ہے۔ میں تیتھوال پہنچا تو وہ سکردو جا چکا تھا۔ میں سکردو میں تو وہ پونچھ میں۔ میں پونچھ میں تو وہ واپس اوڑی میں۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی اور جب تک وہ نہ ملے میری کہانی کیسے پوری ہو!'

میں واپس اوڑی پہنچا جو کرنیل قلیوں کا انچارج تھا۔ اس سے پوچھا آپ کے یہاں ایک احمدو قلی ہے پامپور والا؟" یہ کہہ کر میں قلم کاغذ نکال کر بیٹھ گیا تا کہ اس کے حالات معلوم کر کے افسانہ مکمل کرلوں۔ کرنیل نے میری طرف ایک عجیب انداز سے دیکھا اور جواب میں صرف ایک لفظ کہا 'تھا'۔ "تھا؟"

"ہاں" کرنیل بولا 'رات وہ ایک قریب کی پہاڑی پر مارا گیا"

"مارا گیا؟ مگر وہ سپاہی تو نہ تھا! وہ صرف ایک قلی............"

کرنیل نے کہا "احمدو صرف ایک قلی نہیں تھا'

میں کچھ مطلب نہیں سمجھا۔ اتنے میں ایک کیپٹن داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنگ لگی ہوئی دقیانوسی توڑے دار بندوق تھی۔ کرنیل کو سلام کرتے ہوئے اس نے کہا۔

جناب! اپنی بندوق سے اس نے دشمن کے آٹھ آدمی ہلاک کر دیے۔ اسے وہ ہمیشہ اپنے پیراہن میں چھپائے رکھتا تھا۔

میرے دماغ میں ایک زنانی آواز نے کشمیری میں کہا: "کیوں روتا ہے رے تو تجھے تو اپنے باپ کی طرح بہادر ہونا چاہیے۔"

میں نے کرنیل سے کہا "کیا میں احمدو کی لاش کو دیکھ سکتا ہوں؟" شاید اسی غریب نانبائی کے مردہ چہرے پر اس کے خدوخال میں اس کی شجاعت اور وطن پرستی کا راز مل سکے!

— کرنیل نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ کیپٹن نے ہلکے سے سمجھایا کہ ایک پچیس پونڈ کے گولے نے احمدو کے چیتھڑے بکھیر دیے تھے۔ اس کی لاش کا ایک ٹکڑا بھی دستیاب نہ ہوا تھا۔

میرے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ میں نے احمدو کی بندوق اٹھا لی اس کے کندے پر اب تک لہو———احمدو کا لہو———لگا ہوا تھا۔

سو احمدو سے میری ملاقات نہ ہو سکی جو یہ افسانہ مکمل ہو سکتا۔ امید ہے کہ آپ معاف کریں گے کہ میں آپ کی فرمائش پوری نہ کر سکا بہرحال آپ جان گئے کہ میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی۔

○

میرے بچّے

سورج ایک پہاڑی کے پیچھے ڈوب گیا۔اور پہاڑی کا رنگ سبز ہے جو سرمئی اور سرمئی سے گہرا نیلا ہوتا گیا، آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی جیسے بادلوں میں آگ لگی ہوئی ہو۔زونی کی وحشت زدہ آنکھیں اس آتشیں نظارے کی تاب نہ لا سکیں۔اس کے تخیل کے سامنے اس کا گاؤں جل رہا تھا، اس کا جھونپڑا جل رہا تھا۔اس کا شوہر غفورا جل رہا تھا، جو اپنا کچھ سامان بچانے کے لیے جلتے ہوئے جھونپڑے میں بے تحاشا بھاگتا ہوا گیا تھا اور کبھی زندہ واپس نہ آیا تھا۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اجڑے، لٹے کھٹے، انسانوں کا یہ قافلہ پگڈنڈی پگڈنڈی پہاڑی پر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔زونی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ الگ الگ فرد نہیں تھے بلکہ سب مل کر ایک خوفناک سوناگوں کا کن کھجورا بن گئے تھے، جو پہاڑی پر رینگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

چار دن سے وہ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے قافلے کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔دن میں وہ سب جنگلوں میں درختوں کے نیچے یا پہاڑی کے دامن میں غاروں کے اندر چھپے رہتے، تاکہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جائیں اور شام کو سورج ڈوبتے وقت پھر سفر شروع کر دیتے۔چار دن سے انھوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔صرف پتوں اور جڑوں پر گزارا کیا تھا۔اب تو قدم اٹھانا بھی دوبھر معلوم ہوتا تھا۔اکیلی ہوتی تو وہ کبھی کا دم توڑ چکی ہوتی مگر وہ اکیلی نہ تھی۔اپنی انفرادیت کھو کر

وہ اس قافلے کا جزو بن چکی تھی۔ کن کھجورے کی سو ٹانگوں میں سے ایک ٹانگ، دریا کے بہاؤ میں پانی کے بہاؤ کی ایک بے حقیقت بوند۔ جب تک قافلہ چلتا رہتا وہ بھی چلتی رہتی۔

دور نیچے گھاٹی میں تیز رو دریا شور کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ کہیں نزدیک ہی کوئی بڑا بھاری آبشار گر رہا تھا جو اندھیرے میں نظر نہ آتا تھا۔ مگر پھیلے ہوئے سناٹے میں اس کی آواز ایک خوفناک قہقہے کی طرح پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ خوفناک قہقہے پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔

ہیبت ناک، غیر انسانی قہقہے۔ سرخ ہولناک آنکھیں، لوہے کے پنجوں جیسے کرخت ظالم ہاتھ جن کی گرفت میں ایک جناتی طاقت تھی۔ جن کے لمس میں ایک شیطانی حدّت جیسے حیوانی ہوس کا بخار چڑھا ہو۔ کپڑے پھٹنے کی آواز، جیسے انسانیت کی دستاویز پھاڑی جا رہی ہو۔ جیسے کسی معصوم جسم کی ٹانگیں چیر کر دو ٹکڑے کیے جا رہے ہوں اور پھر ایک چیخ فضا میں بلند ہوتی ہوئی...... اس کے اپنے گلے سے نکلی ہوئی چیخ، مگر خود اس نے اسے ایسے سنا تھا جیسے وہ اس کی اپنی چیخ نہ ہو بلکہ کسی اور عورت کی چیخ ہو۔ گاؤں کی تمام عصمت شکستہ عورتوں کی متحدہ چیخ ہو۔ تمام زخمی انسانیت کی پکار ہو۔

قبائلی طوفان زونی کے گاؤں کو تباہ و برباد کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ کتنے ہی جھونپڑے جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ کتنے ہی آگ بجھ جانے کی وجہ سے آدھے جلے ہوئے ویران پڑے تھے۔ ساز و سامان تمام لٹ چکا تھا۔ خود زونی کی عصمت لٹ چکی تھی۔ اس کا شوہر مر چکا تھا، گھر جل چکا تھا۔ زونی کی امنگیں، زندگی کی تڑپ، اس کی آنکھوں کی چمک...... سب کچھ ختم ہو چکی تھیں۔ کئی برس ہوئے دریا کے کنارے سیلاب گزر جانے کے بعد زونی نے دیکھا تھا کہ گھاس پانی کے زور سے زمین کے ساتھ لگ گئی ہے۔ مردہ گھاس پانی، بے سکت گھاس۔ بے رنگ گھاس۔ وہی حالت اس خونی سیلاب کے گزر جانے کے بعد زونی کی ہوئی تھی۔ وہ زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا جتنی جلدی مر جاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔

اور پھر اسے اپنا بچہ یاد آیا۔ ڈیڑھ برس کی ننھی سی جان، جسے اس نے پھوس کے ایک ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ جہاں ان درندہ صفت انسانوں کی نگاہیں اس پر نہ پڑ سکیں۔ گو اس کی ٹانگوں میں

چلنے کی طاقت نہ تھی، پھر بھی اپنے جسم کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتی ہوئی وہ اس پھونس کے ڈھیر تک پہنچی۔ چند منٹ لگے ہوں گے مگر وہ انتظار اور امید وبیم کے کئی سالوں سے کم نہ تھے۔ بچہ زندہ ہے۔ بچہ مر گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر بچہ مر چکا ہے تو پھر وہ بھی زندہ نہ رہے گی۔ زہر کھانے یا کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی ضرورت نہ تھی، وہ اپنے لال کی لاش کو چھاتی سے لگا کر کہیں جنگل میں لیٹ رہے گی اور رینگتے ہوئے سایے کی طرح موت خود ہی آہستہ آہستہ اس پر چھا جائے گی۔

مگر بچہ زندہ تھا۔ گو بھوک و پیاس سے اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ اس میں رونے کی بھی سکت نہیں رہی تھی 'یا اللہ تیرا شکر ہے' اس کی زبان سے بے اختیار نکلا اور اس نے بچے کو چمٹا لیا۔ اپنے پھٹے ہوئے پیراہن سے ڈھک کر اسے دودھ پلانے لگی۔ دودھ کی دھار کے ساتھ زندگی کی لہر بھی بچے کے جسم میں دوڑ گئی اور کئی گھنٹے کی موت جیسی خاموشی کے بعد وہ رونے لگا۔ زونی کو ایسا لگا جیسے اس نے پھر سے ننھی سی جان کو جنم دیا ہے۔

اس تمام علاقے پر قبائلی حملہ آوروں کا قبضہ ہو گیا تھا مگر زونی کے گاؤں کی طرف پھر انھوں نے توجہ نہ دی۔ وہاں لوٹنے کے لیے رہا ہی کیا تھا جو وہ پھر آتے۔ سڑک پر سے کبھی کبھی ان کے دستے گھوڑوں پر یا لاریوں میں گزرتے بھی تو اس ویران گاؤں میں قیام نہ کرتے۔

موت کے خاکستر سے زندگی کی کونپلیں پھر پھوٹیں۔ گاؤں والے آہستہ آہستہ جنگل سے واپس آ گئے۔ لاشوں کو دفن کیا۔ جو زخمی تھے ان کی مرہم پٹی کی گئی، مکانوں کی مرمت کر کے کسی نہ کسی طرح پھر ان میں رہنے لگے۔ بیل قبائلی ذبح کر کے کھا گئے تھے، گائیں اور بکریاں ہنکا کر لے گئے۔ بیلوں کی جگہ آدمی ہلوں میں جتے اور پھر کھیتی شروع ہوئی۔

زونی اور اس کے بچے پر رحم کھا کر ایک ہمسائے نے اپنے گھر میں جو کسی طرح جلنے سے بچ گیا تھا ایک کوٹھری دے دی تھی، مگر کھانے کو ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ بھرنے کے لیے زونی کو کیا کیا جتن نہ کرنے پڑے۔ وہ ہمسایوں سے بھیک مانگتی۔ موقع ملتا تو چوری کرتی جنگل سے کچھ کچے پھل توڑ کر لاتی، مگر کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ ضرور بھرتی، اپنی خاطر نہیں بلکہ اس ڈر سے کہ کہیں ایسا نہ ہو اس کی چھاتیوں کا دودھ سوکھ جائے اور بچہ بھوک سے مر جائے۔

اب اس کی زندگی کا مرکز اور محور یہی بچہ تھا۔ اس کے بارے میں زونی کے دماغ میں کیا کیا

خواب اور منصوبے تھے ۔ یہ بچہ بڑا ہو کر سپاہی بنے گا۔ دشمن سے اپنی ماں اور مادرِ وطن کی بے حرمتی کا بدلہ لے گا۔ بڑا ہو کر یہ شاید کوئی افسر بنے گا۔ ایسا افسر نہیں جیسے پرانے ذیل دار، تحصیل دار اور وزیر زراعت جو صرف رشوت لینا اور غریب کسانوں پر ظلم کرنا ہی جانتے تھے بلکہ نئے کشمیر کا نئی قسم کا افسر جو اپنے دیش والوں کی سیوا کرے گا۔ جیسا زونی نے ایک بار شیر کشمیر کی تقریر میں سنا تھا۔ خیر، سپاہی بنے، یا افسر، دلہن تو ضرور ہی بیاہ کر لائے گا اور پھر بیٹا اور بہو دونوں بوڑھی زونی کی خدمت کریں گے اور وہ دن بھر پوتے اور پوتیوں کو گود میں کھلایا کرے گی۔ کتنے سندر کتنے میٹھے تھے اس کے سپنے اور پھر یہ سارے سپنے چھوٹے سے معصوم چہرے میں سمٹ آتے جو اپنے شاندار مستقبل سے اتنا ہی ناواقف تھا۔ جیسے اپنے ہولناک ماضی سے۔

کھیتوں میں کونپلیں پھوٹیں، دور دور تک سبزہ لہرانے لگا۔ زونی کے گاؤں والوں کے دل امید اور خوشی سے بھر گئے۔ چار مہینے انھوں نے بڑی مصیبت سے کاٹے تھے، نہ تن ڈھکنے کو کپڑا تھا اور نہ پیٹ بھرنے کو مٹھی بھر چاول۔ پھر بھی انھوں نے اس امید پر یہ مہینے گزارے تھے کہ فصل تیار ہوتے ہی ان کے دن پھر جائیں گے۔ اور کچھ نہیں تو کوئی بھوکا تو نہ رہے گا اور دھان کچھ زائد نکلے تو ان کو کسی قصبے میں بیچ کر شاید کچھ روپیہ بھی مل جائے۔ احد کب سے ایک چمکدار لال چمڑے کے جوتوں کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ علیا بیوی کے ننگے کانوں کے لیے چاندی کی دو بالیاں بنوانا چاہتا تھا تاکہ اس کے زیور جو قبائلی لوٹ کر لے گئے تھے، ان کی کچھ تلافی ہو جائے اور زونی؟ اسے اپنے پیوند لگے ہوئے پیراہن کے بدلے دوسرے پیراہن کی خواہش نہیں تھی۔ اس کو زخمی پاؤں کے لیے جوتیاں نہیں چاہیے تھیں۔ اسے تو بس ایک ہی خیال تھا ایک ہی خواہش تھی۔ کسی طرح اس کے بچے کے لیے ایک ننھا سا لال پیراہن اور لال ٹوپی مل جائے کہ وہ اپنے لال کو گندے چیتھڑوں میں لپیٹنے کی بجائے خوشنما رنگین لباس پہنا سکے۔

مگر اس کی اور دوسروں کی سب خواہشیں دل کی ہی میں رہ گئیں۔ فصل پک کر تیار ہوگئی تو حملہ آوروں کا ایک دستہ سڑک پر سے گزرا۔ اس بار وہ میلے کچیلے کمبل لپیٹے بلکہ خاکی وردیاں پہنے سپاہی تھے جن کے پیتل کے بٹن دھوپ میں جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ ان کا افسر کھیتوں کے بیچ کی پگڈنڈی پر گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور ادھر اُدھر دیکھتا ہوا سرپٹ واپس ہوگیا۔ اتنے عرصے

تک سب کسان کھیتوں میں دم بخود کھڑے رہے اور روپی اپنے بچّے کو اپنے پیرا ہن سے ڈھانپے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔

اگلے دن سورج بھی نہ نکلا تھا کہ موٹروں کے آنے کی آوازیں آئیں ''قبائلی پھر آ گئے۔ قبائلی پھر آ گئے۔'' دبی آوازوں میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ مگر اب کے قبائلی نہ تھے۔ دشمن کے باقاعدہ فوجی سپاہی تھے۔ سوائے چند کے جو لاریوں پر مشین گنیں لگائے کھڑے تھے اور سب کے ہاتھوں میں بندوقوں کے بجائے درانتیاں تھیں۔ اس بار انہوں نے گاؤں یا گاؤں والوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ سیدھے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

چند منٹ تو سب کسان چپ چاپ کھڑے رہے۔ کئی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بار حملہ آوروں کا ارادہ لوٹ مار کا نہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ اس بار لوٹ دوسری قسم کی ہو رہی تھی۔ دشمن کے سپاہی نہایت خاموشی اور اطمینان سے فصل کاٹ رہے تھے اور کٹے ہوئے دھانوں کو لاریوں میں بھرتے جا رہے تھے۔ جب کٹائی کرتے کرتے وہ علیا کے کھیت کی طرف پہنچے تو اس سے نہ رہا گیا۔

''میرے دھان! میری شالی!'' یہ کہتا ہوا وہ پاگلوں کی طرح اپنے کھیت کی طرف بھاگا۔ لاری پر چڑھی ہوئی مشین گن، اپنی ہولناک آواز میں ایک لمحے کے لیے بولی اور خاموش ہو گئی۔ علیا کمر میں گولی کھا کر گرا اور پھر نہ اٹھا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی اور پھر سارے گاؤں اور تمام کھیتوں پر ایک مہیب سناٹا چھا گیا۔ صرف درانتیاں چلنے کی آواز آتی رہی۔

شام تک تمام کھیت ویران ہو چکے تھے۔ درانتیوں کے گھاؤ کھائی ہوئی زمین ایسی برہنہ اور زخمی پڑی تھی، جیسے قبائلی درندوں کی شکار، کوئی کشمیری عورت — دھان سے بھری ہوئی لاریاں حملہ آوروں کے فوجی مرکز کی طرف چلی گئیں۔ اور جاتے جاتے ان کا افسر کسانوں کو مخاطب کر کے کہہ گیا ''آزاد کشمیر کی حکومت تم سب کا شکریہ ادا کرتی ہے تم نے مجاہدوں کی خوراک کا اتنا اچھا انتظام کیا۔''

''آزاد کشمیر مجاہد! آخ تھو'' بوڑھے صمد جو نے حقّے کا کش لگا کر تھوکتے ہوئے کہا۔ جب شام کو سب لوگ اس کے مکان پر جمع ہوئے۔

''لٹیرے کہیں کے۔'' احمد و بولا۔ نئی خوشیوں کا جوڑا اب کبھی اسے نہ مل سکے گا۔''

''پھر صمد جو! بتاؤ نا۔ تم کیا کہتے ہو؟'' کونے میں سے ایک آواز آئی اور پھر سب اکٹھے بول پڑے۔

''اب کس برتے پر پھر سے کھیت بوئیں؟ چار مہینے کے بعد پھر یہ ڈاکو ہماری فصل کاٹ کر لے جائیں گے۔''

'بوئیں گے بھی کیا۔ اب تو ہمارے پاس بیج کے لیے دو مٹھی دانے بھی نہیں رہے۔ جب سے دشمن نے راستے میں اپنی چوکیاں بنائیں ہیں، سری نگر کی طرف سے مدد آنی تو کیا خبریں آنی بھی بند ہو گئیں۔

''اور کھائیں گے کیا؟ اب تک تو اس امید پر زندہ تھے کہ فصل پکنے پر ہمارے پاس کافی دھان ہو جائیں گے۔۔ صمد جو! تم سب سے بڑے ہو تم ہی بتاؤ کیا کریں؟''

چند سنٹ تک خاموشی میں صرف صمد جو کے حقے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی رہی، پھر وہ بولا'' اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔''

''پر اپنا گاؤں چھوڑ کر جائیں گے کہاں؟ دنیا میں ہمارا کون ہے؟ کون ہمیں آسرا دے گا؟''

''کون آسرا دے گا؟ ہماری حکومت۔''

''ہماری حکومت؟ یہ آزاد کشمیر چلانے والے لٹیرے؟''

''نہیں پہاڑیوں کے اس پار۔''

''تم بھی کیا بات کرتے ہو صمد جو۔ کیا مہاراجا ہماری پرواہ کرے گا؟ وہ اور اس کے افسر آج تک ہمارا خون پیتے آئے ہیں۔ ان سے تم ہمدردی کی امید کرنے آئے ہو؟''

''میں مہاراجا کی حکومت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ شیخ عبداللہ کے عوامی راج کی بات کر رہا ہوں۔''

''عوامی راج!'' ہر ایک کے کانوں میں گویا سنگیت کی ایک مدھر لَے سنائی دی۔

''عوامی راج کہنے کو سب کہتے ہیں۔ پر ان لیڈروں کا کیا اعتبار اپنے وعدوں سے پھر جائیں تو؟ اپنا گاؤں جہاں بزرگوں کی ہڈیاں گڑی ہیں وہ بھی چھوٹ جائے اور وہاں پہاڑیوں

کے پار بھی یہی سب ہو جو ادھر ہو رہا ہے تو ہم تو کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔"

"لیڈروں پر اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں۔ عوام کا اپنے پر اعتبار ہونا ضروری ہے۔ ادھر سے خبریں آنی کم ہو گئی ہیں بند نہیں ہوئی ہیں۔ پرسوں ہی ایک آدمی آیا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے 'نیا کشمیر' کا خواب سچا ثابت ہو رہا ہے؟ جاگیرداری کا خاتمہ ہو گیا ہے، زمینداروں سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں کو روکا جا رہا ہے۔ مہاراجا کے اختیارات اس سے لے لیے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم شیر کشمیر پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

"بابا! بابا!" یہ زونی کی آواز تھی۔ مردوں کی بات چیت میں عورتوں کا دخل دینا اچھا نہیں سمجھا جاتا، مگر جب سے پہلے حملے میں اس نے اپنے شوہر، گھر اور عصمت کے ساتھ اپنے ہوش وحواس بھی کھوئے تھے اس کی باتوں کا کوئی برا نہ مانتا تھا۔

"کیوں زونی کیا کہنا ہے؟"

"بابا! بابا! وہ شیر کشمیر ہیں نا؟ وہ میرے بچے کے واسطے لال پیراہن سلوا دیں گے نا؟"

صمد جو، کے جھریوں بھرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔ "ہاں ہاں زونی ضرور بنوا دیں گے۔"

"بس تو میں بھی چلوں گی۔ اس گاؤں میں میرا اب دھرا ہی کیا ہے"

اسی رات کے اندھیرے میں یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ دشمن کی چوکیوں سے بچ کے جانا تھا اس لیے چٹانوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے آہستہ آہستہ وہ رات بھر چلتے، اور دن میں غاروں یا جنگلوں میں چھپ کر لیٹ جاتے۔ صمد جو کا حکم تھا کہ چلتے وقت قدموں کی آواز نہ آنے پائے۔ جب کسی چوکی کے پاس سے گزرتے اس وقت تو زور سے سانس لینے کی بھی اجازت نہ تھی کیونکہ اگر دشمن کے سپاہیوں کو ان کا پتہ چل گیا تو یقیناً سب کو مشین گنوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔

صمد جو کی اطلاعات کے بموجب ان کے گاؤں سے لے کر اوڑی تک دشمن کی سات چوکیاں مختلف پہاڑیوں پر تھیں۔ ان میں سے چھ سے وہ خیریت سے گزر آئے تھے۔ آج کی رات ساتویں چوکی کے قریب سے گزرنا تھا اور قافلے میں ہر ایک کو تاکید کر دی گئی تھی کہ کسی قسم کی آواز نہ ہو ورنہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر بھی وہ پکڑے جا سکتے ہیں۔

زوفی کا دودھ سوکھ چکا تھا اور اس کا بچہ بھوک سے جاں بہ لب ہو رہا تھا۔ گائے یا بکری کا دودھ بھلا کہاں میسر ہو؟ ایک بار اس نے بچے کو بہلانے کے لیے اپنی سوکھی چھاتی اس کے منہ میں دے دی تھی تو اس میں سے خون کی بوندیں نکل آئی تھیں۔ بھوکے بچے نے انھیں بھی دودھ سمجھ کر چاٹ لیا تھا۔ پچھلے پڑاؤ پر زوفی نے پتوں اور جڑوں کو پیس کر اور پانی میں گھول کر بچے کو دے دیا تھا۔ جس سے اس کی بھوک کا تو انتظام ہو گیا تھا۔ مگر شام ہوتے ہی اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ بار بار اس کے ہاتھ پیٹ کی طرف جاتا اور وہ تکلیف سے بلبلاتا اور کراہتا۔

قافلہ چلنے سے پہلے صمد جو نے زوفی سے سختی کے ساتھ کہا ''زوفی! تیرا بچہ بے وقت رو کر ہمیں ضرور پکڑوا دے گا'' اور زوفی نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے منہ سے آہ بھی نہ نکلے گی۔

''شاباش!'' صمد جو بولا'' آج کی رات اور ہے، کل سویرے ہی اوڑی پہنچ کر تیرے بچے کو دودھ پلاؤں گا۔ ہم نے اپنے دو آدمی پہلے ہی خبر کرنے کو بھیج دیے ہیں۔''

''دودھ!'' نام لیتے ہی جیسے اس کے منہ میں دودھ کی مٹھاس آ گئی ہو۔'' دودھ اور وہ ننھے کا لال پیراہن؟''

''ہاں ہاں۔ لال پیراہن بھی ملے گا۔ مگر خبردار جو یہ رویا۔ یا کوئی آواز بھی نکالی۔''

سورج کو غروب ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ چوتھی رات کا چاند نکل آیا تھا۔ اس کی دھیمی دھیمی روشنی میں۔ سامنے کی پہاڑی ایک کالے دیو کی طرح راستے میں کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اسی پہاڑی کی چوٹی پر دشمن کی آخری چوکی تھی۔ اس سے نکل گئے تو آگے اوڑی تک راستہ صاف تھا۔ مگر پگڈنڈی چوٹی کے بالکل قریب ہو کر گزرتی تھی۔ اس خیال سے جوں جوں وہ اوپر چڑھتے گئے قدم سنبھال سنبھال کر دھرنے لگے۔'' بے آواز بھوتوں کا کارواں'' مگر ایک بار کسی کا پاؤں اوچھا پڑا اور ایک پتھر لڑھکتا اور شور کرتا ہوا نیچے دریا میں جا گرا ہر ایک کا سانس اندر کا اندر، باہر کا باہر رہ گیا۔ اوپر سے آواز آئی ''HALT WHO COMES THERE'' اور سب کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زندگی اور موت کے درمیان بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز پل صراط پر کھڑے ہوں اور یہ نہ معلوم ہو کہ اگلا قدم کدھر پڑے گا۔

HALT WHO COMES THERE سامنے والی پہاڑی سے ٹکرا کر سنتری کی آواز پھر لوٹ

آئی اور اسی وقت احدو جو جنگل کی سب بولیاں بول سکتا تھا گیدڑ کی آواز بنا کر بولا، اوپر سے سنتری کے کسی ساتھی نے نیند بھری آواز میں گیدڑ کی پشتوں کو پنجابی میں گالیاں دیں اور پھر سناٹا چھا گیا مگر حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز آتی رہی، جیسے سنتری جاگنے کے لیے یہ شغل کر رہا ہو۔

قافلہ پھر روانہ ہوا۔ دبے پاؤں۔ سانس روکے ہوئے۔ بے آواز سائے اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے۔ پہاڑی پر چڑھتے گئے یہاں تک کہ وہ چوکی سے اتنے قریب آگئے کہ سنتری کے حقے کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سوئے ہوئے سپاہیوں کے خرانٹے بھی سنائی دینے لگے۔

زونی کے شانے سے لگا ہوا بچہ پیٹ کی تکلیف سے کلبلایا اور ایک نحیف سی ''اونہہ'' اس کے منہ سے نکلی، رونے کا پیش خیمہ ''اب یہ روئے گا'' جیسے زونی کے کان میں کسی نے خطرے کی گھنٹی بجا دی ہو اور ایک لمحے سے بھی کم میں اس کے دماغ نے سارے قافلے کو مشین گن کی گولیوں کا شکار ہوتے دیکھا۔ احدو۔ احدو کے بچے۔ بوڑھا صمد جو۔ سارا قافلہ بوڑھے اور بچے اور عورتیں۔ آزادی کا خواب نئے کشمیر کی امنگ تمام امیدوں اور آرزوؤں کا ایک دم خاتمہ ہو گیا۔
''نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے فوراً بچے کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سانس گھٹنے سے کلبلایا۔ اس کے ننھے سے گلے نے فریاد کرنی چاہی۔ مگر زونی کا مضبوط دہقانی ہاتھ سخت ہوتا گیا اور اس کے دانت اپنے ہونٹوں میں گڑتے گئے۔

ساتویں چوکی سے قافلہ خیریت سے گزر گیا۔ سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے پو پھٹ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اوڑی کی وادی کس قدر دلفریب معلوم ہو رہی تھی۔ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا کئی کی آنکھوں میں آنسو آگئے جب انہوں نے سڑک پر چند ہندوستانی اور کشمیری فوجی سپاہیوں کے ساتھ اپنے ان دو ساتھیوں کو کھڑا دیکھا جنھیں اطلاع دینے کے لیے آگے بھیجا گیا تھا۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ ایک لاری کھڑی تھی جس میں سے گرم گرم بھات کی خوشبو آرہی تھی اور اس کے اوپر سرخ ہل والا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

''بچوں کے لیے دودھ بھی ہے۔ سب سے پہلے بچوں کو لے کر آؤ'' ایک والنٹیر نے کہا۔

''زونی!'' صمد جو چلایا ''پہلے تو اپنے بچے کو لے آ'' اور یہ کہہ کر اس نے والنٹیر سے دودھ کا گلاس لے لیا۔ زونی خاموش صمد جو کے پاس گئی اور اپنے پیراہن کے چیتھڑوں میں سے بچے کو نکالا

مگر وہ مر چکا تھااور منہ اور ناک سے خون نکل کر اس کے میلے کرتے کو رنگین بنا رہا تھا۔لال پیراہن!

''زونی! یہ کیا کیا تو نے؟''

زونی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔روتی سسکیاں لیتی وہ اپنے مردہ بچے کو لے کر ایک طرف بیٹھ گئی۔یاس کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی۔

''زونی! زونی!! ذرا سا بھات کھالے'' مگر زونی نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر صمد جو بولا:

''زونی اتنا غم نہ کر۔تیری گود خالی نہیں ہوئی ادھر دیکھ''

زونی نے بچے سے نظر ہٹا کر ادھر دیکھا، جہاں قافلے کے سب لوگ —— مرد اور عورتیں، جوان اور بوڑھے اور بچے —— زمین پر بیٹھے چار دن کے خوفناک سفر کے بعد ستا رہے تھے اور انھیں دیکھ کر اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ ایک ایسے میٹھے نرم اور نازک جذبے کی چمک پیدا ہوئی۔جو صرف ایک ماں کا حصہ ہوتا ہے۔

اب زونی کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔

O

میری موت

لوگ سمجھتے ہیں کہ سردار جی مارے گئے۔

نہیں۔ یہ میری موت ہے۔ پرانے 'میں' کی موت میرے تعصبات کی موت، اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی؟ یہ بتانے کے لیے مجھے اپنے پرانے مردہ 'میں' کو زندہ کرنا پڑے گا۔

میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم اور مسلمان کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا واہ ری قسمت پڑوسی بھی ملا تو سکھ۔ حق ہمسائیگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں سکھوں پر ہنستا بھی تھا، ان سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں بچپن سے میں شاید چھ برس کا تھا جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا۔ جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلّا پڑا ''ارے وہ دیکھو عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی!'' جیسے جیسے عمر گذرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں، مثلاً یہ کہ اسے نمونیہ ہو گیا تھا۔ یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں ''اب سے دور کسی

سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا تھا یا اب سے دور کسی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی' بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوستا 1857 کی یادگار تھا۔ جب ہندو مسلمانوں کی جنگ آزادی کو دبانے میں، پنجاب کے سکھ راجوں اور ان کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی، صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب، ذرا انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا، ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا کہ اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدوں پر خوب کودا، باتھ روم کے آئینے میں اچک کر اپنا عکس دیکھا، سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا، روشنیوں کو کبھی جلایا، کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلاڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھس آئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا۔ یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے، کچھے پہنے بیٹھے تھے۔ مگر میں ان سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے ان سے زیادہ مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے جو میں بھی پہننا چاہتا تھا۔ اور ڈیم بلاڈی فول والی زبان بولتے تھے جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے۔ مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا، وہ حقارت آمیز تھا۔ کتنے عجیب الخلقت تھے یہ سکھ، جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال منڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا ابا کے اس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں۔ میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے۔ تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے ابا کہتے "یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں۔ مگر ابا تو تھے ہی پرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سنتا تھا۔ ان کا

بس چلتا تو سر پر اُسترا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے......... ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں۔ اور پھر داڑھی داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابا کی داڑھی جس کو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابا کی داڑھی جو نکیلی اور چونچ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھتی ہی رہے بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا ملا کر بڑھائی جائے اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اس میں کنگھی کی جائے جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں...... عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے۔ اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ...... میرے دادا جان ٹھہرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لیے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے۔ ان کو ہم دہلی اور یو پی والے نپٹ جاہل اور اجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب و تمدن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار، لٹھ یہ بڑے بڑے لسی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اسی تسی ساڈے، تہاڈے......

لاحول ولاقوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انھوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دے دی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ رہنا ہی ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کر لی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا اور لطیفے خوب سنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا۔ مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سناتا تھا، وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جن کو سن سن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات و خصائل، ان کی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ بقول غلام رسول کے:

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو ان کی عقل بالکل خبط ہو جاتی ہے۔ اس

کے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرت سر کے ہال بازار سے گذر رہے تھے۔ چوراہے پر ایک سکھ کانسٹبل نے روکا اور پوچھا "تمہاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے؟" سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے "جمعدار صاحب ابھی ابھی بجھ گئی ہے۔ گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔" اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا، چلو بھئی کوئی بات نہیں لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلا لو۔" اور اسی قسم کے سینکڑوں قصے غلام رسول کو یاد تھے اور انھیں جب وہ پنجابی مکالموں کے ساتھ سناتا تھا تو سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اصل میں ان کو سننے کا مزہ پنجابی ہی میں تھا کیونکہ اجڈ سکھوں کی عجیب و غریب حرکتوں کے بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔

سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے تھے جیسا کہ ایک ثبوت تو غلام رسول کا (جس نے سینکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے نمازی مسلمانوں کے جو ہر اٹھوارے جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں، یہ سکھ کچھا باندھے سب کے سامنے نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نا جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں لائم جوس گلیسرین لگاتا ہوں جو کسی قدر گاڑھے گاڑھے دودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیومر فیکٹری سے نہایت خوب صورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دوکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا۔ مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑپن، بدتمیزی، اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے تھے، اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان، دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ سکھ مسلمانوں کے رعب کو نہیں مانتے تھے کرپانیں لٹکائے، اکڑ اکڑ کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول کہتا ان کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گزر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔ شادی ہو گئی، بچے ہو گئے، مگر کتنی مدت کے بعد مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا، جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے ــــــ یہ راولپنڈی سے بدل کرا کر آئے تھے کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشین گوئی کے بموجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سورما بنتے تھے۔ کرپانیں لیے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک نہ بنی۔ ان کی داڑھیاں مونڈ کر ان کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی ان کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسب عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جا رہی تھیں، وہ یا تو جعلی تھیں، یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہے اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو ان کا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ان لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر میرا سینہ عظمت اسلام کی روح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی۔ حالانکہ موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے۔ مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بیوقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انھوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نہ جانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا، اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی

کود ے دی) پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوئی سوکھا سا جواب دے دیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے۔ کون اپنی زبان گندی کرے، ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لیے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھ کر آئے کیا بجا ہے۔'' انھوں نے کہلوا دیا ''بارہ بجے کر دو منٹ ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ'' اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بیوقوف بنانے کے لیے سردار جی سے پوچھا۔'' کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟'' اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑ کر جواب دیتے ''جی اسادے ہاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر خوب ہنسے۔ گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اول تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں، کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں چند روز کے بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی ان کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی، اچھا ناک نقشہ، بڑی خوب صورت۔ کم بختوں کی عورتیں کافی خوب صورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں ان کو گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم ان کی ہمت نہ ہوئی کہ اُدھر کا رخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آئے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پا کر ان پر ظلم ڈھانا

شروع کر دیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دہلی میں آنے شروع ہوئے تھے، اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہوگیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی اس لیے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیج دیا اور خود خدا پر بھروسہ کر کے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا، اس لیے میں نے پوری ایک ویگن بک کرالی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اس دن سنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں اس لیے سامان گھر میں ہی پڑا رہا۔

15 اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا، مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی۔ میں نے چھٹی منائی اور دن بھر لیٹا ڈان اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں اس نام نہاد آزادی کے چیتھڑے اڑائے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قائد اعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آکر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کر دیا حالانکہ دنیا جانتی ہے امرت سر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو GOLDEN MOSQUE کے نام سے دنیا میں مشہور ہے..................نہیں وہ تو گرودوارہ ہے اور GOLDEN TEMPLE کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں، جامع مسجد اور لال قلعہ بھی ہے۔ نظام الدین اولیا کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ۔ صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اسی دہلی بلکہ کہنا چاہیے شاہ جہان آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جا رہا تھا، رو لے اب دل کھول کے اے دیدۂ خوںبار.........

اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایہ تخت تھا، تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اجڈ اور غیر متمدن علاقے میں زبردستی بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں کسی کو شستہ اردو زبان بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلواریں جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی

نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے یہ فیصلہ لیا کہ قائداعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہوگی مگر پھر بھی دلی چھوڑنے کے خیال سے دل مرجھایا ہی رہا ...... شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا ''کیوں باؤ جی! تم نے آج کچھ کھشی (خوشی) نہیں منائی؟'' تو میرے جی میں آئی کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دوں۔
ہندوستان کی آزادی اور دل میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے رفیوجیز RERUGEIS کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر، وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آ کر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے۔ کانگریسی پراپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگریس کا نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہا سبھائی، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دنیا کو دکھانے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتل عام شروع ہو گیا۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سینکڑوں گھر پھونک دیے گئے۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دوکانیں لوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا کہ دہلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا کیونکہ اس دن مجھے پراوی ڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لیے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اس نے کہا ''یہ کیا کر رہے ہو۔ جاؤ واپس جاؤ، باہر نہ نکلنا، کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔'' میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے اسکوائر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ کہنے لگے، شیخ جی فکر نہ کرنا جب تک ہم سلامت ہیں تمھیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا

ہے.........مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے بلکہ شاید مجھے چڑھانے کے لیے یہ کہہ رہا ہے کیونکہ سارے اسکوائر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تن تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے ان کافروں کا رحم وکرم نہیں چاہیے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے، میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فسادات شروع ہوئے تھے میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا، اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

''کیوں حضور! کیا ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟''

یہ میرا وفادار ملازم ممدو تھا۔

''میری بندوق کیا ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے، یا چرائی ہے۔

''بولتا کیوں نہیں؟'' میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ ممدو نے میری بندوق چرا کر اپنے چند دستوں کو دے دی تھی جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

''کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں، دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ بھون کر''

میں نے کہا' دریا گنج' میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہوگی۔ میں تو یہاں نہتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟ میں نے ممدو سے کہا۔

وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لے کر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اب ان سے کبھی ملاقات

ہوگی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے پراوی ڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا۔

''ست سری اکال.......... ہر ہر مہادیو''

دور سے آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح ادھر اُدھر دیکھا جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کُتے لگے ہوں، بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور ان میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھا بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آ سکتے تھے۔ ''ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو۔''

آوازیں اور قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے ''شیخ جی! تم ہمارے کوارٹر میں آ جاؤ۔ جلدی کرو۔'' بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گزر گئی کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آ کر رکی اور اس میں سے دس پندرہ نوجوان اترے۔ ان کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ کوارٹر شیخ برہان الدین۔ اس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دنیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اجڑ گئی لٹ گئی، کرسیاں میزیں، صندوق، تصویریں، کتابیں، دریاں قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے ہر چیز لاری میں پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے یہ کون سے کم لٹیرے تھے۔ باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے ''ٹھہرئیے صاحب۔ اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے۔ ہمیں بھی اس لوٹ میں حصہ ملنا چاہیے اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی

لوٹ میں شامل ہو گئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آ رہا ہے، کوئی سوٹ کیس، کوئی میری بیوی بچوں کی تصویریں بھی لا رہا ہے اور یہ سب مالِ غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار! زندہ رہا تو تجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انھیں کہیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں......

ارے اندر آ ؤ تو سی

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لیے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس وڑھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا، اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی، بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ جھجکتا ہوا خاموش۔

''اتھے نہیں، اوس اندر آ ؤ''

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چوندھیاتی جا رہی تھیں۔

''یہ لو جی۔ اپنی چیزیں سنبھال لو'' یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انہوں نے اور ان کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولی ''بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی چابیاں مل جاتیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا۔

''چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔ بھاگ گیا نا ڈرپوک کہیں کا، مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا۔''

سکھی موہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیض اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اس نے یہ سنا۔ وہ بولی "تم بڑے بہادر ہو! شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے وہ تو کوئی بھی پاکستان نہیں گئے۔"

"نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا۔"

"منہ کالا کیوں کرتے وہ تو ہمارے ہاں......

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لیے بند ہوگئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہوگئی۔ مگر ان بلوائیوں کے لیے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہوگیا، انہوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی، اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا۔ تھپڑوں کی آواز— پھر موہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی آواز۔ پنجابی گالیاں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا اس لیے ٹھیک سنائی نہ دیتا تھا۔

اور پھر—— گولی چلنے کی آواز—— سردارنی کی چیخ۔

لاری روانہ ہونے کی گھڑ گھڑاہٹ اور پھر تمام اسکوائر پر جیسے سناٹا چھا گیا، جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور ان کے سینے کے قریب، سفید قمیض خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ ان کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنے گیا تھا۔

سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟ میری زبان سے جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا خیالات، محسوسات تعصبات کی دنیا کھنڈر ہوگئی تھی۔

"سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟"

"مجھے کرجا (قرضہ) اتارنا تھا بیٹا!"

"قرضہ؟"

"ہاں! راولپنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور راجت (عزت) بچائی تھی۔"

''کیا نام تھا اس کا سردار جی؟''

''گلام رسول''

''غلام رسول!''

اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکہ کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیے ایک.................. دو.................. تین.................. چار.................. پانچ

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل ان سے کتنی ملتی تھی۔ چھ.................. سات.................. آٹھ.................. نو..................

جیسے وہ ہنس رہے ہوں، ان کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس.................. گیارہ.................. بارہ۔

جیسے وہ کہہ رہے ہوں ''جی اساں دے ہاں تو چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دور سے آئی۔ میں کہتا نہ تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ــــــ ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دے دی۔

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے۔ میں مرا تھا۔

ایک بچے کا خط
مہاتما گاندھی کے نام

بمقام جنت یا سورگ پہنچ کر اللہ میاں یا بھگوان کی معرفت جناب مہاتما گاندھی صاحب کو ملے۔

باپو!

میری اماں کہتی ہیں کہ آپ جنت کو سدھارے ہیں۔ اللہ میاں کے پاس۔ اور گوپال کی ماتا جی کہتی ہیں کہ آپ سورگ میں بھگوان کو پیارے ہوگئے ہیں۔ نہ جانے کس کا کہنا سچ ہے اس لیے میں اس پتے پر آپ کو یہ خط ڈال رہا ہوں اور یہ شاید سورگ اور جنت ایک ہی جگہ کا نام ہے۔ جیسے بنارس کو کاشی بھی کہتے ہیں اور الہ آباد کو پریاگ۔ امید ہے آپ جس جگہ بھی ہوں گے یہ خط آپ کو مل جائے گا۔

یہ خط اصل میں میں خود نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ مجھ سے لکھوایا جا رہا ہے لکھوانے والے یہ ہیں—— میرا چھوٹا بھائی بندو (جس کا اصل نام بندہ علی ہے) اور مجھ سے بڑی بہن زینب اور چھوٹی سکینہ۔ گوپال۔ گوپال کی چھوٹی بہن سیتا اور ہاں موہن اس کو تو بھول ہی گیا تھا میں۔ بات یہ ہے کہ وہ چاہتا تو ہے کہ میں آپ کو خط لکھوں پر یہ بات اس نے منہ سے نہیں کہی ہے۔ آنکھوں سے کہی ہے۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ جو کہنا ہوتا ہے آنکھوں ہی سے کہتا ہے۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی ہیں پر اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ اس وقت تو یہ کہنا ہے کہ موہن کی آنکھیں بھی مجھ سے کہہ رہی ہیں باپو کو خط لکھو، سو میں لکھ رہا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے معاف کر دینا۔ کر دو گے نہ باپو!

آپ تو بڑے آدمی ہیں سوچتے ہوں گے یہ بچے مجھے کیوں خط لکھوا رہے ہیں۔ پر ہم نے سنا ہے آپ کو بچے بہت بھاتے تھے۔ میں نے ایک تصویر میں دیکھا ہے۔ آپ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھے کھیل اور ہنس رہے ہیں۔ گوپال کہتا ہے ایک دفعہ اس نے آپ کو 'جوہو' میں سمندر کے کنارے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تھا اور موہن جب آپ کی تصویر کو دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں جو ویسے ہمیشہ دکھ اور ڈر سے بھری رہتی ہیں، خوشی سے چمکنے لگتی ہیں اور کہتی ہیں، یہ سب بچوں کے باپو ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا اور برا نہ مانو تو میں کہوں آپ ہنستی ہوئی تصویر میں بالکل بچے لگتے ہیں۔ اتنے چھوٹے بچے جس کے ابھی دانت بھی نہ نکلے ہوں۔ جیسا گوپال کا سب سے چھوٹا بھائی۔ جو سال بھر کا ہے اور آپ کی طرح بکری کا دودھ ہی پیتا ہے۔ سو ہم نے سوچا آپ کو ہم یہ خط لکھیں تو آپ برا نہ مانیں گے اس واسطے یہ خط لکھ رہے ہیں۔

میرا نام انور ہے۔ سب مجھے انو انو کہتے ہیں۔ ہمارا اصلی گھر پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب ہے۔ میرے ابا جن کا نام اکبر علی ہے، دلّی میں سرکاری دفتر میں نوکر تھے۔ میری عمر ساڑھے چھ برس کی ہے۔ میری اماں کا نام تو فاطمہ ہے پر سب ان کو فتو فتو کہتے ہیں اور ایک ہماری نانی اماں ہیں جو آپ کی طرح بڈھی ہیں اور منہ میں دانت بھی نہیں ہے۔ سو پان کو ہَن کُٹّی میں کوٹ کر کھاتی ہیں۔ یہ سب ہمارا خاندان پانی پت میں رہتا تھا۔ سوائے ابا کے جو نوکری پر نئی دلّی میں رہتے تھے۔ ایک کوارٹر میں بابر روڈ کے پاس۔

میرے ابا آپ کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے گاندھی تو مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اماں بھی کہتی تھیں۔ سو میں بھی آپ کو اچھا نہ مانتا تھا۔ پر نانی اماں کہتی تھیں گاندھی اللہ والا آدمی ہے۔ وہ سب کو بھائی بھائی سمجھتا ہے۔ انہوں نے آپ کو بہت دن ہوئے دیکھا تھا۔ جب آپ پانی پت خلافت کمیٹی کے کسی کام سے آئے تھے اور عورتوں کے جلسہ میں بھی تقریر کی تھی۔ جب سے وہ کھدر اور گاڑھا ہی پہنتی ہیں اور آپ کو اچھا مانتی ہیں۔ پر ابا کہتے تھے وہ تو بڈھی بیوقوف ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو کیا جانیں۔ ابا تو علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے ہیں اور اخبار روز پڑھتے ہیں اس واسطے ہم ان کی بات ہی مانتے تھے اور جب آپ کا ذکر آتا تھا آپ کو برا کہتے تھے، مذاق اڑاتے تھے کیونکہ آپ کی لنگوٹی اور ننگا بدن دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔

پھر ہم نے سنا۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہونے والا ہے جیسے دادا ابا کے مرنے پر ان کی جائیداد کا ہوا تھا۔ جس میں آدھی ابا کو اور آدھی تایا ابا کو ملی تھی۔ ہم گلیوں میں "پاکستان زندہ باد" کے خوب نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ میں نے ایک دن ابا سے پوچھا پاکستان کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ مسلمانوں کا اپنا الگ ملک ہوگا۔ جہاں ہم راج کریں گے۔ اس سے ہم بہت خوش ہوئے، کیونکہ میں نے ابا کے ایک رنگین تصویروں والے اخبار میں ایک راجا کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ سونے کا تاج پہنے اور گلے میں موتیوں کا ہار ڈالے تھا۔ سو میں نے سوچا ہم سب مسلمان اب راجا بن جائیں گے اور ہمارے سروں پر سونے کے تاج اور گلے میں موتیوں کے ہار ہوں گے۔

پانی پت میں مسلمان بہت زیادہ رہتے ہیں اور ہندو تھوڑے سے، سو ہم ہندوؤں کے سامنے اکڑ کر چلتے تھے اور بنئے کے لڑکوں کے سامنے زور زور سے پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے اور اگر وہ کانگریس یا آپ کا یعنی گاندھی کا نام لیتے تو ان کو مارتے بھی تھے۔ پر جب پاکستان بن گیا تو ہم نے سنا' پانی پت پاکستان میں نہیں آیا۔ سو یہاں مسلمان راجا نہ بنیں گے۔ پھر سنا کہ سارے ملک میں مارا ماری ہونے لگی۔ ابا جب دلی سے پانی پت آتے تو وہ کہتے ہندو مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ سو میں ہندوؤں سے اور بھی نفرت کرنے لگا۔ پر ایک بات میری سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ پاکستان میں اور جہاں بھی مسلمان زیادہ تھے اور ہندو کم وہاں مسلمانوں کو ہندو کیسے مار سکتے ہیں؟ پھر ہم مسلمان تو بادشاہوں کی اولاد ہیں اور مارنے دھاڑنے میں آگے آگے رہتے ہیں۔ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں جہاں مسلمان ہی مسلمان رہتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کو خوب مار سکتے تھے اور شاید مارا بھی ہوگا پر میں بچہ ٹھہرا۔ شاید میں نے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اور ابا پڑھے لکھے ٹھہرے اس واسطے میں چپ ہی رہا پر یہ بات دل میں کھٹکتی رہی۔

پھر دلی میں مارا ماری شروع ہوگئی اور پانی پت کے مسلمان پاکستان بھاگنے کی تیاری کرنے لگے۔ پر میرے ابا جانے کو تیار نہیں تھے بات یہ ہے کہ میرے ابا ذرا کنجوس ہیں اور اپنی جائیداد، گھربار اور کھیتوں کو چھوڑ کر نہ جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا آہستہ آہستہ سب چیزوں کو اچھے داموں بیچ کر جائیں گے، پر اتنے میں پانی پت میں پنجاب کے بھاگے ہوئے بہت سے ہندو اور سکھ آگئے۔ ہزاروں، لاکھوں جن میں سب کے رہنے کے لیے مکان چاہیے تھا۔ ان سب

کے گھر پچھمی پنجاب کے مسلمانوں نے لوٹ لیے تھے اور ان کے بال بچوں کو مارا بھی تھا اور اب یہ سب مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے۔ سو پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا۔ کچھ پولیس کے ہاتھوں مارے بھی گئے۔ روز انتظار کرتے کہ پاکستان سے موٹریں لاریاں آئیں گی، پر وہ نہ آئیں۔ پھر جب خطرہ بڑھ گیا تو اماں نے ابّا کو دتّی میں لکھا اور وہ وہاں سے فوجی لاری لے کر آئے اور ہم تھوڑا تھوڑا سا سامان ساتھ لے کر اس لاری میں دتّی آ گئے۔

اب میں آپ کو اپنی بندوق کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ یہ بندوق بڑی خوب صورت ہے۔ چمکتی ہوئی نالی۔ لکڑی کا کندا اور چلاؤ تو کھٹاک سے آواز آتی ہے۔ یہ میری پانچویں سالگرہ پر ابّا نے لا کر دی تھی اور کہا تھا۔ ابھی سے بندوق کا شوق کرو تو بڑے ہو کر سورما سپاہی بنو گے اور کافروں کے خلاف جہاد کرو گے۔ اصل میں تو یہ کھیلنے ہی کی بندوق ہے۔ مگر اسے کندھے پر رکھ کر میں ساری گلی کے لڑکوں کو پریڈ کرواتا تھا۔ یہ ہماری پاکستانی فوج تھی۔

ہاں تو جب ہم پانی پت سے چلے تو گھر کا سارا سامان چھوڑنا پڑا۔ ابّا کی کتابیں، امّاں کے برتن، کپڑے، صندوق، لحاف، رضائیاں، سب رہ گیا۔ بس دو چار پہننے کے کپڑے ساتھ لے سکے۔ پر میں نے یہ بندوق چپکے سے ساتھ لے لی کیونکہ اسی سے تو میں کافروں سے بدلہ لینے والا تھا جنھوں نے ہمیں پانی پت سے نکالا تھا۔

دلی میں ہم دس بارہ دن ایک کمرے میں بند رہے کیونکہ وہاں مسلمانوں کو مارا جا رہا تھا اور ہمارے سب کے منہ پیلے پڑ گئے تھے۔ پھر ہم نے سنا کہ آپ کلکتے سے آئے ہیں اور مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں تو ابّا کہتے رہے کہ یہ بھی گاندھی کی کوئی چال ہو گی مگر بعد میں مان گئے کہ آپ سچ مچ مسلمانوں کی جان بچا رہے ہیں۔ دلی میں تھوڑا امن ہو گیا، پر راستے میں بھرت پور کی ریاست میں سنا ریل میں مسلمانوں کو مار رہے تھے۔ اس واسطے جب ابّا کی بدلی بمبئی کی ہو گئی، تو ہم ہوائی جہاز سے یہاں آ گئے۔

میں نے سنا ہے آپ ہوائی جہاز میں کبھی نہیں بیٹھے۔ واہ باپو! معلوم ہوتا ہے آپ ڈرتے ہیں۔ میں تو بالکل ہی نہیں ڈرا۔ سارے راستے کھڑکی کے پاس بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ نانی اماں بھی نہیں ڈریں اور چلتے ہوئے جہاز میں بیٹھی پَن کُٹی میں پان کوٹتی رہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح

بالکل پوپلی ہیں، پر یہ تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔

بمبئی میں ہمیں رہنے کو دو کمرے مل گئے۔ شیواجی پارک کے علاقے میں، جہاں چاروں طرف ہندو ہی ہندو رہتے ہیں۔ ہم سب پہلے تو بہت ڈرے کہ کوئی مار نہ دے پر نانی جان ذرا بھی نہیں ڈریں۔ وہ تو برقعہ اوڑھے سمندر کے کنارے کنارے دور تک ہو آتی تھیں اور کہتیں ہندو سکھ بھی تو اللہ کے بندے ہیں۔ مجھ بڈھی کو کون مارنے لگا۔ سمندر ہمارے گھر کے پاس ہی ہے۔ میں نے سمندر کا ذکر اسکول میں پڑھا تھا، مگر دیکھا نہیں تھا۔ یہ تو بہت بڑا نکلا۔ پانی پت کی نہر اور دلی میں دریا جمنا اور دس جوہڑوں اور دس تالابوں کو ملا کر ان سے بھی بڑا۔ بس پانی ہی پانی ہے۔ نانی اماں کہنے لگیں پانی پت تو یوں ہی کہلاتا ہے۔ اصل پانی پت تو یہ ہے۔

ہمارے برابر کے گھر میں ہندو رہتے تھے۔ گوپال کے ماں باپ گوپال کے چاچا بہت کٹر ہندو ہیں اور سنگھ والوں کے ساتھ پریڈ بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کے بچوں کو پڑھا رکھا تھا کہ مسلمان بہت برے ہوتے ہیں۔ ان کو مارنا چاہیے۔ سو گوپال نے اپنے گھر میں ایک ہندو سینا بنا رکھی تھی اور لکڑی کی تلواریں، ایک ٹین کا پستول اور بانس کے تیر و کمان لے کر روز پریڈ کرتے تھے اور نعرے لگاتے۔ ہندو راج بنا دیں گے۔ مسلمان کو مار بھگا دیں گے۔ اور ہر ہر مہادیو اور دوسرے نعرے جو شاید مراٹھی زبان میں تھے۔ ان کے مقابلے میں میں نے اپنی پاکستانی فوج بنائی۔ گوپال کی فوج میں دس بارہ بچے تھے اور ہم چار ہی تھے۔ پر ہم ڈرتے نہیں تھے۔ ایک تو جیسے ابا کہتے تھے کہ ایک مسلمان چار پانچ ہندوؤں کے برابر ہوتا ہے اور دوسرے میرے پاس بندوق تھی اور ان کے پاس بس لکڑی کی تلواریں اور تیر کمان۔ سو ہم خوب مقابلہ کرتے۔ جب وہ نعرہ لگاتے۔ ہر ہر مہادیو، تو ہم چلاتے اللہ اکبر۔ جب وہ کہتے، ہندو راج بنا دیں گے۔ تو ہم کہتے ہنس کے لیا تھا پاکستان، لڑ کے لیں گے ہندوستان، ابا منع بھی کرتے کہ چاروں طرف ہندو رہتے ہیں ایسی باتیں نہ کرو اور نانی اماں نے بھی ڈانٹا پر ہم ماننے والے تھوڑے ہی تھے۔ ایک دن نعرے لگاتے لگاتے گوپال اور اس کی فوج نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ بندو کو چوٹ بھی لگی۔ پر میں نے اپنی بندوق سے ڈرا کر مار بھگایا۔

جب ہندو سینا اور پاکستانی فوج میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ میں نے موہن کو پہلی بار

دیکھا۔ وہ ہماری لڑائی کو ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس نے ایسی لڑائی پہلے بھی کبھی دیکھی ہو۔ وہ چلّایا نہیں مگر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ گوپال کی فوج کو بھگا کر میں نے موہن سے پوچھا جو ایک قمیض، شلوار پہنے گھروں کے بیچ کی دیوار پر بیٹھا چپکے چپکے رو رہا تھا— ''کیوں بھئی تو کون ہے ہندو یا مسلمان؟'' کیونکہ شلوار سے میں سمجھا تھا شاید مسلمان ہوگا۔ پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے دیکھنے سے ڈر سا لگتا تھا جیسے قلندر صاحب کی درگاہ میں باؤلے فقیر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا یہ بھی باؤلا بچہ ہوگا یا شاید گونگا ہو۔ پر اتنے میں گوپال آ گیا اور کہنے لگا— اس بیچارے کو کیوں مارتے ہو، یہ تو پنجاب سے آیا ہے۔ اس کے ماں باپ وہاں مارے گئے ہیں اور یہ یہاں اپنے رشتہ داروں کے یہاں رہتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بڑا ترس آیا اور بندوق کے کھیل میں جی نہ لگا اور رات کو خواب میں موہن کی ڈراؤنی پھٹی پھٹی آنکھیں نظر آتی رہیں اور میں ڈر کے مارے نیند میں رونے لگا۔

اس دن سے موہن اکثر دیوار پر بیٹھ جاتا اور ہمارا کھیل پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ وہ خود نہ ہمارے ساتھ کھیلتا نہ گوپال کے ساتھ۔ بس الگ چپ چاپ بیٹھا رہتا اور نہ جانے کیا سوچتا اور نہ جانے اس کی آنکھیں کیا کہتیں۔ نہ جانے ان آنکھوں نے کیا دیکھا تھا جس سے اس کو چپ لگ گئی تھی۔

اور پھر ہم نے ریڈیو پر سنا کہ آپ نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ اور جب تک دلّی کے ہندو مسلمانوں کو مارنا بند نہ کریں گے۔ آپ کھانا نہ کھائیں گے۔ یہ سن کر نانی اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انھوں نے دو وقت کا کھانا نہ کھایا۔ اور ابّا بھی کہنے لگے کہ ہندوؤں میں اچھا آدمی گاندھی ہی ہے۔ میں نے نانی اماں کی ریس میں ایک دن دودھ نہ پیا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا۔ پر شام ہوتے ہوتے برا حال ہو گیا۔ نہ کھیل میں جی لگا نہ پڑھائی میں۔ بس آنکھوں کے سامنے شامی کباب، پلاؤ اور فیرنی کی رکابیاں نظر آتی رہیں اور میں سوچتا رہا کہ آپ کیسے بنا کھائے پیے رہتے ہیں۔

جب آپ کے فاقے کو کئی دن ہو گئے اور ہم نے سنا کہ سارے ملک میں سب ہندو مسلمان کان پکڑ رہے ہیں کہ ہم اب نہ لڑیں گے، تو ہم نے بھی ہندو سینا اور پاکستانی فوج کا کھیل بند کر دیا اور ایک دن سویرے جب میں نے موہن کو دیوار پر چپ چاپ بیٹھے دیکھا اور

پاس گیا تو دوسری طرف سے گوپال بھی آ گیا۔

گوپال کہنے لگا ''انو!''

میں نے کہا ''ہاں گوپال کیا بات ہے؟''

وہ بولا ''باپو جی!''

اور بس اتنا کہہ کر رونے لگا۔

اس دن اخبار میں چھپا تھا کہ آپ کی طبیعت بہت کمزور ہوگئی ہے اور بولنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر میں بھی رو پڑا۔

گوپال نے میری طرف تعجب سے دیکھا اور بولا۔ تم بھی رو رہے ہو؟''

میں نے کہا ہاں! وہ مسلمانوں کے لیے ہی تو یہ سب کر رہے ہیں۔''

گوپال نے کہا۔ آج سے ہندو مسلمان کی لڑائی کا کھیل بند.....''

میں نے کہا۔ ہاں بالکل بند کر دیں۔ جب سب کان پکڑ رہے ہیں تو ہم بھی کان پکڑتے ہیں۔''

پھر ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ بندوق، پستول اور تلواریں، سب توڑ کر سمندر میں پھینک دیں گے۔

نہ جانے کیوں میری نظر موہن کی طرف گئی اور اتنے دنوں میں پہلی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں تھوڑی سی خوشی دیکھی اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔

ابا بھی اگلے دن کہنے لگے۔۔۔ دتی میں جادو ہو گیا۔ ہندو سکھ مسلمان لیڈروں نے گاندھی جی کے سامنے کان پکڑ لیے کہ اب کبھی نہ لڑیں گے۔ مسلمانوں کی مسجدیں انھیں واپس مل گئیں اور دتی کے بازاروں میں مسلمان پھر مزے سے چلنے پھرنے لگے اور آپ نے فاقہ توڑ دیا۔ خواجہ قطب الدین کے مزار پر بھی عرس میں گئے۔

ہاں تو ایک دن پہلے تو ہمارا ارادہ تھا کہ میں اپنی بندوق اور گوپال اپنے تیر کمان توڑ ڈالیں گے۔ پر جب میں نے چمکتی ہوئی بندوق کو دیکھا تو میرا جی نہ چاہا اسے توڑنے کو۔ میں نے سوچا کیا معلوم گوپال نے اپنا پستول اور تیر کمان نہ توڑے ہوں، میں بھی بندوق کیوں نہ رکھ لوں۔ پھر میں کوئی چلا تھوڑے ہی رہا تھا۔ بس رکھی ہوئی تھی ضرورت کے واسطے۔

ادھر گوپال نے بھی یہی سوچا کہ اتو شاید اپنی بندوق نہ توڑے میں اپنا پستول اور تیر کمان کیوں کھودوں؟

آپ کا فاقہ ختم ہو گیا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ نہ جانے کیوں، مگر آپ کی بیماری اور کمزوری کی خبر سے دل گھبراتا تھا۔ جیسے ابا یا اماں کی طبیعت خراب ہو۔ میرا اور گوپال کا ہی نہیں، سارے محلے والوں کا۔ جب ہی تو سب آپ کو باپو کہتے ہیں۔

پھر ہم یہ سن کر دھک سے رہ گئے کہ آپ پر بم پھینکا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ بال بال بچ گئے اور بم پھینکنے والا پکڑا گیا۔

میں نے گوپال سے کہا۔ گوپال یہ تو بہت برا ہے۔ برے لوگ گاندھی جی کو مارنا چاہتے ہیں۔

گوپال بولا۔ ''ہمیں گاندھی جی کی حفاظت کرنی چاہیے۔''

میں نے کہا کیسے؟

وہ بولا۔ ہم دلّی جا کر گاندھی جی کے گھر پر پہرہ دیں گے۔

میں نے کہا۔ تم کیسے پہرہ دو گے؟ نہ بندوق نہ تلوار......

وہ جلدی سے بولا۔ پستول اور تیر کمان جو ہیں۔

پھر وہ چپ ہو گیا۔ جیسے بھول سے کہہ گیا ہو۔ میں بھی بے سوچے بول پڑا۔ پستول کی مار تو دو چار گز ہی ہوتی ہے۔ میں بندوق لے کر پہرہ دوں گا۔

وہ مجھے گھور کے دیکھ کر کہنے لگا۔ تمھارے پاس بندوق کہاں سے آئی؟

میں نے بھی ویسے ہی جواب دیا۔ جہاں سے تمھارے پاس پستول اور تیر کمان آئے۔

وہ بگڑ گیا اور لگا کہنے۔ تم مسلمانوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ وعدہ کیا تھا، بندوق توڑ دوں گا۔

میں بھی چپ بیٹھنے والا نہیں تھا، بگڑ کر بولا۔ اور تم ہندو کافروں کا کیا اعتبار۔ تم نے نہیں کہا تھا پستول اور تیر کمان توڑ دوں گا۔

وہ بولا۔ جاؤ نہیں کھیلتے تمھارے ساتھ!

میں نے کہا۔ ہم کون سے مرے جا رہے ہیں اور یہ کہہ کر میں چلا آیا اور گھر آ کے اپنی بندوق کو صاف کیا، اس کے کل پرزے میں تیل ڈالا۔ نہ جانے کب ہندو سینا سے مقابلہ ہو جائے۔

ادھر گوپال اور اس کے بھائی بانس کے تیروں کو چھیل کر تیز کرتے رہے۔
اور اب کی جب میں نے موہن کو دیوار پر چپ بیٹھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وہی دکھ اور درد تھا جو پہلے تھا۔

کئی دن گزر گئے۔

شام کو ہم سمندر کے کنارے لگے ہوئے میلے کو دیکھ رہے تھے کہ ابا دفتر سے بھاگے ہوئے آئے۔ کہنے لگے گاندھی جی کا انتقال ہو گیا، کسی پاگل نے ان کو گولی ماردی۔

پہلے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ بھلا گاندھی جی کیسے مر سکتے ہیں۔ ہم نے سوچا، وہ تو بم سے بھی نہیں مرے۔ پھر خیال آیا اور سوچا کہ ان کی حفاظت نہیں کی ٹھیک سے کسی نے۔ پستول چلانے والا وہاں تک پہنچا کیسے؟

رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بس ریڈیو کے پاس بیٹھے خبریں سنتے رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر سنی، اتنے بڑے آدمی ہو کر بھی وہ رو رہے تھے، بس بولتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ یہ سن کر مجھے بھی رونا آ گیا اور بڑی دیر تک روتا رہا۔ نانی اماں اور اماں تو پہلے ہی سے رو رہی تھیں۔ ابا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

اس رات کو مجھے ٹھیک سے نیند نہ آئی۔ ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے رہے کبھی دیکھا آپ کو کوئی مارنے آرہا ہے اور میں چلا رہا ہوں— گاندھی جی کو بچاؤ گاندھی جی کی جان خطرے میں ہے پر کوئی نہیں سنتا۔ پر سب سے ڈراؤنا خواب یہ دیکھا کہ ایک آدمی آپ کی طرف گولی چلا رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں میری بندوق ہے اور اس کی گولی آپ کو لگ رہی ہے اور مجھے لگا کہ آپ اسی واسطے مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے ہیں۔

اگلے دن ہڑتال تھی۔ اسکول بند تھا، پر کھیلنے کو جی نہ کرتا تھا۔ احاطے کی دیوار کے پاس گیا تو دیکھا، موہن بیٹھا رو رہا ہے، زور زور سے چیخ مار کر۔ اسے دیکھ کر مجھے اور بھی رونا آ گیا، پھر گوپال آیا وہ بھی رو رہا تھا۔

گوپال بولا— باپو جی چل بسے

میں نے کہا ہاں نانی اماں کہتی ہیں۔ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پھر گوپال بولا۔ انّو! میں نے سپنے میں دیکھا.......... میرا دل دھک سے ہوگیا۔ جلدی سے بولا۔ تم نے خواب دیکھا کہ میری بندوق سے..........

گوپال نے بات کاٹی۔ نہیں۔ دیکھا میرے پستول سے باپو کو کوئی مار رہا ہے۔

میں نے اس سے اپنے خواب کی بات بتائی۔

گوپال نے کہا۔ باپو ہم دونوں سے خفا ہو کر چلے گئے ہیں۔

پھر ہم دونوں مل کر رو دیے۔ موہن پھر زور زور سے رونے لگا اور ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس زور سے اس کی آواز کھل گئی تھی۔ اب وہ بول سکتا تھا۔

تیرہ فروری

کل کتنے ہی دریاؤں سمندروں میں آپ کی چتا کی راکھ کو ڈالا گیا چوپاٹی پر ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کئی لاکھ کا جلوس تھا۔ اس میں بہت سے مسلمان بھی تھے۔ آپ کو مرے ہوئے تیرہ دن ہوگئے ہیں۔ ان دنوں میں ہماری سرکار نے بہت سے برے آدمیوں کو پکڑا ہے جو ہندو مسلمانوں کو لڑواتے تھے اور آپ کو مارنا چاہتے تھے اور ہندوستان پاکستان دونوں میں ہندو مسلمان توبہ کر رہے ہیں اور کان پکڑ رہے ہیں کہ اب مار دھاڑ نہ کریں گے۔ اب آپ ان کو معاف کر دیجیے اور واپس لوٹ آیئے۔

ہاں، آج شام کو جب سب لوگ سمندر کے کنارے سے چلے گئے تو میں چپکے سے اپنی بندوق کو توڑ کر پانی میں پھینک آیا ہوں۔ جہاں میں نے اپنی بندوق کے ٹکڑے پھینکے وہیں میں نے دیکھا کہ گوپال کا ٹوٹا ہوا پستول اور ٹوٹے ہوئے تیر کمان بھی پانی میں پڑے ہیں۔

اور اب میں اور گوپال اور بندو اور زینب اور سکینہ اور سیتا، سب توبہ کرتے ہیں اور کان پکڑتے ہیں کہ پھر آپس میں نہ لڑیں گے۔ اب ہمیں معاف کر دیجیے اور لوٹ آیئے۔

آپ لوٹ آئیں گے نہ باپو؟

انتقام

لال اور پیلے پیلے اور لال رنگ، ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہتے۔

لال۔لہو کی طرح لال۔

زرد۔ایک مردہ چہرہ کی طرح زرد۔

لال اور پیلے، پیلے اور لال رنگوں کے بلبلے فضا میں ہر وقت منڈلاتے رہتے۔

لال اور پیلے۔ پیلے اور لال رنگوں کی شعاعیں نہ جانے کس سورج سے آکر آنکھوں کے راستے اس کے دماغ میں گھس جاتیں۔اس کے روئیں روئیں میں یہ لال اور پیلی شعاعیں سوئیوں کی طرح پیوست ہوتی چلی جاتیں۔

ہر وقت لال اور پیلے۔ پیلے اور لال شعلے شیطانی زبانوں کی طرح فضا میں لپکتے ہوئے نظر آتے۔ ایک الاؤ جس کے گرد بھوت ناچتے ہوتے اور اس الاؤ میں لکڑیوں کے بجائے مُردوں کی ہڈیاں جلائی جاتیں۔ ہزار چتاؤں کا ایک الاؤ اور اس کے گرد بھوت ناچ ناچ کر چلاتے انتقام! انتقام! انتقام!!!

لال اور پیلے۔ پیلے اور لال یہ دو آتشیں رنگ اس کے دل اور دماغ اور روح پر چھائے ہوئے تھے۔ شفق کی سرخی میں ڈوبتے ہوئے سورج کی یرقانی زردی میں اسے شعلے ہی شعلے دکھائی دیتے۔اس کی ہر حس میں آگ بس گئی تھی۔اس کے ہر سانس میں دھواں نکلتا تھا۔کبھی کبھی اسے خود یہ محسوس ہوتا کہ وہ اب انسان نہیں رہا بلکہ لال اور پیلے شعلوں کا بگولہ بن گیا۔

لوگ کہتے تھے ہری داس پاگل ہو گیا ہے۔ وہ نہ کسی سے ملتا جلتا نہ بات کرتا کیونکہ وہ خاموش رہتا تھا۔ اس لیے لوگوں کو اس کے پاگل پن کا یقین ہو گیا ورنہ بولتا کیوں نہیں۔ اس کے سامنے؟ اس کے سامنے کوئی بات بھی ہو رہی ہو ہنسی مذاق یا شادی بیاہ کی بات چیت یا کسی سنیما کا ذکر۔ وہ نہ صرف گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیتا بلکہ اس کے چہرے پر کسی قسم کا ردعمل نہ پایا جاتا۔ جیسے وہ پتھر کا بنا ہوا ہو، یا مردہ ہو یا بیک وقت اندھا بہرا اور گونگا ہو لیکن اگر اس کے سامنے کوئی فسادات کے بارے میں کچھ کہہ دیتا تو فوراً ہری داس کی آنکھوں میں خونیں شعلے چمکنے لگتے اور بن ایک لفظ بھی منہ سے نکالے ہوئے اس کے روئیں روئیں سے یہ نعرۂ جنگ سنائی دیتا۔ انتقام! انتقام!!!! انتقام!!!!

یہ تو سب کو معلوم تھا کہ ہری داس لائل پور کا وکیل تھا۔ جب پنجاب دو ٹکڑے ہو کر فسادات کی خوفناک بھٹی میں جھونکا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ بچ پایا تھا، مگر اب اس واقعے کو دس مہینے گزر چکے تھے اور وقت کے ساتھ ایسے ہولناک واقعات بھی آہستہ آہستہ فراموش ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ہری داس کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اس کی بیوی بچوں نے کن حالات میں اپنی جان دی۔ دریا میں کود کر یا آگ میں جل کر یا کسی قاتل کی چھری کا شکار ہوئے؟ اس نے کسی کو اپنا ہم راز نہ بنایا تھا۔

ہری داس پاگل نہ تھا۔ اسے اپنے گھر کا لٹنا اور جلنا، اپنی بیوی کا دریا میں کود کر اپنی جان دینا کتنے ہی پڑوسیوں، رشتے داروں اور دوستوں کا قتل سب کچھ یاد تھا، مگر جب کبھی اسے اپنی بیٹی جانکی یاد آجاتی اس کے دماغ کا کوئی پرزہ دفعتاً خراب ہو جاتا۔ چند ہولناک واقعات تصویروں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے مگر بغیر کسی تسلسل کے جیسے سنیما کی مشین بگڑ جائے اور فلم الٹا سیدھا چلنے لگے اور کامیڈی ٹریجڈی، ہیرو اور ہیروئن میں تمیز کرنی مشکل ہو جائے۔

تصویریں۔ خوشنما تصویریں اور ہولناک تصویریں۔

جانکی۔ سترہ سالہ جانکی۔ ماں اور باپ کی آنکھوں کا تارا جانکی۔ جانکی جس کی رنگت دودھ میں گلاب کی پتیاں ڈال کر بنائی گئی تھی۔ جس کی آنکھیں نرگس کو شرماتی تھیں، جو اتنی نازک تھی کہ ہاتھ لگاتے ڈر لگتا تھا، جو میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخل ہونے والی تھی، وہ سارے لائل پور کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ ذہین تھی۔

جانکی کا خوب صورت اور معصوم چہرہ۔

اور پھر چند بھیانک اور خوفناک چہرے۔ آنکھوں میں بربریت اور وحشیانہ ہوس کرخت ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ۔

چہروں کی تیز دھار سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی بندوقوں کی کالی اندھی آنکھیں۔ وہ خوفناک، بد ہیئت چہرے جانکی کے معصوم چہرے کی طرف بڑھتے ہوئے۔ ہری داس کو اپنی چیخ دس مہینے کے بعد بھی فضا میں گونجتی سنائی دیتی۔ میری جان لے لو پر میری بیٹی کی جان چھوڑ دو۔

وہ خوفناک چہرے پھر پھول جیسی جانکی کی طرف بڑھتے ہوئے۔

''میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ میری بیٹی بھی مسلمان ہو جائے گی۔ پر اسے چھوڑ دو۔''

ان خوفناک چہروں پر رحم کی ایک جھلک بھی نہ دکھائی دی۔ ہوس ناک آنکھیں برابر جانکی کی طرف بڑھتی رہیں۔

''میری بیٹی جوان ہے۔ خوب صورت ہے۔ تم میں سے کوئی ایک اس کو پسند کرلو۔ اس کو مسلمان کر کے شادی کرلو، پر اس کی جان مت لو۔

خوفناک چہروں میں سب سے زیادہ خوفناک چہرہ۔ زرد گندے دانت آنکھوں سے ہوس اور ظلم کی لپٹیں نکلتی ہوئی۔ بھری ہوئی داڑھی اور جانکی کا معصوم پھول سا چہرہ، پھر دونوں ایک ہو گئے۔ چاند پر کالی بھیانک بدلی چھا گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ بربریت معصومیت کو کچل دے، ہری داس کو اپنی بیٹی کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں خوف، غم، لاچاری، نفرت، التجا، رحم کی درخواست اور مکمل مایوسی کی ایسی ملی جلی جھلک آئی کہ باپ اس کی تاب نہ لا سکا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

اب بھی جب کبھی وہ ہیبت ناک تصویر ہری داس کے دماغ کے پردے پر چمکتی وہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ کپڑے پھٹنے کی آواز۔ اس وحشی کے بھاری سانس کی دھوکنی اور جانکی کی چیخیں، کراہیں، سسکیاں، آہیں، اس کے کانوں میں پھر گونجتیں اور ایک بار پھر اسے نرک کا ایندھن بننا پڑتا۔

آنکھیں بند ہونے پر بھی ایک خوفناک چہرے کے بعد دوسرا، دماغ کے پردے پر نظر آتا رہتا۔ دوسرا تیسرا چوتھا، پانچواں، یہاں تک کہ جانکی کی آہیں بھی سنائی دیتیں اور یہ خاموشی اسے ان دردناک چیخوں سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں کھول دیتا۔

جانکی کا پھول سا چہرہ........... جیسے مسلا ہوا پھول مٹی میں پڑا ہو بے رنگت، بے جان۔ بالوں میں خاک اٹی ہوئی، گالوں پر وحشی دانتوں کے نشان۔ تازہ زخموں سے خون رستا ہوا۔ مردہ پیلے گالوں کو غازے کی کتنی ضرورت تھی!................ وحشی دانتوں کے نشان اور رستا ہوا خون گالوں پر ہی نہیں بلکہ ناک پر، کانوں پر...... اور برہنہ چھاتیوں پر...........

جب بربریت حد سے بڑھ جائے تو اس کی ہولناکی کی کمی یا زیادتی کا خیال کرنا مشکل اور بے کار ہے۔ کیا ناک کی نتھنی کو اس طرح کھینچ کر نکالنا کہ نتھنے چیر کر زخمی ہو جائیں، بالیاں کھینچ کر کان زخمی کر دینے سے کم برا ہے؟ کیا یہ زیادہ ہولناک ہے کہ ایک معصوم لڑکی کی لاج لوٹ کر اس کو مار ڈالا جائے؟ یا یہ کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا جائے؟.......... مگر ان معصوم جوان برہنہ چھاتیوں پر وحشی دانتوں کے نشان ——— سفاکی کا یہ ہولناک منظر ہمیشہ کے لیے ہری داس کے دماغ پر آتشیں رنگوں میں ثبت ہو گیا تھا۔

چتا کے شعلے۔ اس کی پیاری جانکی کی چتا جو ہری داس نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھی۔ اگنی دیوتا اس پھول سی لاش کو کھا گئے۔ جانکی، اس کی معصومیت اس کی بے حرمتی، اس کے زخم، سب کو کھا گئے۔ ہری داس کو اس چتا کے شعلے اب بھی نظر آتے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے لال اور پیلے ہیولے بن کر ناچتے تھے اور اسے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ان کی جانکی ہی نہیں سارے بھارت کی لاج جل رہی ہے، انسانیت بھسم ہو رہی ہے۔ رحم اور انصاف کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ ساری کائنات لال اور پیلے رنگوں میں تحلیل ہو رہی تھی۔

چتا کے شعلے آخر کار بجھ گئے مگر انتقام کی جو آگ انہوں نے ہری داس کے دل اور دماغ میں سلگائی تھی، وہ اب تک نہ بجھی تھی۔ وہ کبھی نہ بجھے گی........... کبھی نہیں........... ہاں ایک ہی صورت تھی اس آگ کے بجھنے کی...... انتقام!۔ اگر مرنے سے پہلے ہری داس کسی مسلمان لڑکی کی برہنہ چھاتیوں میں وہ چھرا بھونک دے جسے وہ ہر وقت اسی مقصد کے لیے اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس کے بعد ہری داس ایک منٹ بھی زندہ نہ رہنا چاہتا تھا۔

انتقام کے لیے ایک مسلمان لڑکی درکار تھی اور مسلمان لڑکیاں دہلی میں نایاب تھیں، وہ شہر کے بیچوں بیچ اپنے گندے اور تنگ محلوں، گلیوں اور کوچوں میں رہتے تھے، جہاں ہری داس کا

گزرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

پھر قدرت نے ہری داس کے ساتھ ایک عجیب مذاق کیا۔ شرنارتھی فنڈ سے اسے تین سو روپے نقد دیے گئے، مگر وہ ان روپیوں کا کیا کرے، جس کا گھر ہو نہ بار جس کو نہ کھانے کا ہوش ہو اور نہ کپڑے کا۔ وہ تین سو روپے کا کیا کرے؟ کیا کرے؟ کیا کرے اسی ادھیڑ پن میں وہ کہاں کہاں مارا پھرتا رہا۔

نئی دہلی سے چاندنی چوک تک۔ چاندنی چوک سے جامع مسجد تک جس کے اونچے اونچے مینار اور گنبد ہری داس کو یاد دلا رہے تھے کہ اسے مسلمانوں سے......تمام مسلمانوں......انتقام لینا ہے۔ جامع مسجد سے دریا گنج راج گھاٹ، جہاں گاندھی جی کی سمادھی کے درشن بھی ہری داس کی آتشِ انتقام کو بجھانے کے لیے کافی نہ تھے۔ اس نے سوچا گاندھی جی مہاتما تھے۔ میں معمولی انسان ہوں۔ بغیر انتقام لیے میرے من کو کبھی شانتی نہ ملے گی۔ وہاں سے واپس ایڈورڈ پارک۔ فرنگی بادشاہ کا گھوڑے سوار بت "واہ بادشاہ سلامت واہ" تم چلے گئے اور ہمیں اس دشا میں چھوڑ گئے؛ ہری داس نہ جانے کن کن سڑکوں کی خاک چھانتا ہوا کہاں آنکلا۔

رات ہو گئی تھی۔ دائیں ہاتھ کو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر اس جیسے کتنے ہی بے گھر شرنارتھی سو رہے تھے۔ ہوا میں پیشاب، فنائل، عطر، پھول، پسینے، گیلی مٹی اور پٹرول کی ملی جلی بو بسی ہوئی تھی۔ بائیں طرف دوکانیں کچھ کھلی کچھ بند۔ مٹھائی کی دوکانیں، ہوٹل، دودھ والے، لسی کی دوکانیں، مگر ہر راہ گیر کوٹھوں کی طرف دیکھ کر چل رہا تھا۔ کوٹھے جہاں روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور جہاں سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ جگہ کیا تھی؟

ایک نہایت چکنے چپڑے کالے سے دبلے آدمی نے ہری داس کا رستہ روک کر کہا "بابو جی! کوئی مال چاہیے؟"

ہری داس کچھ نہ سمجھا۔ خاموشی سے آگے چلنے لگا، مگر وہ لچر اتنی آسانی سے ٹلنے والا نہ تھا

"بابو جی طبیعت خوش ہو جائے تب انعام دیجیے گا۔"

ہری داس کی زبان سے نکلا "بھئی میں تو شرنارتھی ہوں۔"

"میں خود شرنارتھی" ہوں صاحب...................... اور آپ شرنارتھی ہیں تو آئیے میں آپ کو ایک مسلمان لونڈیا دکھاؤں۔ ذرا پاکستانی حور کے بھی تو مزے لوٹو۔ بابو جی!"

''مسلمان لونڈیا! پاکستانی حور!''

انتقام کے لال اور پیلے شعلے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔

راستے میں دلال مزید معلومات فراہم کرتا رہا۔''چوزہ ہے صاحب چوزہ، بس سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی اور پھر دھیمی آواز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر جالندھر سے لائے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہے۔ دس مہینے لگے ہیں رام کرنے میں تب جا کر اس دھندے میں پڑنے کو راضی ہوئی ہے۔

جانکی بھی تو سترہ اٹھارہ سال ہی کی تھی اور خوفناک چہروں نے ذرا رحم نہ کھایا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا۔ تیسرا، چوتھا...... یہاں تک کہ وہ معصوم حسن مٹی میں مل گیا تھا۔'' میں کیوں رحم کھاؤں؟'' اس نے اپنے کوٹ کی تہوں میں چھرے کو ٹٹولتے ہوئے سوچا۔

رنڈی کا کوٹھا۔ زمین پر سفید چاندنی، چھت میں جھاڑ فانوس۔ دیواروں پر راجا چندر جی، ستی سیتا، نیتاجی سبھاش چندر بوس، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویریں۔ دو بڑے بڑے آئینے۔ ایک کونے میں ایک موٹی بھدی کالی چیچک منہ داغ عورت بیٹھی پان بنا رہی تھی اور ہارمونیم طبلے اور سارنگی والوں سے گھری ہوئی پاکستانی حور بیٹھی گا رہی تھی۔

ہری داس نے کبھی حور دیکھی تو نہ تھی مگر ذکر ضرور سنا تھا۔ یہ لڑکی سچ مچ حور ہی تھی۔ رنگت جانکی سے بھی زیادہ گوری مگر کسی قدر زردی لیے ہوئے۔ دبلی، نازک، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں مگر جانکی کی طرح ان میں......زندگی، خوش دلی کی چمک نہیں تھی بلکہ اس کی بجائے ایک گہری یاس کی پرچھائیں۔

ہری داس نے دیکھا کہ وہ گا رہی ہے مگر اس کے کانوں نے کچھ نہ سنا کیا گا رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں بہت سے تماشائی بیٹھے واہ واہ کر رہے تھے مگر اس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ کون تھے، کس قماش کے تھے امیر تھے یا غریب، شریف تھے یا رذیل، ایک کونے میں بیٹھا وہ اس لڑکی کو گھورتا رہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں دوسرے تماشائیوں کی طرح ہوس نہ تھی۔ صرف لال پیلے شعلے تھے۔

دلال نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے بارہ بجے تک انتظار کرنا پڑے گا تا کہ دوسرے تماشائی چلے جائیں۔ قیمت دو سو روپے طے ہوئی تھی۔ باقی سو روپے کا کیا کرے گا؟ آج تو اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ اس کے بعد وہ روپے پیسے انتقام، ہوس ہر ضرورت سے آزاد ہو جائے

گا۔ سو اس نے گانے والی کو دس دس روپے دے کر ان سو روپیوں کو گھنٹے بھر میں ختم کر ڈالا۔ ہر بار جب وہ دس روپے کا نوٹ دیتا اور وہ سلام کر کے اٹھا لیتی تو ہری داس کے زخمی من کو بڑی تسکین حاصل ہوتی۔ وہ اس مسلمان لڑکی کو ذلیل کر کے تمام مسلمانوں سے اپنی جانکی کا انتقام لے رہا تھا۔ مگر یہ تو انتقام کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ اصل انتقام تو وہ اس وقت لے گا جب بس وہ ہوگا اور یہ لڑکی ہوگی اور کمرے کے دروازے بند ہوں گے۔

وہ اس لڑکی کی ہر حرکت کو، ہر جنبش کو اس طرح ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا جیسے شیر اپنے شکار کو گھور کر مسحور کر لیتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ گو نہ جانے کن حالات اور کن مجبوریوں کے تحت اس لڑکی نے یہ پیشہ کرنا اختیار کر لیا تھا مگر وہ اپنی اداؤں میں وہ ''رنڈیا نہ پن'' نہ پیدا کر پائی تھی جو طوائفوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ گاتے وقت ''بھاؤ بتانے کے لیے ہاتھ بھی چلاتی تھی اور آنکھیں بھی مٹکاتی تھی، مگر ایک عجیب مشینی انداز سے بغیر کسی قسم کے جذبات کے جیسے ولایتی گڑیا چابی بھرنے پر ناچنے اور آنکھیں مٹکانے لگے اور ہری داس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک عورت کو نہیں بلکہ ایک بے روح، بے جان مگر چلتے پھرتے پتلے کو دیکھ رہا ہو۔

ایک بات اور اس نے دیکھی۔ جب کوئی تماشائی اسے روپیہ یا نوٹ دینے کے بہانے سے اس کے ہاتھ یا جسم کے کسی اور حصے کو چھونے کی کوشش کرتا تو وہ بجلی جیسی سرعت سے وہاں سے ہٹ جاتی۔ ایک تماشائی نے سو روپیہ تک کا نوٹ دکھا کر کوشش کی کہ وہ اس کے ہاتھ کو چھو لے، مگر وہ وہاں سے ہٹ آئی۔ اس کے چہرے پر غصے، نفرت یا حقارت کے جذبات بھی نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر قسم کے جذبات نچوڑ کر اس کی روح سے نکال لیے گئے ہوں...... ہاں! یہ ضرور تھا کہ ہر بار جب کوئی اسے نوٹ یا روپیہ دیتا تھا، وہ نہایت لاپروائی سے کمرے کے بیچوں بیچ اس کالی، موٹی بھیانک عورت کی طرف پھینک دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی کوئی جذبہ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر جس جھٹکے کے ساتھ وہ روپیہ پھینکتی تھی اس میں کتنی حقارت تھی...... ''یہ لو۔ روپیہ لو۔ اسی کے خاطر تم مجھے سر بازار نچنی ہونا تو یہ لو...... اور لو...... ان روپیوں سے اپنے پیٹ کا دوزخ بھر لو۔''

اور ہری داس کو یہ ادا بہت بھائی۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی گھٹیا قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ کسی شریف اور کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ گانے میں اس کے تلفظ سے معلوم

ہوتا تھا کہ وہ کافی پڑھی لکھی بھی ہوگی۔ جانکی کا انتقام لینے کے لیے وہ ہر لحاظ سے موزوں تھی۔

بارہ بجے تماشائیوں کو رخصت کر دیا گیا۔ لڑکی بغیر ہری داس کی طرف ایک نظر دیکھے سیدھی اندر کمرے میں چلی گئی۔ دلال نے ہری داس سے سو سو روپے کے دو نوٹ لے کر موٹی عورت کو دیے جس نے ان کو مسل مسل کر روشنی کے مقابل غور سے پرکھا۔ پھر پاندان میں سے دس روپے نکال کر دلال کو دیے اور گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہری داس سے کہا۔ جاؤ بابو جی پر کھیال (خیال) رکھنا۔ جرانوی (ذرا نئی) ہے نوی۔"

اگلے لمحے ہری داس کمرے کے اندر تھا۔

اس نے احتیاط سے اندر کی چٹخنی لگائی۔ پھر وہ لڑکی کی طرف بڑھا جو پلنگ پر بیٹھی دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ہری داس کو دیکھ کر وہ ادب سے کھڑی ہوگئی اور پھر جھک کر اس کے بوٹوں کے فیتے کھولنے لگی۔ شاید اسے ہر ایک کو خوش کرنے کا حکم ملا ہو۔

"رہنے دے" ہری داس نے کرختگی سے کہا۔ مگر ایک مسلمان لڑکی کو یوں اپنے قدموں میں جھکے دیکھ کر اسے کتنا اطمینان ہوا۔

"کپڑے اتار" ہری داس نے حکم دیا۔

لڑکی نے کسی قدر کانپتے ہاتھوں سے ساڑی اتار دی۔ صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز رہ گئے۔

"یہ بھی"

لڑکی نے شرم سے دوسری جانب منہ پھیر لیا اور پیٹی کوٹ بھی اتار دیا۔ ہری داس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا۔

"میں تجھے بالکل ننگی دیکھنا چاہتا ہوں۔ دو سو روپے دیے ہیں سنا؟"

اپنے بدن کو شرم سے چراتے ہوئے لڑکی نے مڑ کر ایک بار التجا بھری نظروں سے اپنے ادھیڑ عمر کے گاہک کو دیکھا۔ شاید وہ رحم کھا کر اس کے مکمل برہنہ ہونے پر اصرار نہ کرے۔

"جلدی کر میرے پاس وقت نہیں" جیب کے اندر چھرے کی دھار کو وہ اپنی انگلی سے چھو کر اس کی تیزی کو آزما رہا تھا۔

لڑکی نے ہلکی سی جنبش کی۔ بجلی کے بٹن کی طرف۔

''نہیں'' ہری داس نے راستہ روکتے ہوئے کہا ''اندھیرا نہیں چاہیے۔ آخر اس کی جانکی کی بے حرمتی تو دن دہاڑے سڑک کے کنارے ہوئی تھی۔

لڑکی نے بلاؤز بھی اتار دیا۔ صرف چولی رہ گئی جو چھاتیوں کے ابھار کو اور نمایاں کر رہی تھی۔

''یہ بھی'' اور اس نے چھرا جیب سے نکال کر ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا۔

ایک بار لڑکی نے التجا بھری نظروں سے ہری داس کی طرف دیکھا ایسی ہی التجا بھری نگاہوں سے جانکی نے ان ظالموں کو دیکھا تھا اور انھوں نے رحم نہ کھایا تھا۔ سو آج ہری داس کیوں رحم کھائے۔ لڑکی نے ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ سسکیوں کی آواز آئی اور چند آنسو آنکھوں کے پردے سے نکل کر اس کی چھاتیوں پر گرے۔

ہری داس کے ہاتھ میں چھرا چمکا۔ ایک ہاتھ اوپر ہوا میں گیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے لڑکی کے ہاتھوں کو اس کے چہرے سے علیحدہ کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جو کرنے والا ہے اسے یہ مسلمان لڑکی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے............ جیسے جانکی نے دیکھا تھا۔ لال اور پیلے۔ پیلے اور لال شعلے فضا میں ہر جانب اڑ رہے تھے، خوشی سے ناچ رہے تھے۔

لڑکی نے جب ہری داس کے ہاتھ میں ایک دھار دار چھرے کو دیکھا اور دوسرے ہاتھ کو اپنی چولی کی جانب بڑھتے دیکھا تو دفعتاً اس کی آنکھوں میں ہری داس کو وہ ساری خوف، نفرت، لاچارگی، حیرت، غم، التجا، رحم کی درخواست اور مکمل مایوسی نظر آئی جو اس نے ایک دن اپنی بیٹی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

مگر جانکی کی التجا بھری نگاہیں ان وحشیوں کے وار کو نہ روک سکی تھیں۔ اس لیے آج ہری داس کے انتقام کی آگ کو بھی کسی کے آنسو نہ بجھا سکیں گے۔

بایاں ہاتھ سرعت کے ساتھ چولی پر پڑا۔ آنکھ جھپکی چولی جو کافی بھاری اور بوجھل تھی اتر گئی اور اس کے ساتھ ہی...... ہری داس کا دایاں ہاتھ جس میں چھرا تھا ہوا میں معلق رہ گیا۔ اس کی آنکھیں شرم اور ندامت سے جھک گئیں۔ اس کی زبان سے صرف ایک لفظ نکلا۔ ''بیٹی۔''

چولی کے نیچے جہاں وہ وار کرنے والا تھا، وہاں چھاتیاں نہ تھیں۔ وہاں کچھ نہ تھا۔

شاعر کی آواز

آپ نے راجوں، مہاراجوں، شہزادوں، شہزادیوں، جنوں، بھوتوں اور پریوں کی کہانیاں تو ضرور پڑھی اور سنی ہوں گی، مگر شاعر کی کہانی نہ سنی ہوگی۔ آیئے آج آپ کو شاعر کی کہانی سناؤں، گو راجا اس میں بھی آتا ہے۔

ایک تھا شاعر، ارتقا کے چابک دست ہاتھوں نے اسے نہایت نرم و نازک مٹی سے بنایا تھا۔ اس کی فطرت میں آبشاروں کی موسیقی تھی اور شہد کی مٹھاس۔ شفق کی رنگینی تھی اور پھولوں کی خوشبو، بادلوں کی نرمی تھی اور ہرے بھرے کھیتوں کی شادابی۔ اس کا دل سوز اور ساز سے بھرا تھا۔ انسان کے دکھ اور سکھ دونوں سے وہ آشنا تھا۔ اس کے تخیل کی پہنچ آسمان سے اونچی تھی، کائنات کا کوئی پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہ تھا۔ وہ زمین کا محرم تھا مگر فلک کے بھید بھی اس سے چھپے نہیں تھے۔

وہ فطرتاً آزاد تھا۔ مکاں اور وقت سے آزاد۔ نسل اور مذہب، قوم اور ذات کے بندھنوں سے آزاد۔ فکر معاش اور غم روزگار سے آزاد وہ آزاد منش، بے فکر اور لاپرواہ تھا، جہاں چاہے گھومتا، کہیں بھی ٹھہر جاتا۔ جب دل چاہتا پھر چل کھڑا ہوتا۔ آج یہاں، کل وہاں، زندگی کا کارواں جدھر مڑتا وہ بھی ادھر کا رخ کرتا، کبھی راہرو تو کبھی راہ گر۔ آج قافلے کی گرد کا سراغ لگا رہا ہے تو

کل قافلہ سالاری کر رہا ہے۔ کبھی زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس پر ہنس رہا ہے اور ہنسا رہا ہے، کبھی ''قیدِ حیات و بندِ غم'' کو ایک ہی بتا کر رو رہا ہے اور رلا رہا ہے۔ کبھی سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا سفیر بھیج رہا ہے تو کبھی خدا کو للکار رہا ہے۔ کبھی رات کے تاروں میں اپنا رازداں تلاش کر رہا ہے تو کبھی زمین و آسمان دونوں کو پھونک کر اپنی ''خودی'' سے اپنا جہان پیدا کر رہا ہے، مختصر یہ کہ وہ شاعر تھا۔

ساری دنیا شاعر کو پسند کرتی تھی، اس کے گیت سن کر سر دھنتی تھی، مگر اس کی بے فکری کی زندگی اور عاشقانہ اشعار کی وجہ سے بڑے بوڑھے اس کے چال چلن کو مشتبہ سمجھتے تھے۔ کبھی وہ باغ میں نکل جاتا تو پھولوں پر بلبل کو فریفتہ دیکھ کر غزل کہہ دیتا۔ کبھی پنگھٹ پر کوئی دیہاتی حسینہ دکھائی دے جاتی تو اس کے گیت گانے لگتا۔ کبھی رات کے وقت الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے گاؤں کے بوڑھوں کی زبانی کسی پرانے زمانے کے عاشق و معشوق کے جوڑے کا ذکر سن لیتا تو مثنوی موزوں ہو جاتی۔

ہاں تو شاعر کو ساری دنیا پسند کرتی تھی مگر راجا اس سے جلتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعر راجا کا ادب نہیں کرتا تھا۔ ساری ریاست میں شاعر ہی ایسا تھا جس کا سر راجا کے سامنے کبھی نہ جھکا تھا۔ جب کبھی راجا کی سواری نکلتی، تو اس کی بھوکی ننگی رعایا، سڑک کے دونوں طرف قطاریں باندھ کر جے جے کار سے اس کا سواگت کرتی۔ (یہ اور بات تھی کہ ہر ایک کے پیچھے ایک سپاہی تلوار یا سنگین لیے کھڑا رہتا تھا کہ اگر وقت پر راجا کے حضور میں سر نہ جھکے تو ایک کچوکا دے کر آگاہ کر دیا جائے) ہاں تو ان جھکے ہوئے سروں میں راجہ کو شاعر کا سر کبھی نہ نظر آتا اور اس کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ شاعر اپنے کو خود اقلیم سخن کا شہنشاہ سمجھتا تھا۔ بھلا اسے کیا پڑی تھی کہ ایک معمولی راجا کو حضور میں حاضر ہو۔

ایک دن کی بات ہے کہ شاعر مشقِ سخن کی دھن میں باغ میں جا نکلا کہ گل و بلبل کے عشق کو کسی نئی غزل کا موضوع بنائے۔ مگر وہاں کوئی پھول ہی نہیں تھا۔ گلاب کی سب جھاڑیاں زمین میں مسلی، روندی ہوئی پڑی تھیں، معلوم ہوا کہ راجا کی گھوڑ سوار فوج ادھر سے گذر کر گئی ہے اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے سارے چمن کو برباد کر ڈالا ہے۔ یہ دیکھ کر شاعر کا نازک اور حساس دل

بھر آیا۔ اس نے سوچا نہ جانے یہ سماں دیکھ کر بلبل پر کیا گذری ہوگی۔ گل کے فراق میں بچاری نالہ و بکا کر رہی ہوگی۔ مگر چاروں طرف سناٹا تھا، بلبل کی آواز نہ سنائی دی۔ پھر اس نے دیکھا کہ مسلی ہوئی پنکھڑیوں کے پاس ہی بلبل ایک زہریلے تیر سے چھدی ہوئی مردہ پڑی ہے۔ راجا نے شکار پر جاتے ہوئے تیر انداز کی مشق کرنے کے لیے اسی غریب کو نشانہ بنا دیا تھا۔

چمن سے مایوس ہو کر شاعر نے سوچا چلو پنگھٹ پر چلیں اور وہاں اپنی رادھا اور اس کی سندر سکھیوں کی چہل دیکھ کر کوئی گیت لکھیں مگر آج پنگھٹ پر بھی وہ پہلی سی رونق نہ تھی۔ سب لڑکیاں خاموشی سے پانی بھر رہی تھیں۔ ان کے گالوں میں گڈھے پڑے ہوئے تھے۔ سڈول بانہوں پر گوشت غائب ہو کر ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے، بال مٹی میں اَٹے ہوئے تھے اور کپڑے تار تار تھے۔ ان کے ہونٹوں پر سے ہنسی تو کیا مسکراہٹ بھی غائب تھی۔ حیران ہو کر اس نے پوچھا۔ "تم سب کو کیا ہوا؟" تب انھوں نے بتایا کہ گاؤں میں اَکال پڑا ہے اور کتنے ہی دن سے وہ سب پانی پی پی کر ہی گزارا کر رہی ہیں۔ "میری رادھا کہاں ہے؟" اس نے پوچھا اور ان میں سے کوئی بولی "وہ دیکھو سڑک پر —"

یہ سڑک راجا کے موٹر کے لیے بنائی جا رہی تھی اور اَکال کے مارے بہت سے کسان اس پر کام کر رہے تھے۔ راجا کے آدمی ہاتھوں میں کوڑے لیے ادھر اُدھر پھر رہے تھے کہ اگر کوئی لمحے بھر کے لیے بھی کام سے کوتاہی کرے تو اس کی خبر لیں۔ شاعر ادھر اُدھر دیکھتا، راجا کو تلاش کرتا جا رہا تھا کہ اسے کانچ کی چوڑیاں کھنکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ پہچان گیا کہ یہ اس کی رادھا کی چوڑیوں کی مدھر کھنکھناہٹ ہے۔ مڑ کر دیکھا تو رادھا ایک بھاری موگری ہاتھ میں لیے سڑک کوٹ رہی تھی۔ بھوک اور محنت سے اس کی ساری سندرتا جاتی رہی ہے۔ نہ آنکھوں میں پہلی سی چمک تھی اور نہ سینے میں ابھار۔ جن زلفوں کو وہ ناگنوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا، وہ آج مٹی اور کیچڑ میں اٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کی مہندی اڑ چکی تھی اور اس کے بجائے ہتھیلیوں سے خون پھوٹ آیا تھا۔ ننگے پاؤں میں آبلے پڑے ہوئے تھے، وہ تو اس کو پہچان بھی نہ سکتا، اگر اس کے ہاتھوں میں وہی کانچ کی آسمانی چوڑیاں نہ ہوتیں جو پچھلے تہوار پر خود اس نے لا کر دی تھیں۔ وہ سر جھکائے سڑک کوٹ رہی تھی، ہر دھما کے کے ساتھ چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور فضا میں عجیب اور دردناک موسیقی پھیلی

ہوئی بھی اور پھر ایک بار جب اس نے موگری کو سڑک پر زور سے مارا، اس کی کلائی لکڑی سے ٹکرائی اور کئی چوڑیاں ٹوٹ کر زمین پر گریں، مگر رادھا کو ان کا کوئی ہوش نہ تھا، وہ سڑک کوٹتی رہی، پتھر اور مٹی کے ساتھ اپنی آسمانی چوڑیوں کو بھی سڑک میں دفن کرتی رہی...... چوڑیاں...... آسمانی چوڑیاں...... جو شاعر نے اسے لا کر دی تھیں۔

شاعر نے سوچا دیہاتی اپنے سرسبز و شاداب کھیتوں کو چھوڑ کر کیوں یہاں سڑک کوٹنے آگئے۔ رادھا نے چاندی کے چند ٹکڑوں کے لیے اپنی جوانی اپنی سندرتا، اپنی عزت کو کیوں بیچ دیا؟ سچا آنند صرف آکاش کے تلے ان ہرے بھرے کھیتوں میں مل سکتا ہے ....سو وہ کھیتوں میں گیا۔ لہلہاتے ہوئے کھیت، جہاں تک نظر جائے، ہریالی ہی ہریالی—— گیہوں کی بالیاں سورج کی روشنی میں جھوم جھوم کر ہنس رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر شاعر کا مرجھایا ہوا دل، ایک بار پھر خوشی اور امید سے شگفتہ ہوگیا۔ اس نے سوچا ''میں جا کر رادھا کو لے آتا ہوں۔ اس کی نازک کلائیاں سڑک کوٹنے کے لیے نہیں بنائی گئی تھیں، ان میں تو کنگن جگمگانا چاہیے۔'' میں کھیتوں میں ہل چلاؤں گا۔ بیج بوؤں گا، فصل پیدا کروں گا۔ دوپہر کو میری رادھا، سر پر ٹوکری دھرے، میرے گیت گاتی ہوئی میرا کھانا لے کر آیا کرے گی۔ کتنا سکھ کتنا آنند ہوگا۔ یہی کھیت سورگ بن جائیں گے، پر اسی وقت اس نے دیکھا کہ ساہوکار کے آدمی آئے اور انھوں نے ان تمام کھیتوں اور فصل کی قرقی کرالی۔ کسانوں کی بے دخلی کر دی گئی۔ کھیت ساہوکار کے ہوگئے اور شاعر کو ساہوکار نے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ ''کیوں بے کیا بھٹکے چرانے آیا ہے؟''

ابھی تک شاعر نہ غزل کہہ پایا تھا نہ گیت نہ نظم۔ لکھے تو کیا لکھے اس کے تخیل پر چوٹ پر چوٹ پڑ رہی تھی، اس کے پھول مسلے ہوئے پڑے تھے، اس کی بلبل کا سینہ چھدا ہوا تھا، اس کی رادھا کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں اسے دنیا میں نہ کہیں حسن نظر آتا تھا نہ عشق، تو نظم کس پر لکھے۔ پھر اس نے سوچا نظارۂ قدرت انسان کی کرتوتوں سے بے نیاز ہے۔ ان سب جھگڑوں سے دور...... بہت دور...... میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاؤں گا...... اور وہاں سے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھوں گا۔ جب مغربی آسمان پر شفق کی رنگا رنگی ہوگی اور ہوا میں خنکی اور خوشبو۔ صناع فطرت کے اس شاہکار پر میں نظم لکھوں گا۔

سو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ آسمان پر واقعی شفق پھولی ہوئی تھی سرخ اور زرد۔ اور سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، اور رنگین منظر کو دیکھ کر وہ خوش ہو گیا، اس کے کانوں میں ایک گیت کی مدھر تان گونجنے لگی مگر.......... ہوا میں خنکی کیوں نہیں؟ اور فضا میں سارے جہاں کے پھولوں کی خوشبو کے بجائے دھوئیں اور جلی ہوئی ہڈیوں کی بو کیسی!........... جیسی شمشان بھومی کی جلتی ہوئی چتاؤں میں سے آتی ہے!.............. پھر اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ افق پر غروب آفتاب کی شفق سے رنگا رنگی نہیں تھی، بلکہ راجا کے سپاہیوں نے مزدوروں کی ایک بستی میں آگ لگا دی تھی اور اس کے لال اور پیلے شعلے اور کالے دھوئیں کے بادل تھے جو آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ راجا کی موٹر ادھر سے گزری تھی اور ان اندھیرے، گلے، سڑے، بدبودار جھونپڑیوں کو دیکھ کر راجا کی نازک طبیعت کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور اس نے حکم دے دیا تھا کہ اس ساری بستی کو رات ہونے سے پہلے جلا کر خاک کر دیا جائے تا کہ آئندہ سیر و تفریح کے وقت ایسا بدہیئت نظارہ اس کے مزاج کی ناگواری کا باعث نہ ہو۔ بستی جلا دی گئی تھی اور بعض جھونپڑوں میں کئی مزدور اور ان کی عورتیں اور بچے بھی جل مرے تھے اور یہ انھیں کی ہڈیوں کے جلنے کی بو تھی جو شعلوں سے جھلسی ہوئی گرم ہوا فضا میں پھیلا رہی تھی۔

شاعر جانتا تھا کہ ان شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کے پیچھے آسمان پر ضرور رنگین شفق پھولی ہوگی۔ مگر وہ اس وقت تک اس کی نظر سے اوجھل رہے گی جب تک ظلم کی آگ کا یہ دھواں چھایا ہوا ہے۔

مزدوروں کی جلتی ہوئی بستی پر پھر نظر کی تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ یہ انقلاب کی آگ ہے جس کی لپٹیں ایک دن ساری دنیا کو جھلس ڈالیں گی اور اسی وقت اس کے دماغ سے خود اعتمادی کی ایک لہر دل میں ہوتی ہوئی اس کی زبان تک آئی اور گویا دنیا کو للکار کر وہ پکارا تھا:

نصیب خفتہ کے شانے جھنجھوڑ سکتا ہوں
طلسم غفلتِ انساں کو توڑ سکتا ہوں

اور پھر للکارا

پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو

بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے، دہقاں کو

مزدوروں کے جھونپڑے جل رہے تھے اور شاعر کے تخیل میں وہ شعلے ایک آتشیں ہیولی بن کر ناچ رہے تھے۔ آگ اور خون، خون اور آگ دھوئیں کے بادل لپکتے ہوئے شعلے۔ یہ سب دیکھ کر شاعر پکار اٹھا:

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے، خون برساتے ہوئے
خون کی بُو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
(مجاز)

اور اس آگ میں، ان شعلوں میں، اس تخریب میں اسے ایک نئی دنیا، ایک بہتر دنیا کی جھلک دکھائی دے۔ وہ بول اٹھا

شہر یہ دل شاد ہوگا ایک دن
یہ کھنڈر آباد ہوگا ایک دن
پھر نسیم جاں فزا اٹھلائے گی
لالہ و گل پر بہار آجائے گی
ریگ ساحل پر عیاں ہوجائے گی
یہ زمیں پھر آسماں ہوجائے گی
(سردار جعفری)

شاعر کی آواز میں جادو تھا، یا یہ شاید اس کی آواز نہ تھی بلکہ اس کی ساری قوم کی آواز تھی، انسانیت کی آواز تھی، کیوں کہ اس کے گیتوں کی گونج سارے سارے دیش میں پھیل گئی۔ اسے سن کر جو سو رہے تھے وہ جاگ اٹھے جو تھک کر بیٹھ رہے تھے، وہ پھر منزل کی طرف چل کھڑے ہوئے جو مایوس ہو چکے تھے ان کی آنکھیں پھر امید سے چمک اٹھیں، شاعر نے دیکھا کہ انسانوں

کا ایک اُمڈتا ہوا سیلاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے:

کسان

مزدور

کاریگر

فقیر

بھکاری

مظلوم

سڑک کوٹنے والی عورتیں اور ان میں اس کی رادھا بھی۔

مگر وہ خود اب صرف رادھا کا شاعر نہ تھا۔ آج وہ ساری قوم کا شاعر تھا۔ ایک نئی دنیا کا پیغامبر۔ ان مزدوروں، کسانوں، مجبوروں اور مظلوموں کی طرف دیکھ کر اس نے وعدہ کیا۔

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارہ بھر دوں گا
مدھم لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پگ پر مشعل لے کر نکلوں گا
اب سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا
(ساحر)

رادھا کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو کر اب اس کے ہونٹوں پر امید اور خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ اس کی ساڑی اب بھی پھٹی ہوئی تھی، اور آنچل جو سر پر پڑا تھا تار تار تھا، پھر بھی اسے پھٹے آنچل میں اس کا چہرہ ماہتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر شاعر کو بہت سے سنہرے سپنے یاد آ گئے۔ سینکڑوں ارمانوں اور مسرتوں نے اس کے دل میں کروٹ لی مگر اس نے رادھا کی طرف دیکھ کر کہا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
(مجاز)

رادھا کے سر سے آنچل نیچے آ گیا اور وہ مزدوروں اور کسانوں کی اس فوج میں مل گئی جو نعرے لگاتی، شاعر کے گیت گاتی جا رہی تھی۔ آندھی کا ایک تند جھونکا آیا اور رادھا کا آنچل پرچم بن کر لہرانے لگا۔

شاعر بھی اس انقلابی فوج کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور ڈنکے کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر گا رہا تھا:

ڈنکے کی چوٹ سے آسماں گونج رہا ہے
ہمارے پاؤں تلے کی زمین ناہموار ہے
لیکن نئی صبح کے فرزندو!
بڑھے چلو بڑھے چلو۔
ہم شفق کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے
اور صبح کی دولہن کو باہر لائیں گے
ہم رات کی ظلمت کو چیرتے جائیں گے
خواہ رستے میں بندھیاچل جیسے پہاڑ کیوں نہ حائل ہوں۔

(نذر الاسلام)

عوام کے باغیانہ نعروں نے راجا کے محل کی دیواروں کو ہلا دیا۔ وہ اپنے درباریوں پر برس پڑا۔ گرج کر بولا

''اس بغاوت کا ذمہ دار کون ہے؟
انھوں نے کہا شاعر''
راجا چلایا ''شاعر کو خرید لو''

درباری بھاگے بھاگے شاعر کے پاس پہنچے اور کہا ''راجا تمھیں دنیا کی ہر دولت، ہر عیش و آرام دینے کے لیے تیار ہے۔ اس بغاوت کی آگ کو بجھا دو تو وہ تمھارا منہ ہیرے جواہرات سے بھر دے گا۔''

شاعر نے جیب سے چنے اور مونگ پھلیاں نکال کر ایک پھنکی لگاتے ہوئے جواب دیا: ''میں انسان ہوں چنے کھاتا ہوں۔ تمھارے راجا کی طرح شتر مرغ نہیں ہوں جو کنکر پتھر کھاؤں۔''

راجا نے جب یہ سنا تو غصّے سے چلایا'' شاعر کو قید کر دو۔

سو شاعر کو ایک کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ بیس برس قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ باغیانہ نظمیں لکھنے کے جرم میں اور قید خانے سے شاعر نے اپنی رادھا کو مخاطب کر کے ایک نظم لکھی

بیس سال قید

کاغذ کے ایک پرزے پر لکھے ہوئے چند الفاظ کی بنا پر لیکن میری رفیقہ!

اس میں غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں

یہ ان کی بزدلی اور خوف ہے......

اپنے دل سے مایوسی دور کرو

ہنسو کہ یہ ہماری فتح ہے۔

اگلے برس یا اس سے اگلے برس یا اس سے اگلے۔ کون جانتا ہے؟ ہم یہاں بیٹھے مستقبل کا خواب دیکھیں گے۔

اپنے جھکے ہوئے سر کو بلند کرو

اور سنو

سنو طوفانی لہروں کی آواز۔

جیسے ایک خاموش سمندر میں ابال آ گیا ہو

بہت جلد یہ لہریں دنیا کے آہنی دروازوں پر دستک دینے والی ہیں۔

(یا نگ سو)

شاعر کی آواز قید خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر فضا میں پھیلتی رہی اور انقلابی فوجیں اس کے گیت گاتی ہوئی راجا کے محل کے پاس آن پہنچیں۔ ان کے استقبال کے لیے شاعر کی آواز قید خانے کی دیواروں کو پار کرتی ہوئی آئی

رک نہ سکتا تھا انقلاب زمیں

کر گیا کام سوز ناکامی

دل کی بے تابیوں سے محو کلام

دے اٹھی لو خود آرزوئے حیات
کرب و امید کے منازل میں
قافلہ ولولوں کا آج اے دوست
سوئے آزادیٔ وطن ہے رواں
قلب سے گرچہ اٹھ رہا ہے دھواں
اک ستارہ افق پہ چمکے گا
ملک خواب گراں سے اٹھے گا
منزلیں ہوں گی خود غبار بہت
سرنگوں ہوں گے تاجدار بہت
ان کے ٹوٹے ہوئے سنگینوں پر
سرفروشوں کا نام چمکے گا

(پشکن)

راجا گھبرا گیا۔ اس نے شاعر کو بلا کر کہا۔ ''ابھی باغی فوجوں کو پیچھے ہٹ جانے کو کہو، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

شاعر نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں کالے کالے بادل ابھی سے راجا کا سوگ منا رہے تھے۔ اور بجلی کی چمک اور کڑک شہنشاہیت کی موت کا پیغام سنا رہی تھی۔ وہ بولا: ''میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اور پھر......

سنو اے بستگان زلف گیتی
صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا لمحہ بہتر ہے
غلامی کی حیات جاوداں سے

(جوش)

اب تو راجا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے کہا ''شاعر کی زبان گدی سے کھینچ لو۔''

جلاد نے چھرا نکالا اور شاعر کی زبان کاٹ ڈالی گئی۔ مگر شاعر کے چہرے سے وہ فاتحانہ مسکراہٹ دور نہ ہوئی۔ ''یہ زبان سے نہیں میرے دل سے پیدا ہو رہے ہیں۔ زبان کاٹنے سے میری آواز بند نہ ہوگی'' اور واقعی شاعر کی آواز اور بھی زور سے گونج اٹھی کیوں کہ یہ اسی کی آواز تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو لاکھوں، کروڑوں کی آواز تھی، اور دنیا نے شاعر کا پیغام سنا۔

میں دیکھ رہا ہوں جو کسی کو دکھائی نہیں دے رہا
وقت کی چوٹیوں پر سے آتے ہوئے
کانٹوں والے تاج کو پہنے
میں انقلاب کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں
سنو!
آئندہ نسلوں میں آنے والے ساتھیو!
سنو ایک شاعر کی آواز
یہ اشعار جو بیس برس تک فاتحانہ شان سے چھائے رہے
اول سے آخر تک تمہاری نذر کرتا ہوں

(مایکافسکی)

انقلابی فوجیں اب راجا کے محل کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھیں۔ راجا کو اپنی موت سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس کے غصے میں اب خوف کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ کانپتی ہوئی آواز میں پاگلوں کی طرح چلایا:

''یہ شاعر نہیں جادوگر ہے۔ اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دو۔''

جلادوں نے ایسا ہی کیا۔ شاعر کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیے گئے۔ مگر راجا کی یہ سب سے بڑی بھول تھی کیونکہ جہاں کہیں بھی شاعر کے بدن کا ایک ٹکڑا بھی گرا اسی زمین سے ایک اور شاعر پیدا ہوا۔ جس کی آواز اور بھی زور سے گونجی اور جہاں کہیں اس کے خون کا ایک قطرہ بھی گرا وہاں سے انقلاب کا ایک سپاہی پیدا ہوا۔ اس طرح راجا کا راج ختم ہوگیا اور کہانی بھی ختم ہوگئی۔ مگر شاعر کی آواز....

جہاں کہیں درد ہے وہاں میں ہوں
ہر آنسو پر جو بہایا جاتا ہے
میں اپنے آپ کو مصلوب محسوس کرتا ہوں

(مائیکلا فسکی)

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس شاعر کا نام کیا تھا؟ ممکن ہے اس کا نام سقراط ہو جسے پرانے یونان کی ''سی آئی ڈی'' نے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے کے جرم میں گرفتار کر کے زہر کا پیالہ پلایا تھا۔ ممکن ہے اس کا نام سرمد ہو جسے باغیانہ اور صوفیانہ خیالات پھیلانے کے جرم میں اورنگ زیب نے قتل کرایا تھا۔ ممکن ہے اس کا نام والٹ وہٹ مین ہو جسے امریکن پولیس نے اپنی نظموں کا مجموعہ پاس رکھنے کے جرم میں قید کیا۔ ممکن ہے اس کا نام بھگت سنگھ ہو جو خود شعر نہ کہنے پر بھی شاعر تھا۔ اور ''میرا رنگ بسنتی چولا'' گاتے ہوئے پھانسی پر چڑھ گیا۔ ممکن ہے اس کا نام ٹیگور ہو جس کے گیتوں کو انگریزوں نے باغیانہ قرار دیا۔ اور آج بھی جس کے گیت گانے کے لیے پولیس سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ ممکن ہے اس کا نام یانگ سو ہو جسے چیانگ کائی شیک نے بیس برس قید میں رکھا۔ ممکن ہے اس کا نام مخدوم محی الدین ہو جس کے گیتوں نے تلنگانہ میں انقلاب برپا کر دیا۔ ممکن ہے اس کا نام ساحر لدھیانوی ہو جس کے 'سویرا' کو پاکستان حکومت نے بند کر دیا۔ مگر جو آج پھر اسی انقلابی ''شاہراہ'' پر گامزن ہے اور ممکن ہے اس کا نام علی سردار جعفری ہو جسے ۲۱ر جنوری کو صبح کے سات بجے بمبئی پولیس کی مسلم برانچ نے گرفتار کیا۔

میں کون ہوں؟

ہاں! تو تم سب جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟......

تم جاننا چاہتے ہو کہ ایک آدمی جو مرنے کے قریب ہو وہ کیسے کھلکھلا کر ہنس سکتا ہے......؟

تم رہنے دو ڈاکٹر صاحب کیوں تکلیف کرتے ہو؟ اپنی ڈسپنسری میں کونین مکسچر اور اسپرین کی گولیاں بیچو۔ تم مجھے مرنے سے نہیں بچا سکتے۔ بات یہ ہے کہ مجھے ایک چھوڑ دو گھاؤ لگے ہیں۔ ایک پسلیوں میں آر پار کرے سے لے کر جگر تک، دوسرا پیٹ میں۔ دیکھتے نہیں آنتیں باہر نکل آئی ہیں......

ہاں تو تم سب جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟ تم جاننا چاہتے ہو کہ مرتا ہوا آدمی کیسے ہنس سکتا ہے؟ میں ابھی بتاتا ہوں بات یہ ہے کہ مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں کون ہوں۔ کیا کہا تم نے بڑے میاں؟ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ کمال کیا۔ ہنسی کی نہیں تو کیا رونے کی بات ہے؟ ایک مہینے سے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون ہوں؟ ہندو یا مسلمان یا سکھ جس کے بال اور داڑھی زبردستی مونڈ دیے گئے ہوں اور زبردستی ختنہ کر دی گئی ہو۔ برہمن یا اچھوت؟......امیر یا غریب......؟ مشرقی پنجاب کا رہنے والا یا مغربی پنجاب کا......؟ لاہور کا باشندہ یا امرتسر کا......؟ راولپنڈی کا یا جالندھر کا......؟ میں نے ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی میں کہ میں کون ہوں؟ میرا دھرم کیا ہے؟ ذات کیا ہے؟

نام کیا ہے......؟ پر کسی کو نہیں معلوم ہو سکا............خود مجھے یاد آیا۔ مگر یاد آیا تو اب........... جب کہ میں مر رہا ہوں............

ڈاکٹر صاحب! تم اتنے پریشان نہ ہو۔ نہیں تو تمہاری شکل دیکھ کر مجھے اور ہنسی آئے گی۔ یقین مانو کہ تم کیا، دنیا کا کوئی ڈاکٹر بھی مجھے نہیں بچا سکتا............ میں جانتا ہوں تم کس شش و پنج میں پڑے ہو؟............ میرے دو زخم اتنی بیڈھب جگہوں پر پڑے ہیں کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پہلے کس کی مرہم پٹی کرو۔ پہلے چت لٹا کر۔ آنتوں کو واپس اندر ڈال کر پیٹ سیتے ہو تو اتنی دیر کمر والے گھاؤ میں اتنا خون بہہ جائے گا کہ ایک ٹانکہ بھی نہ لگا سکو گے کہ میں مر چکوں گا اور اگر تم مجھے اُلٹا کر پہلے کمر کے گھاؤ کی خبر لیتے ہو تو اتنی دیر میں انتڑیاں تو انتڑیاں سارا کلیجہ باہر نکل آئے گا۔

ہاں تو بات یہ ہے کہ ایک مہینہ ہوا جب میرا دماغ نہ جانے کتنے دنوں کے بعد ایک اندھیرے سپنے سے باہر نکلا اور میں نے اپنے آپ کو دہلی کے ایک سرکاری اسپتال میں پڑا پایا تو میری یاد ایک دم غائب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

''تمھارا نام؟''

میں نے بہت سوچا۔ دماغ پر زور ڈالا۔ پھر کہنا پڑا

''یاد نہیں''

''ہندو یا مسلمان؟''

ڈاکٹر نے دوسرا سوال کیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ دھرم، مذہب، ذات جماعت، وطن، شہر، محلہ۔ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میں شادی شدہ ہوں، کنوارا یا رنڈوا۔ اور تو اور مجھے اپنی عمر کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ نا جانے کیوں ہوش آنے پر میرا خیال تھا کہ میں کافی جوان ہوں۔ مگر جب ایک نرس نے آئینہ دکھایا تو میں اپنی شکل دیکھ کر ڈر گیا۔ سر کے آدھے بال سفید۔ آٹھ دس دن کی بڑھی کھچڑی رنگ کی داڑھی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ چہرے پر جھریاں۔ غرض یہی حلیہ جواب بھی تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ ہاں اس وقت سر کے سفید بالوں میں خون کی مہندی نہیں لگی تھی جو اب لگی ہوئی ہے۔ دیکھا! تم بھی ہنس دیے۔ خون کی مہندی؟ مہندی، عورتیں ہتھیلیوں

پر لگاتی ہیں اور بوڑھے مرد سر کے سفید بالوں میں۔اب خود ہی بتاؤ یہ سوچ کر ہنسی کیوں نہ آئے.................!

ہاں تو دلّی کے ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی کہ میرا نام، پتہ، دھرم مذہب معلوم ہو جائے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے خود بڑی دوڑ دھوپ کی کیونکہ بغیر اپنا نام جانے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں زندہ نہیں ہوں مردہ ہوں، پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ پچاس ساٹھ اور زخمیوں کے ساتھ مجھے ریل میں پنجاب سے لایا گیا ہے۔ میں نے سوال کیا "باقی زخمی ہندو تھے یا مسلمان" تو معلوم ہوا ہندو بھی تھے، سکھ بھی، مسلمان بھی۔

ہوا یہ تھا کہ امرتسر اور لاہور کے درمیان یکے بعد دیگرے دو ریلیں پٹری سے اتار دی گئی تھیں۔ ایک میں مغربی پنجاب سے ہندو امرتسر آرہے تھے، دوسری میں مشرقی پنجاب سے مسلمان لاہور جارہے تھے۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب ایک اسٹیشن کے نیچے بم پھٹا۔ پہیے پٹری سے نیچے آرہے انجن الٹ گیا کتنے تو ویسے ہی ہلاک ہو گئے۔ باقیوں پر گولیاں برسیں۔ رات کے اندھیرے میں زخمی گرتے پڑتے، ادھر ادھر بھاگے۔ اس کے بعد اس جگہ سے میل بھر دور دوسری اسٹیشن پر جو الٹی طرف سے آرہی تھی، اس بار بم کی ضرورت نہیں پڑی۔ گاڑی جوں ہی ایک موڑ پر ہلکی ہوئی، مشین گن کی گولیوں کی بوچھار اس پر پڑی۔ ڈرائیور، گارڈ اور بہت سے مسافر جو کھڑکیوں کے قریب بیٹھے تھے، فوراً ہلاک ہو گئے۔ انجن مست ہاتھی کی طرح دھڑ دھڑاتا گاڑی کو گھسیٹتا چلا گیا، مگر تھوڑی ہی دور پر ریل کی پٹری کا کانٹا بدل دیا گیا تھا، اس لیے پوری گاڑی الٹ گئی۔ اس کے زخمیوں نے بھی رات کے اندھیرے میں پناہ لی......

اگلی صبح کو جب ہندوستانی سرحدی فوجیں اور پاکستانی سرحدی فوجیں گشت کو نکلیں تو انھوں نے کتنے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کو عین نئی سرحد پر مردہ اور زخمی پڑا پایا۔ ان میں میں بھی تھا.........اب تم ہی کہو ہنسی نہ آئے یہ سن کر کہ کتنے ہی ہندوؤں نے اندھیرے میں پاکستان میں دم توڑا تھا اور کتنے ہی مسلمانوں نے ہندوستان میں۔ اور پھر بھی وہ اس طرح عین سرحد پر خلط ملط پڑے تھے کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ کون ہندوستان میں ہے اور کون پاکستان میں۔ بہر حال نئی سرحد کی لکیر ضرور کھنچ گئی تھی۔......خون سے!......یا یوں کہیے

کہ بوڑھی زمین کی داڑھی میں خون کی مہندی لگ گئی تھی......

''دیکھو سفید داڑھی والے مولانا گھبراؤ مت! میرا اشارہ ہرگز تمہاری داڑھی کی طرف نہیں تھا۔ تم میری طرف اس طرح نہ گھورو۔ میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں مر رہا ہوں نا اور مرتے وقت انسان پر سب بھید کھل جاتے ہیں نا۔ ہاں تو تم سوچ رہے ہو کہ اگر میں مسلمان ہونے کا اعلان کردوں تو تم انجمنِ خُدّام المسلمین کی طرف سے میری تجہیز و تکفین کا بندوبست ابھی سے شروع کردو اور لمبی چوٹی والے مہاشے جی میں تمھارے وچار بھی جانتا ہوں۔ تم اس تاک میں ہو کہ کب میں اپنے ہندو ہونے کا اقرار کردوں اور تم دھرم سیوک سماج کی طرف سے میرے کریا کرم کا انتظام شروع کردو۔

میں نے سنا ہے یہاں بمبئی میں پارسی لوگ اپنے مردوں کو مالا بار ہل پر ایک کھلے میدان میں رکھ آتے ہیں تاکہ گدھ لاشوں کو کھا جائیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ہزاروں گدھ ہر وقت اس انتظار میں منڈلاتے رہتے ہیں کہ کب کوئی تازہ لاش لائی جائے۔ پر یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسے گدھ بھی ہوتے ہیں جو موت سے پہلے ہی مرنے والے پر منڈلاتے رہتے ہیں۔

کسی نے مجھے بتایا کہ جب مجھے ہندوستان پاکستان سرحد پر اس طرح بے ہوش پڑا پایا گیا کہ میری ایک ٹانگ ہندوستان میں تھی دوسری پاکستان میں۔ ایک ہاتھ ادھر دوسرا اُدھر تو اس وقت میرے بدن پر ایک پھٹی ہوئی شلوار اور خون میں لت پت قمیض تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ پنجابی ہندو کا لباس ہے یا پنجابی مسلمان کا.......... خیر نہ جانے کیوں مجھے دہلی لے آیا گیا۔ مجھے زخم تو معمولی آئے تھے۔ وہ جلد اچھے ہوگئے۔ مگر ڈاکٹر کہتے تھے کہ دماغ میں کوئی شدید اندرونی چوٹ آئی ہے۔ جس سے یاد غائب ہوگئی ہے......

ہاں صاحب! تو میں تمام دنیا میں عجیب الخلقت انسان بن گیا جس کو نہ اپنا نام یاد تھا نہ اپنا پتہ نہ دھرم۔ میری تصویریں ہندوستان بھر کے اخباروں میں چھپیں اور پاکستان کے اخباروں میں بھی مگر میرے کسی رشتے دار دوست، یا جاننے والے نے میری خبر نہ لی۔ شاید سب کے سب ختم ہوچکے تھے۔ شاید سرے سے میرا کوئی رشتہ دار کوئی دوست، یا کوئی جاننے والا تھا ہی نہیں اور اس عرصے میں زخم اچھے ہونے پر مجھے اسپتال سے نکال دیا گیا۔ میں نے سوچا میرے جیسے مصیبت

کے مارے کے لیے کہیں تو دو روٹیوں کا انتظام ہو ہی جائے گا۔

پھرتا پھراتا جامع مسجد کے پاس ایک کیمپ میں پہنچا۔ میں نے کہا میں مصیبت زدہ ہوں۔ مجھے پناہ دو۔ کیمپ کے مہتمم نے پوچھا "ہندو ہو یا مسلمان؟" میں نے جواب دیا یاد نہیں" واقعہ بھی تھا۔ جھوٹ بولنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ مہتمم نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ "یہ کیمپ صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔" سڑکوں کی خاک چھانتا پرانی دِلّی سے نئی دِلّی پہنچا۔ وہاں ایک بہت بڑا کیمپ نظر آیا۔ دروازے پر میں نے کہا" میں بڑا دکھی ہوں۔ تین وقت سے دانہ پیٹ میں نہیں گیا۔ مجھے پناہ دو۔" پوچھا گیا" ہندو ہو یا مسلمان؟" میں نے پھر سچ جواب دیا" مجھے یاد نہیں۔"

نام.........." نام بھی یاد نہیں۔" میں نے کہا۔ جواب ملا" یہ کیمپ صرف ہندوؤں کے لیے ہے۔" نہ جانے کتنی دیر تک میں دہلی اور نئی دہلی کی خاک چھانتا رہا۔ کتنے ہی کیمپ نظر آئے مگر وہ یا ہندوؤں اور سکھوں کے لیے تھے یا مسلمانوں کے لیے۔ انسانوں کے لیے کوئی نہیں تھا۔

اس رات میں ایک کوٹھی کے سامنے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کوٹھی کسی سردار جی کی تھی، وہ مجھے مصیبت زدہ دیکھ کر اٹھا لائے۔ مجھے دودھ پینے کو دیا۔ جب ہوش آیا تو انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ۔ صرف یہ پوچھا" کیوں بھئی اچھے تو ہو؟"

میں کئی دن وہاں رہا۔ سردار جی، ان کی بیوی اور بچے سب مجھ سے بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ میں نے انھیں بتا دیا کہ میری یاد جاتی رہی ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ" میں کون ہوں؟" پھر بھی انھوں نے میرے ساتھ اچھا ہی سلوک کیا۔ پھر چند روز بعد ان کے کتنے ہی رشتے دار راولپنڈی ضلع سے آگئے۔ ان بیچاروں پر وہاں کے مسلمانوں نے بڑا ظلم کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ہندو پڑوسیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ ان سب کے دل مسلمانوں کے خلاف نفرت اور غصّے سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی یہ واقعات سن کر خود میرا دل مسلمانوں کے نام سے نفرت کرنے لگا۔ سردار جی نے ان کو میری بابت بتا دیا تھا کہ میں بھی مصیبت زدہ ہوں جس کی یاد جاتی رہی ہے۔ ان میں سے کئی بڑے بوڑھوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ مگر چند نوجوان مجھے شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے اور ایک رات میں نے ان میں سے ایک کو کہتے ہوئے سنا، کیا معلوم یہ آدمی بن ہی رہا ہو اور اگر یاد کھونے کا واقعہ سچا بھی ہے

تو کون کہہ سکتا ہے ممکن ہے یہ مسلمان ہی ہو۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں انتقام کی خونی چمک دیکھی، اور میں نے سوچا شاید میں واقعی مسلمان ہی ہوں۔ شاید خود زخمی ہونے سے پہلے میں نے بھی وہ تمام مظالم کیے ہوں جو ان بیچاروں پر ہوئے ہیں۔ شاید میں اسی قابل ہوں کہ مجھ سے انتقام لیا جائے ....اسی رات میں وہاں سے بھاگ گیا۔

پھر کئی دن کے فاقے، سڑکوں کی خاک، یہ کیمپ ہندوؤں کے لیے ہے، یہ کیمپ مسلمانوں کے لیے ہے، تمھارا نام کیا ہے؟ تمھارا دھرم کیا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟......

جب کہیں پناہ نہ ملی اور کمزوری کے مارے چلنا مشکل ہو گیا تو میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا۔ سامنے میدان میں ہزاروں مسلمان پڑے ہوئے تھے جو مشرقی پنجاب سے بھاگ کر آئے تھے۔ دن بھر پڑے رہنے کے بعد مجھے ہوش بھی نہ رہا۔ نہ جانے کب تک یوں ہی پڑا رہا۔ ایک بار ہوش آیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی میرے قریب ہی کھڑا ہو۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایک بچہ تھا مشکل سے آٹھ برس کا ہوگا کہنے لگا ''لو یہ کھا لو، اماں نے بھیجا ہے کہ کسی بھوکے کو کھلا آؤ۔'' بے سہارے میرے لیے بیٹھنا بھی مشکل تھا اس بیچارے نے ہاتھ کا سہارا دیا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اف کتنی مزیدار تھیں وہ روٹیاں اور وہ دال۔

کھانا کھا کر میں نے بچے سے کہا ''جیتے رہو بیٹا'' اور محبت سے اس کے ننھے ہاتھ کو چھوا تو وہ بولا ''ارے تمھیں تو بخار ہے۔ چلو میرے ابا کے پاس چلو وہ حکیم ہیں۔ تمھیں دوا دیں گے۔ تو تم فوراً اچھے ہو جاؤ گے..........''

ہاں تو وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ حکیم جی بیچارے بڑے نیک آدمی تھے پانچ وقت نماز پڑھتے اور کتنے ہی آدمیوں کا ہر روز مفت علاج کرتے۔ دوا اپنے پاس سے بلا قیمت دیتے۔ انھوں نے دو ہی دن میں میرا بخار اتار دیا پر میری کھوئی یاد وہ بھی واپس نہ لا سکے۔ میں نے انھیں اپنا پورا حال بتا دیا تھا۔ ''حکیم جی'' میں نے ایک دن کہا ''ممکن ہے اصل میں میں ہندو ہی ہوں۔ آپ کہیں تو آپ کے گھر سے میں کہیں چلا جاؤں۔

وہ بولے ہندو ہے تو کیا ہوا خدا کا بندہ تو ہے..........

اور پھر ایک دن حکیم جی کا لڑکا جامع مسجد کسی اور بھوکے لاچار کو کھانا کھلانے گیا تو شام تک

واپس نہ آیا۔ رات کو پتہ چلا کہ واپسی میں دریبہ سے ہو کر آ رہا تھا۔ ہندوؤں نے قتل کر ڈالا۔ گھر میں کہرام مچ گیا حکیم جی کی بیوی کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اب میرے لیے اس گھر میں رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ ہر وقت مجھے یہی خیال کھائے جاتا، کون جانے شاید میں ہندو ہوں۔ شاید میں نے بھی حکیم جی کے بچے کی طرح اور مسلمان بچوں کو قتل کیا ہو۔ آخر کار میں وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

اب دہلی میں چاروں طرف قتل عام ہو رہا تھا گولیوں کی بارش ہو رہی تھی بچتا بچاتا اسٹیشن تک پہنچا۔ سنا تھا بمبئی میں کسی قدر امن ہے بمبئی کی ریل میں بیٹھ گیا۔ برابر میں ایک ہندو نوجوان بیٹھا تھا گاڑی چلی تو وہ بولا "تم کون ہو بھائی؟" میں نے کہا کہ مجھے یاد نہیں کون ہوں۔ شاید ہندو ہوں یا شاید مسلمان۔" اس نے کہا "سنا ہے راستے میں مسلمان مسافروں پر بہت ظلم کیا جا رہا ہے۔ تمھارے چہرے پر داڑھی ہے اس لیے پوچھتا ہوں" میں نے اپنا پورا حال بتا دیا پر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا اور وہ میری بڑھی ہوئی داڑھی کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کی بہت بڑی دوکان تھی لاہور میں جو لٹ گئی۔ کتنے ہی رشتہ دار مارے گئے۔ کتنے لاپتہ تھے۔ اب وہ ریلیف کمیٹی سے تھرڈ کلاس کا کرایہ لے کر بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے جا رہا ہے۔ ہاں تو بھرت پور میں لائن کے پاس پتھر رکھ کر گاڑی روک لی گئی۔ درجے سے مسلمان مسافروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا گیا۔ ہمارے درجے میں بھی قاتل گھس آئے، مگر میرے نوجوان ساتھی نے مجھے چادر سے ڈھانک دیا۔ جب انھوں نے پوچھا "یہ کون ہے؟" تو اس نے کہہ دیا یہ تو میرا بھائی ہے بے چارہ، پہلے ہی لاہور میں زخمی ہو چکا ہے، وہ چلے گئے۔ گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ چند چیخیں اور ٹرین پھر روانہ ہو گئی اور میں بمبئی پہنچ گیا۔

یہاں بھی اس جان لیوا سوال نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ ہندو ہو؟ مسلمان ہو؟ اور میں سوچتا ہندو کون ہے؟ مسلمان کون ہے؟ سکھ کون ہے۔ ہندو وہ نوجوان ہے جس نے ایک داڑھی والے کی جان بچائی جس کو وہ مسلمان سمجھتا تھا۔ یا وہ دریبے والے جنھوں نے حکیم جی کے معصوم بچے کو ذبح کر ڈالا۔ مسلمان حکیم جی ہیں یا وہ سب جنھوں نے راولپنڈی میں سردار جی کے رشتے داروں کو قتل اور ان کی عورتوں کو بے عزت کر ڈالا؟ سکھ سردار جی ہیں یا وہ سورما جنھوں نے امرتسر میں

سینکڑوں مسلمانوں کو گھروں میں بھون ڈالا؟ پھر بھی وہی سوال ہندو ہو؟ مسلمان ہو؟

ایک سوال ''تم کون ہو؟ تم ہندو ہو؟ تم مسلمان ہو؟

یہ سوال میرے دماغ میں ہر وقت گونجتے رہتے، میں کون ہوں؟ ہندو ہوں؟ مسلمان ہوں؟ سکھ ہوں؟ میں کون ہوں؟ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہ سوال میرا پیچھا کرتا۔ خواب میں مجھے دہکتے ہوئے انگاروں جیسی آنکھوں والے بھوت گھیر لیتے اور آگ میں تپے ہوئے بھالے مار مار کر پوچھتے تو کون ہے؟ بول تو ہندو ہے یا مسلمان؟ اور میں نیند میں چلا اٹھتا'' مجھے نہیں معلوم میں کون ہوں، مجھے چھوڑ دو، میں کچھ نہیں ہوں میں صرف ایک انسان ہوں۔

بمبئی میں پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے بڑے بڑے کیمپ کھلے تھے۔ سکھ ہو تو خالصہ کالج جاؤ، ہندو ہو تو راما کرشنا آشرم میں پناہ لو، مسلمان ہو تو بھنڈی بازار میں مسلم لیگ کے دفتر کا رخ کرو۔ پر میں کہاں جاؤں؟ میں ہر جگہ سے دھتکار دیا گیا تھا۔ میں، جس کو نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔ بھیک کے ٹکڑے بھی ملنے بند ہو گئے۔ ہندو ہو یا مسلمان، ہر ایک بھیک دینے سے پہلے پوچھتا تھا ''تم کون ہو؟'' فاقوں کی نوبت آ گئی۔ میں بھوکا مرنے لگا۔ ایک آسیبی بگولے کی طرح یہ سوال میرے دماغ پر چھا گیا میں کون ہوں؟ میں کون ہوں، ہندو یا مسلمان؟ مسلمان یا ہندو؟ جب تک اس سال کا جواب نہ ملے جینا ناممکن تھا۔

ایک شریف آدمی نے کہا ''ڈاکٹر سانی کے پاس جاؤ وہی تمہاری یاد واپس لا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سانی کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔ وہ دماغی مرضوں کے علاج کا ماہر ہے۔ وہ چیر پھاڑ سے نہیں، باتوں سے دماغی خرابیوں کا علاج کرتا ہے۔

مجھے ایک شاندار کمرے میں ایک نرم کوچ پر لٹا دیا گیا اور بڑی طاقت کا لیمپ روشن تھا۔ چاروں طرف ہر چیز سفید۔ دیواریں، الماریاں، ڈاکٹر کوٹ، نرس کی یونی فارم۔

ڈاکٹر نے نرمی سے کہا ''آنکھیں بند کر لو۔ دماغ پر زور نہ ڈالو ڈھیلا چھوڑ دو۔ پھر جو کچھ بھی تمہیں یاد آئے وہ بولتے رہو، خواہ کتنا ہی بے معنی اور بے کار خیال کیوں نہ ہو'' یہ کہہ کر وہ کاغذ پنسل لے کر قریب بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں.......... میں نے کہنا شروع کیا۔

''سرسبز لہلہاتے کھیت، دور تک پھیلے ہوئے۔ نیلا آسمان' شاباش شاباش' ڈاکٹر بولا اور کاغذ

پنسل چلنے کی آواز آئی۔ ''بولتے رہو'' اور میں بولتا گیا۔ ''نیلا آسمان۔ ایک دریا۔ برسات میں پانی چڑھا ہوا۔ دریا میں کشتیاں............ ایک نہر............ نہر میں بچے نہاتے ہوئے، ان بچوں میں بھی......'' شاباش! شاباش! ڈاکٹر کی آواز جیسے دور بہت دور سے آئی۔

کھیت میں فصل کٹی ہوئی۔ سنہرے گیہوں کا ایک ڈھیر۔ بہت بڑا ڈھیر۔ آسمان تک............ بیساکھی کا میلہ............ دور کوئی بنسری بجا رہا ہے...... ڈھولک کی آواز قریب ہوتی جارہی ہے۔ نیم کے تلے عورتیں بیٹھی گیت گا رہی ہیں............'''' شاباش! ڈاکٹر بولا'' کون سا گیت گا رہی ہیں؟''

میں نے اسے بتایا: اوجدوں ماہی یاد آوے ہائے ہائے جن وے ہنجو ڈل ڈل پیندے نے۔''

''گیت ہندو عورتیں گاتی ہیں یا مسلمان عورتیں، یا پنجابی عورتیں گاتی ہیں۔ دیکھو وہ سب مل کر اترہ اٹھا رہی ہیں، یہ عورتیں کون ہیں۔ ہندو یا مسلمان؟'''' پنجابی ہندو بھی مسلمان بھی۔''

ڈاکٹر کے بھاری سانس کی آواز آئی۔ جیسے اس جواب سے اس کا بنا بنایا کام بگڑ گیا ہو۔ ''شاباش بولے جاؤ جو کچھ بھی یاد آئے۔''

''ایک بہت بڑا سا باغ، میلہ سا لگا ہوا۔ رنگین شلواریں اور قمیض دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے چنچل لڑکیوں کے قہقہے............ بچوں کا شور''

''شاباش! شاباش! بولے جاؤ۔ خاموش کیوں ہوگئے؟'

''اب کچھ نہیں سنائی دیتا۔ کچھ نہیں دکھائی دیتا۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ میرے کانوں میں ایک عجیب سا شور، ''شاباش! شاباش'' آگ لگ رہی ہے۔ ہر طرف شعلے ہی شعلے۔ شور بڑھتا جارہا ہے۔ ''شاباش'' یہ فسادیوں کا شور ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے ظلم نے تمھارے گھر بار کو تباہ کر ڈالا تمھارے عزیز رشتہ داروں کا خون کر ڈالا۔ تمھارے دماغ کے توازن کو ہلا ڈالا۔ سنو! غور سے سنو! یہ کیا کہہ رہے ہیں............؟ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ شور بہت ہے۔ بس ایک لفظ سمجھ میں آتا ہے مارو! مارو!! مارو!!! مجھے بچاؤ ڈاکٹر صاحب۔''

گھبراؤ نہیں۔ پھر غور سے سنو۔ یہ لوگ جو آگ لگا رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں یہ ہندو ہیں یا مسلمان؟ ابھی پتہ لگ جاتا ہے تم کون ہو۔''

اور میرے دماغ میں جیسے خطرے کی گھنٹی بجی۔ ابھی معلوم ہو جائے گا میں کون ہوں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا میں کون ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ میں نے سردار جی کے گھر والوں کا ہزاروں بے گناہ سکھوں اور ہندوؤں کا خون کیا ہے۔''

''میں ہندو ہوں۔ میں نے حکیم جی کے بچے اور سینکڑوں معصوم مسلمان بچوں کو قتل کیا ہے۔''

''نہیں نہیں'' میں چلایا۔'' میں نہیں معلوم کرنا چاہتا میں کون ہوں'' میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر کی نرم آواز کے جادو کو توڑ ڈالا۔ میں کوچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ڈاکٹر کو حیران و پریشان چھوڑ کر چلا آیا۔

''میں ہندو ہوں۔ میں مسلمان ہوں، میں مسلمان ہوں، میں ہندو ہوں۔ میں کیا ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں میں ہندو ہوں۔

راستے بھر میرے کانوں میں آوازیں آتی رہیں۔

نہ جانے میں کس راستے، کس علاقے سے ہو کر چلا جا رہا تھا کہ کسی نے ٹوکا۔''اے کدھر جاتا ہے؟ کون ہے تو۔'' وہ ایک مسلمان سوالی تھا اس کی آنکھوں میں خون، اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ میں نے اس کا سوال سنا مگر سمجھا نہیں۔ اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر پھر اپنے راستے چل پڑا۔ میں اپنی وہی بک بک بڑبڑائے جا رہا تھا'' میں ہندو ہوں۔ میں؟......''

ابھی میں، میں مسلمان ہوں' نہ کہہ پایا تھا کہ اس کا چھرا میری کمر میں پیوست ہو گیا۔ یہی گھاؤ جو آپ دیکھ رہے ہیں، کافر کا بچہ' میں چکرایا مگر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ چلتا ہی رہا۔ گو میرے پیچھے خون کی ایک گہری لکیر سڑک پر پڑتی ہی جا رہی تھی۔ تمھیں یقین نہیں آتا؟ میں مر رہا ہوں مجھے تم سے سچائی کا سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے۔

ہاں تو میں گرتا پڑتا کسی اور سڑک پر نکل گیا۔ اس بار ایک ہندو غنڈے نے مجھے روکا۔ ''اے کون ہے؟'' میں مسلمان ہوں میں ہند—— اور ابھی ہندو نہ کہہ پایا تھا کہ اس کی تیز دھار والی کھوکھری نے میرا پیٹ چاک کر ڈالا۔

تو یوں یہ دونوں گھاؤ کھائے ہیں میں نے۔ مجھے ہندو مسلمان دونوں نے مارا ہے جبھی تو میں کہتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ تم مجھے نہیں بچا سکتے اور نہ تم سب بچا سکتے ہو۔ تم جو میرے مرنے کی راہ دیکھ رہے ہو اور سچی بات یہ ہے کہ تم لوگ مجھے بچانا چاہتے ہی نہیں۔ اگر میں مرتے مرتے کہہ دوں کہ میں ہندو ہوں تو یہ ہندو ویر فوراً میرے بدلے چار مسلمانوں کو قتل کرنے کا بیڑہ اٹھا لیں گے اور اگر کہوں کہ میں مسلمان ہوں تو یہ مسلمان مجاہد پوری ہندو قوم سے میرا انتقام لینے کو تیار ہیں۔ اور میں ہنس رہا ہوں کیونکہ مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں کون ہوں۔ اپنی بیوی کی آنکھیں اپنے بچے کی باتیں۔ اپنا کھیت، اپنا گھربار جو جل چکا ہے مجھے سب یاد آ گیا ہے۔ اب جب میں مر رہا ہوں۔ تم سب بے کار انتظار کر رہے ہو۔ میری زبان سے ہرگز نہ نکلے گا کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان۔ نہ میرے ہندو قاتل کو معلوم ہوگا نہ مسلمان قاتل کو کہ ان میں سے کس نے غلطی سے اپنی ہی قوم کے آدمی کو مار ڈالا۔ ان سے بھی میرا انتقام ہے۔ ان سے ہی نہیں ان جیسے ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سے جنھوں نے میرے وطن پنجاب کو ملیامیٹ کر ڈالا۔ میری بوڑھی مادرِ وطن کے سفید بالوں میں خون کی مہندی مَل دی۔ میں ہندو تھا، یا مسلمان، مسلمان تھا یا ہندو؟ یہ سوال ایک بھوت بن کر ان کے دماغوں پر منڈلاتا رہے گا۔ یہ سوال ان کے دن کا آرام، راتوں کی نیند اڑا دے گا۔ یہ سوال ان کو ان کی اولاد کو، ان کی آنے والی نسلوں کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ میرا انتقام بہت خوفناک ہوگا........... جاؤ بھائی جاؤ اپنا کام کرو۔ میرے مرنے کا انتظار کب تک کرو گے۔ میں تو دیر کا مر چکا ہوں۔ یقین نہیں آتا تو سامنے والے ڈاکٹر کو بلا کر معائنہ کرا لو۔ اب تو میری لاش بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے یہ اور بات ہے کہ میں کبھی نہیں مروں گا۔

''اب بھی جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟''

کہتے ہیں جس کو عشق

پانچواں افسانوی مجموعہ جو پروین بک ڈپو الہ آباد سے پہلی بار 1953 میں شائع ہوا

ان سب کے نام

جو شکایت کرتے ہیں کہ ترقی پسند افسانہ نگار ہمیشہ بھوک، بیکاری، بیماری کا رونا
کیوں روتے رہتے ہیں، محبت کی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے

کہتے ہیں جس کو عشق ہے...

(1)

کئی دوستوں کی زبانی یہ شکایت سننے میں آئی کہ ترقی پسند مصنفین کی کہانیوں میں عشق ومحبت کا عنصر بہت کم ہو گیا ہے، جو کہانی پڑھو وہ خون، پسینے، شراب، قے اور پیپ سے لت پت نظر آتی ہے، ہر طرف سے اگر آہیں اور کراہیں نہیں تو انقلابی نعرے ضرور سنائی دیتے ہیں اور تو اور کرشن چندر کو بھی ''پورے چاند کی رات'' میں کسی دلکش رومانی منظر کی بجائے ''مہالکشمی کا پل'' ہی نظر آتا ہے۔ عصمت کا ریشمی ''لحاف'' ''کیڈل کورٹ'' کے نیچے بیٹھے ہوئے موچی کی گندی گدڑی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور مہندر ناتھ نے بھی ''زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں'' والے فلسفے سے توبہ کر لی ہے، اگر یہی حال رہا تو کوئی تعجب نہیں کہ قرۃ العین حیدر اپنے سجے ہوئے ڈرائنگ روم کے اطالوی دریچے سے باہر کود کر ان غیر رومانی مہاجرین کے بارے میں کہانی لکھ ڈالیں، جن کی گندی، غلیظ کوٹھریاں ان کی کوٹھی سے دور نہ ہوں گی اور عزیز احمد لندن، اور پیرس کی رنگین راتوں کو بھلا کر کراچی کے اُن مزدوروں، تانگے والوں، پھیری والوں اور گورنمنٹ کے ادنیٰ ملازمین کی طرف متوجہ ہو جائیں جن کے دن راتوں سے بھی زیادہ تاریک ہیں شفیق الرحمٰن کی رومانی ''کرنیں'' گرلز کالج کے حسین افسانوی ماحول سے ہٹ کر ان استانیوں کی زندگی کو اُجاگر

کردیں جو رہنمایانِ قوم کے بلند بانگ ارشادات کی تعمیل میں اپنی جوانی اپنی آرزوئیں اور اُمنگیں بیس تیس روپے ماہوار کے عوض بیچ کر تعلیم نسواں کا قومی نصب العین پورا کر رہی ہیں۔ کون جانتا ہے عسکری صاحب بھی ژاں پال سارتر کے گورکھ دھندے سے نکل کر سندھ کے اُجڈ اور قطعی غیر رومانی کسانوں کی اقتصادی کشمکش کے بارے میں کہانیاں لکھنے لگیں۔ اگر ایک بار ادب کے ہاتھ سے رومان کا دامن چھوٹ گیا تو امکانات خطرناک ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہیں۔

اگر چہ میں خود "ترقی پسند ادیب" کہلانے کا کسی طرح اہل بھی نہیں ہوں (کیونکہ ترقی پسند مجھے رجعت پسند اور عوام دشمن گردانتے ہیں اور ادیب مجھے صحافی محض سمجھتے ہیں) پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ یہ شکایت مجھ پر بھی عاید ہوتی ہے۔ میں بھی رومان سے پہلو تہی کرنے کا مجرم ہوں۔ میری کہانیوں میں "ڈھونڈے سے بھی دور دور کوئی عاشق و معشوق نظر نہیں آتے۔ صرف ایک بار رومانی "چڑھاؤ" قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی مگر غیر رومانی "اُتار" نے پڑھنے والوں کا سب مزا کرکرا کر دیا اور تو اور کشمیر کی حسن خیز اور عشق پرور وادی میں بھی مجھے "زعفران کے پھول" سُرخ ہی نظر آئے...... گاندھی جی، استالن گراڈ، ایک بوڑھے سردار جی، پانچ جڑواں بچوں کی ماں۔ ایسے بے ہنگم موضوعات میں تو رومانیت کی بو باس بھی نہیں مل سکتی۔" بھارت ماتا کے پانچ روپ" بھی مجھے نظر آئے تو پانچ نہایت غیر رومانی بوڑھی عورتوں میں!

تو کیا ادیبوں کی موجودہ نسل عشق و محبت سے بالکل بے بہرہ ہے؟ کیا ہم لوگوں نے کبھی محبت نہیں کی یا دوسروں کو محبت کرتے نہیں دیکھا؟ ورنہ بات کیا ہے کہ شاذ و نادر ہی کسی افسانے میں پائل کی جھنکار،، کوئل کی پکار، ناکام عاشق کی آہیں اور محبوبہ کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں؟ میں نے اس مسئلے پر کافی غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ترقی پسند ادیب صرف سُستی کی وجہ سے عشقیہ افسانوں سے کترا رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ مزدوروں کی ہڑتالوں اور کسانوں کے مورچوں، پولس کی گولی باری کے بارے میں اخباروں میں جو رپورٹیں چھپتی رہتی ہیں انھیں پڑھ کر اور چند اشتراکی نعروں کا فارمولا لگا کر افسانہ لکھ دینا تو آسان ہے مگر تخیل پر زور ڈال کر کوئی داستانِ محبت تخلیق کرنا، ٹیڑھی کھیر ہے بقول شاعر "مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ"

یہ سوچ کر میں نے طے کیا کہ چاہے جتنی بھی محنت کرنی پڑے کم سے کم ایک عشقیہ افسانہ ضرور لکھوں گا تا کہ اور کچھ نہیں تو ''سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔''

(2)

تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے اور اس طرح عشق اور عشقیہ افسانے دونوں کے لیے، ایک عاشق اور معشوق کی ضرورت ہوتی ہے۔ معشوق کا حسین ہونا ضروری ہے اور عاشق کا شاعر ہونا......

اس لیے عشقیہ افسانہ لکھنے سے پہلے میں نے اپنے ہیرو اور ہیروئین کو تخلیق کیا۔ ہیروئین کے سڈول جسم کو دنیا کی سب سے نرم مٹی سے بنایا۔ اس کی آنکھوں کو بنگال کا جادو بخشا، رنگت کشمیر سے لی اور اعضا کا تناسب مہاراشٹر سے۔ اس کو پنجاب کی صحت بخشی اور اس کے بدن میں بمبئی کی مچھلی والیوں جیسا لوچ دیا۔ بالوں کو گھونگر والا بنایا۔ ابروؤں میں کمان جیسا خم دیا۔ ہونٹوں میں مٹھاس بھری اور گال پر ایک دلآویز تل بنایا۔ آنکھوں میں مستی، سینے پر جوانی کا اُبھار اور چال میں والہانہ پن۔ اور اس مجسمۂ حسن کو آشا کا شاعرانہ نام دے کر میں نے ادبی تخلیق کے اعجاز سے اپنی ہیروئین میں جان ڈالی اور اس کے کان میں لیلیٰ مجنوں، جولیٹ، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور دیوداس، پاروتی کے رومانوں کے گیت گنگنائے۔

آشا کے عاشق کا کردار ادا کرنے کے لیے میں نے ایک نوجوان نرمل کمار کو تخلیق کیا اس کے بدن کو میں نے مضبوطی اور توانائی بخشی کسی حسینہ کو اٹھا لینے اور اپنے چوڑے چکلے سینے سے لگا لینے کے لیے اس کے بازوؤں میں طاقت دی، اس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھ دیا اور اس کے دماغ کو امنگوں اور آرزوؤں سے بھرپور کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بانسری دی اور بانسری کو نغموں سے معمور کر دیا۔

آشا اور نرمل

نرمل اور آشا

دنیا کے تاریخی پریمیوں کے جوڑوں میں یہ جوڑا میرے دماغ کی تخلیق تھا۔ میں نے سوچا، میں ان دو پریمیوں کے دل کی دھڑکن کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر ان کی کہانی کو امر کر دوں گا۔ جس

طرح لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کا نام آج تک لیا جاتا ہے اس طرح میرے نرمل اور آشا کا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہے گا اور یہ سوچ کر میں نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لیے تخیل کی دنیا میں آزاد چھوڑ دیا۔

(3)

پورے چاند کی رات میں میں نے ان دونوں کی ملاقات کرائی۔ پورے چاند کی رات ...... جب چاندنی ہر حساس دل میں سوئی ہوئی محبت کو گدگدا کر بیدار کرتی ہے، شباب کے چہرے پر نور کا غازہ ملتی ہے۔ حسن کو خود بیں اور خود آرا اور عشق کو متوالا اور مدہوش بنا دیتی ہے اس وقت ماحول میں شعریت گھلی ہوتی ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں پر چاندنی کی لطیف چادر ڈھک جاتی ہے اور ہر طرف محبت کے نغمے گونجتے سنائی دیتے ہیں۔

اور اس رات کو جب میرے نرمل کی بانسری کی تان فضا میں گونجی اور آشا اس کے جادو بھرے ان دیکھے تاروں سے کھنچی ہوئی اپنے گھر سے باہر نکل آئی تو مجھے ایسا لگا کہ میرے فن کا تخلیقی مقصد پورا ہو چکا ہے اب کہانی یہ دونوں خود لکھیں گے۔ اب آشا نرمل سے پوچھے گی...... ''مسافر تمھاری بانسری کسے آواز دے رہی ہے؟'' اور نرمل جواب دے گا۔ ''تمھیں سندری اور کسے؟'' اور اس تمہید کے بعد اقرار محبت ہوگا، عہد و پیمان باندھے جائیں گے ہجر و وصال کے تذکرے چھڑیں گے اور جیسے جیسے پورے چاند کی رات ڈھلتی جائے گی ان دونوں کی لازوال محبت جوان ہوتی جائے گی۔

مگر آشا نے کہا'' ارے او! یہ کیا بے وقت کی راگنی چھیڑی ہے تو نے؟ سونے بھی دے گا یا رات بھر بانسری ہی بجاتا رہے گا؟''

اور نرمل نے جواب دیا'' چل، چل بڑی مہارانی آئی کہیں کی۔ دیکھتی نہیں کہ پریکٹس کر رہا ہوں۔''

''پراکٹیس؟'' آشا نے انگریزی کا منہ چڑاتے ہوئے کہا'' وہ کیا بلا ہے؟''

'اری مشق کر رہا ہوں بانسری بجانے کی۔ نہیں تو بینڈ میں کیسے کام ملے گا۔''

بینڈ کا نام سن کر آشا کی دلچسپی جاگ اٹھی۔'' تم بینڈ بجاتے ہو سچ مچ؟''

''بینڈ نہیں بجاتا۔ بینڈ میں بانسری بجاتا ہوں''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ پیسے ملتے ہیں۔ سوا روپیہ روز''

''ڈھول کیوں نہیں بجاتے؟''

ڈھول بجانے والے کو دو روپے روز ملتے ہیں اس لیے ڈھول بینڈ ماسٹر کا سالا بجاتا ہے۔

مجھے غصہ آ رہا تھا کہ چاندنی رات بیکار ڈھلتی جارہی ہے اور یہ لوگ محبت بھری باتیں کرنے کے بجائے آنے پیسوں کا حساب لگا رہے ہیں۔ میں نے موسیقی کے جادو سے رومانی ماحول پیدا کرنے کے لیے ایک بار پھر بانسری نرل کے ہونٹوں سے لگادی اور ایک نئی فلمی دھن فضا میں گونج اُٹھی۔

آشا بولی'' مجھے یہ بانسری کی ریں ریں بالکل نہیں بھاتی۔''

پھر کون سا باجا اچھا لگتا ہے؟ ہارمونیم؟''

''اونہوں''

''پھر کیا؟ سارنگی؟ ستار؟''

''اوں ہوں۔ مجھے تو گراموفون اچھا لگتا ہے۔ جیسا ہمارے برابر کے پڑوسی تھانیدار کے گھر میں ہے۔ جیسا ریکارڈ جی چاہا چڑھالیا۔''

''یہ نیا تھانیدار کیسا آدمی ہے؟''

''اچھا ہے بیچارہ جب مانگو ہمیں اپنا گراموفون بجانے کو دے دیتا ہے۔ اس کے پاس ریڈیو بھی تو ہے۔''

''پر تھانیدار کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔ تنخواہ تو سو، سوا سو ہی ملتی ہوگی۔''

''پر بھگوان اوپر کی آمدنی بھی تو دیتا ہے..... تمھارے بینڈ میں اوپر کی آمدنی نہیں ہوتی؟''

''ہوتی ہے جب کبھی کسی کی شادی میں جاتے ہیں تو کبھی کبھی ہر ایک کو چونی اٹھنّی انعام کی مل جاتی ہے۔..... تمھاری شادی ہو چکی ہے؟''

آشا نے جواب نہیں دیا، شرما کر سر جھکالیا۔ مگر اس پر چاندنی کا جادو کام کر رہا تھا اور اس کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''نہیں ہوئی؟ تو اچھی بات ہے''

آشا نے سر اٹھا کر شرارت سے نرمل کی طرف آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں اچھا کیا ہے اس میں؟''

اور میں نے سوچا ''اب اچھا موقع ہے نرمل کو اپنی محبت کا اظہار کرنے کا۔''

مگر اس نے جواب دیا ''اس لیے کہ جب تیری شادی ہوگی اور بارات میں ہمارا بینڈ آئے گا تو تیرا دولھا مجھے انعام دے گا۔ اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟''

''چل ہٹ'' آشا نے کہا اور بھاگ کر اپنے گھر لوٹ آئی۔

جب نرمل نے اپنے دوستوں سے آشا کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا ''ابے دماغ خراب ہوا ہے''۔ اس لونڈیا کے باپ کو بھی دیکھا ہے چاول کے بلیک مارکیٹ میں ہزاروں کما رہا ہے وہ بھلا بینڈ والے سے کیوں آشا کی شادی کرنے لگا؟''

''پھر ذات پات کا فرق بھی تو ہے...... تم ٹھہرے راجپوت، اور وہ ہے بنیا وہ بھی جینی۔''

''اور ہم سے پوچھو تو بڈھا لونڈیا کی بات کب کی پکی کر چکا ہے۔ میں نے تو سنا ہے اگلے مہینے شادی بھی ہونے والی ہے۔''

''کس کے ساتھ۔''

یہ نیا تھانیدار جو آیا ہے۔

''پر وہ تو رنڈوا ہے اور بالوں میں خضاب لگاتا ہے۔''

''اس سے کیا تھانیدار تو ہے۔''

نرمل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بانسری منہ سے لگا کر ''جیا بے قرار ہے آئی بہار ہے'' کی لے بجانے لگا۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کی طرح میری پریم کہانی کا اختتام بھی ٹریجڈی پر ہوگا۔

اور اگلے مہینے جب تھانیدار اپنے بالوں اور مونچھوں میں خوب خضاب لگا کر دولھا بنا اور گھوڑے پر چڑھ کر بارات ساتھ لے کر چلا تو آگے آگے بینڈ ''چل چل رے نوجوان'' کی دھن بجا رہا تھا اور نرمل حسبِ معمول بانسری بجانے میں مشغول تھا۔ اس کے چہرے پر یاس کے بادل

چھائے ہوئے تھے اور وہ اپنے خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ "چل چل رے نوجوان" سے بھٹک کر اس کی بانسری سے "آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اُجڑ کے رہ گیا" کی لے نکلنے لگی۔
جب جھانجن بجانے والے نے اسے ٹوکا اور پوچھا 'ارے نرل تجھے کیا ہو گیا ہے آج؟" تو وہ بولا "میں بڑا پریشان ہوں یار۔ ماں بیمار ہے اور ڈاکٹر نے نسخہ لکھ دیا ہے مہنگا۔ دوا آتی ہے پونے دو کی اور شام کو ملے گا صرف سوا روپیہ یہی سوچ رہا تھا کہ باقی آٹھ آنے کہاں سے آئیں گے۔"

پر مجھے یقین تھا کہ یہ بات صرف ٹالنے کے لیے نرل کہہ رہا ہے ورنہ دراصل اس کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ آشا کے بیاہ کی وجہ سے اور جب بینڈ ماسٹر نے دھن بدلی تو میں نے سوچا واہ واہ کیا کلاسیکی ٹریجڈی ہے کہ معشوقہ کی برات جا رہی ہے اور عاشق اسی برات میں 'جھوم جھوم کے ناچو آج، گاؤ خوشی کے گیت، کی دھن بانسری پر بجا رہا ہے۔

پھیروں کے وقت جب آشا سرخ ریشمی ساڑی میں لپٹی، زیوروں سے لدی پھندی، منڈپ کے بیچ میں آگ کے پاس لا کر بٹھائی گئی تو مجھ یقین تھا کہ وہ نرل کی ناکام محبت کو یاد کر کے رو رہی ہوگی۔ کون جانتا ہے، زہر کھانے والی ہوگی۔ گھونگھٹ کی وجہ سے چہرہ تو دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر اس کے مہندی لگے پیروں پر جب چند قطرے گرے تو اس کے سوا کیا سوچا جا سکتا تھا کہ یہ ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے ہیں جو آنسوؤں کی شکل میں ٹپک رہے ہیں، پر جب اس کی سہیلی نے مذاق کرتے ہوئے گھونگھٹ اٹھایا تو دیکھا کہ کپڑوں اور زیوروں کی گرمی کی وجہ سے آشا کو سخت پسینہ آ رہا ہے اور یہ پسینے کے قطرے تھے جو اس کے ماتھے اور گالوں پر سے ٹپک رہے تھے اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی سہیلی کے کان میں کہا "اری میری یہ انگوٹھی تو دیکھ اصلی ہیرا ہے اصلی۔"

عورتیں تو ہمیشہ کی بے وفا ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا، اس آشا کو دیکھو۔ وہاں وہ نرل اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھالے، خون کے آنسو رو رہا ہے اور یہ کمبخت ادھر ہیرے کی انگوٹھی پا کر پھولی نہیں سما رہی ہے اور یہ نہیں سمجھتی کہ اسے چند سکوں کے عوض ایک بوڑھے بدصورت آدمی کے ہاتھ بیچ دیا گیا ہے۔

پر جب باہر جا کر دیکھا کہ دوسرے بینڈ والوں کے ساتھ نرل بھی اطمینان سے بیٹھا لڈو

کھا رہا ہے۔ وہی لڈو جو آشا اور تھانے دار کی شادی کی خوشی میں تقسیم ہو رہے تھے اور جن کی مٹھاس میں نرمل کی محبت کے لیے زہر ہی زہر بھرا تھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہنس کر کہہ رہا تھا ''یار لڈو اچھے ہیں'' پھر میں نے سوچا شاید یہ زہر خند ہے'' دل رو رہا ہے، لب مسکرا رہے ہیں۔'' اس قسم کا کلاسیکی المیہ منظر۔ مگر اگلے لمحے تھانیدار پھیروں سے فارغ ہو کر اپنی خضاب شدہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا باہر آیا اور بینڈ والوں کو آٹھ آٹھ آنے تقسیم کرنے لگا۔ جب نرمل کی باری آئی تو مجھے امید تھی کہ وہ ہرگز اپنے رقیب روسیاہ کے ہاتھوں سے یہ بھیک قبول نہ کرے گا ممکن ہے کہ پیسے منہ پر پھینک کر دے مارے۔ ممکن ہے کہ ایک شاعرانہ طنز بھرے جملے کے ساتھ واپس کر دے۔ مثلاً ''جہاں آپ دنیا کی اتنی بڑی دولت سمیٹے لیے جا رہے ہیں وہاں یہ آٹھ آنے بھی آپ ہی رکھیے۔'' مگر مشکل سے ایک سیکنڈ کی خفیف سی ہچکچاہٹ کے بعد نرمل نے تھانیدار کے ہاتھ سے چمکتی ہوئی اٹھنی لے لی اور سلام کرتے ہوئے کہا۔ ''بھگوان آپ کا سہاگ قائم رکھے، تھانیدار صاحب'' اور جب وہ چلا گیا تو اپنے ایک دوست سے مخاطب ہو کر بولا ''چلو بھئی اب ماں کے لیے بازار سے دوا تو آ جائے گی۔''

میں نے سوچا۔ ''لعنت ہو ان گھٹیا پریمیوں پر۔ یہ تو رومیو جولیٹ اور مہیوال کی روایات پر چلنا تو الگ، دیوداس اور پاروتی کے نقش قدم پر بھی نہ چل سکے'' اور اس لمحے میں نے اپنی تخئیل کی تلوار سے ان دونوں کو ختم کر دیا اور ایک نئے نرمل اور نئی آشا کو جنم دیا۔

(4)

اس بار میں نے نرمل اور آشا کو بنگال میں جنم دیا۔ سنہرا بنگال۔ ٹیگور کا وطن، تمدن، آرٹ اور ادب کا گہوارہ جہاں شاعری بچوں کو گھٹی میں ملی ہے، جہاں دھان کے سرسبز کھیتوں میں، چوڑے چکلے دریاؤں کے کنارے اور تاڑ کے جھنڈوں میں رومان پلتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ ایک پریم کہانی کے لیے اس سے زیادہ موزوں ماحول بھلا اور کہاں ہو سکتا ہے؟

نرمل اور آشا ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گاؤں کی گلیوں میں، ساتھ ساتھ کھیل کود کر

بڑے ہوئے۔ گاؤں کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ مل کر زمیندار کے باغ میں وہ کچے پکے آم توڑتے، پھر کائی اور کنول کے پھولوں سے ڈھکے تالاب میں انھیں دھوتے اور مزے لے لے کر کھاتے۔ کبھی کبھی نرمل آشا کے ہاتھ سے آدھا چُسا ہوا آم چھین کر خود چوسنے لگتا اور پھر اُسے آم کی کھٹاس میں بھی ایک عجیب مزا آتا۔ جیسے آشا کی ساری مٹھاس ہونٹوں کے ذریعے آم کے رس میں گھل گئی ہو اور وہ شرارت بھری کن انکھیوں سے آشا کی طرف دیکھ کر کہتا ''آشو آم بہت میٹھا ہے۔''

اور آشا جھینپ کر ایک کچی امبی نرمل کی طرف پھینک کر کہتی ''جاہ ڈھشو کو تھا کار'' (چل ہٹ شریر کہیں کا)

مگر نرمل آشا کی شرمیلی نگاہوں میں محبت کا پیغام پالیتا ہے۔

بڑی احتیاط سے میں نے اس معصوم محبت کو سینچا، پروان چڑھایا، جوان کیا۔ اس بار میں نے اُن کو ایک ہی ذات کے گھرانوں میں پیدا کیا تھا۔ گوت بھی الگ الگ تھی تاکہ ان کی محبت کو شادی کی منزل تک پہنچنے میں کوئی سماجی رکاوٹیں حائل نہ ہوں۔ آشا کے ماں باپ نرمل کو پسند کرتے تھے اور نرمل کے ماں باپ آشا کو۔ بیاہ کی بات چل ہی رہی تھی کہ......

بارش کی کمی کی وجہ سے فصلیں جل گئیں۔ رہا سہا اناج چور بازاری سے سیٹھوں کے گوداموں میں پہنچ گیا۔ کسانوں کے گہنے پاتے، برتن بھانڈے، یہاں تک کہ زمینیں بھی مہاجن کے ہاتھوں گروی ہو گئیں۔ جب کھانے کو دھان نہ رہے تو پتوں، گھاس اور جڑوں پر گزارا کرنے لگے۔ جب ہر قسم کی سبزی سوکھ گئی تو سب نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے سوچا مصیبت ہی میں محبت معراج کمال کو پہنچتی ہے۔ اس آڑے وقت میں نرمل اور آشا کی محبت ہی ان کو سہارا دے گی۔ بھوک میں، پیاس میں، غریب الوطنی میں وہ جہاں اور جس حال میں ہوں گے، محبت کا چراغ اُن کی زندگی کو منور رکھے گا۔

مگر جب سے کال پڑا، نرمل اور آشا اور ان کے گھر والوں کے میل جول میں وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ اوّل تو دن بھر نرمل بیچارہ اپنے گھر والوں کے لیے گھاس اور پتے اور جنگلی بیر تلاش کرنے نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرتا۔ شام کو جب گھر آتا تو بھوک اور تھکن سے اتنا نڈھال کہ

بس لیٹتے ہی سو جاتا۔ مگر نیند بھی ٹھیک طرح سے نہ آتی۔ بھوکے پیٹ میں آنتوں کا کھنچاؤ سونے نہ دیتا۔ پھر بھی کمزوری کے باعث نیم مدہوشی سی طاری رہتی۔ عجیب عجیب خواب نظر آتے۔ خواب پہلے بھی آتے تھے۔ آشا کے خواب۔ مگر اب اس کے سپنوں میں گرم گرم بھات کے پہاڑ نظر آتے، دودھ کے دریا اور رس گلّوں کے مینار، آشا نظر نہ آتی۔

اُن دنوں وہ دونوں اکیلے مل جاتے تو کوئی ڈھنگ کی بات نہ کر پاتے۔

''کہو آشا کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں۔''

''کیا کھاتے ہیں تمھارے گھر والے آج کل؟''

''جو بھی مل جاتا ہے۔''

''سنا تم نے۔ سب شہر جانے کی بات کر رہے ہیں۔''

''ہاں اور کیا ہو سکتا ہے؟''

ایک بار نرمل کی تھکی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ایک پرانی چمک جاگ اٹھی اور اُس نے آشا سے کہا ''شہر ساتھ ہی چلنا۔ تم تھک جاؤ گی تو میں کمر پر چڑھا لوں گا۔''

اور آشا نے جواب میں وہی پرانا فقرہ دہرایا: ''جاہ۔ ڈشٹو۔ کوتھا کار۔''

مگر اس بار ان الفاظ میں کوئی محبت کا پیغام نہیں تھا۔ صرف ایک عجیب تھکی ہوئی بے نیازی تھی جیسے اب اُسے اتنا سوچنے کی نہ طاقت تھی، نہ پرواہ کہ وہ کب اور کہاں جائے گی اور کس کے ساتھ۔

اور اگلے لمحے نرمل کی تھکی آنکھوں میں بھی وہ پرانی چمک سو گئی اور اُس کے پیٹ کی چبھتی ہوئی بھوک پھر جاگ اُٹھی۔

بھوک کا کارواں چل پڑا، شہر کی طرف۔

گاؤں چھوڑنے کے تیسرے دن ہی نرمل کی ماں چل بسی۔ باپ بوڑھا اور بیمار تھا۔ وہ دوسرے گاؤں والوں سے پیچھے رہ گیا اور اس کے ساتھ نرمل بھی۔ کئی میل تک نرمل باپ کو پیٹھ پر لاد کر چلا۔ مگر ایک رات کو جب انھوں نے پڑاؤ کیا اور سونے کے لیے لیٹے تو نرمل کے بھوکے پیٹ میں عجیب عجیب ڈراؤنے خیالات اُٹھ کر اُس کے دماغ میں آنے لگے۔ ''باپ بیمار ہے''

اس نے سوچا۔ '' آج نہیں تو کل یہ ضرور مر جائے گا۔ میں اسے کہاں کہاں لادے پھروں گا۔ اس کی وجہ سے میں قافلے سے بچھڑ گیا تو میری موت بھی یقینی ہے۔ جیسے ہی یہ سو جائے گا میں یہاں سے چل دوں گا۔ قافلے والوں سے جا ملوں گا۔ نہ جانے آشا کس حال میں ہے۔ شاید اُسی کے باپ کے پاس دھان کے چند دانے ہوں۔ دھان، بھات، بھوک...... باپ...... دھان...... بھات...... ''

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا باپ مرا پڑا ہے۔ آنکھیں اب تک کھلی ہیں۔ جیسے حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں اور اب وہ مردہ آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں پر نرمل کو ایسا لگا جیسے وہ اُسے گھور رہی ہوں۔ تعجب اور حیرت اور غصے اور نفرت سے اور وہ وہاں سے چل پڑا۔ جتنا تیز بھی اُس کا بھوکا جسم گھسٹ سکتا تھا۔ اور اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ خوف اور کمزوری سے اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

قافلے والوں تک پہنچنے میں اُسے دو دن لگے۔ اس عرصہ میں وہ مجسم بھوک بن کر رہ گیا تھا۔ ساری زمین اس کے تخیل میں ایک عظیم الشان گول روٹی بن گئی تھی۔ کمزوری اب اتنی ہو گئی تھی کہ وہ گھسٹ گھسٹ کر ہی چل سکتا تھا۔ تیسرے دن سامنے سڑک کے اگلے موڑ پر جب قافلہ جاتا نظر آ رہا تھا، نرمل نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان لڑکی کو مٹی اور ریت میں لت پت پڑے ہوئے دیکھا۔ وہ یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ شاید یہ لڑکی مر چکی ہو یا کم سے کم بے ہوش ہو اور اس کی پھٹی ہوئی ساڑی کے پلو میں اب تک چند دانے چاول کے بندھے ہوئے ہوں......

لڑکی شاید مری نہیں تھی کیونکہ اُس کے سپاٹ سینے میں اب بھی کبھی کبھی سانسوں کی ہلکی سی موج اٹھتی تھی۔ اتنی ہلکی جیسے کسی تالاب کی پر سکون سطح پر ہوا کے جھونکے سے ایک خفیف سی لہر پڑ جائے۔ لڑکی کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی مٹھیاں زور سے بھنچی ہوئی تھیں۔ جیسے تشنج کا دورہ پڑا ہو۔ نرمل نے جلدی جلدی ساڑی کے پلوؤں کا جائزہ لیا۔ کھانے کی کوئی چیز کہیں بندھی ہوئی نہ ملی۔ پھر ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید آس پاس کچھ پڑا ہوا ہو۔ مگر وہاں سوائے سڑک کے کنارے کی دھول کے اور کچھ نہیں تھا۔ مہین ریتلی دھول جو اس لڑکی کے الجھے ہوئے بالوں میں اٹی ہوئی تھی، جس کا غازہ اُس کے پیلے سوکھے ہوئے پچکے ہوئے گالوں پر لگا ہوا تھا۔

'' ہونہہ، مرنے دو، اسے اور چلو۔ '' نرمل نے سوچا اور اس کے بھوکے پیٹ کی انتڑیوں نے یاد

دلایا کہ اُسے فوراً کہیں نہ کہیں کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنی چاہیے۔ چاہے وہ کسی درخت کے پتے ہی کیوں نہ ہوں۔ گھاس ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی مرا ہوا پرندہ ہی کیوں نہ ہو؟ مگر جاتے جاتے اُس نے گھوم کر ایک نظر پھر اُس بے ہوش لڑکی پر ڈالی۔ نہ جانے کیوں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس نے اس لڑکی کو پہلے کہیں دیکھا ہو مگر کہاں؟ اسے تو اس وقت یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس سے پہلے اُس نے کسی لڑکی کو بھی کہیں دیکھا ہے...... پھر اُس کے دماغ کے پردے پر ایک دھندلی سی تصویر کیوں اُبھر رہی تھی؟ اتنی دھندلی کہ وہ اسے پہچان نہ سکتا تھا۔ اُس کے کانوں میں دور سے کسی مانوس نام کی ہلکی گونج سنائی دے رہی تھی؟ جیسے کسی دوسری دنیا سے کوئی آواز دے رہا ہو اور یہ اُس کے اپنے دل کی دھڑکن کیوں تیز ہوگئی تھی؟ بھوک کی شدت سے اُس پر دل کا دورہ پڑ رہا تھا۔ اُس لڑکی سے اُس کا اپنا کوئی تعلق تھا؟ یہ لڑکی کون ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟ کیا میں نے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے؟ کہاں؟ کب؟ کیسے؟ دھندلے سوالیہ نشان اس کے شعور میں اُبھرتے رہے بنتے رہے، مٹتے رہے...... مگر جلد ہی اُس کے بھوکے پیٹ کا بنیادی سوالیہ نشان ان سب سوالوں کو سمیٹتا ہوا اس کے شعور پر اُس کے دل و دماغ اور روح پر چھا گیا اور اس لمحے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی وہ لڑکی اُسے اتنی ہی اجنبی اور بیکار اور غیر متعلق لگی جیسی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے پتھر یا وہ سوکھے ہوئے پیڑ جن کی شاخوں پر سے ہریالی کی آخری کونپل بھی نوچ لی گئی تھی۔ اپنے بدن کو گھسیٹتا ہوا نرمل پھر چل کھڑا ہوا......

اور میں چلاتا رہ گیا۔ "ارے نرمل تو کہاں جا رہا ہے؟ یہ تیری آشا ہے جو سڑک کے کنارے بھوک سے بے ہوش پڑی ہے۔ تیری آشا۔ تیری محبوبہ۔ وہی آشا جس کو ساتھ لے کر تو زمیندار کے باغ سے کچے پکے آم توڑ کر لاتا تھا اور پھر تم دونوں اُن آموں کو کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تالاب میں دھوتے تھے اور تو آشا کے ہاتھ سے آدھا چوسا ہوا آم چھین کر خود چوسنے لگتا تھا اور پھر اُسی آم کی کھٹاس میں تجھے ایک عجیب مزہ آتا تھا جیسے آشا کی ساری مٹھاس ہونٹوں کے ذریعے آم کے رس میں گھس گئی ہو...... کیا تو اُسے نہیں پہچانتا؟ کیا تو نے اپنی محبت، اپنی جوانی، اپنے بچپن سب کو بھلا دیا ہے؟"

مگر نرمل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سیدھا چلتا رہا۔ میرے آواز دینے پر بھی وہ

نہ رکا۔ میں چلایا مگر اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ میں نے چیخ کر کہا'' میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ ٹھہر جا۔ اپنی محبوبہ کو گود میں اٹھا، اُس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں میں اپنے پیار بھرے لبوں سے جان ڈال دے۔ اُسے کندھے پر اُٹھا کر لے چل اُس کے بغیر تیری زندگی بیکار ہے۔ اس لیے کہ وہ تیری محبوبہ ہے۔ تیری جان ہے۔ تیرے دل کی دھڑکن ہے۔ تیرے سپنوں کی رانی ہے......
اگر مرنا ہے تو تم دونوں کو ہم آغوش ہوکر ساتھ ہی مرنا چاہیے تا کہ تمھاری موت بھی امر ہوجائے۔ لیلیٰ مجنوں کی طرح، شیریں فرہاد اور سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھا کی طرح......

مگر زرل نے میری ایک نہ سنی۔ چاولوں کے چند دانوں کے پیچھے وہ اپنی محبوبہ چھوڑ کر، اُسے بھلا کر، چلا گیا۔

میں پھر چلایا اور غصے سے میری آواز کانپ رہی تھی۔

'' زرل ٹھہر، تو میری مخلوق ہے میں تیرا خالق ہوں۔ میں نے تجھے اپنے تخیل سے پیدا کیا ہے۔ تو میرا حکم نہیں ٹال سکتا۔''

مگر زرل نے اپنے خالق کی پکار بھی نہ سنی اور اُسے روکنے کے لیے مجھے اُس کے پیچھے دوڑنا پڑا۔

جب میں ہانپتا کانپتا اُس کے قریب پہنچا تو زرل موٹر میں بیٹھے ہوئے چند سفید پوش آدمیوں سے کھانے کے لیے بھیک مانگ رہا تھا۔

'' بابو جی — زرا سا بھات دے دو نہیں تو مر جاؤں گا۔''

یہ دیکھ کر میں غصّے، نفرت اور شرم سے کانپ اٹھا۔ میری مخلوق — اشرف المخلوقات — اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، کیا میں نے اُس کے خمیر میں غیرت اور خودداری اور عزتِ نفس کے بیش بہا انسانی جوہر نہ رکھے تھے؟ میں نے الٹ کر کہا'' زرل۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ چاول کے چند دانوں کے لیے بھیک مانگ رہا ہے۔ کہاں ہے تیری خودی''؟

زرل نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ مگر اُس کی گڑگڑاہٹ میں میرے سوال کا جواب بھی تھا۔

'' بابو جی — دَیا کرو — پانچ دن کا بھوکا ہوں۔''

او میں نے ڈانٹ کر کہا:'' بھوکا ہے تو کیا ہوا؟ ایک بہادر اور خوددار انسان کی طرح جان

دے دے مگر بھیک مت مانگ۔ بھوک تیری خودداری، تیری عزّتِ نفس تیری انسانی عظمت کو نہیں کچل سکتی۔''

اور اس بار پھر اُس کی گڑگڑاتی ہوئی آواز میں میرا جواب بھی تھا۔

''بھوک بُری بلا ہے، بابو جی۔''

موٹر میں بیٹھے ہوئے سفید پوش آدمیوں نے ایک تھیلے میں سے ایک سوکھی ہوئی ڈبل روٹی نکالی اور نرل کو دے دی اور اُس کو پاتے ہی نرل کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی آگئی۔ اُس نے روٹی کو کئی بار چھوکر، دبا کر، سونگھ کر دیکھا۔ جیسے یقین کرنا چاہتا ہے کہ یہ سچ مچ کھانے کی ڈبل روٹی ہے، راستے کا پتھر نہیں ہے جسے اُس کے بھوکے تخیل نے ڈبل روٹی کی شکل دے دی ہے۔ پھر بھی یقین نہ آیا تو ایک بھوکے کتے کی طرح اس نے دانتوں سے ایک بڑا سا ٹکڑا توڑا اور اُسے جلدی جلدی چبا کر دیکھا تب جا کر اُسے اطمینان ہوا کہ یہ سچ مچ ڈبل روٹی ہی ہے اور پھر دفعتاً وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور اُسے سجدہ کرتے دیکھ کر موٹر والے کھلکھلا کر ہنس پڑے اور میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ میری مخلوق جسے میں نے خدا سے ٹکّر لینے کے لیے تخلیق کیا تھا آج انسان کو سجدہ کر رہی ہے۔

اور پھر موٹر والوں سے ایک موٹے چیچک منہ داغ والے آدمی کی بھینگی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی اور اس نے نرل کو اشارے سے پاس بلا کر کہا: ''ایک بات تو بتاؤ۔''

نرل روٹی چباتے ہوئے بولا: ''جو کہو بابو جی۔ تم نے میری جان بچائی ہے، میں تمھاری کیا سیوا کر سکتا ہوں؟''

بھینگی آنکھوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور سڑک کو سنسان پا کر نرل سے پوچھا اگر کوئی کام کی لڑکی دیکھی ہے آس پاس؟ ذرا جوان سی۔''

اور اس سے پہلے کہ میں اُسے چلا کر ہوشیار کر سکوں نرل کا جواب اُس کی زبان سے نکل چکا تھا۔ ہاں! بابو جی۔ ایک دیکھی تو ہے۔ پیچھے کوئی میل بھر پرے سڑک کے کنارے پڑی ہے بے ہوش، جلدی کرو کہیں مر نہ جائے۔''

اور پلک جھپکتے وہ موٹر گرد اُڑاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

اب تو میں غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ''اے ذلیل انسان۔ مجھے شرم آتی ہے کہ تو میرے تخیل کی تخلیق ہے۔ جانتا ہے یہ لوگ کون ہیں؟ اور کیوں جوان لڑکیوں کی تلاش میں پھر رہے ہیں؟ جانتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ ایک سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کے بدلے تو نے آشا کی لاج بیچ دی ہے۔ تو نے اپنی عزت آبرو اور انسانیت بیچ دی ہے......''

مگر نرل سوکھی ہوئی روٹی کو چبانے میں اتنا مصروف تھا کہ اُس نے میری باتوں کی طرف بالکل کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہاں میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ جیسے جیسے روٹی اس کے پچکے ہوئے پیٹ میں جا رہی تھی اور جیسے جیسے اُس کی سکڑی ہوئی، سوئی ہوئی، سوکھی ہوئی انتڑیاں پھر سے جاگ رہی تھیں، نرل کی آنکھوں میں سے وہ غیر انسانی وحشت دور ہوتی جا رہی تھی۔

اُس کا احساس جاگتا جا رہا تھا اور اس کے تحت الشعور سے یادیں اس طرح اٹھا رہی تھیں۔ جیسے کوئی حسینہ انگڑائی لے کر کسمساتی ہوئی اٹھتی ہے۔ جیسے اُس کی آشا......

آشا!

آشا!

اوہ بھگوان! آشا!

روٹی کے آخری لقمے کے ساتھ ایک بھیانک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا۔

''نہیں! نہیں!'' اس کے دل نے آواز دی ''ایسا نہیں ہو سکتا! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا! کبھی نہیں!...... کبھی نہیں......''

وہ مڑ کر پیچھے بھاگنے والا ہی تھا کہ ادھر سے وہی موٹر لوٹتی ہوئی نظر آئی اور سفید پوش آدمی اور ان کے ساتھ ایک خاک آلود چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی جوان لڑکی۔

''آشا! آشا!'' وہ چلایا جب موٹر اُس کے پاس سے گزری اور وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔

''کیا ہے؟'' ایک سفید پوش نے اس سے پوچھا، جب وہ ہانپتا ہوا موٹر کے پاس پہنچا اور ایک لمحہ کے لیے نرل کوئی جواب نہ دے سکا۔

لڑکی کو ہوش آ چکا تھا، وہ ایک سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا آہستہ آہستہ چبا رہی تھی۔ اس کی توجہ تمام تر روٹی پر تھی۔ اس نے آنکھ اُٹھا کر بھی اس بھکاری کی طرف نہ دیکھا جو پاگلوں کی طرح

''آشا۔ آشا'' چلاّتا ہوا موٹر کے پیچھے دوڑتا آیا تھا۔ اور وہ دیکھتی بھی کیوں؟ اس کا نام آشا تھوڑا ہی تھا؟ اس کا نام تھا کیا؟ اس کا کوئی نام تھا بھی؟ اسے کچھ یاد نہ تھا...... اور نہ اُس سے کوئی پرواہ تھی۔ اس وقت اس روٹی کے سوا دنیا کی کوئی دوسری چیز اہمیت نہ رکھتی تھی۔

''آشا'' بالآخر نرمل چلایا ''موٹر سے نیچے اتر آؤ۔ یہ بُرے لوگ ہیں یہ تمھیں بیچ ڈالیں گے۔ آؤ آشا! میرے ساتھ آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے چلیں گے۔''

لڑکی نے ایک پل کے لیے نرمل کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی وحشت بھری بجھی ہوئی آنکھوں میں پہچان کی کوئی چمک پیدا نہ ہوئی۔ پھر وہ اپنے برابر سفید پوش کی طرف مُڑی اور اس سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے''؟

''تم مجھے نہیں پہچانتیں؟ آشا تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نرمل ہوں، نرمل، یاد نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے؟ یاد نہیں ہم ساتھ ہی تو کھیلا کرتے تھے؟ یاد نہیں، ہم اکٹھے ہی زمیندار کے باغ سے آم توڑ کر لاتے تھے اور انھیں تالاب میں دھو کر چوستے تھے، اور جب میں تمھارے ہاتھ سے آدھا چوسا ہوا آم چھین کر خود چوسنے لگتا......؟

لڑکی نے کہا۔ ایک عجیب مری ہوئی آواز میں جیسے وہ اس کی آواز نہ ہو۔ جارے...... جارے...... اَی کی جانوں؟'' اور موٹر دھول اُڑاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

(5)

پلک جھپکتے میں میرے تخیل نے ان دونوں کو فنا کر دیا۔ ''بھلا یہ بھی کوئی عشق ہوا؟''

میں نے سوچا ''اس بار میں نرمل اور آشا کو ایسے ماحول میں پیدا کر دوں، جہاں وہ عشق کی روایات کو پوری طرح نبھا سکیں۔''

میں نے فیصلہ کر لیا کہ چونکہ بھوک محبت کی قاتل ہے اور ''بے زر عشق ٹیں ٹیں ہوتا ہے۔ اس لیے اس بار نرمل اور آشا کو ایسے گھرانوں میں پیدا کیا جائے جہاں ان کی محبت کو افلاس اور قحط کا شکار نہ ہونا پڑے۔ بلکہ ان کی محبت کو پروان چڑھنے کے لیے ہر قسم کی آسانی اور آسائش مہیا ہو، یہاں تک کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی ضروریات اور مشکلات سے بے نیاز ہو کر محبت اور صرف

ا محبت پر اپنی تمام توجہ صرف کر سکیں۔

میں نے آشا کو ایک لکھ پتی سیٹھ کے ہاں پیدا کیا اور نرل کو دوسرے لکھ پتی کے ہاں۔ نرل کو آکسفورڈ یونی ورسٹی، پیرس کے ناچ گھروں اور نیویارک کے نائٹ کلبوں میں تعلیم دلائی۔ آشا کو نینی تال کے ایک انگریزی اسکول، ٹیگور کے شانتی نکیتن اور بمبئی کے تاج محل ہوٹل کے بال روم میں اپنی تعلیم اور شخصیت کی تکمیل کرنے کا موقع دیا۔ پھر آشا کو 'اعلیٰ تعلیم'' کی غرض سے فرانس، سوئٹزر لینڈ اور انگلستان کی سیر کرنے کو بھیجا اور واپسی سفر میں ان دونوں کی ملاقات ایئر انڈیا انٹرنیشنل کے ایک ہوائی جہاز میں کرائی۔

لندن سے جب ہوائی جہاز روانہ ہوا تو ایک خوب صورت لڑکی کو اکیلا بیٹھے دیکھ کر نرل مسکرایا اور کوئی دوسری سیٹ خالی نہ ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے اپنے بہترین نیم آکسفورڈ، نیم امریکی لہجہ میں آشا سے کہا ''اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ کے برابر والی سیٹ پر میں بیٹھ جاؤں۔''

آشا نے ایک نظر نرل کے پچاس پونڈ والے بڑھیا سوٹ پر ڈالی اور کہا 'ہاں' ہاں کیوں نہیں بڑے شوق سے۔''

''میرا نام نرل کمار کارا بھائی ہے۔'' نرل نے لیپ اسٹریپ (LAP STRAP) باندھتے ہوئے کہا۔

''اور میرا نام آشا آلو والا ہے۔''

''ہاؤ ڈو یو ڈو مس آلو والا۔ پلیز ڈ ٹو میٹ یو۔''

''شیک ہینڈ کرتے ہوئے آشا کی نازک نرم اور سرخ پالش کیے ہوئے ناخن والی انگلیوں نے نرل کے ہاتھ میں ضرورت سے قدرے زیادہ گرم جوشی اور بے تکلفی محسوس کی مگر سوسائٹی میں ایسی باتوں کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔ ایسے ہی مسئلوں پر تعلیم حاصل کرنے تو وہ ولایت آئی تھی۔

''تو آپ، کارا بھائی کاٹن ملز والے، کارا بھائی ہیں۔''

''جی ہاں یا یوں سمجھ لیجیے کہ میں ان کا چھوٹا بیٹا ہوں اور آپ تو یقیناً سیٹھ آلو والا کی سپتری ہیں۔''

''تو کیا آپ پتا جی کو جانتے ہیں؟''

''لیجیے ایسا بھی کوئی ہے جو ہندوستان کے POTATO KING کے نام سے واقف نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ہوائی جہاز لندن کے ایئرپورٹ کو ہی نہیں ENGLISH CHANNEL کو بھی کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب فرانس کے سرسبز میدان دور نیچے نظر آ رہے تھے۔ پھر نرل نے کہا آپ انڈیا ہاؤس کی پارٹی میں شاید نہیں آئیں۔ ورنہ پہلے ہی ملاقات ہو جاتی۔

''جی میں اس وقت سوئٹزرلینڈ میں تھی۔''

''کہاں؟ جنیوا؟''

''جی نہیں۔ انٹرلاکن۔''

''بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو سال میں کم سے کم دو ہفتے انٹرلاکن میں ضرور گزارتا ہوں۔''

''اس سال تو آپ نہیں آئے''؟

''جی ہاں اسی کا افسوس ہے۔ بات یہ ہے کہ میں امریکہ گیا تھا صرف تین ہفتے کے لیے مگر وہاں دو ہفتے ٹھہرنا پڑا......''

''جنیوا اور روم کے درمیان جب ان کا ہوائی جہاز اطالوی ALPS کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ نرل نے کہا ''سردی بہت ہوگئی ہے آپ یہ کمبل ٹانگوں پر ڈال لیجیے۔''

''آپ کو بھی تو سردی لگ رہی ہوگی۔ آپ بھی لیجیے۔''

نرم کمبل کے نیچے ان کے گھٹنے ایک دوسرے کو 'اتفاقیہ' چھو گئے اور پھر الگ نہ ہوئے۔

''اگر آپ کی آنکھوں کو یہ لائٹ بری لگ رہی ہو تو بجھا دوں؟''

ہوائی جہاز کے کیبن میں ایک لطیف اندھیرا چھا گیا اور دور نیچے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں چاندنی رات میں سیلانی بادلوں سے آنکھ مچولی کرتی رہیں۔

نہ جانے کیسے آشا کا نرم و نازک ہاتھ نرل کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔

''یہ کون سی خوشبو ہے جو آپ نے بالوں میں لگائی ہے''؟ نرل نے آشا کے کان میں کہا۔

''میں نے تو آج نہ بالوں میں تیل لگایا ہے اور نہ کوئی سینٹ ہی استعمال کیا ہے۔''

''جب ہی خوشبو اتنی مست کرنے والی ہے۔''

۔"تو آپ بن پیے بھی مست ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں بھگوان بھلا کرے مرارجی ڈیسائی کا، اس شراب بندی کے زمانہ میں کم سے کم عشق کے نشہ پر ابھی پابندی نہیں لگی۔

"............"

"آپ بہت شریر ہیں۔"

"نہیں یقین مانیے میں بہت شریف ہوں۔ مگر کیا کروں آپ بہت خوب صورت ہیں۔"

جب ہوائی جہاز روم پہنچا اور کیبن میں روشنی کی گئی تو دوسرے مسافروں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ آشا لپ اسٹک دوبارہ لگا کر اپنے میک اَپ کو درست کر رہی ہے۔

مسافر اُتر کر کافی پینے ریستوران میں گئے تو معلوم ہوا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے جہاز آگے نہیں جائے گا۔ رات انھیں روم کے کسی ہوٹل میں گزارنی پڑے گی۔

نرل پہلے بھی کئی بار اس ہوٹل میں ٹھہر چکا تھا۔ منیجر اسے پہچانتا تھا آنکھ کا صرف ایک اشارہ ہی کافی ثابت ہوا اور نرل اور آشا کو برابر کے کمرے دے دیے گئے جن کے درمیان کے دروازے کی چٹخنی صرف نرل کی طرف تھی۔ ابھی آشا نے رات کے کپڑے بدلے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور ہاتھ میں شامپین کے دو گلاس لیے نرل داخل ہوا۔

"ہیلو ڈارلنگ' صرف دس گھنٹے میں مس آلو والا سے آشا اور آشا سے ڈارلنگ!

"ہیلو"

میں نے سوچا سونے سے پہلے ایک آخری جام ہو جائے، کل تو بمبئی جا کر بھی سمندر کا پانی ہی پینا ہے۔"

"مگر بس ایک جام۔ میں زیادہ نہیں پیتی۔"

"تمھارا جام صحت"

"اور یہ تمھارا"

"اور یہ محبت کی اس یادگار رات کے نام"

اور اگلی رات کو بمبئی پہنچتے پہنچتے وہ دونوں عشق کی تمام منزلیں طے کر چکے تھے، جنھیں قدیم

صدیوں کے عاشق و معشوق برسوں میں طے نہ کر پاتے تھے۔ ایئرپورٹ پر جب وہ اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھنے لگے تو نرل نے کہا "چیریو آشا۔ جلد ملیں گے۔"

اور آشا نے کہا "ضرور، ضرور، چیریو نرل۔ فون کرنا۔"

موٹریں روانہ ہوگئیں اور میں نے سوچا یہ ہے سچا عشق۔ نہ بک بک نہ جھک جھک۔ بس عشق، اب یہ دونوں روز ایک دوسرے سے تاج میں، گرین میں، چاندنی رات میں جوہو کے ساحل پر ملیں گے۔ عشق و محبت کی باتیں کریں گے۔ ان کے درمیان نہ سماج کوئی دیواریں کھڑی کر سکے گی اور نہ ہی مفلسی اور بھوک ان کو جدا کر سکے گی۔ ان کی محبت آزاد ہے اور اس لیے اٹل اور امر ہے۔ یہ پریم کہانی ضرور کامیاب اختتام تک پہنچ کر رہے گی۔

مگر آشا گھر پہنچی تو اس کا استقبال کرنے کے لیے اس کے پتا جی، ماتا جی اور بھائی بہنوں کے علاوہ ادھیڑ عمر گنجے سر کے سیٹھ لال چند کمال چند بھی تھے جو POTATO KING کے پارٹنر تھے۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے آشا سے ہاتھ ملایا اور اس کے ہاتھ کے دباؤ میں بھی آشا کو کسی قدر اسی بے تکلفی کا انداز محسوس ہوا جو نرل کے شیک ہینڈ میں تھا مگر لال چند کمال چند کے ہاتھ عمر بھر روپے گنتے گنتے سخت اور کھردرے ہو گئے تھے اور ان کی چبھنے والی ہڈیوں کے دباؤ میں جوانی کا اشارہ نہیں تھا بڑھاپے کی التجا تھی۔

اگلے روز آشا نرل کے ٹیلیفون کا انتظار کر رہی تھی کہ اس کے باپ نے کسی جاتے جاتے اس سے کہا کہ شام کو اس کی خیریت سے واپسی کی خوشی میں لال چند کمال چند نے تاج میں سب گھر والوں کو دعوت دی ہے "وہ تمھیں بہت پسند کرتا ہے، آشا! اور عمر بھی کوئی خاص زیادہ نہیں ہے، میرے خیال میں تمھیں اس کی تجویز پر غور کرنا چاہیے۔"

آشا باپ کے سامنے خاموش رہی۔ مگر اس نے سوچا "ہنہ! کھوسٹ کہیں کا اس کی شکل تو دیکھو۔ کہاں وہ اور کہاں نرل؟"

رات کو تاج میں جب ڈنر کے بعد وہ صرف اپنے باپ کو خوش کرنے کے لیے لال چند کمال چند کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے سخت کوفت محسوس کر رہی تھی، نرل کو آتے دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔

''معاف کیجیے گا۔ایک دوست سے مل لوں'' کہہ کر وہ ڈانس ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے پارٹنر کے بازوؤں سے آزاد ہو کر ناچنے والوں کی بھیڑ میں سے راستہ چیرتے ہوئے نکل گئی۔

مگر......مگر......یہ نرل کے ساتھ کون تھی؟

''اوہ! ہیلو آشا، ان سے ملو۔''

ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو پینٹ، پاؤڈر، لپ اسٹک کسی ہوئی چولی اور رنگے ہوئے بالوں کی مدد سے جوان نظر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور جو نرل کی کمر میں بے تکلفی اور مالکانہ انداز سے ہاتھ ڈالے ہوئے تھی کہ ایک بھیانک شبہ آشا کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گیا۔

نی نی سے ہاتھ ملاتے ہوئے، اُس نے کہا ''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسز کارا بھائی۔''

نی نی سُن یہ کہہ کر ہنس پڑی۔ بدتمیزی سے کھلکھلا کر۔ کتنے بدنما دانت تھے اس کے ''اپنی دوست کی غلطی تو دیکھو ڈارلنگ'' اس نے نرل سے کہا۔ ڈارلنگ! اس کی زبان سے یہ لفظ سُن کر آشا جل ہی تو گئی۔

''آشا! تمھیں بھول ہوئی۔ یہ نی نی ہیں مسز فنا کا۔ میری بیوی نہیں۔''

آشا نے نی نی فنا کا کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ مگر اس سے پہلے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کی شادی جوانی میں ایک ادھیڑ عمر کے امیر آدمی سے ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر اب بھی زندہ تھا اور بیوی کے سارے اخراجات اٹھاتا تھا مگر کئی برس سے ان کا ازدواجی رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ دونوں الگ الگ بنگلوں میں رہتے تھے۔ سیٹھ فنا کا عمر کے آخری دن کو کین کھا کھا کر گزار رہا تھا اور نی نی اپنی کھوئی ہوئی جوانی کی تلاش میں سوسائٹی کے مختلف نوجوانوں کا پیچھا کرتی رہتی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر اب کوئی شک باقی نہ رہا کہ نرل نی نی کا تازہ ترین ''مفتوح'' ہے، اس لمحے میں آشا کی نہ جانے کتنی آشائیں اور اُمنگیں چکنا چور ہو گئیں اور عمر میں پہلی بار وہ بڑی بدتمیزی سے بولی: ''معاف کیجیے گا مسٹر کارا بھائی مگر انھیں آپ کی بیوی نہیں، آپ کی ماتا جی سمجھی تھی۔''

اور اس سے پہلے کہ نی نی اس جملے کا جواب دے سکے۔ آشا وہاں سے اپنی میز پر واپس چلی آئی۔ آرکسٹرا نے ایک اور ناچ کی دھن شروع کر دی تھی۔ او مائی ڈارلنگ! او مائی ڈارلنگ! نی

نی اور نرل، ایک دوسرے کی بانہوں میں جھولتے ہوئے ناچ رہے تھے۔ نرل کے انداز میں کسی قدر بیزاری تھی مگر نی نی اس سے چپٹی ہوئی تھی جیسے اُسے ڈر ہو کہ کوئی اس سے نرل کو چھین کر لے جائے گا۔

''نرل کارا بھائی کو تم جانتی ہو۔'' آشا کے باپ نے پوچھا۔

''جی ہاں، ہوائی جہاز میں ملاقات ہوئی تھی، بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ باتیں خوب کرتا ہے۔''

''ہاں اب تو باتیں ہی بنا سکتا ہے؟'' لال چند نے لقمہ دیا۔

''جی! کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔''

تب اس کے باپ نے بتایا کہ سیٹھ کارا بھائی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو اس کی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی وجہ سے عاق کر رکھا ہے۔'' باپ کے مرنے پر بھی اسے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔

''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' آشا بولی۔'' وہ رہتا تو بڑی شان سے ہے۔ ہر سال ولایت جاتا ہے۔ یہ بڑھیا کپڑے — موٹر — یہ سب کہاں سے آتا ہے؟''

''کہاں سے آتا ہے؟'' لال چند کمال چند نے اپنے زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے اور پھر غیر ضروری حد تک جھک کر آشا کے کان میں کہا'' بہت سے ذریعے ہیں۔ برج، فلاش، پوکر اور نی نی فا کا'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنے گنجے سر سے اشارہ ہال کے اس کونے کی طرف کیا جہاں نرل نی نی کو رمبا کی چک پھیریاں دے رہا تھا اور آرکسٹرا کے ساتھ آواز ملا کر گا بھی رہا تھا۔ اومائی ڈارلنگ! اوہ مائی ڈارلنگ!

آشا نے لال چند کمال چند سے کہا'' میرا جی متلا رہا ہے۔ شاید گرمی بہت ہے، چلیے باہر سمندر کی ٹھنڈی ہوا میں کچھ دیر ٹہل لیں۔

چند دن میں ان کی ENGAGEMENT کا اعلان ہو گیا۔ بڑی شاندار پارٹی ہوئی۔ لال چند کمال چند نے پچیس ہزار کی ہیروں جڑی انگوٹھی اپنی منگیتر کو تحفے میں دی۔ نرل بھی پارٹی میں آیا اور ایک منٹ کے لیے آشا کو اکیلا پا کر کہنے لگا۔'' مبارک ہو آشا'' اور اس کے کان میں آہستہ

سے: ''جب کبھی ضرورت ہو مجھے نہ بھولنا۔''

چھ ماہ بعد شادی بھی ہو گئی۔ مگر شادی کی دعوت میں نرمل نہ آیا کیونکہ وہ پھر ولایت کی سیر کے لیے گیا ہوا تھا۔ لال چند کمال چند نے بھی ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا طے کیا۔ بمبئی سے قاہرہ، وہاں سے روم۔ روم سے کئی نئے مسافر ہوائی جہاز میں چڑھے مگر جب آشا اور اس کا شوہر ریستوران سے واپس ہوئے تو اور سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے۔ آشا نے دیکھا کہ اگلی سیٹ پر جو اب تک خالی تھی ایک جوڑا آکر بیٹھا ہے، ایک مرد اور ایک لڑکی مگر پیچھے سے شکلیں نظر نہ آتی تھیں۔

ایک بار پھر اطالوی ALPS کے اوپر سے ہوائی جہاز گزر رہا تھا۔ نیچے برفیلی چوٹیاں ستاروں کی مدھم روشنی میں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں، آشا نے سوچا، آج چاند نہیں نکلے گا۔ دل کے ساتھ میری زندگی کی روشنی بھی غائب ہو گئی ''پیارا نرمل! لاپرواہ ظالم نرمل! حسین چہرے اور مضبوط بانہوں والا نرمل! آج نہ جانے وہ کہاں ہوگا؟ نہ جانے کس حال میں ہوگا؟ میری شادی کی خبر سے دل برداشتہ ہو کر ہی ہندوستان سے چلا آیا ہو، وہ ضرور انٹرلاکن گیا ہوگا اور وہاں کی برفیلی پہاڑیوں میں مجھے بھلانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ کاش اس وقت برابر کی سیٹ پر وہ بیٹھا ہوتا اور......

اگلی سیٹ سے ایک لڑکی کی آواز آئی ''آپ بہت شریر ہیں۔''

اور پھر ایک جانی بوجھی آواز ''نہیں یقین مانیے میں بہت شریف ہوں، مگر کیا کروں، آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

(6)

تیسری بار پھر مجھے اپنی مخلوق کو فنا کرنا پڑا۔ لعنت ہو ان عاشقوں اور معشوقوں پر۔ ایک لمحہ، آپ کی نظر چوکی اور وہ لگے عشق کی شاہراہ کو چھوڑ کر زندگی کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے یا شاید عشق کو نہ بہت مفلسی راس آتی ہے نہ امیری۔ اس بار میں نے اپنے نرمل اور آشا کو متوسط طبقے میں پیدا کیا۔ نرمل کو ایک دفتر میں ڈیڑھ سو کا کلرک کرا دیا۔ آشا کو صرف میٹرک تک تعلیم دلوائی۔

اس بار نرمل اور آشا بمبئی کی ایک چال میں دوسرے مالے پر رہتے تھے۔ شام کو جب نرمل دفتر سے تھکا ہارا لوٹتا تو دور سے ہی بالکنی میں آشا کو کھڑے دیکھ کر اُس کے من کی کلی کھل جاتی۔ اب اس نے شام کو سنیما جانا بھی کم کر دیا تھا کہ پردے پر فلمی ستاروں کی پرچھائیں دیکھنے سے،

آشا کو اصلی رنگ اور روپ میں دیکھنا کہیں بہتر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آشا بھی اسے پسند کرتی ہے ورنہ بلا ناغہ ہر شام کو اس کے دفتر سے آنے کے وقت اپنے کمرے کے سامنے کیوں کھڑی رہتی ہے؟ نرل اگر اپنے کمرے میں کھڑے ہو کر دیوار سے کہے کہ آج تو گھر میں شکر ہی نہیں چائے کیسے پی جائے تو آشا فوراً اپنے باپ سے کہتی ''دادا نرل راؤ کے ہاں شکر نہیں ہے۔ ایک پیالی چائے بھجوادوں؟'' اور اس کا باپ جو نرل کو بہت پسند کرتا تھا۔ فوراً کہتا۔ ہاں ہاں ضرور، منجو سے کہو ایک پیالی چائے دے آئے اور جب چھوٹی بہن پیالی لے کر چلتی تو آشا خواہ مخواہ چلاّ کر کہتی۔ اری منجو سنبھال کر اُٹھا، تو پیالی ضرور گرا کر توڑے گی۔ ٹھہر مجھے دے اور پھر وہ خود پیالی لے کر جاتی اور ہر بار پہلا گھونٹ پی کر نرل کسی فلم میں سنا ہوا فقرہ ضرور دہراتا۔ ''چائے بہت میٹھی ہے، آشا، لگتا ہے تم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

اور آشا جھینپ کر وہاں سے چلی آتی اور بہن کو چلاّ کر کہتی ''نرل راؤ چائے پی لیں تو پیالی لے آئیو کہیں چائے کے ساتھ ہماری پیالی بھی ہضم کر جائیں۔''

میٹرک کا امتحان نزدیک آیا تو ایک دن اس کے باپ نے نرل سے ذکر کیا کہ آشا تاریخ جغرافیہ میں ذرا کمزور ہے اور موقع پا کر نرل نے کہا'' تاریخ جغرافیہ تو بڑے ہی آسان مضمون ہیں۔ ان ہی مضامین میں تو بی۔ اے کیا تھا'' اب تو آشا کے باپ کو کہنا پڑا ''اگر تمھیں بہت تکلیف نہ ہو تو شام کو گھنٹہ بھر اسے پڑھا دیا کرو۔''

اور اس دن سے تو ان دونوں کو روزانہ ملنے اور بات کرنے کا ایک باقاعدہ بہانہ مل گیا۔ شروع شروع میں تو سبق کے دوران میں آشا کی ماں یا اس کے باپ کی موجودگی ضروری تھی مگر جلد ہی، ہندوستان کی معدنی پیداوار اور پانی پت کی تین لڑائیوں کے ذکر سے ان دونوں کا جی اُکتا گیا اور اس کے علاوہ نرل کا رویہ اور رکھ رکھاؤ اتنا شریفانہ تھا کہ سبق کے دوران میں کسی تیسرے کی موجودگی غیر ضروری سمجھی گئی اور اس کے بعد یہ قدرتی امر تھا کہ شاہجہاں اور ممتاز محل کے تاریخی رومان میں ان دونوں کو ذاتی اور غیر تاریخی دلچسپی پیدا ہونے لگے اور آب و ہوا کا ذکر کرتے کرتے بات دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے نئی فلم تک پہنچ جائے۔ اور باتوں باتوں میں استاد شاگرد سے یہ بھی کہہ جائے کہ اس کی آنکھیں نرگس کی آنکھوں سے بھی زیادہ خوب صورت ہیں۔

پھر ایک دن ہمت کر کے نرل بالوں میں لگانے کی موتیا کے پھولوں کی ڈبی لے آیا' پانچ روپے کا نوٹ بُھنانا تھا'' پھول والے نے کہا، بابو جی دو چار آنے کا ہار گجرا لو تو چھٹا دیے دیتا ہوں، سو میں نے سوچا تمھارے لیے ایک ڈبی ہی لے چلوں۔ تمھارے جوڑے میں لگتی بھی تو بہت خوب صورت ہے'' اور آشا نے پھولوں کی قوس کو اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے کہا'' کتنی اچھی خوشبو ہے ان پھولوں میں، رات بھر یہ مہکتے رہیں گے'' نرل نے بغیر کوئی فلمی مکالمہ سوچے فی البدیہہ کہا'' اور تمھیں میری یاد دلاتے رہیں گے'' اور اس دن سے نرل کو ہر روز ہی پانچ روپے کا نوٹ بُھنانا اور چار آنے کی ڈبی خریدنا ضروری ہو گیا۔ جس دن آشا کے امتحان کا نتیجہ نکلا۔ آشا کے باپ نے اکیلے میں نرل سے کہا'' تمھاری مہربانی سے ہماری آشا پاس تو ہو گئی ہے اور وہ بھی سکنڈ کلاس میں۔ اب تو اس کے بیاہ کی فکر ہے۔ سوچتا ہوں کوئی اچھا سا بر مل جائے تو...... اور پھر کسی قدر ہچکچاتے ہوئے'' تم اپنی سناؤ نرل، شادی بیاہ کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟'' اور جب نرل سوچ میں پڑ گیا تب: '' تم تو جانتے ہی ہو کہ آشا کی ماں اور میں دونوں تمھیں کتنا پسند کرتے ہیں......''

نرل نے کہا'' میں اس اتوار کو گھر جا رہا ہوں، پتا جی سے پوچھ کر سوموار کو آپ کو جواب دوں گا۔'' اور میں نے سوچا چلو اس بار تو نرل اور آشا کے عشق کی بیل منڈھے چڑھتی نظر آتی ہے۔

نرل اتوار کو اپنے گاؤں گیا تو اپنے باپ سے ذکر کیا، جو پچاس روپے ماہوار پر اسکول میں پڑھاتا تھا۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا'' اچھی بات ہے، میں دو دن کی چھٹی لے کر شہر آؤں گا۔ اور لڑکی کے باپ سے بات چیت کروں گا۔''

نرل بمبئی واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ آشا نے ہونے والے رشتے کی وجہ سے اس کے سامنے آنا اور بات کرنا بند کر دیا ہے۔ شاید اس کی ماں نے منع کر دیا ہو مگر اس دوری اور علیحدگی میں بھی کتنی میٹھی رومان انگیز چاشنی تھی۔ کبھی کبھار چال کے برآمدے میں دفعتاً ان کی مڈبھیڑ ہو بھی جاتی تو آشا کے گال لاج کے مارے تمتما اُٹھتے اور وہ الٹے پیروں بھاگ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتی اور پھر جھری میں سے نرل کو جھانکتی اور نرل؟ وہ تو اپنے باپ کے آنے اور شادی کے طے ہونے اور پھر شادی ہونے کے دن گن رہا تھا۔ کتنا لطیف تھا یہ انتظار۔

نرمل کا باپ آیا اور آشا کے گھر والوں نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ رسمی بات چیت کے بعد نرمل کے باپ نے بیٹے کو وہاں سے اُٹھ جانے کا اشارہ کر دیا اور دونوں باپوں میں تخلیے میں گفتگو ہونے لگی۔

نرمل کے باپ نے دریافت کیا کہ آشا کا باپ داماد کو جہیز میں کتنا روپیہ دینے کو تیار ہے؟۔

آشا کے باپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، جہیز میں تو ہم سوائے دو چار کپڑوں اور چھوٹے موٹے زیوروں کے کچھ بھی نہ دے سکیں گے۔'' پھر اس نے اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا۔ چھوٹی سی دوکان، وہ بھی کساد بازاری کے زمانے میں اس پر کنٹرول کی مشکلات، مشکل سے اتنے بڑے خاندان کا گذارا ہوتا ہے۔

نرمل کے باپ نے کہا: ''تب تو مجھے افسوس ہے یہ رشتہ نہ ہو سکے گا۔ میری بھی اپنی کچھ ایسی ہی مجبوریاں ہیں۔''

آشا جو کواڑوں کے پیچھے چھپی ہوئی یہ سب سُن رہی تھی دھک سے رہ گئی، اب کیا ہوگا؟ مگر نہیں اس کا نرمل ضرور اپنی محبت کو نبھائے گا۔ اپنے باپ کی طرح ہرگز وہ روپے کا لالچ نہیں کرے گا۔

اور رات کو جب باپ بیٹے اکیلے ہوئے اور نرمل کو اپنے باپ کے فیصلہ کا علم ہوا تو اس نے بے شک اپنی محبت نبھائی۔ اس نے باپ سے صاف صاف کہہ دیا: ''اب جہیز ایسے پرانے ڈھکوسلوں کو چھوڑ دیجیے اور روپوں کے لالچ میں دو زندگیوں کو تباہ نہ کیجیے۔ کیا آپ نے شانتارام کا فلم ''جہیز'' نہیں دیکھا۔''

اس کے باپ نے جواب دیا ''فلم دیکھنے کے لیے میرے پاس فالتو پیسے کہاں ہیں؟ اور پھر اس نے بیٹے کو وہ راز کی بات بتائی جو آج تک اس سے چھپائی تھی۔ اس نے ساہوکار سے دو ہزار قرض لے رکھا تھا، جو بیاج ملا کر اب تین ہزار کے لگ بھگ ہو گیا اور اس کی ادائیگی کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ نرمل کا بیاہ کسی ایسی جگہ کیا جائے جہاں سے جہیز میں معقول رقم ملنے کی امید ہو۔'' تم بی۔ اے ہو۔ اچھی نوکری پر ہو۔ تین ہزار تو ملنا ہی چاہیے۔''

''مگر پتا جی اتنا روپیہ آپ نے قرض لیا تھا کس لیے؟''

اور باپ کو کہنا پڑا ''تمھاری پڑھائی کے لیے نرل اور کس لیے؟ ورنہ تم بی اے کس طرح کر پاتے؟'' یہ سن کر نرل کے عشق کی آگ بھی ٹھنڈی پڑ گئی اور اُسے کہنا پڑا ''پتا جی شما (معاف) کریں مگر مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔''

اگلے مہینے نرل کی شادی اس کے گاؤں کے سُنار کی موٹی اور ان پڑھ بیٹی سے ہو گئی، نہ نرل نے زہر کھایا اور نہ آشا نے، جہیز میں صرف ڈیڑھ ہزار کی رقم ملی جو ساہوکار کو دے دی گئی۔ مگر باقی رقم اور بیاج ملا کر دو ہزار کی رقم اب بھی بقایا ہے۔ آشا کی شادی ایک غریب میٹرک پاس لڑکے سے ہو گئی جو ڈاکخانے میں پوسٹ مین ہے اور جگہ نہ ملنے کی وجہ سے فی الحال آشا کے باپ کے پاس ہی گھر داماد بن کر رہتا ہے۔ نرل نے لاکھ کوشش کی کہ کسی دوسری چال میں کھولی مل جائے، مگر آخر میں وہ اپنی بیوی کو اسی چال میں لانے پر مجبور ہوا۔ آشا اور نرل کی بیوی دونوں میں کافی دوستی ہو گئی ہے اور جب کام پر چلے جاتے ہیں وہ دونوں بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہیں اور اپنے ہونے والے بچوں کے لیے ننھے ننھے کپڑے سیتی رہتی ہیں......''

اور اس قطعی غیر رومانی منظر کو دیکھ کر مجھے ایک بار پھر اپنی مخلوق کو اپنے تخیل کی تلوار سے قتل کرنا پڑا۔

(7)

آخری بار آشا اور نرل کو تخلیق کرنے کے بعد میں نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ چاہے عشق کریں یا نہ کریں۔ پھر میں انھیں بالکل بھول گیا اور اپنی کہانیوں کے لیے دوسرے کردار تخلیق کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اور پھر برسوں بعد میں نے ایک بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کو بازار میں جاتے دیکھا مرد کے چہرے پر جھریاں تھیں اور اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ عورت کے سفید بالوں میں مہندی لگی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ چکی چلاتے اور مصالحہ پیسنے سے سخت اور کھردرے تھے وہ دونوں بازار سے راشن اور ترکاری خرید کر گھر جا رہے تھے، ان کی شکلیں کافی بدل چکی تھیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی ان کو نہ پہچان سکتا مگر میں اپنی مخلوق کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ بوڑھے نرل کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں راشن کے گیہوں اور چاول اور ترکاریاں بھری ہوئی تھیں۔ تھوڑی دور جا کر بوڑھی آشا

نے کہا" لاؤ مجھے دے دو۔تم تھک گئے ہو گے" یہ کہہ کر اس نے وہ تھیلا نرمل کے ہاتھ سے لے لیا اور جب ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں محبت کی وہی چمک تھی جو تخلیق کرتے وقت میں نے ان دونوں کو عطا کی تھی۔

تو بڑھاپے تک بھی ان کی محبت مدھم ہوئی تھی؟ یہ تھا ایک سچی پریم کہانی کا معیاری انجام مگر پوری کہانی کیا تھی؟ وہ دونوں کیسے ملے؟ اور کیسے ان کی محبت پروان چڑھی تھی؟ اور کن کن مشکلات اور مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا؟ ان کے عشق کو کتنے امتحان دینے پڑے تھے۔

یہ سب معلوم کرنے کے لیے میں ان کا پیچھا کرتا ہوا، گلیوں گلیوں ہوتا، ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچا، جیسے ہی نرمل اور آشا داخل ہوئے۔ درجنوں بچوں کی چیں، چیں، چیں، چیں میں بہت دیر تک کسی نے میرے کنڈی کھنکھٹانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

جب بچوں کا شور کسی قدر کم ہوا، تب جا کر بڑھیا نے کنڈی کھنکھٹانے کی آواز سنی" ارے او، گوپال، موہن، للو، کوئی دیکھو دروازے پر کون ہے؟"

بچوں کے جلوس میں مجھے اس ٹوٹے ہوئے مونڈھے تک لے جایا گیا، جس پر بیٹھا بوڑھا نرمل کھانس رہا تھا، اپنی بوڑھی چندھی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے کہا:" بیٹھو بھائی بیٹھو، چائے پیو گے۔"

اور بوڑھی آشا، شوہر کے سامنے حقہ رکھتے ہوئے بولی:" ہاں، ہاں کیوں نہ پئیں گے یہ بابو لوگ تو دن میں دس دس بارہ بارہ پیالیاں چائے کی پی جاتے ہیں۔"

میں آپ دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا

"ہاں، ہاں بھائی شوق سے پوچھو۔"

" آپ دونوں کی شادی کو کتنے برس ہوئے؟"

اپنی جھریوں کے باوجود آشا شرما گئی، جب بوڑھے نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔" کیوں راجو کی اماں کتنے برس ہوئے ہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے، جیسے کل ہی کی بات ہو۔"

" ہائے تمھیں لاج نہیں آتی، دس تو پوتے پوتیاں ہیں تمھارے۔"

پھر بوڑھے نے کہا، کوئی چالیس برس ہوئے ہوں گے۔ بابو جی۔ مگر تمھیں ہماری شادی کی

تاریخ کی کیونکر فکر پڑی؟''

میں کہنا چاہتا تھا کہ میں تمھارا خالق ہوں اس لیے۔ مگر پھر میں نے اتنا ہی کہا ''میں کہانیاں لکھتا ہوں، اس لیے آپ کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''کھوں! کھوں! حقہ گڑگڑاتا، کھانستا اور ہنستا ہوا بوڑھا بولا: ''ہماری بھی کوئی زندگی ہے بابوجی، پیدا ہوئے، جوان ہوئے، محنت مزدوری کی، شادی کی، بچے پیدا کیے۔ اب بچوں کے بھی بچے ہوگئے، بس مرنا رہ گیا ہے۔''

نہیں، نہیں۔ میں یہ باتیں نہیں۔ آپ کی محبت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، آپ اپنی بیوی سے پہلی بار کیسے ملے؟ کیسے آپ کو عشق ہوا؟''......

بڑھیا نے تو شرم کے مارے اوڑھنی سر پر سرکالی اور بوڑھا غصے کے مارے مونڈھا چھوڑ کر کھڑا ہوگیا، محبت!...... عشق!...... وہ کھانستا ہوا چلایا ''یہ کیا مسخری ہے، ہمارا مذاق اُڑانے آیا ہے...... جانتا نہیں یہاں شریف آدمی رہتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ حقے کی نے لے کر مجھے مارنے ہی والا تھا کہ میں وہاں سے بھاگا اور اب تک بھاگتا ہی چلا آ رہا ہوں...... اس لیے سانس پھولا ہوا ہے۔

آپ ہی بتایئے، عشقیہ کہانی لکھوں تو کیسے؟

شکر اللہ کا

نہیں صاحب کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ رشتے داروں، دوستوں، دشمنوں، تعلقات والوں، افسروں، مالکوں، کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ نہ سرکار سے کوئی گلہ ہے نہ اللہ میاں سے کوئی شکوہ ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے، سو میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں اور صبح شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کھانے کو پلاؤ قورما نہیں تو چٹنی روٹی تو بھیج دیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں تو کیا ہوا، سونے کے لیے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کر رحم نہ کھایئے، صاحب خدا کا شکر ہے، دوسری ٹانگ تو صحیح ہے......

سچ پوچھیے، تو صبر ہی ہم غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے، صبر ہماری عورتوں کا زیور ہے اور ہمارے بچوں کا کھلونا۔ آپ محلوں، بنگلوں میں رہنے والے صبر کے فائدے کیا جانیں۔ سوکھی روٹی کو صبر کی چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغ مُسلّم کا مزا آتا ہے۔ پھر سڑک کے کنارے صبر کی مخملی گدّی بچھا کر اوپر سے صبر کی ریشمی چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ نواب کو نہ آتی ہوگی اور جب مشین میں آکر میری بائیں ٹانگ کٹ گئی اور مل مالکوں نے ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا اور میں ایک کباڑی کے یہاں سے دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں خرید کر اُچھلتا، کودتا، لنگڑاتا ہوا ایک ڈاکٹر کے یہاں پہنچا جو کہ نقلی ٹانگ بنانے میں مشہور تھا اور اُس نے ربڑ کی ٹانگ لگانے کے لیے

ہزار روپیہ اور لکڑی کی ٹانگ کے پانچ سو مانگے اور میری جیب میں صرف سات روپے نکلے، تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ نہ ربڑ کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی — صبر کی ٹانگ لگوائی۔ اُس دن سے آج تک انھیں ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور صبر کی ٹانگ سے گزارا کر رہا ہوں۔ صبر ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ اللہ نے ہاتھ دیے ہیں۔ کولھے دیے ہیں۔ وہ سامنے دیکھیے نا' لولے رزلدو کی تو دونوں ٹانگیں بیکار ہیں۔ پھر بھی ہاتھوں اور کولھوں کے سہارے، مزے سے گھسٹ کر چل لیتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے ٹانگوں کے ساتھ بانہوں پر فالج نہ گرا دیا۔

خدا کی مہربانی تھی کہ بچپن ہی میں ماں باپ سے صبر کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولاہے ہیں، صاحب۔ یوں تو ہم مسلمانوں میں ذات پات نہیں ہوتی، خدا کے بندے سب برابر ہیں۔ مگر امیری غریبی اونچ نیچ! شرافت، رذالت بھی تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لیے میرے باپ کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنا درجہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے اور وہ ہمیشہ اسی اصول پر عمل بھی کرتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریفوں کے لونڈوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو ''خان صاحب'' ہر سید کو ''میر صاحب'' ہر بنئے کو ''لالہ جی'' ہر برہمن کو ''پنڈت جی'' اور ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر کو — یہاں تک کہ پٹواری، نمبردار تک کو — ''سرکار'' کہتا تھا، مگر وہ سب اُسے ''بندو جولاہا'' کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ان امیر شریفوں کے بچّوں کو اُجلے کپڑے پہنے، کتابیں ہاتھ میں لیے اسکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چاہتا کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں مگر میرا باپ ہمیں سمجھاتا — ''بیٹا! اپنی اوقات کبھی نہ بھولنی چاہیے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے، اسی پر صبر شکر کرنا چاہیے نہیں تو، کوا چلا ہنس کی چال، والی کہاوت ہو جائے گی۔'' میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں اور جیسا موقع ہوتا، وہ فوراً کوئی نہ کوئی کہاوت سُنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے، جب ہم شہر کے ایک آڑھتی بنیے کے لیے کمبل بُنا کرتے تھے۔ وہ ہمیں اون اور کمبل ڈیڑھ روپیہ کتائی اور بُنائی کا دیتا اور پھر اسی کمبل کو دس روپے، گیارہ روپے میں بازار میں بیچتا۔ ہاں، تو ایک برس عید کے موقع پر بابا کو آڑھتی کے یہاں سے رقم نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال ولایت اور جاپان سے مشین سے بُنے ہوئے جھاگ جیسے ملائم کمبل سستے داموں میں آ گئے تھے اور ہمارے مظفر نگر کے کمبلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں کمبل بن بکے پڑے

ہوئے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے ولایتی کمبلوں کی ایجنسی لے لی تھی۔ ہاں، تو جب بابا کو پچاس ساٹھ کمبلوں کی بُنائی نہ ملی تو وہ بیچارا ہمارے لیے کپڑا کہاں سے بنواتا؟ وہی پچھلے سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابن سے دھوکر دے دیے۔ جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچکنوں اور نئی ترکی ٹوپیاں پہنے دیکھا، تو ہمیں بڑا رونا آیا۔ پر بابا نے کہا۔ ''ارے، روتے کیوں ہو؟ وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں مست۔'' یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ وہ دن اور آج کا دن، جب کبھی میں کسی امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑفوں کرتے دیکھتا ہوں، تو فوراً اپنی کھال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب، تو جب میں بڑا ہوا تو کئی برس تو اپنے باپ کے ساتھ کمبل بُننے کا کام کرتا رہا۔ مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا، تو میرے باپ نے نمبردار سے سفارش کرواکر مجھے تحصیل دار صاحب کے یہاں نوکر رکھا دیا۔ تحصیل دار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے، خان قدرت اللہ خاں نام تھا اُن کا، بڑے رعب داب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو زور سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جائے۔ شہر بھر اُن سے کانپتا تھا۔ اُن کے یہاں بس مَیں ایک ہی نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چپراسی بھی کچہری کے وقت کے بعد اوپر کا کام کرتے تھے۔

مگر گھر کا سب کام کاج مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کو ایک بُڑھیا دو وقت آ جاتی تھی مگر جھاڑو دینا، روز کمرے کی میز کرسیوں کو جھاڑنا پونچھنا، تحصیل دار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقّہ بھر کر دینا، برتن دھونا، بستر بچھانا، بازار سے سودا سلف لانا۔ یہ سب میرا کام تھا، اور ہاں، ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی تھا۔ وہ تھا تحصیل دار کی بیٹی بانو کی کتابیں اٹھا کر اُسے اسکول چھوڑ کر آنا۔ لڑکیوں کا اسکول کوئی دور نہ تھا۔ بنگلے سے مشکل سے آدھا میل ہوگا اور کھیتوں سے ہو کر جاؤ تو اس سے بھی کم۔ مگر تحصیلدار صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ اُن کی بیٹی خود کتابیں اُٹھا کر لے جائے۔ اس لیے بانو کو اسکول پہنچانا اور وہاں سے واپس لانا— میرا فرض تھا اور سچ پوچھیے تو سارے کاموں سے یہی کام مجھے سب سے اچھا لگتا تھا۔

اُن دنوں میں کوئی 17،18 برس کا ہوں گا۔ صاحب! خدا کے فضل سے ناک نقشہ بھی برا

نہیں تھا، صحت بھی ماشا اللہ اچھی تھی۔
پھر تحصیل دار صاحب نے دو چار پرانی قمیضیں اور شلواریں دے دی تھیں، جنھیں میری ماں نے گونتھ گانتھ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر اور سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال، میں بھی اچھا خاصہ جینٹل مین لگتا تھا۔ بانو اسکول تو برقع اوڑھ کر جاتی تھی، مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیل دار صاحب پردے کے معاملے میں ویسے بڑے کٹر تھے، مگر اُن کا کہنا تھا کہ نوکروں سے کیا پردہ؟ اور وہ ایسے ہی کہتے جیسے کوئی کہے کہ گھر کے کتے سے کیا پردہ؟ یا گھوڑے سے کیا پردہ؟
ہاں تو صاحب، بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ کوئی 15 یا16 برس کی ہوگی، ساتویں کا امتحان دینے والی تھی۔ اُس کا حال کیا بتاؤں، آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔ پر یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔
رنگت ایسی جیسے میدا اور شہد! اور کالے ریشمی برقع میں منھ نکال کر، جب وہ میری طرف دیکھ کر کبھی مُسکرا دیتی، تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو۔
گھونگھر والے بال، بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں۔ میں تو آدمی تھا، سرکار، وہ بھی جوانی کا عالم! پر فرشتے بھی اُسے دیکھ لیتے تو ایک بار اپنی پارسائی کو بھول جاتے۔ پھر بھی وہ مالک کی بیٹی تھی میں نوکر تھا۔ کبھی ایسا ویسا خیال آتا بھی تو میں سوچتا: ''ابے اوٹنڈ وجولاہے کے بیٹے، کیوں پاگل ہوا ہے؟ اپنی اوقات مت بھول، نہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر گنجا ہو جائے گا۔'' اور یہ سوچتے ہی میرا نشہ ایسا غائب ہوتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پر، سرکار، جھوٹ کیوں بولوں، اگلے دن جب اُس کی کتابیں، میں اٹھائے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا بانو کے ساتھ اسکول جاتا اور ادھر اُدھر کسی کو نہ پاکر وہ برقع سر سے اُتار دیتی اور اُس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو، ہوا میں پھیل جاتی تو شیطان مجھے بہکانے لگتا اور کہتا: ''ابے تو نوکر نہیں ہے، یہ مالک کی بیٹی نہیں ہے۔ تو بھی جوان ہے وہ بھی جوان ہے۔
ایسے تو بانو تحصیل دار صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی چہیتی اور اس کے لیے دنیا کا ہر عیش و آرام موجود تھا! پر یہ تحصیل دار صاحب کی دوسری بیوی، خانم جو تھی۔ یہ تو بڑی ظالم تھی۔ سوتیلی بیٹی کو ایک گھڑی خوش دیکھنا اُس کے لیے مشکل تھا۔ پر تھی بڑی چالاک۔ جب تک تحصیل دار صاحب گھر میں رہتے اُن کو دکھانے کے لیے بانو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ پر جیسے ہی وہ

کچہری جانے کے لیے نکلے اور اُس نے چولا بدلا۔ بات بات پر غریب بانو پر ڈانٹ پڑتی، پٹتی بھی بے چاری۔ ایک دن سویرے خانم نے اپنے گود کے بچّے کے گوہ اور موت میں سنے ہوئے، نحالچے اور پوتڑے دھونے کے لیے بانو کو کہا۔ وہ بے چاری اسکول کا کام کر رہی تھی اس میں ذرا دیر ہوگئی۔ خانم گودام میں سے کھانا پکانے والی کو آٹا تول کر دے کر باہر جب نکلی، تو دیکھا نحالچے ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس، آگ ہی تو لگ گئی۔ بانو کے ہاتھ سے اسکول کی کاپی چھین کر پُرزے پُرزے کر دی اور لڑکی کو چوٹی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی اور وہیں چھپر کھٹ کا پایا اُٹھا کر، اس کے ہاتھوں کو نیچے دبا کر خود چھپر کھٹ پر چڑھ بیٹھی اور کہتی رہی تو جب تک معافی نہیں مانگے گی، ناک نہیں رگڑے گی، میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ پر بانو بھی ہٹ کی بڑی پکی تھی۔ دانت بھینچے رہی! نہ روئی، نہ سسکی، نہ معافی مانگی۔

جب خانم کا بچہ رویا تو وہ خود ہی اُٹھی۔ میں برآمدے کے چِک میں سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ جا کر خانم کو جان سے مار دوں۔ جب اس کمبخت کو کمرے کے باہر جاتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ پر اب بانو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ خود پائے اُٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر میں خانم سے ڈرتا ڈرتا کمرے میں گیا اور جلدی سے پلنگ کا پایہ اُٹھایا۔ اس وقت بانو کی آنکھوں کا حال کیا بیان کروں، سرکار! ایسی لگتی تھی جیسے کوئی گھائل ہرنی جسے کسی نے قصائی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچالیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب اُن آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے، پھر تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں بھر رہی ہے۔ آپ ہی بتایئے ایسے موقع پر کوئی کرے بھی تو کیا کرے؟ میرا تو سانس اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ''چھوٹی بی بی کیا کر رہی ہو؟ خانم دیکھ لے گی تو میری کھال اُدھیڑ دے گی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر جیسے ہی دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی نے ساڑھے نو کا گھنٹہ بجایا میں نے کہا— ''اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔'' اور اسکول کا نام سُن کر بانو کی سسکیاں تھم گئیں اور میرے گیلے مونڈھے سے سر اُٹھا کر اس نے کہا۔ ''چل ممدو میری کتابیں اٹھا۔ آج تو میرے ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔''

اس دن بانو اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو میں نے دیکھا کہ برقعے کے اندر اُس نے ایک پوٹلی سی چھپا کر بغل میں داب رکھی ہے۔ اسکول کے راستے میں بانو نے ہمیشہ کی طرح

فاتحہ اُلٹ دی۔ راستہ پگڈنڈی پگڈنڈی کھیتوں میں سے جاتا تھا اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ بولی ــ
ممدو، یوں تو میں مر جاؤں گی۔''

میں نے کہا'' ہاں، چھوٹی بی بی، یہ خانم بڑی ظالم ہے۔''

''پھر؟'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف یوں نظر بھر کر دیکھا کہ میرا منہ گھبراہٹ سے لال ہو گیا۔

''تحصیل دار صاحب سے کیوں نہیں شکایت کرتیں؟ وہ تمھارے باپ ہیں آخر؟''

''ابّا سے شکایت کی تو یہ ڈائن مجھے جان ہی سے مار ڈالے گی۔ اور پھر ابّا میری بات کیوں ماننے لگے؟ تم نے دیکھا نہیں، اُن کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کرتی ہے۔''

''پھر؟'' اس بار میں نے یہ سوال کیا۔

وہ بولی ــ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ــ ''چل، ممدو، کہیں بھاگ چلیں میرے پاس تھوڑا سا زیور، گہنا ہے۔ تیس، چالیس روپے بھی میں نے بچا کر رکھ چھوڑے ہیں۔

امیر چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں، ایسے قصّے میں نے سنے ضرور تھے مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں قصے کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ اب بانو کی زبان سے سُن کر میرا یہ حال ہوا، سرکار، کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ ایسا لگا جیسے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ایک دل کہتا تھا ــ ''ابے ممدو، تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ ایسا موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ذرا لونڈیا کا جُوبن تو دیکھ، اور جولاہوں کی کالی کلوٹی لڑکیوں کا مقابلہ تو کر، جن سے تیری ماں قسمت پھوڑنے والی ہے۔ اور پھر وہ خود کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے بھی ہیں۔ ابے عیش کرے گا عیش! پر، سرکار، دوسرے دل نے کہا ــ ''اپنی اوقات مت بھول، تو ممدو ہے، ممدو۔ بندو جولا ہے کا لونڈا، تحصیل دار صاحب کا نوکر ایسی ویسی کوئی بات کرے گا، تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پر بال نہ رہے گا۔''

وہ تو خیر ہوئی سرکار، کہ اتنے میں سامنے سے اسکول کا کوئی ماسٹر آتا ہوا نظر آ گیا اور بانو نے جھٹ سے نقاب گرا دی۔ پھر آہستہ سے مجھ سے بولی ''چھٹی چار بجے ہوگی، پر تو تانگہ تین ہی بجے لے کر آ جائیو۔ ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتی ہے۔ بس، آج میں گھر واپس نہ جاؤں گی''

ماسٹر پاس سے گذر گیا تو میں نے چپکے سے کہا ــ ''بی۔ بی، ایسی باتیں مت کرو۔ تحصیل

دار صاحب کو پتہ چلے گا، تو میری کھال کھینچ دیں گے۔"

وہ بولی— "ارے، تو مرد ہو کر ڈرتا ہے؟" اور پھر برقعے میں سے سسکی کی آواز آئی۔

"مدوا گر تو تین بجے تانگہ لے کر نہیں آیا تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔"

بس یہ کہا اور وہ تو جھپ سے اسکول کے اندر چلی گئی اور میں وہیں دروازے کے سامنے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی گری ہو۔ آپ ہی بتایئے سرکار، کرتا تو کیا کرتا؟ ایک طرف تو تحصیل دار کے ہنٹر کا ڈر، دوسری طرف بانو کی جان کا سوال۔ نہ جانے کتنی دیر تو میں وہیں اسکول کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا تو سیدھی پگڈنڈی سے بھٹک کر کتنی ہی دیر تک کھیتوں میں بھٹکتا رہا، جب میں واپس پہنچا تو بارہ بج رہے تھے اور خانم غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ ابھی میں نے دروازے میں قدم رکھنا شروع ہی کیا تھا کہ گالیوں، کوسنوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ "کہاں تھا تو اب تک حرامزادے؟ گھر کا سارا کام یوں ہی پڑا ہے، اور تو یوں ہی واہی تباہی پھر رہا ہے۔ کیوں رے، جواب کیوں نہیں دیتا۔ آخر تو تھا کہاں؟"

اور جب میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تو آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی، وہ میری طرف بڑھی۔

"ارے بولتا کیوں نہیں؟ گونگا ہو گیا ہے کیا؟ یہ کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔ پر جیسے ہی اُس نے میرا ہاتھ چھوا، اس کی چیخ نکل گئی— "ارے، تجھے تو تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ ملیریا، کہیں پلیگ تو نہیں ہے؟ گھر میں آج ہی ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔" اور یہ کہہ کر اُس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں ہی وہ مرا ہوا چوہا تھا اور فوراً جا کر کاربولک صابن سے ہاتھ دھونے لگی کہ کہیں میری بیماری کی چھوت نہ لگ گئی ہو۔ تو، سرکار، خدا جو کچھ بھی کرتا ہے، بندے کی بھلائی کے لیے ہی کرتا ہے۔ مجھے پلیگ تو نہیں ہوا، پر ملیریا بخار جو اُس دن چڑھا تو اُس نے ایک مہینہ تک نہ چھوڑا۔ میں ادھ مُوا تو ہو گیا، مگر تحصیل دار صاحب کے ہنٹروں سے میری چمڑی بچ گئی۔ خانم نے تو اُسی وقت ہی مجھے چپراسی کے ساتھ گھر بھجوا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ بس، اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں، مجھے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار ہوتے ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے تو سرسام کا دورہ پڑ گیا اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر بھر کی رضائیاں اور گدڑے میرے

اوپر ڈال دیے پھر بھی کپکپی نہ گئی۔ پر اس بخار کی حالت میں بھی سرکار، بانو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا اور بیہوشی میں بھی بار بار یہی چلا تا رہا۔ ''چھوٹی بی بی تم گھبرانا مت میں پورے تین بجے تانگہ لے آؤں گا۔'' یہاں تک کہ میرے باپ نے تنگ آ کر مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ ''ابے، کیا تانگہ تانگہ بڑبڑا رہا ہے؟ کہیں گرمی دماغ کو تو نہیں چڑھ گئی؟'' مہینہ بھر کے بعد جب چلنے پھرنے کے لائق ہوا، تو سُنا کہ تحصیل دار قدرت اللہ خاں کی بدلی سہارنپور ہو گئی۔

اُن کی جگہ کوئی اور تحصیل دار آیا ہے۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ خان صاحب کی ترقی ہو گئی اب وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حاکم ہوتا ہے۔ سرکار سے تنخواہ بھی کافی ملتی ہے۔ جب ہی تو خان صاحب نے سہارنپور جاتے ہی موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا؟ اب آپ پوچھیں گے کہ تمھیں کیسے پتہ چلا کہ انھوں نے موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا؟ تو بات یہ ہے سرکار، اچھا ہونے کے دو چار مہینے بعد میں لالہ گردھاری مَل آڑھتی کی غلّہ کی دوکان پر اناج کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ سہارنپور سے کوئی زمیندار، ٹھاکر نواب علی ملنے آئے تو کہنے لگے: لالہ سُنا تم نے تمھارے یہاں جو تحصیل دار قدرت اللہ خاں تھے نا۔''

یہ نام سُن کر میرے تو کان کھڑے ہو گئے اور بوریوں کے پیچھے سے دھیان دے کر سننے لگا۔ لالہ بولے ''ہاں! ہاں، وہ تو اب تمھارے یہاں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں۔ اب تو سنا ہے بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ موٹر بھی رکھ لی ہے۔''

ٹھاکر نواب علی بولے: ''ارے لالہ، یہ موٹر ہی کی برکت ہے، موٹر کی، اور نئی تعلیم کی۔''

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی، لالہ بھی بولے۔ ''ٹھاکر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟''

ٹھاکر صاحب نے کہا: ''لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خان صاحب قدرت اللہ خاں کی لونڈیا اُن کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔'' میں نے اپنے دل کو لاکھ سمجھایا کہ اب تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ خان صاحب کے ہنٹر اس سالے ڈرائیور کی پیٹھ پر پڑیں گے۔ تو تو صاف بچ گیا مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار، سچی بات یہ ہے کہ دن بھر مجھ سے ٹھیک سے کام نہ ہو سکا۔ اور اس رات جب ماں نے روز کی طرح پھر بُندی جولاہن سے میرے بیاہ کی بات چھیڑی، تو میں نے بھی کہہ دیا ''اچھا ماں، جیسی تیری مرضی۔'' صبر عجب چیز ہے سرکار، انسان اپنی قسمت پر صبر شکر کرنا چاہے

تو پھر بھی فٹ پاتھ کے پتھر بھی مخمل کے گدّے بن جاتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں بُندی شیدی جولا ہن بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سال بھی نہیں ہوا تھا کہ شیدی نے ایک بچہ جَن دیا۔ اگلے برس ایک بچی۔ پھر تو سرکار نمبر لگ گیا۔ چھ برس میں پورے پانچ بچے۔ تین لڑکیاں اور دو لونڈے۔ پر خدا کی مرضی میں کس کو چارہ ہے؟ اولاد بھی اسی کی دین ہے جب چاہے واپس لے لے۔ ایک بچہ تو پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ ایک لونڈیا دو برس کی ہوکر نمونیا سے ہلاک ہوگئی، اب ایک لونڈا اور دو لونڈیاں رہ گئیں۔ پر اپنے سے اتنی اولاد کو پالنا بھی مشکل تھا۔ گھر کا سارا بوجھ، اب مجھ پر ہی تھا، بابا کی کمر تو کھاٹ کو لگ گئی تھی اور ماں کو آنکھوں سے بجھائی دینا بہت کم ہوگیا تھا۔ بے چاری دن میں بھی ٹا مک ٹوئیاں مارتی تھی۔ میرا بڑا بھائی ایک سال پہلے بمبئی جو گیا، تو پھر لوٹا نہیں تھا۔ نہ کوئی خط ہی بھیجا نہ روپیہ۔

پہلے سنا تھا، کسی کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ پھر سنا کسی فلم کمپنی میں چوکیدار ہے۔ بڑی بڑی خوب صورت ایکٹریسوں کی موٹروں کے دروازے کھولتا ہے۔...... میرا بھی کئی بار جی چاہتا کہ بھائی کے پاس چلا جاؤں، ذرا بمبئی، کلکتہ کی سیر کروں۔ مگر گھر والوں کو کس پر چھوڑوں؟ اور پھر ریل کا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ اسی سوچ وچار میں کئی برس گزر گئے اور ہم مظفر نگر ہی میں محنت مزدوری پر صبر کرتے رہے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اپنا بھی کلکتہ جانے کا ایک موقعہ نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اپنے محلے میں ایک نھنے نان بائی تھا۔ اس کا لونڈا رحمت ایک برس سے دتی میں کام ڈھونڈ ھنے گیا ہوا تھا۔ وہ جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل جینٹل مین بنا ہوا ہے۔ جاپانی سلک کی قمیض، گلے میں سونے کے بٹن، بال انگریزی فیشن کے بنے ہوئے۔ میرے بچپن کا یار تھا۔ میں نے کہا ''کیوں بے رحمت کہاں سے گڑا خزانہ مل گیا؟'' بولا ''ہم تو پانی سے سونا بناتے ہیں۔'' میں سمجھا سالے کو کیمیا بنانے کا نسخہ ہاتھ آ گیا ہے، پر اُس نے بتایا کہ اُس نے ریل میں سوڈا لیمن بیچنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، اسی سے دو ڈھائی سو روپیہ مہینہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا ''تیس روپیہ مہینہ تو میں اپنے نوکروں کو دیتا ہوں، جو ہر اسٹیشن پر سوڈا لیمن کی آواز لگاتے ہیں اور سارے کلکتے اور بمبئی کی سیر مفت کرتے ہیں، وہ الگ۔'' یہ سُن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا ''بھیا رحمت ایک بار کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔''

سو سرکار، سوڈا لیمن بیچتے بیچتے میں بھی کلکتہ پہنچ ہی گیا۔ میں نے تو پہلے دلی بھی نہیں دیکھا تھا۔ کلکتہ دیکھ کر تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف سڑکیں، یہ موٹریں، بس، ٹرامیں، میں نے پہلے کہاں دیکھی تھیں؟ میں نے سوچا رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت بھیجو اور یہیں رہ پڑو۔ وہ دن اور آج کا دن پندرہ برس ہو گئے۔ آج تک کلکتہ سے باہر قدم نہیں دھرا۔

پہلے تو کئی مہینہ رکشا چلاتا رہا۔ دن میں کبھی کبھی دو ڈھائی روپے بھی مل جاتے تھے، میں نے سوچا یہ کام تو بڑا اچھا ہے۔ مہینے میں ساٹھ ستر روپے مل جاتے ہیں۔ مزدوروں کے محلے میں ایک کوٹھری لے لی تھی۔ دس روپیہ اُس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی دس پندرہ روپے بیوی کو بھی بھیج دیتا تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ اُس پر کیا گزری۔ جوان آدمی تھا سرکار اور پھر کلکتہ میں روپیہ دو روپیہ میں سوناگاچی میں نئی بیوی مل جاتی ہے، تو پھر ہزار میل دور بھینگی بدصورت بیوی کو روپیہ بھیجنا تو بڑا مشکل ہوتا ہے! اور پھر دارو پینے کی عادت بھی پڑ گئی تھی سرکار۔ آپ کہیں گے کہ یہ آدمی بڑا آوارہ بدمعاش ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لیے تھوڑی سی دارو ضرور چاہیے اور پھر دارو کے بعد، جانے کیسے پھر آپ ہی آپ قدم سوناگاچی کی طرف چل پڑتے ہیں۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلائی، کوئی سو سوا سو روپے آڑے وقت کے لیے جمع بھی کر لیے۔ پر یہ پتہ نہ تھا کہ آڑا وقت اتنی جلدی آ پہنچے گا۔ برسات کے دنوں میں بھیگ کر بخار چڑھا، بخار سے نمونیا ہو گیا۔

ڈاکٹر نے کہا ''رکشا کھینچتے کھینچتے پھیپڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ کام چھوڑ دو۔''

پورے ڈیڑھ مہینے کھاٹ پر پڑا رہا۔ جب بخار نے پیچھا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جتھا جو کچھ تھا وہ سب ختم ہو چکا تھا، پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمونیا سے مرا نہیں، سوچا زندہ تو ہوں۔ لعنت بھیجو رکشا پر۔ چلو اور کوئی کام کریں گے۔ کلکتہ میں جہاں خدا تیس لاکھ کو روزی دیتا ہے۔ کیا مجھے ہی نہ دے گا؟ اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھا رہا۔

میری برابر والی کوٹھری میں اپنی ہی طرح کے کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہرنام تھا۔ بلند شہر کا، باپ نے ساری جائیداد شراب پی پی کر اُڑا دی تھی، بیٹے کو پڑھایا لکھایا نہیں سو وہ

اب کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک بنارس کا چمار تھا منگو، ایک چیلی بھیت کا مسلمان تھا، رحمت خاں، اور مزا یہ کہ تینوں میں گہری دوستی تھی اور تینوں ایک ساتھ ہی رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اکیلے میں رحمت خاں سے کہا بھی کہ تم ان کافروں کے ساتھ رہتے ہو، ایمان دھرم کا بھی کچھ خیال نہیں؟ وہ گالی دے کر بولا: ''ارے ایمان دھرم کی ایسی تیسی ہمارا دھرم تو مزدوری ہے، مزدوری۔

ان تینوں نے مجھ سے کہا۔ ''چل تجھے اپنے کارخانے میں نوکری دلائے دیتے ہیں۔ دو روپے روز ملیں گے۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ رکشا کھینچ کھینچ کر پھیپھڑے کھوکھلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی رہے گی۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے میں لے گئے، جہاں پٹ سَن کی بُنائی ہوتی تھی، اور مزدوروں کے ٹھیکیدار کو جسے سب سردار، سردار کہتے تھے، میری طرف سے پانچ روپے رشوت بھی دے دیے۔ پر مجھے نوکری بھی نہ ملی۔ ویونگ ماسٹر بولا۔ ''کام آج کل مندا ہے۔ اس لیے ہم تو پہلے سے بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں۔ نیا آدمی کہاں سے رکھ سکتے ہیں؟ اور میری جانب اشارہ کر کے بولا'' پھر اسے ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے۔ کتنے ہی دن تو اُسے کام سیکھنے میں لگ جائیں گے۔''

میں واپس آ گیا اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ پر خدا کا کرنا کیا ہوا، اسی دن اُس کارخانے میں ہڑتال ہو گئی۔ ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا، بازار میں مندی ہونے کی وجہ سے ہمیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑے گی یا ان کی تنخواہ کم کرنی پڑے گی۔ اس لیے ہم نے دو روپے سے گھٹا کر ڈیڑھ روپے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مزدوروں نے جب یہ سنا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ہڑتال کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے رحمت خاں اور منگو دونوں کو ہڑتال کی باتیں کرتے سُنا تو بولا۔ ''تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ آٹھ آنے کی لالچ میں ڈیڑھ روپے کی آمدنی پر لات مار رہے ہو؟'' ارے بھائی جو ملتا ہے اُسی پر صبر کرو۔ خدا کی مرضی ہو گی تو مزدوری بڑھ جائے گی۔'' مگر ان دونوں پر تو ہڑتال کا بھوت سوار تھا۔ رحمت خاں بولا۔ ''اگر اس وقت ہم نے چُپ چاپ پگار کٹوائی، تو یہ مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے، سینے پر! ''اور منگو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا: ''اگر بازار میں مندی ہوا ہی ہے تو یہ سالا مالک پانچ موٹروں میں سے دو ایک کیوں نہیں بیچ دیتا؟ سالے نے تین تین تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں، جن

میں سے ایک ولائتی میم بھی ہے۔"

"ہاں تو جب یونین والوں نے ہڑتال کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا۔ مگر ہرنام سویرے اُٹھ کر چپ چاپ کام پر چلا گیا۔ بستی میں خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو ہڑتال میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ رحمت تو کہنے لگا۔ "نہیں نہیں ایسے ہی گھومنے گیا ہوگا۔" مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اُس کے کپڑوں پر لگے کالکھ کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کام کر کے آرہا ہے۔ منگو تو لگا ماں بہن کی گالیاں دینے، مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا— "کیوں ہرنام یہ سچ ہے؟" یہ سُن کر ہرنام چلّا کر بولا— "ہاں ہاں، گیا تھا کام پر! کرلے جس کا جو جی چاہے۔"

رحمت اب بھی دھیرے سے ہی بولا— "اچھا یہ بات ہے؟" پھر وہ اُٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اُس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر، ٹین کا ٹرنک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑی خاموشی سے اُس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا۔ چُپ چاپ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور حقّہ گڑگڑانے لگا۔ ہرنام کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بانہیں چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا مگر منگو بیچ میں آ گیا۔ کالا کلوٹا منگو تھا تو دُبلا پتلا سا، مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھرتیلا بھی تھا۔ ہرنام کو روک کر اُسے الک لنگڑی جو دی، تو چاروں خانے چت زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بستی بھر کے مزدور وہاں جمع ہو گئے۔ ہرنام سے سبھی جلے ہوئے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر سبھی کھکھلا کر ہنس پڑے۔ اب جو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا اٹھا، تو دیکھا کہ چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے، تو سارے کے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے! اس لیے اس بیچارے نے اپنی چیزیں اکٹھی کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں پھر میرے پاس آ کر بولا— "کیوں ممدو، تیرے یہاں آ جاؤں؟ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دے دیا کروں گا۔"

سرکار، اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں۔ میں ٹھہرا بیکار۔ مجھے تو پہلے ہی فکر تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دوں گا۔ سو میں نے کہا۔ "تو بے کھٹکے یہاں آ جا، ہرنام۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔" وہ جو کہتے ہیں کہ کر بھلا تو ہو گا بھلا، سو وہی ہوا۔ میں نے ہرنام کو رہنے کے لیے کوٹھری میں جگہ دے

دی اور اس نے اگلے ہی دن مجھے کارخانے میں نوکر رکھا دیا۔

ہڑتال کی وجہ سے مالک ہر کسی کو رکھنے کے لیے تیار تھے۔ چاہے اُسے کام آتا ہو یا نہیں بس دو ہاتھ دو ٹانگیں ہونی چاہیے۔ سو میں بھی ڈیڑھ روپے روز پر نوکر رکھ لیا گیا۔ اوپر سے ایک روپیہ روز ''اسٹرائک الاؤنس'' ملتا تھا اور ملنا بھی چاہیے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے۔ روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ دو ایک بار اینٹ پتھر بھی ہم پر پھینکے گئے! پر میں نے کہا— ''جو بھی ہو، ہڑتال کر کے بھوکا مرنے سے بہتر ہوگا۔''

ہاں، تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا، مگر مجھے کام آتا ہی نہ تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہرنام نے ''ویونگ ماسٹر'' سے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ میں نے اسے کام سکھا دیا ہے۔ اب یہ ایک مشین سنبھال سکتا ہے۔ کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں، تاکہ اخباروں میں یہ اعلان کر سکیں کہ ہڑتال فیل ہو گئی اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہرنام نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو تو یہی ظاہر کیجیو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے پاس ہی تھی۔ میں برابر اس کو دیکھتا رہتا اور جو وہ کرتا وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے بٹن دبایا میں نے بھی دبا دیا، اس نے تیل کی کُپی لے کر پُرزے میں تیل دیا میں نے بھی یہی کیا۔ اس نے مشین تیز کی میں نے بھی کی۔ تین دن تو میں نے ایسے ہی گزار دیے۔ پگار تو ہفتہ کے ہفتہ ملنے والی تھی مگر اسٹرائیک الاؤنس کا روپیہ روز کا روز مل جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اپنی بلا سے— اسٹرائیک عمر بھر چلے۔

اتنے میں مجھے مشین کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا تھا— کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔ کام تو سارا مشین کرتی تھی۔ ہمیں تو صرف بٹن دبا کر مشین چالو کرنا اور اس کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ چوتھے دن ہرنام کی مشین کا پُرزہ بگڑ گیا اور اُسے کہیں دوسری مشین پر لگا دیا گیا—

''کیوں مدو سنبھال لے گا نا؟'' میں نے کہا ''تو فکر نہ کر اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگے ہیں۔'' پھر بھی وہ جاتے جاتے لوٹ کر آیا اور کہنے لگا۔ ''ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کیجیو۔''

ہاں تو وہ دوسری مشین پر چلا گیا۔ اب اس کی مشین اور کتنی مشینوں کی طرح بیکار کھڑی تھی۔

مگر میری مشین کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کام کر رہی تھی۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ، مشین چل رہی تھی اور میں خدا کی قدرت پر عش عش کر رہا تھا کہ واہ واہ! ان ولائت والوں کو کیا عقل دی ہے۔ انسانوں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں۔ جب ہم کمبل بُنتے تھے اور میرا باپ اون کو دھو اور دُھن کر اس میں سے میل نکالتا تھا، پھر میری ماں چرخے پر اون کاتتی تھی، پھر ہم سب بھائی، بہن تانا تیار کرتے تھے، پھر کرگھے پر میرا باپ کمبل بُنتا تھا۔ اور اس طرح ہم سب کی کئی دن کی محنت کے بعد نو گز کمبل تیار ہوتا تھا۔ تانا بانا ہو رہا تھا، کپڑا بُنا جا رہا تھا، لپٹا جا رہا تھا۔ اور کتنی تیزی کے ساتھ! میرا باپ اور ماں اور سب بھائی اور پڑوسی، بلکہ مظفر نگر کے سارے جولا ہے مل کر ایک مہینے میں اتنا کپڑا نہیں بُن سکتے تھے جتنا یہ مشین ایک گھنٹے میں بُن رہی تھی۔ واہ واہ! سبحان تیری قدرت، اب اس کپڑے کی بوریاں بنیں گی۔ ان بوریوں میں دھان اور گیہوں اور دالیں اور مرچی، نمک بھر کر دوسرے ملکوں کو بھیجا جائے گا۔

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، مشین چلی جا رہی تھی۔ میں نے بجلی کی پھرکی دبا کر گھما کر مشین کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس تیز رفتار میں مجھے مزہ آ رہا تھا۔ کپڑا اب اور تیزی سے بُنا جا رہا تھا۔ اور اسی تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا، میں سوچ رہا تھا، یہ کس کس دیش کی میر کرے گا؟ کتنا اچھا ہوتا کہ اسی کپڑے میں لپیٹ کر میں بھی ..... کھٹا کھٹ، مشین کے گیت میں مجھے ایک بے سُری سی آواز سنائی دی۔ سامنے دیکھا تو ایک جگہ سے تانے کا تار ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگے کی نلی اِدھر سے اُدھر بار بار گھوم رہی تھی مگر بُنائی نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے کرگھے پر جب کبھی اُون کا دھاگہ ٹوٹ جایا کرتا تھا، تو میرا باپ دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک مروڑی دے دیتا تھا، بس دھاگے پھر جُڑ جاتے اور تانے بانے کا سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ ایک دم میرے دماغ میں بھی یہی آیا کہ ممدو، تو بھی یہی کر اور یہ ذرا بھی نہیں سوچا کہ یہ بجلی سے چلنے والی مشین ہے۔ بندو جولا ہے کا کرگھا نہیں ہے۔

بنا مشین بند کیے میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹوٹے ہوئے سرے پکڑنے چاہے مگر میری بانہیں چھوٹی تھیں اور مشین لمبی تھی۔ ایڑیاں اُٹھا کر مجھے کافی آگے کو جھکنا پڑا۔ کھٹا کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ کھٹ، مشین چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی دھاگے کا ٹوٹا ہوا سرا میرے ہاتھ میں آیا، میرے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے اور میں منہ کے بل مشین کے تنے ہوئے کپڑے پر آ رہا۔ کھٹا کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ کھٹ، مشین چل رہی تھی اور اس کے ساتھ مجھے اندر گھسیٹ رہی تھی۔ کپڑا لوہے کے

رولر پر لپٹا جارہا تھا اور میں مشین کے فولادی جبڑے کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ اس وقت تو سرکار، مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا ہاتھ پاؤں مارے، مگر کپڑے کے جھول میں اتنا اُلجھ گیا تھا کہ کسی طرح نکلنے کی صورت نہ نکلی اور ایک بار جو میں نے ٹانگوں کو زور سے جھٹکا دیا تو بایاں پاؤں اس کمبخت مشین کے نہ جانے کس پرزے میں پھنس گیا۔ اب میں لاکھ چھڑانا چاہتا ہوں، مگر پاؤں نہیں نکلتا، بلکہ میں گھسٹتا چلا جارہا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور کتنے ہی مزدور میری طرف دوڑے، ویونگ ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ ''بجلی بند کرو! بجلی بند کرو!'' مگر ابھی کوئی بٹن نہ دبا پایا تھا کہ کھٹاک سے آواز آئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی بھیانک ہاتھ نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں اور پھر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی......

جب مجھے ہوش آیا تو میں مفت اسپتال میں پڑا تھا اور میری داہنی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر پہلے تو مجھے دکھ ہوا، مگر پھر میں نے سوچا، خدا کا شکر ہے ٹانگ ہی گئی، جان تو بچ گئی۔ اور اگر دونوں ٹانگیں چلی جاتیں، تو کیا ہوسکتا تھا۔ آج میں بھی اس لنجے رولدو کی طرح بانہوں اور کولھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا۔

ہاں تو، سرکار پندرہ دن کے بعد جب میں اس اسپتال سے نکلا تو میں لنگڑا ہو چکا تھا۔ میری جیب میں صرف سات روپے تھے، چھ روپے تو ہرنام نے چار دن کی مزدوری کے لے کر دیے تھے اور ایک روپیہ میرے پاس پہلے کا بچا ہوا تھا۔ ہرنام نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے، ویونگ ماسٹر سے بات چیت کی تھی کہ کارخانے کی طرف سے میری کچھ مدد کی جائے، مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اناڑی مزدور اگر اپنی بھول سے اپنی ٹانگ اور ہماری مشین توڑ ڈالے، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مل مالکوں کی طرف سے ہرجانہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ خیر میں نے دل کو سمجھایا کہ مدد خدا تیرے صبر کا امتحان لے رہا ہے گھبرا مت۔ جب میں بستی آیا اور گاڑی سے اُتر کر دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنی کوٹھری تک پہنچا تو رحمت، منگو، اور بہت سے مزدور مجھے دیکھنے آئے، تھوڑی دیر تو سب چُپ چاپ کھڑے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتے رہے؟ اور اُن کو اس طرح سے گھورتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے غصہ کا پارا ایک دم تیز ہوگیا۔ اور میں چلّایا۔ ''یہاں کھڑے۔ کھڑے کیا گھورتے ہو! کیا پہلے کبھی ایک ٹانگ کا آدمی نہیں

دیکھتا؟ نکلو یہاں سے!'' اس پر وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے پر رحمت وہیں کھڑا رہا۔ پھر دیر تک سنے بولا۔ ''مردو یہ خدا نے تجھے ہرتال توڑنے کی سزا دی ہے!'' بس یہ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ پھر یہ سُن کر مجھے ذرا سا بھی غصہ نہ آیا! صرف میں نے سوچا۔ کتنا بدقسمت ہے یہ رحمت! اسے صبر کی قدر ہی نہیں معلوم! اور پھر کون جانتا ہے! شاید خدا ہڑتال توڑنے والوں ہی سے خوش ہوا اور اس لیے اتنے سخت حادثہ کے باوجود میری جان بچ گئی۔ ورنہ سب ہڑتال توڑنے والوں کی ٹانگیں ٹوٹنی چاہیے تھیں!''

ہاں! تو سرکار، صبر کے امتحان میں میں پورا اترا۔ جب ربڑ یا لکڑی کی ٹانگ نہ ملی تو میں نے صبر کی ٹانگ لگوالی اور کباڑی کے یہاں سے یہ دو بیساکھیاں لے لیں اور اُس دن سے ان کے سہارے ہی کود پھاند کر چل لیتا ہوں۔ جب محنت مزدوری ممکن نہ ہوئی تو بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ روزی دینے والا تو خدا ہے۔ انسان تو اس کا ذریعہ ہے۔ پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے میں کہاں کی شرم؟ اصل میں تو ہم خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے سرکار، کہ بھیک میں ڈیڑھ دو روپیہ روز سے زیادہ کما لیتا ہوں۔ پھر کارخانے میں جان کھپانے سے کیا حاصل؟ اور ہاں جب ہرنام بیوی بیاہ کر لے آیا اور اُس نے مجھے میری ہی کوٹھری سے نکال دیا، تب سے میں نے یہاں سڑک کی پٹری پر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ چھتیں اور فرش، بنگلے اور کوٹھیاں، اور پلنگ کرسیاں — یہ سب تو بیکار کے چونچلے ہیں۔ صبر کی چھت اور صبر کا فرش ہو تو سڑک کا کنارہ بھی محل بن جاتا ہے۔

کتنے ہی مہینے میں نے صبر سے بھیک مانگ کر بتا دیے ہیں۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں مزا آنے لگا۔ نہ محنت، نہ مزدوری، نہ مالک مکان کو کرایہ دینا، نہ چولہے چکی کا بکھیڑا، فقیر کی زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے۔ میں اور تمام بندھنوں ضرورتوں اور جھگڑوں سے تو آزاد ہو گیا، پر کٹی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں کو تنگ کرتی ہے۔ جب میرے پاس پانچ دس روپے جمع ہو جاتے تھے، میں رات کو چپکے سے سوناگاچی پہنچ جاتا تھا، آپ جانتے ہی ہیں، سرکار، اس بازار میں امیر غریب، نواب فقیر، سب برابر ہیں۔ جس کی جیب میں دام ہوں، وہ جو مال چاہے خرید سکتا ہے — چاہے وہ لنگڑا لولا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے۔ میں بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا سونا گاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا! یہ جگہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اکثر میں وہیں آیا کرتا تھا! دو روپیہ میں سودا ہو جاتا تھا! مگر اس رات کو بوڑھی نائکہ نے مجھے دیکھتے ہی ہنس کر کہا— ''کیوں رے لنگڑے پھر آ گیا تو؟ پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا! گدڑی میں پانچ روپے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں تو راستہ پکڑ۔'' اُن دنوں مجھے بھیک میں اچھی رقم مل رہی تھی، چالیس کے نوٹ تو میں نے گدڑی کے اندر سیے ہوئے تھے اور سات آٹھ روپے اور کچھ پیسے اس وقت بھی میرے پاس تھے۔ میں نے کہا— ہاں لنگڑا ہوں تو کیا؟ پیسہ میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ مال دکھاؤ پانچ روپے بھی مل جائیں گے۔''

پر وہ بڑی گھاگ تھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی، مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے کمرے میں ڈھکیل دیا۔ اندر جا کر میں نے بیساکھیاں تو پھینک دیں اور پلنگ پر سو گیا، لونڈیا کوئی بیچ بچ نئی معلوم ہوتی تھی، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا میری جان صورت تو دکھاؤ! میں لنگڑا ہوں پر تمھیں خوش کر دوں گا۔'' مگر اس نے گھونگھٹ اُٹھایا، تو یقین مانیے، سرکار، میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ چلائی— ''ممدو۔''

اور میں نے کہا: ''چھوٹی بی بی، تم کہاں؟'' وہ بولی 'ہاں، ممدو، یہ میری قسمت کا پھیر ہے، تمھاری ٹانگ کیا ہوئی؟''

میں نے کہا: ''اور یہ میری قسمت کا پھیر ہے!''

وہ رو رہی تھی۔ میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی، تو بانو مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دھیان سے دیکھا، ان تین برسوں میں اس کا وہ رنگ و روپ نہ رہا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر میں تیس پینتیس کی لگتی تھی۔ آنکھوں کے گرد گڈھے پڑ گئے تھے، پاؤڈر سرخی کے ہوتے ہوئے بھی رنگت پیلی تھی! آدھی اتنی ہو گئی تھی کہ بانہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئیں تھیں۔ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ جب آنسو کچھ دیر کو تھمے، تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا! جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگی تھی، وہ بڑا بدمعاش نکلا، یہاں لا کر دو تین مہینہ تو بانو کا زیور بیچ بیچ کر خوب عیش کیا، پھر جب گزارے کی کوئی صورت نہ رہی تو اس نے کرم پر مجبور کیا اور ایک رات کو اسے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ کر غائب ہو گیا۔

میں نے کہا: ''پر چھوٹی بی بی، تم نے پولیس میں کیوں نہ رپورٹ لکھوائی؟ تم تو پڑھی لکھی ہو، تحصیل دار صاحب کو لکھا ہوتا، وہ آ کر تمھیں لے جاتے اور اس سؤر کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔''

وہ بولی: ''پولیس میں رپٹ لکھواتی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ زبردستی واپس گھر بھیج دیا جاتا۔ جو کچھ مجھ پر گزر چکا تھا، اس کے بعد میں کیا منہ لے کر ابا کے سامنے جاتی؟

مطلب یہ کہ بیچاری بانو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخر میں گھسیٹا رنڈی خانے میں پہنچی تھی۔ جہاں قسمت اسی رات مجھے لے آئی تھی۔ میں نے کہا: ''اب تم کوئی فکر نہ کرو جب تک ممدو کے دم میں دم ہے، تمھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔ اب میں تمھیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے نرک میں نہ رہنے دوں گا۔''

وہ آنکھیں نیچی کر کے بولی: ''پر ممدو، میں بیمار ہوں، بہت بری بیماری ہے۔''

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی، جو بانو کے چاند جیسے مکھڑے کو داغدار بنائے ہوئی تھی۔ مگر میں نے کہا— ''کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں ہی کون سا چھبیلا جوان ہوں؟ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں۔ میں تمھارا علاج کراؤں گا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سنا ہے، اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے چلو میرے ساتھ اسی وقت۔''

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ میں نے کہا— ''آ جاؤ۔'' بوڑھی نائکہ بولی: ابے او لنگڑے! پانچ روپے ہی دیے ہیں، کوئی رات بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔'' پیچھے ایک بھیانک، کالا سا، موٹا تگڑا آدمی نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور دوسرے سے بیساکھیاں اُٹھاتے ہوئے کہا:

''یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے، اب یہ یہاں نہ رہے گی۔''

اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا، ٹھیک یاد نہیں، شاید نائکہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ بانو کو دبوچنے کے لیے بڑھا۔ بانو کی چیخ ضرور یاد ہے— ایسی چیخ جو پتھر دل کو موم کر دے۔ نہ جانے کب اور کیسے میری بیساکھی ہوا میں اُٹھی۔ اور اس شرابی کی کھوپڑی پر گری۔ اگلے پل میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا اور اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا، اور نائکہ چلاّ رہی تھی— ''خون! خون! کوئی آؤ، دوڑو، اس خونی کو پکڑو!'' اور بانو ڈری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی—

''ممدو، یہ تو نے کیا کیا؟'' اور میں کہہ رہا تھا۔ ''چھوٹی بی بی، تم فکر نہ کرو، اس دن میں تانگہ وقت پر نہ لایا تھا، یہ اس کی سزا ہے۔''

اور سو، وہ دن اور آج کا دن۔ دس برس قید کاٹی، پرسوں ہی چھوٹا ہوں، اب پھر وہی سڑک کا کنارہ ہے، وہی صبر کا فرش اور صبر کی چھت ـــ سنتا ہوں، ان دس سالوں میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہوئی ہوگی۔ سنتا ہوں لاکھوں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ مارے گئے اور اس کلکتے کی سڑکوں پر خون کے دریا بہے۔ بہے ہوں گے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا۔ ہوا ہوگا۔ مجھے تو پتہ نہیں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک پہلے سے کم ملتی ہے اور بہت سے رحم دل بابو بھی جب پاس سے گزرتے ہیں اور پیسے دینے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ لے جاتے ہیں تو جیب کو خالی پاتے ہیں......

پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک ٹانگ تو ہے۔ رولدو کی طرح بالکل اپاہج نہیں ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے اور میرے پاس ہے...... وہ بڑھیا آپ دیکھتے ہیں نا؟ سامنے بیٹھی اپنے سفید بالوں سے جوئیں نکال کر مار رہی ہے، وہی بانو ہے ـــ بانو، جس کی رنگت کبھی ایسی تھی جیسے میدا اور شہد، اور جو کبھی کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہو، جس کی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں، اور جس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کرنے کو کافی تھی۔ اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں، اور سارا بدن پیپ رستے ہوئے پھوڑے، پھنسیوں سے پٹا پڑا ہے اور بہت دن ہوئے اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کے سُکھ یاد ہیں اور نہ جوانی کے دُکھ۔ نہ تحصیل دار صاحب، نہ خانم، نہ ممدو۔ دن بھر وہ بیٹھی بیٹھی جوئیں مارتی رہتی ہے اور آپ ہی آپ نہ جانے کیا بڑبڑاتی ہے......

مگر شکر اللہ کا، بانو زندہ ہے اور میرے پاس ہے اور میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔

مسوری 1952

(قرۃ العین حیدر سے معذرت کے ساتھ)

روز کاٹج، مسوری

11 جون 1952

اوشا ڈارلنگ!

تم ضرور خفا ہوگی کہ میں نے اب تک تمھیں خط نہیں لکھا اور شاید یہی سوچتی ہوگی کہ مسوری جا کر سلمٰی نے تمھیں بھلا دیا۔ یقین مانا کہتی ہوں سچ (کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے) جب سے ہم یہاں آئے ہیں۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ تمھاری یاد نہ آئی ہو یا تمھیں خط لکھنے کا ارادہ نہ کیا ہو مگر پاپا اور ممی اور بھائی جان کی مشترکہ سازش سے مجھے صبح سے شام تک اتنا مصروف رکھا جاتا ہے کہ ایک منٹ کی بھی فرصت یا تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔ صبح کا ناشتہ نہیں کر پاتی کہ بھائی جان کا حکم ہوتا ہے کہ رائڈنگ کو چلو۔ (پہلے چند روز تو سلیکس میں ہی سواری کی۔ مگر اب میں نے برجیس سلوائی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ رائڈنگ ڈریس میں میں بری نہیں لگتی) ہاں تو کیملو بیک روڈ کا چکر لگا کر آتے ہیں تو گیارہ بج جاتے ہیں اور رمی کا دور شروع ہوتا ہے۔ پاپا تو تم جانو رمی کے پرانے شوقین بلکہ ماہر کھلاڑی ہیں اور بھائی جان کو انھوں نے خود ہی سکھایا ہے۔

مگر میری خاطر ممی نے بھی رمی کھیلنی شروع کر دی ہے تاکہ ان کی اکلوتی پیاری بیٹی سلمٰی کا جی نہ گھبرائے۔ ہاں تو لنچ تک رمی کا سلسلہ رہتا ہے اور لنچ کے بعد ممی کا حکم ہوتا ہے، آرام کرو ورنہ تمھاری صحت خراب ہو جائے گی۔ رنگت پھیکی پڑ جائے گی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آج کل ممی میرے کمرے ہی میں سوتی ہیں۔ (بیٹی کی خاطر پاپا کا ایثار تو دیکھو) شاید اُن کو خدشہ یہ ہے کہ میں دوسنٹ بھی اکیلی رہی تو کہیں انگوٹھی کا ہیرا نہ چبا لوں۔

تو اس طرح چائے کا وقت ہو جاتا ہے اور چائے پیتے ہی باہر نکلنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ تم جانتی ہو مسوری میں فیشن ایبل لڑکیوں کی کتنی کثرت ہوتی ہے۔ اگر روز نئی ساڑی یا شلوار یا غرارے کا نیا سوٹ نہ پہنو اور میک اَپ پر آدھ پون گھنٹہ نہ لگاؤ تو لائبریری کی ''گرل پریڈ'' میں شاید کوئی نوٹس نہ لے۔ اس لیے کافی محنت کرنی پڑتی ہے (ہاں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ پاپا نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر کتنے ہی نئے کپڑے مجھے سلوا دیے ہیں۔) کوئی دس تو نئی ساڑیاں ہیں۔ شیفون کی ایک نیلی ساڑی لی ہے اور اس کے ساتھ سنہری بروکیڈ کا ایک بہت ہی چست بلاؤز۔ میری جان دیکھو تو ایک بار تم بھی ڈُم ہو جاؤ۔

شام کو ہم لوگ لائبریری کی بھیڑ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے کیونکہ پاپا کہتے ہیں یہاں اب LOW CLASS کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی لائبریری کو ایک سرے سے BY PASS بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس نچلے درجے کی لڑکیوں میں کوئی کوئی بڑی ہی حسین صورت نظر آتی ہے اور انھیں دیکھنے کے لیے ہائی کلاس کے لڑکے ادھر روز چکر لگاتے ہیں۔ کمبخت اس بری طرح گھورتے ہوئے گزرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے ان کی ایکس رے نگاہیں کپڑوں کو چیرتی ہوئی ننگے بدن کو گدگدا رہی ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ گردن کٹی کھال اُتری ہوئی بکریاں ہیں۔ جو قصائی کی دوکان پر لٹکی ہوئی ہیں اور ہمارا گوشت خریدنے کو یہ سب لڑکے جمع ہیں اور کوئی کہتا ہے ''ران کا گوشت دینا'' اور کوئی کہتا ہے: ''سینے کا''۔ کبھی کبھی تو میرا جی متلانے لگتا ہے اور طبیعت چاہتی ہے کہ اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالوں۔ میک اَپ کیے ہوئے منہ پر کیچڑ مل لوں اور کسی پہاڑن کے گندے چیتھڑے پہن کر اس سڑک سے گزرا کروں تاکہ یہ بے شرم بے رحم نگاہیں گدگدانے، چھیڑنے، کاٹنے کو میری طرف نہ دوڑیں۔

ہاں تو اس طرح لائبریری سے گزرتے ہوئے ہم ہیک مینز کے ہال روم پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں پاپا اپنا مقررہ چار پیگ وہسکی کے پیتے ہیں اور بھائی جان ان کی نظر بچا کر کسی دوسری میز پر جا کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیئر کا ایک گلاس پی آتے ہیں۔ اور ممی کوئی پندرہویں بار یہ اعلان کرتی ہیں کہ شیری کوئی شراب تھوڑے ہی ہے۔ مگر میرے لیے کافی ہی آرڈر کی جاتی ہے۔

پچھلی بار ہم ۱۹۴۷ کے سیزن میں مسوری آئے تھے۔ جب تو میں میٹرک میں پڑھتی تھی اور کانونٹ اسکول کا نیلا یونیفارم پہنتی تھی۔ نہ میک اَپ کرنے کی اجازت تھی نہ ہیک مینز ہال روم میں آنے کی۔ اس لیے مجھے تو اس زمانے کی کوئی خاص یاد نہیں ہے مگر پاپا (جنھوں نے فسادات کے بعد پہلی بار مسوری پھر آنے کی ہمت کی ہے) کہتے ہیں۔ اب مسوری میں وہ LIFE اور GAIETY نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک تو تم جانو ان کے پیارے انگریز اب یہاں مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پھر ان کے تعلقہ دار SET کے اکثر مسلمان پاکستان چلے گئے ہیں، جو باقی ہیں ان میں سے بہت سے زمینداری ابالیشن کے بعد اب مسوری آنا افورڈ ہی نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو سنہ 1947 کے واقعات سے اب تک خوفزدہ ہیں اور اس لیے اِدھر کا رُخ نہیں کرتے۔ مگر پاپا کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اب گھٹیا درجے کے لوگ مسوری آنے لگے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں کے وکیل، ڈاکٹر، تحصیل دار، ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔ بھلا ان لوگوں کو پاپا کب خاطر میں لاتے ہیں۔ رہے بزنس کلاس کے لوگ سندھی اور پنجابی۔ روپیہ تو ان لوگوں کے پاس بہت ہے اور خرچ بھی کرتے ہیں بری طرح۔ شراب تو پیتے نہیں لنڈھاتے ہیں مگر پاپا کہتے ہیں یہ سب بدمذاق ہیں۔ ان میں کلچر نہیں ہے۔ ان کی فلم اسٹاروں کی تصویروں والی شرٹس اور چیختے ہوئے رنگوں کی ٹائیاں دیکھ کر تو پاپا تلملا اُٹھتے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ان سب کو زبردستی مسوری سے باہر کر دیں۔ مشکل یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ ''ہیک مینز'' میں بھرے رہتے ہیں۔ ان کی لڑکیاں، بیویاں سب سے بڑھیا کپڑے پہنتی ہیں اور سب سے زیادہ میک اَپ کرتی ہیں۔ ڈانس بھی زوروں سے کرتی ہیں۔ دو چار سندھی پنجابی نوجوانوں نے بھی مجھ سے ڈانس کے لیے کہا مگر میں نے پاپا کے ڈر کے مارے انکار کر دیا اور پھر مجھے ڈانس آتا بھی نہیں تھا۔ ممی ایک زمانہ میں ڈانس کیا کرتی تھیں۔ اب نہیں کرتیں۔ میں نے پاپا سے کہا کہ پھر کیا ہرج ہے،

میں بھی سیکھ لوں؟ پہلے تو انھوں نے اجازت نہیں دی کہنے لگے ان دنوں کی بات اور تھی۔ انگریز ڈانس کرنے کا سلیقہ جانتے تھے، پھر جو ہندوستانی ہوتے تھے، وہ بھی ہائی کلاس کے ہوتے تھے۔ تمھاری ممی نے نواب رامپور اور راجہ صاحب ناپارہ اور سر جے۔ پی کے ساتھ ڈانس کیا ہے اور یہ ...... یہ لوگ تو وحشی ہیں وحشی۔ مگر چند روز بعد جب ڈانس کے شوقین نوجوانوں نے میری طرف رُخ کرنا بھی چھوڑ دیا تو پاپا کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اب اتنی اجازت مل گئی ہے کہ بھائی جان سے ڈانس کرنا سیکھوں۔ اس لیے کبھی کبھی اب میں بھی ڈانس فلور پر نظر آتی ہوں۔ مگر اپنے بھائی کے ساتھ ڈانس کرنے میں وہ بات اور وہ تھرل کہاں جو......

ہاں! تو جانِ من! اس طرح اپنا وقت صرف ہوتا ہے۔ صرف رات کو جب گیارہ بارہ بجے پلنگ پر لیٹتی ہوں اور ممی گڈ نائٹ کہہ کر خراٹے لینا شروع کر دیتی ہیں۔ صرف اس وقت میں اپنے خیالات کے ساتھ تنہا ہوتی ہوں اور اس وقت اور یادوں کے ساتھ تمھاری یاد بھی آتی ہے" اور یادوں" کا مطلب سمجھ گئیں نا؟ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے گزرو اور ایک کالی ورسٹڈ پتلون اور ایک بھورا ٹوئیڈ کا کوٹ نظر آئے (اس کوٹ کے مونڈھے پر میرے ہاتھ کا رفو کیا ہوا حصہ دکھائی دے گا) تو میری طرف سے ایک نظرِ شوق ادھر ڈال لینا۔ بس۔ ڈیڈی اور ممی اور بھائی جان نے مجھے اس سنہرے پنجرے میں بند تو کر رکھا ہے۔ مگر" میرے خیالات کو بیڑی نہیں پہنا سکتے اور اس لیے اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے۔"

اچھا میری جان خدا حافظ! (یہ خط غسل خانے میں بند ہو کر لکھ رہی ہوں۔ اور ممی دروازہ دھڑ دھڑا رہی ہیں کہ جلدی کرو۔ اس لیے باقی آئندہ) لکھنؤ کے مفصل حالات لکھنا۔ روشنی اور شمی اور نورو اور نینا کو بہت بہت پیار۔

(کہو تمھارا چاند باغ والا رومانس کیسا لڑ رہا ہے؟)

تمھاری (مگر صرف تمھاری نہیں)

سلمیٰ

روز کالج،

18 جون

جانِ سلمیٰ جیتی رہو!

تمھارا خط کیا آیا۔ لکھنؤ کی یادوں کا دروازہ کھل گیا اور مسوری کی "جنت نظیر" بیوٹی پھیکی پڑ گئی۔ تم گرمی اور لُو اور پسینے کی شکایت کرتی ہو اور میرا جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں جہاں تم ہو۔ جہاں "وہ" ہے۔ خواہ وہاں جہنم جتنی گرمی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔ بنتی کیوں ہو! جیسے تمھیں احمد کے بارے میں میری جو فیلنگز FEELINGS ہیں ان کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نہیں مان سکتی کہ تم جو اُڑتی چڑیا پہچانتی ہو اس اوپن سیکرٹ سے بے خبر تھیں۔ تم پوچھتی ہو "آخر تم نے اس بے ہنگم، گنوار کے لٹھ لیکچرر میں ایسا کون سا سُرخاب کا پر لگا دیکھا ہے جو اس کو دل دے بیٹھی ہو؟ (اور جو میں یہی بات تمھارے جگر کے ٹکڑے زُحل کے بارے میں کہوں جس کے دودھ کے دانت ابھی نہیں ٹوٹے اور جو ابھی تک محبت کو "وڈیاپتی" فلم اور مہادیوی ورما کی کویتا ہی سمجھتا ہے) تو میری جان بات یہ ہے کہ ہمیں تو احمد کی ہر آن بھاتی ہے۔ اس گرمی اور لُو میں اس کا گرم کوٹ پہننا بھی بھاتا ہے (اس لیے کہ اس کوٹ پر میرا رفو کیا ہوا ہے) اس کے بے کنگھی کیے ہوئے گھنے کالے بال بھاتے ہیں اور اس کا اکنامکس پڑھانے کے بہانے سوشلزم پر لیکچر جھاڑنا بھاتا ہے اور جس انداز سے وہ کہتا ہے: "ہاں تو مس سلمیٰ شمشاد علی خاں! آپ بھی تو ایک تعلقہ داری خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی رائے زمینداری ابالیشن کے بارے میں کیا ہے؟" وہ بھاتا ہے اور بتاؤں؟ نہیں کیوں منہ کھلواتی ہو۔ کسی اور کے ہاتھ خط پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے؟

تمھارا خیال غلط ہے کہ میں اُس بچکانہ موڈ میں ہوں جب لڑکیوں کو اپنے ہر پروفیسر سے عشق ہوتا ہے۔ معاف کرنا مجھ پر یہ دورے کبھی نہیں پڑتے اور احمد تو مجھے اس وقت سے بھاتا ہے جب وہ پروفیسر نہیں تھا۔ بی۔ اے میں پڑھتا تھا اور ہم لوگ آئی۔ ٹی میں فرسٹ ایر میں تھے اور ہمت کر کے ایک دن میں اور تم اور روشنی تینوں کافی ہاؤس گئے تھے اور وہاں ایک شرابی فوجی انگریز گھس آیا تھا۔ اور ہم لڑکیوں کو UNESCORTED دیکھ کر اول فول بکنے لگا تھا اور ہم لوگ ڈر کے مارے کانپ رہے تھے اور وہ بالکل قریب آ گیا تھا۔ لال لال منہ کا بندر کہیں کا۔ اتنے قریب کہ اس کے سانس سے شراب کی بو آتی تھی اور میرا دوپٹہ سر سے اُٹھا کر کہنے لگا تھا "او مائی

ڈارلنگ کم دِس اِز نائٹ فور لو' O! MY DARLING COME THIS NIGHT FOR LOVE۔ اور جتنے بھی لڑکے کافی ہاؤس میں تھے ان میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کمبخت کو ٹوکے اس لیے کہ اس کی پیٹی میں پستول لگا ہوا تھا اور ہر ایک کو ڈر تھا کہ وہ پستول نکال کر گولی چلانا نہ شروع کر دے اور اس وقت ایک دبلا سا لمبا سا' سانولا سا لڑکا جو اس وقت تک اکیلا بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا' خاموشی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور میز پر سے کافی پوٹ COFFEE POT اٹھا کر اس ہٹے کٹے انگریز کے سر پر دے مارا۔ یاد ہے کتنی خوفناک ہاتھا پائی ہوئی تھی ان دونوں میں اور جب ملٹری پولس والے آ کر اُسے لے گئے تھے تو ہم نے دیکھا تھا کہ ہماری جان اور عزت بچانے والے کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے اور وہ اس خون کو اس طرح پونچھ رہا تھا جیسے کوئی پسینہ پونچھتا ہے اور ہم سے کہہ رہا تھا کہ "معاف کیجیے گا آپ کو ناحق تکلیف ہوئی۔ اب وہ موذی آپ کو تنگ کرنے کی کبھی ہمت نہ کرے گا۔" اور پھر اتنا بہت خون نکلتے دیکھ کر میرا سر چکرایا تھا اور میں بے ہوش ہوگئی تھی!...... وہ دن میں اب تک نہیں بھولی اور وہ بھی نہیں بھولا۔ اس لیے کہ اس کی پیشانی پر اب بھی زخم کا نشان ہے...... اور جب بھی وہ آئینہ دیکھتا ہے۔ اُسے اُس دن کی...... اور میری...... یاد دلاتا ہے۔

نہیں اوشا۔ میری جان۔ میں اسکول گرلش INFATUATION میں بالکل گرفتار نہیں ہوں۔ میں نے احمد کو ہر ڈھنگ سے دیکھا ہے۔ ہنستے ہوئے بھی' غصہ ہوتے ہوئے بھی ایک بار روتے ہوئے بھی۔ اس کی زبان سے میں نے اکنامکس کے لکچر بھی سنے ہیں اور اسی زبان سے غالب اور اقبال، فراق اور مجاز کی نظمیں اور غزلیں بھی سُنی ہیں...... یہ سچ ہے کہ اس نے آج تک مجھ سے یہ نہیں کہا کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" مگر اس کا یہ مطلب نہیں (جیسا تم نے لکھا ہے) کہ "ہوسکتا ہے کہ اُسے تم سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو، یا صرف اتنی ہو جتنی ہر نوجوان پروفیسر کو ہر خوب صورت اور نوجوان گرل اسٹوڈنٹ میں ہوتی ہے۔" اول تو میں سرے سے خوب صورت ہی نہیں ہوں۔ ہماری کلاس میں کتنی ہی لڑکیاں مجھ سے کہیں زیادہ "ڈِم" ہیں مگر وہ ان میں سے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دوسرے یہ کہ میں بھی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ اچھے بُرے میں تمیز کر سکتی ہوں۔ نہ پردے میں پلی بڑھی ہوں۔ احمد کے علاوہ اور بھی دو چار اچھے خاصے معقول نوجوانوں سے ملی ہوں۔ خود پسندی کا الزام نہ دو تو کہوں کہ احمد پہلا نوجوان تو نہیں

ہے جس نے مجھ میں دلچسپی لی ہے اور اگر بے شرم نہ کہو تو یہ اعتراف بھی کر ڈالوں کہ وہ بھی میری زندگی کا پہلا درد دل نہیں ہے۔ اس لیے اگر وہ مجھے اچھا لگتا ہے اور میں اس کی خاطر بہت کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں تو کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔ سمجھیں...... یا نہیں سمجھیں!

خیر اب سنو کہ پاپا اور ممی اور بھائی جان تینوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مسوری کے سیزن کی دلچسپیوں میں، میں احمد کو بالکل بھلا بیٹھی ہوں، اس لیے ممی نے میرے کمرے سے اپنا ڈیرہ اٹھالیا ہے اور اس لیے اب مجھے اپنے دوستوں کو خط لکھنے کی آزادی ہے اس رات پہلا خط اُسے لکھا ہے (اور چھٹیوں میں مسوری آنے کی صلاح دی ہے!) اور دوسرا خط یہ تمھیں لکھ رہی ہوں۔ اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہیں اور عام طور سے ہم لوگ ساڑھے چار بجے چائے پیتے ہیں۔ اس لیے تمھیں اور بہت کچھ لکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر ممی اپنے کمرے سے چلا کر اعلان کر رہی ہیں کہ ہمیں اپنے پڑوسی مسٹر ماتھر کے یہاں چائے پر جانا ہے (کوئی پی۔ای۔ایس قسم کے بور ہیں جو برابر والے بنگلے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ ان کے یہاں جانے کے خیال سے ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ لیکن پاپا اور ممی ان کے معاملات میں بہت ہی فورمل ہیں اور اگر میں انکار کردوں تو ایسی ڈانٹ پڑے گی کہ بس) اس لیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ باقی آئندہ

تمھاری...... سلمیٰ

PS: تم کتنی خوش قسمت ہو کہ لکھنؤ میں ہو۔ روز یونی ورسٹی پڑھنے جاتی ہو اور ''کسی'' کو دیکھ سکتی ہو!

PPS: کیا تم نے رام کمار کی نئی تصویر ''خواب'' دیکھی؟ نہ دیکھی ہو تو ضرور دیکھنا 'یہ لڑکا تو دلیپ اور راج سے بھی زیادہ ''زم'' نکلا۔ مسوری میں تو ہر لڑکی اس کی دیوانی ہو رہی ہے۔

مسوری، 26 جون

اوشا' مائی ڈیر۔ بہت بہت پیار۔

''اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے''......

گومتی، چاندنی رات میں چھتر منزل کا نقرئی منظر۔ بوٹ کلب کا پکنک، اور اس میں ''وہ'' بھی موجود۔ تم نے اتنی خوب صورت تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے کہ واہ واہ۔ میں جل ہی تو گئی ''ذکر

اس پری وش کا اور بیان تیرا!...... کیا وہ سچ مچ میری بابت پوچھ رہا تھا؟ یا یہ سب تم نے مجھے چھیڑنے کے لیے من گھڑت لکھا ہے؟ بھئی اس سیریس معاملے میں تم نے مذاق کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ تم سے یہ بات اس لیے کرید کرید کر پوچھ رہی ہوں کہ میرے پاس جو خط آیا ہے وہ تو اتنا روکھا پھیکا اور فورمل ہے کہ دور دور بھی رومانس کا نشان نہیں۔ امید ہے کہ اب آپ کی طبیعت بہتر ہوگی۔ اور آپ نے کالج میں جو لکچر "مس" کیے ہیں ان کے بدلے آپ خود گھر پر پڑھ رہی ہوں گی۔ کیونزم کی اقتصادیات کو سمجھنا ہے تو ویبز WEBBS کی کتاب پڑھنا ضروری ہے ایسے مخالفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے برنہم BURNHAM کی MANAGERICAL REBOLITION وغیرہ جیسی کتابیں بھی پڑھ لیجیے تا کہ معلوم ہو جائے کہ اینٹی سوشلسٹ طبقے کی منطق کتنی لچر پوچ ہے......" وغیرہ وغیرہ۔ اب تم ہی بتاؤ...... میں نے خواہ مخواہ اتنی احتیاط برتی کہ خط گھر کے پتہ کے بجائے مسز ماتھر کی معرفت منگوایا (ہاں تم بھی آئندہ سب خط "معرفت مسز روپ کماری ماتھر۔ پربت لاج، مسوری کے پتہ سے مجھے بھیجنا)

اب ان ماتھرز کے بارے میں سنو۔ (شاید پچھلے خط میں میں نے ان کا کچھ ذکر لکھا تھا) یہ فیملی دو تین ہفتے سے ہمارے برابر والے بنگلے میں آ کر ٹھہری ہے۔ نفسیاتی مطالعے کے لحاظ سے نہایت دلچسپ لوگ ہیں۔ ہر ایک سائیکولوجی کی کتاب کا ایک چیپٹر معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر ماتھر پی۔سی۔ایس کے پرانے آدمی ہیں۔ بیس برس سے سروس میں ہیں اور اب کسی ضلع میں کلکٹر ہیں۔ عمر کوئی پینتالیس سال کی ہوگی۔ سر کے بال بالکل غائب ہیں۔ ان کے بے تکلف دوست اکثر ان پر پھبتی کستے رہتے ہیں۔ رنگ سانولا اور اس پر چیچک کے نشان۔ کمزور آنکھوں پر بڑے موٹے شیشوں کا چشمہ پہنتے ہیں۔ پان بکثرت کھاتے ہیں خوشبودار تمبا کو ڈال کر۔ شاید اس لیے کہ دانتوں میں پائیریا ہے اور جب پان نہ کھا رہے ہوں تو دور سے بدبو کا بھبکا آتا ہے...... INFERIORITY COMPLEX کی مثال دیکھنا ہو تو ماتھر صاحب کو دیکھ لو۔ بیچارے شکل سے کمترین ہی نہیں یتیم اور مسکین معلوم ہوتے ہیں۔ پی۔سی۔ایس کے ہیں۔ اس لیے آئی۔سی۔ایس والوں سے کمتر محسوس کرتے ہیں۔ گنجے ہیں اس لیے بال والوں سے اپنے آپ کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔ بیچارے پستہ قد ہی نہیں ایک درمیانہ توند کے مالک بھی ہیں۔ اس لیے لمبے اور

نگڑنے، صحت مند اور اسمارٹ نوجوانوں کا سامنا کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ باپ کسی وکیل کے منشی تھے اور بیٹے کو سرکاری وظیفوں کی مدد سے تعلیم دلوائی تھی۔ اس لیے خاندانی رئیسوں، تعلقہ داروں اور لکھ پتی سندھی تاجروں کے مقابلے میں ماتھر صاحب احساسِ کمتری محسوس کرتے ہیں مگر شاید اس کمتری کا سب سے شدید احساس ان کو اپنی نوجوان بیوی کے سامنے ہوتا ہے۔

مسز ماتھر کافی حسین اور شاندار عورت ہیں۔ گو ان کا حسن نہ شاہانہ اور رعب دار قسم کا ہے اور نہ نسیم اور وینا کی قسم کا۔ عمر کوئی اٹھائیس تیس برس کی ہوگی مگر ان کو اپنے سے چھوٹی عمر کی لڑکیوں کی برابری کرنے میں مزا آتا ہے۔ (مجھ سے بیچاری بہت محبت سے پیش آتی ہیں مگر ان کا اصرار ہے کہ مجھے مسز ماتھر نہیں، روپ کہا کرو۔ آخر میں تم سے کوئی زیادہ بڑی تھوڑی ہی ہوں۔ اور ہاں میری رومانی وارداتوں کے قصے سننے کی برابر فرمائش کرتی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنی زندگی میں رومانس مس کرنے کی وجہ سے دوسروں کے رومانوں میں انھیں غیر معمولی اور غیر قدرتی حد تک دلچسپی ہوگئی ہو) سنا ہے کسی زمانے میں وہ روپ کماری کے نام سے ہندی میں بڑے اچھے رومانی افسانے لکھا کرتی تھیں (ان ہی کا بیان ہے) تم نے شاید کبھی مایا، سریتا میں ان کی کہانیاں پڑھی ہوں۔ (کیا وہ واقعی اتنے ہی اچھے معیار کی ہیں جتنا ان کا خیال ہے) کہتے ہیں ان دنوں ایک نوجوان ادیب سے ان کا کافی گہرا عشق بھی چل رہا تھا (افسانوی اور ادبی عشق کنھیالال منشی اور لیلاوتی منشی یا امتیاز علی تاج اور حجاب اسمٰعیل کے عشق جیسا) مگر ان کے والدین کو اصرار تھا کہ داماد آئی۔سی۔ایس نہ ہو تو کم سے کم پی۔سی۔ایس ہو۔ وہ بیچارہ اس پر بھی راضی ہوگیا کہ ادبی کام چھوڑ کر آئی۔سی۔ایس کا امتحان دے۔ مگر مقابلے میں صرف ایک نمبر سے رہ گیا اور روپ کے والد نے بیٹی کو زبردستی مسٹر ماتھر کے ساتھ بیاہ دیا۔ اوشا پیاری۔ ہم نے، تم نے بھی بہت سے امتحان دیے ہیں اور امتحانوں کے سارے سسٹم کو ہی کنڈم کرتے رہتے ہیں مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ایک نمبر— سنا تم نے صرف ایک نمبر...... کی کمی سے پوری پوری زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں؟ ہاں تو جب وہ بیچارہ ایک نمبر سے آئی۔سی۔ایس میں آنے سے رہ گیا تو روپ کے پتا نے زبردستی اس کی شادی ماتھر صاحب سے کردی (یہ اور بات ہے کہ اب اس شادی کو ہوئے چھ برس گزر گئے ہیں اور ماتھر صاحب صرف نو سو روپے ماہوار پاتے ہیں۔ اور وہ نوجوان ادیب جو آئی۔سی۔ایس

میں صرف ایک نمبر سے رہ گیا تھا اس وقت واشنگٹن ایمبسی میں پریس اتاچی لگا ہوا ہے اور اٹھارہ سو روپے ماہوار پا رہا ہے۔)

کم عمر بیوی اور بوڑھا ادھیڑ شوہر — یہ تو کافی پرانی اور جانی پہچانی کہانی ہے مگر ماتھر صاحب پہلے سے شادی شدہ بھی تھے اور ان کی پہلی بیوی سے ایک بچی بھی تھی۔ سنا ہے ان کی پہلی بیوی کم رو ہی نہیں، ان پڑھ بھی ہے۔ اس لیے ایک سرکاری افسر کی بیوی کی حیثیت سے بیچاری بالکل ناکامیاب رہیں۔ راوی (یعنی مسوری کے پروفیشنل اسکنڈل فنگر) بیان کرتے ہیں کہ کمشنر صاحب کے ڈنر میں ایک دن غریب بوکھلاہٹ میں فنگر بال FINGER BOWL میں ہاتھ دھونے کے بجائے اس کا پانی پی گئی۔ بس اسی دن ماتھر صاحب نے اسے واپس میکے بھیج دیا (اور اس وقت سے آج تک اس کو سو روپے ماہوار باقاعدگی سے بھیجتے ہیں) اور اپنی بیٹی کو نینی تال کے ایک کونوینٹ اسکول میں داخل کرا دیا ہے اور اس کے بعد برسوں کسی خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی کی تلاش کرتے رہے۔ جو ان کی سوشل لائف میں ان کا ہاتھ بٹا سکے اور فنگر بال میں پانی نہ پیتی ہو اور آخر ان کی نظرِ انتخاب روپ کماری پر پڑی۔ نتیجہ کیا ہوا وہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ ماتھر صاحب روپ کماری پر جان دیتے ہیں۔ اپنی مُسمسی آنکھوں سے بیوی کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے من ہی من میں اس کی پوجا کر رہے ہوں۔ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت بجالانے میں عار نہیں سمجھتے۔ میں نے خود روپ کو اطمینان سے پان چباتے اور ماتھر صاحب کو بار بار اگالدان پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کپڑے والوں، درزیوں، جیولرز وغیرہ کے بل بے چون و چرا ادا کرتے رہتے ہیں روپ کماری کے پاس کم سے کم ڈیڑھ سو ساڑیاں تو ضرور ہوں گی۔ اور نہ جانے کتنے غرارے اور قمیض اور شلواریں، ہر رنگ کی ساڑیوں کے ساتھ پہننے کے لیے الگ الگ کوٹ، جوتوں اور سینڈلوں کی قطار تو کمرے کے چاروں طرف لگی ہوئی ہے۔ ہر مہینے بیوی کے لیے درجنوں رسالے اور اخبار اور کتابیں منگواتے ہیں مگر روپ کماری کہتی ہیں اب ان کی ادبی دلچسپی مرجھا گئی ہے اور وہ صرف فلمی رسالوں اور ہفتہ واروں خصوصاً فلم انڈیا کا بغور مطالعہ کرتی ہیں۔ ہر فلم اسٹار کا شجرۂ نسب انھیں زبانی یاد ہے۔ کون کب پیدا ہوا۔ کب فلمی دنیا میں داخل ہوا۔ کس کس کمپنی میں کس کس تصویر میں آیا۔ کون سا ہیرو کس

ہیروئین کے ساتھ ''وابستہ'' ہے۔ایسی باتیں تو انھیں پوری تفصیل سے معلوم ہیں۔ پرسوں ہی ہم لوگ رام کمار کی نئی فلم 'خواب' دیکھ کر لوٹ رہے تھے تو کہنے لگیں، جانتی ہو کہ یہ رام کمار اپنے لکھنؤ ہی کا رہنے والا ہے۔ سینیر کیمبرج کیا تھا۔ایم اے میں پڑھتا تھا کہ رائل فلم کمپنی کا رستم ایرانی لکھنؤ کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آیا اور رام کمار کو کنٹریکٹ کر کے ساتھ لیتا گیا۔ پہلی ہی فلم میں رام کمار بملا رانی کے ساتھ ہیرو کے رول میں آیا۔ بملا رانی اس پر عاشق ہوگئی اور اس کے بعد تو ہر پروڈیوسر جو بملا رانی کو لینا چاہتا اس کو ساتھ میں رام کمار سے بھی کنٹریکٹ کرنا پڑتا وغیرہ وغیرہ۔ میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک آئی۔ کہنا یہ چاہتی تھی کہ ماتھر صاحب روپ کی اتنی خاطر مدارات کرتے ہیں مگر وہ اس بیچارے کو ذرا منہ نہیں لگاتیں......اور سنو، ہر رات کو ڈنر کے کوئی گھنٹہ بھر بعد انھیں نیورلجیا (یعنی آدھے سر کے درد کا) نہایت شدید دورہ پڑتا ہے۔اسپرین کی درجنوں گولیاں بھی بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔شوہر بیچارہ اگر سر دبانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ بیچارہ کمرے در کمرے پریشان گھومتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح روپ کی پالتو کالی بلی 'جولیٹ' اپنی مالکہ کی خاطر ماری ماری پھرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گیارہ بارہ بجے جب روپ سونے کی دوا پی کر لحاف میں سر چھپاتی ہیں تو 'جولیٹ' ان کے پیروں میں دبک کر سو جاتی ہے اور ماتھر صاحب بیچارے دوسرے کمرے میں خود بھی ایک سلیپنگ ڈوز پی کر سو جاتے ہیں۔

تو یہ بیچاری روپ اور بیچارے ماتھر صاحب کی حالت ہے۔ مجھے تو دونوں پر بہت ہی ترس آتا ہے۔مگر ان سے بھی زیادہ عجیب اور قابل رحم حالت شمو کی ہے۔شمو ماتھر صاحب کی بیٹی ہے' پہلی بیوی سے' پورا نام شیام کماری ہے مگر گھر میں سب شمو شمو کہتے ہیں۔ کوئی اٹھارہ سال کی ہوگی۔ پچھلے سال نینی تال کے ایک کونوینٹ اسکول سے سینیر کیمبرج کیا ہے اب آئی ٹی کالج میں فرسٹ ایر میں پڑھتی ہے......

مگر مجھے خط ختم کرنا ہی پڑے گا۔ ممی ڈرائنگ روم سے چلا رہی ہیں کہ چلو کھانے کا وقت ہوگیا۔ اس لیے شمو کے بارے میں اگلے خط میں لکھوں گی۔ تم تو اپنے آپ کو ''سائیکالوجی اور سائیکو انالیسس'' کی توپ سمجھتی ہو مگر اس ماتھر خاندان جیسے نمونے تم کو اپنی کتابوں میں بھی نہ ملے ہوں گے۔

اچھا خود کو بہت بہت پیار اور موقع ملے تو کسی کو میری طرف سے بس ایک نظر دیکھ لینا مگر ایک نظر سے زیادہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ''ہوگئی رقیب آخر۔ تھی جو راز داں اپنی'' والا مضمون ہو جائے۔

تمہاری......سلمٰی

مسوری، 27 جون

اوشا پیاری

کل ہی تمھیں ایک کافی طویل خط لکھ چکی ہوں۔ جو شاید آج ہی کی ڈاک سے نکلے گا اور اس خط کے ساتھ ہی تمھیں ملے گا۔

یہ مختصر سا خط جلدی میں اس غرض سے لکھ رہی ہوں کہ یونی ورسٹی کے رجسٹرار کے دفتر سے یہ پوچھ کر لکھو کہ کوئی لڑکی پرائیویٹ کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے انٹر کا امتحان دے سکتی ہے یا نہیں۔ یہ بات شمّو معلوم کرنا چاہتی ہے (شمّو یعنی ماتھر صاحب کی لڑکی شیام کماری جس کی صحت اچھی نہیں ہے اس لیے اس کے پتاجی اس کی پڑھائی چھڑانا چاہتے ہیں مگر وہ سال ضائع کرنا نہیں چاہتی اور اس لیے چاہتی ہے کہ جب تک صحت بہتر ہو گھر پر پڑھ کر امتحان دے سکے)

دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب (یعنی اپنے پاپا) سے پوچھنا کہ اگر کسی لڑکی کو ہر تیسرے چوتھے دن پیٹ میں سخت درد ہوتا ہے۔ (کبھی دائیں کبھی بائیں طرف) اور ایکس رے میں اپنڈکس نہ نکلے اور نہ اسٹول اگزامینشن میں کیچوؤں یا کیڑوں کا ہونا ثابت ہو اور نہ پرانی پیچش کے جراثیم ہوں تو یہ کیا بیماری ہو سکتی ہے۔ درجنوں ڈاکٹر بیچاری شمّو کا معائنہ اور علاج کر چکے ہیں مگر اب تک کوئی صحیح تشخیص نہیں کر سکا۔

اس خط کا جواب، واپسی ڈاک سے دینا۔ بہت ہی جلدی میں

تمہاری......سلمٰی

P.S: ''وہ'' نظر پڑیں تو میرا ذکر بالکل نہ کرنا۔ وہ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو؟ دس دن ہوگئے ہیں مجھے خط لکھے ہوئے اور اب تک جواب میں ایک سطر بھی نہیں آئی۔

مسوری......3 جولائی

اوشاڈارلنگ!

تمھارے پاپا کی تشخیص سچ مچ صحیح نکلی۔شمو کے پیٹ کا درد واقعی ہسٹیریا کی ایک نئی شکل ہے، ایسا لگتا ہے اس کا "سب کونشس" (یعنی تحت الشعور) اپنے پتاجی کی توجہ سوتیلی ماں کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرا لینے کے لیے یہ تدبیر اختیار کرتا ہے۔تم کہوگی مجھے یہ کیسے معلوم ہوا۔تو سنو پچھلے اتوار کا ذکر ہے کہ روپ تو دن گزارنے اپنی سہیلی بیگم نقشبندی کے ہاں گئی ہوئی تھیں (دونوں ایک ہی درزی سے کپڑے سلواتی ہیں اور ہر ہفتے نئے کپڑے ڈیزائن کرنے کے لیے مشترکہ کانفرنس کرتی ہیں) ماتھر صاحب دن بھر شمو کے پاس بیٹھے کیرم کھیلتے رہے۔دوپہر کے کھانے کے بعد میں روپ سے اس ہفتہ کا "اسکرین" مانگنے گئی (اس میں خبر چھپی ہے کہ رام کمار بیچارے کو پلوریسی ہوگئی ہے۔کئی ہفتے سے بیمار ہے اور اس کی جتنی فلمیں بن رہی تھیں سب کی سب لٹک گئی ہیں) تو دیکھا شمو کی حالت بہت بہتر ہے صبح سے درد کا دورہ بالکل نہیں ہوا۔شام کو باہر جاتے ہوئے ممی نے کہا' چلو ماتھر صاحب کے یہاں ہوتے چلیں۔وہاں گئے تو ماتھر صاحب اور شمو بیٹھے چائے پی رہے تھے اور شمو بالکل خوش و خرم نظر آرہی تھی۔ماتھر صاحب کہنے لگے آؤ بھائی تم لوگ بھی ایک ایک پیالی چائے پیو۔ پھر ہم بھی ٹہلنے چلیں گے' اتنے ہی میں روپ آگئیں اور آتے ہی ماتھر صاحب سے کہنے لگیں۔"چلو سنیما چلیں۔آج رام کمار کی فلم "کلنک کا آخری دن ہے۔" ماتھر صاحب نے فرماں بردارانہ لہجے میں کہا "ہاں۔ہاں ضرور ضرور۔ میں ابھی سیٹوں کے لیے فون کرتا ہوں۔آج تو شمو کی طبیعت بھی اچھی ہے' اسے بھی لے چلتے ہیں۔" مگر روپ نے ڈانٹ کر کہا "نہیں ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کو منع کیا ہے' وہ سنیما نہیں جائے گی۔ چلو جلدی کرو۔اپنا اُورکوٹ اُٹھاؤ۔"

ماتھر صاحب تو اس وقت ایسے لگ رہے تھے جیسے ماسٹر کے سامنے اسکول کا بچہ۔ چپکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہیٹ اسٹینڈ سے اپنا ہیٹ اور کوٹ اُتار ہی رہے تھے کہ شمو کے کمرے سے اتنی خوفناک چیخوں کی آواز آئی کہ ہم سب ادھر دوڑے۔ جا کر دیکھا کہ درد کے مارے بیچاری بستر پر لوٹ رہی ہے۔ اور "ہائے میں مرجاؤں گی۔ہائے میں مر جاؤں گی، پتا جی' چلا رہی ہے۔ میں نے چھو کر دیکھا، ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھنڈے برف مگر ماتھے پر پسینہ چھوٹا ہوا تھا۔

آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھی ہوئیں اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو دبائے ہوئے۔ ''سلمیٰ بی بی'' ماتھر صاحب چلّائے، ''ذرا ڈاکٹر شرما کو فون تو کرو'' اور پھر بہت ڈرے انداز میں بیوی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ''اب تو سنیما......''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ روپ نے ان کی بات کاٹ کر پیر پٹختے ہوئے کہا وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ تو آپ رہیے اپنی بیٹی کے پاس میں جا رہی ہوں، کیوں سلمیٰ چلتی ہو؟''

رام کمار کی فلم دیکھنے کا شوق تو مجھے بھی بہت تھا مگر شمو کے خیال سے میں نے کہا ''جی...... میں پھر کبھی دیکھ لوں گی۔ آج تو شمو کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔'' مگر ممی نے کہا'' کوئی بات نہیں۔ میں یہاں ٹھہر جاتی ہوں۔ تم پکچر دیکھ آؤ، روپ کے ساتھ''

سو میں اور روپ 'کلنک' دیکھنے گئے۔ رام کمار کے پچھلے فلم 'خواب' کے بارے میں میں تو پہلے ہی لکھ چکی ہوں مگر 'کلنک' میں تو اس نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ایک شرابی شاعر کے کردار کو ایسی خوبی سے نبھایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے عام طور سے ہندستانی پکچرز نہیں بھاتیں (ان میں وہ ہالی ووڈ کی شان و شوکت اور گلیمر بھلا کہاں) مگر رام کمار کی ہر فلم میں اور کچھ ہو یا نہ ہو اس کا اپنا کام اتنا اچھا ہوتا ہے کہ میری جیسی ''سوپر کریٹک'' بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ 'کلنک' میں کمزوری ہے تو صرف یہ کہ وہ بھینگی آنکھوں والی نیلما اس میں ہیروئین کا کام کرتی ہے۔ ایک سین میں بھی تو رام کمار کے سامنے آنے کے قابل نہیں ہوتی۔ نہ جانے اتنا بڑا اور مشہور اور قابل ایکٹر کیسے نیلما جیسی تھرڈ گریٹ ایکٹرسز کے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ فلم کے دوران میں روپ کہنے لگیں ''کیوں سلمیٰ! اگر کسی لڑکی کو رام جیسا خوب صورت اور اچھا شوہر مل جائے تو کیسا ہو؟ کیا اُسے خوشی اور فخر سے شادی مرگ نہ ہو جائے؟'' میں نے کہا اس وقت تو خود رام کمار کی جان کی خیر منانی چاہیے۔ بیچارا پلورسی جیسے خطرناک مرض کا شکار ہوا ہے۔ اس پر روپ نے چپکے سے میرے کان میں کہا'' میں نے تو آج ہی منت مانی ہے کہ رام کمار اچھا ہو گیا تو ایک دن کا برت رکھوں گی اور دس روپے دان دوں گی۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا، لو بھئی یہ تو پوری طرح ''فین کریز'' FAN CRAZE میں مبتلا ہیں!

میں بھی کتنی عجیب ہوں۔ چلی تھی شمو کی بیماری کا حال لکھنے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں

تو اس رات کو جب ہم سینما سے واپس آئے تو دیکھا کہ شمو (جسے ہم درد سے کراہتا اور بلبلاتا چھوڑ گئے تھے) پلنگ پر بیٹھی ماتھر صاحب اور ممی کے ساتھ رمی کھیل رہی ہے۔ بعد میں ممی نے بتایا کہ روپ کے سینما چلے جانے کے بعد چند منٹ تک شمو درد کی شکایت کرتی رہی مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ درد غائب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شرما دو تین منٹ کا معائنہ کرنے اور اپنی سولہ روپیہ فیس لینے آئے تو شمو کا درد بالکل جاتا رہا تھا۔ جب ہی تو میں نے کہا کہ تمھارے پاپا کی تشخیص سولہ آنے ٹھیک نکلی۔ ان کو یہ سب سنا دینا۔

یہاں بارشوں کے بعد موسم میں کافی خنکی آ چکی ہے۔ اس سیزن میں یہاں بڑی رونق ہے۔ بمبئی سے بڑے اسمارٹ لڑکوں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے؟ جن سے اسکیٹنگ رینک SKATING RANK میں اکثر ملاقات کیا بچ بچ مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔ ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ تین چار بار دھڑام سے گرنے کے بعد میں رولر اسکیٹنگ کی ماہر ہوگئی ہوں۔

اسکیٹنگ ہے مزیدار مشغلہ۔ ڈانسنگ کا بھی مزہ آتا ہے اور ورزش کی ورزش ہو جاتی ہے۔ تم بھی اس سال یہاں آ جاتیں تو بڑا مزہ آتا۔ اکیلی تو میں کسی سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ مگر تم نہ جانے کیوں اس غضب کی گرمی میں لکھنؤ سے چپکی ہوئی ہو۔ اور وہ جناب ان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک نہایت روکھے اور غیر شاعرانہ قسم کے اکھڑ خط میں لکھتے ہیں "تمھیں مسوری کی بورژوا ٹھنڈک مبارک ہو۔ ہم تو لکھنؤ کی پرولتاری گرمی ہی میں خوش ہیں۔" یہ میرے تین خطوں کا جواب ملا ہے۔ جن میں میں نے مسوری آنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ آئے بڑے پرولتاری بننے! جل ہی تو گئی میں یہ پڑھ کر۔

باقی آئندہ۔ اور کچھ لکھا تو خط کے بجائے پورا ناول نہ بن جائے' اور خواہ مخواہ تمھیں پندرہ فیصدی رائلٹی دینی پڑے۔

تمھاری...... سلمیٰ

P.S: تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا کہ اچھی خاصی فلاسفی اور سائیکولوجی چھوڑ کر (جو تمھارے محبوب مضامین تھے) تم اب اکنامکس میں ایم۔اے کرنا چاہتی ہو۔ جب "وہ" تمھیں بھی مارکسزم پر لکچر دے دے کر بور کرے گا۔ تب

تمھیں اپنی حماقت کا احساس ہوگا۔ خیر تمھاری مرضی ''ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔''

مسوری 11 جولائی

اوشا۔

یہ اسپیشل براڈ کاسٹ مسوری سے کیا جا رہا ہے۔ ایک اہم خبر بلکہ مہا اُتّم سماچار سنئے۔

روپ کا نیورلجیا یک بیک جاتا رہا ہے۔

شمو کا پراسرار پیٹ کا درد بھی غائب ہو گیا ہے۔

اور مسز نقشبندی نے آدھی آدھی درجن نئے ڈیزائن کے چولی بلاؤز سلنے کے لیے دے دیے ہیں۔ میں بھی مسوری کی بورڈم میں اب کسی قدر دلچسپی پیدا ہونے کی امید کر رہی ہوں۔

یہ کایا پلٹ کیوں بھلا؟ اس لیے کہ رام کمار آنے والا ہے۔ رام کمار، فلمی دنیا کا محبوب ترین ہیرو، مسوری آ رہا ہے۔ تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے اور جانتی ہو کہاں ٹھہرے گا؟ نہیں سیوائے میں نہیں، نہ ہیک مینز میں، (ہوٹل میں تو اس کے متوالے اور متوالیاں اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے) اس لیے وہ ماتھر صاحب کے یہاں ٹھہرے گا۔ یہ کیسے؟ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے، ماتھر صاحب کے چچازاد بھائی ایک اور ماتھر بمبئی میں سنٹرل گورنمنٹ کے سپلائی کے دفتر میں کنٹرولر یا ڈائریکٹر یا کوئی چیز ہیں۔

وہ جس بلڈنگ میں رہتے ہیں۔ اسی میں رام کمار بھی رہتا ہے۔ اس لیے ان کی کافی ملاقات بلکہ دوستی ہے۔ جب رام کمار کو ڈاکٹروں نے تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے مسوری جانے کو کہا تو ان بمبئی والے ماتھر نے اپنے کزن یعنی ہمارے والے ماتھر صاحب کو لکھا۔ وہ بیچارے پہلے تو کافی نروس ہوئے۔ بولے: ''ارے بھئی یہ فلم والے کافی بد دماغ ہوتے ہیں۔ لاکھوں روپے کماتے ہیں نا۔ نہ جانے یہ مسٹر رام کمار کس قسم کے آدمی ہیں۔ ہمارے گھریلو ماحول میں فِٹ ان ہوں یا نہ ہوں'' مگر روپ نے ڈانٹ کر کہا: ''آنے بھی دو نا بیچارے کو۔ بیماری سے حال ہی میں اٹھا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرے گا تو ایک منٹ چین نہیں ملے گا۔ یہاں ہم سب مل کر اچھی طرح سے اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ اور ماتھر صاحب نے فوراً بات بدل کر کہا'' ہاں۔

ہاں۔ میں خود بھی کہتا ہوں کہ ضرور بلانا چاہیے۔ اور پھر رام کمار تو اپنے یو۔ پی ہی کا رہنے والا ہے اور اسکرین پر دیکھنے سے کافی شریف نظر آتا ہے۔''

اور سو رام کمار اگلے ہفتہ آرہا ہے اور مسوری کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے......اور مجھے روپ کے یہاں ایک امپورٹنٹ کانفرنس کے لیے جانا ہے جو INTERIOR DECORATION کے سلسلے میں ہو رہی ہے......اس لیے باقی آئندہ۔ رام کمار کے آنے پر۔

تمھاری ......سلمیٰ

P.S. تمھارے اکنامکس کے پروفیسر صاحب ملیں اور میرے بارے میں پوچھیں تو کہنا میں کافی مصروف رہی۔ اس لیے ان کے خط کا جواب نہ دے سکی۔ اگلے ہفتے فرصت ملی تو خط لکھوں گی۔

مسوری 23 جولائی

اوشا پیاری!

معاف کرنا اتنے دنوں سے تمھارے خط کا جواب نہ دے سکی۔ کیا کروں پچھلے دس دن سے اتنا اکسائٹمنٹ رہا ہے کہ تو بہ ہی بھلی۔ رام کمار کیا آیا ہے، سارے مسوری اور خصوصاً ہمارے پڑوس میں ایک ہلچل مچ گئی ہے۔ آج ماتھر صاحب کے ہاں ڈنر، تو کل مسز نقشبندی کے ہاں لنچ، تو پرسوں ہمارے ہاں چائے۔ روز پکنک کبھی کیمپٹی فال تو کبھی موسیٰ فال، کبھی چنڈال چوٹی تو کبھی سن بینک۔ غرض ایک گڑبڑ DISAPPOINTMENT مچی ہوئی ہے۔

تم نے رام کمار کے بارے میں پوچھا ہے، کہ سچ مچ زندگی میں کیسا لگتا ہے۔ تو ایمان کی بات تو یہ ہے کہ پہلے پہل اسے دیکھ کر مجھے تو کافی ڈس اپوئنٹمنٹ DISAPPOINTMENT ہوئی۔ خاصا سانولا رنگ (فلموں میں تو میک اپ ہوتا ہے نا) سر پر بال غائب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ (فلموں میں نقلی بالوں کی وگ پہنتا ہے) اور آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا بڑا انٹلکچوئل قسم کا چشمہ۔ فینسی سوٹوں کے بجائے اکثر ایک نہایت موٹی ٹوئیڈ کا کوٹ پہنے رہتا ہے، اور دن میں تو پتلون پر صرف ایک کالی جواہر جیکٹ (اس کی دیکھا دیکھی مسوری کے تمام فیشن ایبل نوجوانوں نے کالی جواہر جیکٹیں سلوالی ہیں) ایکٹر کے بجائے ادیب یا چھوٹا موٹا پروفیسر (وہ بھی اکنامکس

کا) معلوم ہوتا ہے۔ باتیں بھی کبھی کبھی اسی قسم کی کرتا ہے۔ ہاں اس کی آنکھوں میں وہی مقناطیسی چمک ہے جو اسکرین اور اس کے کلوز اَپ میں نظر آتی ہے اور اس کی آواز میں وہی رومانی گہرائی ہے جو اسکرین پر سنائی دیتی ہے۔ (یاد ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی آواز حلق سے نہیں دل سے نکلتی ہے) اور اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ ہے جو لاکھوں لڑکیوں کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہے۔

ایک دن روپ نے بڑے رومانی انداز میں پوچھا: ''کیوں رام! (پہلے دن وہ مسٹر رام کمار کہتی تھی۔ دوسرے دن رام جی اور تیسرے دن صرف رام) تمھیں تو بچپن ہی سے ایکٹنگ کا شوق رہا ہوگا؟''

اور اس نے نہایت غیر رومانی انداز میں کہا: ''نہیں مسز ماتھر (روپ اسے لاکھ کہتی ہیں کہ تم سے اتنی بڑی تھوڑی ہوں۔ تم مجھے صرف روپ کہا کرو مگر وہ انھیں مسز ماتھر ہی کہتا ہے) بچپن میں تو میں ریل کے انجن کا ڈرائیور بننا چاہتا تھا اور اس کے بعد پتا جی کی طرح وکیل مگر کالج میں مجھے اکنامکس میں دلچسپی ہوگئی اس لیے اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا، جب پڑھائی چھوڑ کر بمبئی جانا پڑا۔ اب تک تو میں مارکسزم پر تھیسیس لکھ کر پی۔ ایچ ڈی۔ بھی ہو جاتا۔''

اکنامکس! مارکسزم! سچ کہتی ہوں ایک ایکٹر کی زبان سے یہ باتیں سن کر میں جل ہی تو گئی (شاید اس لیے اور بھی کہ یہ باتیں پہلے کی سنی ہوئی ہیں) میں نے کسی قدر طنز بھرے لہجے میں پوچھا: ''مسٹر رام کمار (وہ برابر مجھ سے کہتا ہے کہ مانا میرے بال غائب ہو گئے ہیں۔ مگر میں تم سے عمر میں اتنا بڑا نہیں ہوں تم مجھے صرف رام کہا کرو مگر میں مسٹر رام کمار ہی کہتی ہوں) پھر آپ نے مارکسزم پر ریسرچ چھوڑ کر فلم لائن کیسے اختیار کر لی۔ آرٹ کی خدمت کا جذبہ ایک دم کیسے پیدا ہو گیا؟''

''آرٹ کی خدمت''؟ میرے الفاظ دہرا کر وہ بڑے زور سے ہنسا ''فلم لائن میں آرٹ کی خدمت کون بیوقوف کرتا ہے؟ اور سچ پوچھو تو تمھارے کالجوں، یونی ورسٹیوں میں بھی تعلیم کی خدمت کون کرتا ہے؟ ہم سب...... ایکٹر ہوں یا پروفیسر صرف اپنے پیٹ کی خدمت کرتے ہیں۔ میں ایکٹر اس لیے بنا کہ پتا جی سورگباش ہو گئے اور ماتا جی میری یونی ورسٹی کی پڑھائی کا خرچہ

برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ان دنوں میں نے ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور اپنا زیادہ تر وقت کافی ہاؤس میں گزارا کرتا تھا۔وہاں ایک دن رستم ایرانی سے ملاقات ہوگئی۔وہ 'نئے چہروں' کی تلاش میں لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہو ایکٹر بنو گے؟ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم نہ لوں گا کیونکہ ڈیڑھ سو کی نوکری تو مجھے یہاں بھی مل سکتی ہے۔اس نے کہا منظور ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پانچ سو روپے ماہوار تک دینے کو تیار تھا۔ خیر اگلے کنٹریکٹ میں میں نے کسر پوری کر لی......اور اس طرح میں انسان سے ایکٹر بن گیا۔'' یہ کہہ کر خوب زور سے ہنسا اتنے زور سے کہ مجھے اس ہنسی میں ایک عجیب کھوکھلاہٹ معلوم ہوئی جیسے وہ اصلی نہ ہو نقلی ہو۔فلمی ہو......جیسے اس ہنسی کی تہ میں ایک گہری مایوسی چھپی ہوئی ہو۔

اور شمو جو اب تک خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے رام کمار کو تک رہی تھی۔ بولی: ''کیوں رام جی۔کیا ایکٹر انسان نہیں ہوتا؟''

''نہیں'' کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولا: ''ایکٹر انسان نہیں ہوتا یا یہ کہنا چاہیے کہ صرف آدھا انسان ہوتا ہے۔آدھا انسان اور آدھا مشین'......اور پھر جیسے خود اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔ یا با آواز بلند سوچ رہا ہو: ''آدھا انسان اور آدھا مشین! یہی ایکٹر کی ٹریجڈی ہے۔وہ بھی دل اور دماغ رکھنے والا گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے مگر اس سے کام لیا جاتا ہے، ایک جذباتی مشین کا' بٹن دبایا وہ بملا سے محبت کرنے لگا' بٹن دبایا وہ کملا پر فریفتہ ہوگیا۔بٹن دبایا وہ نیلما پر مرنے لگا' بٹن دبایا وہ آوارہ شہزادہ بن گیا' بٹن دبایا وہ رنگیلا شاعر بن گیا' بٹن دبایا وہ بھکاری گویا بن گیا' بٹن دبایا وہ پورن بھگت بن گیا' بٹن دبایا وہ سنت گیانیشور بن گیا' بٹن دبایا وہ دیوداس بن گیا' بٹن دبایا وہ گانے لگا' بٹن دبایا وہ ہنسنے لگا' بٹن دبایا وہ رونے لگا......اور پھر اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کی آوارگی میں بھی اصلیت ہو اور اس کی پارسائی میں بھی۔اس کی ہنسی بھی قدرتی ہو اور اس کا رونا بھی۔ وہ شراب بھی سچ مچ کی پیئے اور زہر بھی سچ مچ کا کھائے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ جب اسکرین پر عشق کرے تو جذبات کی گہرائی میں ڈوب جائے مگر اسٹوڈیو سے نکلتے ہی پاکباز برہم چاری اور مہاتما بن جائے۔ یہ سب جذباتی قلابازیاں کھانا یا تو

کوئی سوپرمین SUPER MAN کر سکتا ہے جو معمولی جذبات اور محسوسات سے اونچی سطح پر رہتا ہو یا آدھا انسان یعنی ایکٹر..... وہ بدقسمت انسان جس کی ایکٹنگ میں زندگی گھلی ہوئی ہوتی ہے اور جس کی زندگی میں ایکٹنگ شامل ہو جاتی ہے۔''

بڑی ہی دلچسپ ہوتی ہیں اس کی باتیں۔ فلموں میں جو ڈائیلاگ اس سے بلوائے جاتے ہیں ان سے کہیں زیادہ دلچسپ۔ بس جی چاہتا ہے کہ بیٹھی سنتی رہوں۔ روز رات کو روپ کے ڈرائنگ روم میں بارہ ایک بجے رات تک بیٹھک ہوتی ہے۔ تب ہم لوگ اپنے گھر لوٹتے ہیں (گھر پہنچ کر بھی میرے کانوں میں تو اس کی آواز گونجتی رہتی ہے!) سویرے ہی ناشتہ کے بعد یہ سلسلہ پھر چل پڑتا ہے۔

ہاں ایک بات لکھنا تو بھول ہی گئی۔ شمو کے پیٹ کا درد اور روپ کے سَر کا درد دونوں جاتے رہے ہیں۔ پچھلے دو ہفتے سے ایک بار بھی دورہ نہیں پڑا۔ جانتی ہو کس کے علاج سے؟ رام کمار کے۔ وہ اچھا ایکٹر ہونے کے علاوہ ایک میچور ڈاکٹر بھی تو ہے، ہومیوپیتھی کا بہت ہی قائل ہے۔ کہتا ہے اس کی پلوری کو صرف ہومیوپیتھی کی دواؤں نے دور کیا ورنہ ایلو پیتھک کے ڈاکٹروں نے انجکشن دیتے دیتے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ بڑے مزے سے ایک دن کہنے لگا: ''اگر دو چار انجکشن اور لگ جاتے تو مجھ میں اور چھلنی میں کوئی فرق نہ رہتا۔'' ہاں تو اب ہومیوپیتھی کا نہ صرف زبانی پروپگنڈا کرتا ہے بلکہ ہومیوپیتھی کی کتابیں پڑھتا ہے اور دوائیں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے سامان میں ایک کالا چمڑے کا بکس ہے۔ جو ہومیوپیتھی کی ننھی ننھی شیشیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم لوگ اس کو اکثر ان دواؤں کے بارے میں چھیڑتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ''ارے بھئی آج کھانے پر کوئی میٹھی چیز نہیں ملی، لاؤ ہومیوپیتھی کی دوا کی ایک پڑیا کھالیں.....'' کوئی کہتا ہے: یہ تو رام کے ہاتھ کا اعجاز ہے ورنہ ان پڑیوں میں پسی ہوئی شکر ہی تو ہے۔'' مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی دی ہوئی پڑیوں سے روپ کا (نیورلجیا) جاتا رہا ہے اور شمو کو بھی اب درد کے دورے نہیں پڑتے مگر تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ رام کی موجودگی ہی ان دونوں کے لیے دوا ثابت ہوئی ہے اور اس مسرت آمیز ہنگامہ خیزی میں وہ اپنی پرانی تکلیفوں کو بھول گئی ہیں۔ اور تو اور ماتھر صاحب بھی تو رام کے سخت گرویدہ ہو گئے ہیں۔ اس کے پاس ان کے انفیریورٹی کومپلکس

INFERIORITY COMPLEX کا علاج بھی ہے۔ کئی کئی گھنٹے وہ ان کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا ہے اور ماتھر صاحب ٹھہرے شطرنج کے دھنی۔ رام کا بیان ہے کہ وہ بمبئی کے دس بارہ بہترین شطرنج کے کھلاڑیوں میں سے ہے۔ مگر ماتھر صاحب اس سے بھی اچھا کھیلتے ہیں۔ شطرنج کھیلتے وقت ان میں ایک نئی فاتحانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنے مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو مورچوں پر لگا رہا ہے۔ اس وقت وہ اپنی ادھیڑ عمر، گنجے سر، چیچک کے داغ یا پائریا کی بوسب کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے انھوں نے روپ کو شطرنج سکھانے کی بہت کوشش کی اور شاید اسی لیے روپ نے شطرنج میں کبھی کوئی دلچسپی نہ لی۔

ہاں تو یہ ہے آج کل اپنا لائف پیٹرن LIFE PATTERN دور سیوائے ہوٹل کا گھڑیال بارہ بجا رہا ہے اور سویرے ہی ہمیں پکنک پر جانا ہے۔ اس لیے اب یہ خط ختم کرنا ہی چاہیے۔

تمھاری......سلمیٰ

مسوری 7 ستمبر

ڈیر اوشا!

معاف کرنا۔ تمھارے خط کا جواب اتنے دنوں بعد دے رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں بہت پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کس کو اپنی پریشانی سناؤں۔ تم مسوری ہوتیں تو پرانے دنوں کی طرح تمھارے سامنے اپنا رونا رو کر دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔ اب سوچتی ہوں خط ہی لکھ کر بھڑاس نکالوں۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ پاپا لکھنؤ سے مجھے اس لیے لائے تھے کہ میں احمد کو بھول جاؤں۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری قسمت پھوڑنے کے لیے اس کے علاوہ دوسری سازشیں بھی ہو رہی ہیں۔

کل ہمارے ہاں پاکستان سے ایک مہمان آئے ہیں' چودھری حنیف اللہ۔ پاپا ان کو پیٹرو نائزنگ طریقے سے ''ہیلو مائی بوائے'' ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ مگر عمر اڑتیس چالیس سے کم نہ ہوگی۔ انگریزی میں دستخط کر لیتے ہیں اور اخبار ہاتھ میں الٹا نہیں پکڑتے بس تعلیم اتنی ہی ہے۔ پہلے کانپور میں چمڑے اور کھالوں کی تجارت کرتے تھے۔ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ایک ایک

سال میں ان کی فرم کئی لاکھ کی کھالیں ولایت اور امریکہ بھیجتی تھی۔ (کھالوں کی تجارت کرتے کرتے۔ ان حضرت کی اپنی کھال بھی کافی موٹی ہوگئی ہے۔ کوئی مذاق کرو تو تار پہنچتا ہی نہیں اور چھوٹی موٹی سنب (SNUB) کرو تو شربت کی طرح پی جاتے ہیں) جون 1947 میں جیسے ہی ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا۔ انھوں نے چپکے سے اپنی فرم اور جائیداد بیچ ڈالی اور اگست تک سارا روپیہ پاکستان پہنچادیا۔ اب لاہور میں سرکاری ٹھیکوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ پاپا ان کے باپ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے ان کے بلانے سے یہ حضرت ہندستان بلکہ مسوری تک آتو گئے ہیں مگر ہر وقت جان اور مال کا خطرہ لگا رہتا ہے (مال کا خطرہ اس لیے کہ 1947 تک کا کئی لاکھ انکم ٹیکس دینا ہے اور اگر انکم ٹیکس والوں کو معلوم ہوگیا تو ڈر ہے کہ یہیں گرفتار نہ کر لیے جائیں) جان کا خطرہ تو ہر وقت ہی لگا رہتا ہے ہر ہندو اور سکھ کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ نہ جانے کب چھری نکال کر گھونپ دے۔ ہندستان میں ہمارے جیسے جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کو ایسا سمجھتے ہیں' جیسے ہم قربانی کے بکرے ہیں۔ جن کو آج یا کل ہندو اکثریت کے ہاتھوں ذبح ہونا ہے۔ کافی بیوقوف آدمی ہیں اور ان کی حرکتیں اور باتیں دلچسپی کا سامان بن سکتی تھیں مگر وہ یہاں ''امیدوار'' کی حیثیت سے بلائے گئے ہیں یعنی پاپا مجھے ان کے ہاتھ بیچنا چاہتے ہیں۔ (ان کو امید ہے کہ حنیف صاحب کے اثر سے وہ بھی پاکستان پہنچ کر جائیداد یا بزنس وغیرہ کچھ حاصل کرلیں گے) اور مجھے غصہ تو اس بات پر آتا ہے کہ ان حنیف صاحب کا GENERAL ATTITUDE ہماری طرف ایسا ہے جیسے ہم پر بڑا افسوس کر رہے ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ کبھی سوچتی ہوں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ کہیں نوکری کر کے گزارا کروں مگر اس قصائی کے ہاتھوں بکنے سے تو بچ جاؤں مگر ایسی باتیں کہانیوں اور ناولوں میں تو آسان معلوم ہوتی ہیں۔ اصل زندگی میں مشکل نظر آتی ہیں۔ گھر چھوڑ کر جاؤں تو کہاں جاؤں؟ کہاں ٹھہروں، نوکری کیسی اور کہاں تلاش کروں؟ بی۔ اے پاس لڑکیاں تو سینکڑوں کی تعداد میں آج کل ماری ماری پھرتی ہیں۔ کسی اسکول میں استانی ہو بھی گئی تو ساٹھ ستر روپے میں گزارہ کیسے ہوگا؟ اور پھر ماں باپ کو ناراض اور DEFY کروں بھی تو کس کے سہارے پر؟ دنیا میں میرا ہے کون؟ احمد کو اپنی اکنامکس اور مارکسزم سے کب فرصت ملتی ہے جو کسی کے جذبات کا خیال کریں اور میں اتنی CHEAP تو نہیں بننا چاہتی کہ زبردستی کسی کے سر پڑ جاؤں۔

غرض اسی ادھیڑبن میں رات دن گزرتے ہیں۔ دن بھر حنیف صاحب کی بکواس سننی پڑتی ہے۔ جو زیادہ تر کھالوں اور جوتوں کے بارے میں ہوتی ہیں (کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اگر اس کی چمڑی ادھیڑ لی جائے، تو اس میں سے کتنے جوتے بن سکتے ہیں) اس کے بعد ممی اور بھائی جان کے لیکچر سننے پڑتے ہیں کہ ہندستان میں تو مسلمان لڑکیوں کو اب اچھے لڑکے مل ہی نہیں سکتے کیونکہ جتنے مالدار، تعلیم یافتہ عہدے دار مسلمان نوجوان تھے وہ سب پاکستان چلے گئے ہیں اور پھر پاپا INDIRECTLY ہر وقت حنیف کی تعریف کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ لاکھوں کا بزنس ہے' کروڑوں کی جائیداد ہے۔ لاہور میں ایک جج کا بنگلہ الاٹ ہوگیا ہے۔ ایک سنیما مل گیا ہے۔ ایک جوتوں کا کارخانہ ہے۔ گورنمنٹ سے ٹھیکے ملتے رہتے ہیں۔ مَری میں ایک خوب صورت کاٹیج ہے، تین موٹریں ہیں وغیرہ وغیرہ' غرض میری جان! قیمت اچھی مل رہی ہے۔ پر اس کو کیا کیا جائے کہ ''طبیعت ادھر نہیں آتی۔'' حنیف صاحب تاجر چرم کے ہاتھوں اپنی چمڑی اُدھیڑوانا منظور نہیں۔

دو دن سے نہ ماتھر صاحب کے ہاں گئی ہوں، نہ رام کمار سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ لوگ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ سلمٰی کو کیا ہوگیا ہے مگر پاپا اور ممی کی خوشنودی کے لیے ہر وقت حنیف صاحب کی خاطر داری کرنی پڑتی ہے نا۔ کیا کیا جائے۔

اتنا کچھ تمھیں لکھنے کے بعد دل کسی قدر ہلکا ہوا ہے۔ دیکھو شاید کوئی صورت نکل آئے۔ جواب جلد دینا۔ اس گھٹن اور جلن میں تمھارے خطوں ہی سے کسی قدر سکون ملتا ہے۔

تمھاری پریشان اور دل شکستہ
'سلمٰی'

مسوری، 17 ستمبر

اوشا پیاری!

سب سے پہلے تو خوش خبری سن لو۔ چودھری حنیف اللہ صاحب تاجر چرم وٹھیکدار گورنمنٹ پاکستان' کل لاہور واپس جانے کے لیے سامان باندھ رہے ہیں۔ پاپا اور ممی اور بھائی جان تینوں از حد ملول و دل شکستہ ہیں۔ اس لیے کہ حنیف صاحب نے مجھ سے شادی کرنے سے

صاف صاف انکار کر دیا ہے۔ اور میں خوش ہوں...... اتنی خوش کہ خوشی سے پھٹی جا رہی ہوں......

یہ ساری کایا پلٹ ہفتے بھر میں کیسے ہوئی یہ بڑی دلچسپ کہانی بلکہ فلمی سینر یو ہے اور اس کا ہیرو۔ رام کمار!

ہوا یہ کہ جب میں دو دن تک ماتھر صاحب کے ہاں نہیں گئی تو تیسرے دن کیا دیکھتی ہوں، رام کمار صاحب ہمارے ہاں چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت پاپا اور ممی اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور بھائی صاحب حنیف صاحب کو لے کر ڈاک خانے گئے ہوئے تھے (حنیف صاحب کو اپنے بزنس کے سلسلے میں ایک تار دینا تھا اور ایسے کام وہ کبھی نوکروں پر نہیں چھوڑتے) میں گول کمرے میں بیٹھی ہوئی ریڈیو گھما رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور رام کمار صاحب ''ہیلو سلمیٰ'' کہہ کر داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ تم تو ایسی لگتی ہو جیسے برسوں کی بیمار ہو کہو تو اپنے کالے بکس میں سے ایک شکر کی پڑیا دے دوں...... یا کوئی اموشنل EMOTIONAL بخار چڑھا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ کوئی پاکستانی ''ڈون جوان'' آئے ہوئے ہیں۔'' یہ باتیں اس نے کچھ ایسی ملائمیت اور ایسی ہمدردی اور ایسے پر مذاق طریقے سے کہیں کہ میں بے اختیار رو پڑی۔

''ارے ارے۔ یہ کیا تم تو بالکل بچی نکلیں۔ کہو تو پریشانی کیا ہے؟''

پھر تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اس کو حنیف اللہ کی شانِ نزول بتا ہی دی۔

'ہوں' اس نے سوچتے ہوئے کہا: 'یہ تو بڑی گڑبڑ ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟'

اور اس وقت نہ جانے کہاں سے ایک DARING خیال میرے دل میں آیا اور میں نے بک دیا: اس مشکل کو آپ ہی آسان کر سکتے ہیں، رام صاحب؟''

''میں؟'' وہ گھبرا کر بولا۔ ''وہ کیسے؟''

پہلے تو میں ہچکچائی مگر پھر میں نے ہمت کر کے کہہ دیا: اگر آپ...... جھوٹ موٹ...... چند روز کے لیے...... میرا مطلب ہے...... کہ مجھ میں دلچسپی لینے لگیں...... تو حنیف صاحب SHOCK ہو کر بھاگ جائیں گے۔

''اوہ!'' اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ جیسے کسی بچے کو کوئی بڑا دلچسپ کھلونا کھیلنے کو مل جائے۔'' یہ تو آسان بات ہے، اور جھوٹ موٹ' کیا تم میں سچ مچ دلچسپی لینا بھی کوئی مشکل

نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا اور میں نے سوچا وہ مذاق کر رہا ہے۔ ورنہ جس پر ہندستان کی ہزاروں خوب صورت لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ وہ بھلا مجھ میں کیوں دلچسپی لینے لگا مگر اس نے کہا''اب تم فکر نہ کرو۔ تاجر چرم کو مسوری سے بھگانا میرا ذمہ ہے۔''

''تو پھر کب سے آپ......؟'' میں پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ ناٹک کب سے شروع ہوگا۔

میری ہکلاہٹ اور ہچکچاہٹ کے باوجود وہ میرا سوال سمجھ گیا اور بولا''کب سے کیا آج سے۔ ابھی سے۔''

اسی وقت باہر سے باغ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور پھر حنیف کے جوتوں کی چرمراہٹ' جو خود ان کے کارخانے کے بنے ہوئے ہیں اور اسی لیے دور سے سنائی دیتے ہیں۔ رام کمار اپنی کرسی سے اٹھا اور میری کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

دروازہ کھلا اور حنیف صاحب اور بھائی جان داخل ہوئے۔ میرا تو رنگ فق ہو ہی گیا کہ اب کیا ہوگا؟ مگر رام بھی گھبرا گیا اور گڑبڑا کر میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے چور چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب اس کی ایکٹنگ تھی) اور کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بھائی جان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔''اوہ ہیلو سلیم کہو کیسے ہو۔ کئی دن سے ملے نہیں'' اور پھر حنیف کی طرف دیکھ کر۔ بھئی اپنے دوست سے تو ملاؤ۔''

بھائی جان نے اپنے غصے اور خفت کو کنٹرول کرتے ہوئے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

''آپ ہیں ہمارے دوست حنیف اللہ صاحب' پاکستان سے آئے ہیں' اور یہ ہیں مسٹر رام کمار بڑے مشہور فلم اسٹار، ان کو تو اسکرین پر آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔''

حنیف نے بددلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا''اوہ ایکٹر؟'' اور جس طرح اس نے''ایکٹر'' کا لفظ ادا کیا' اس میں حقارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔''نہیں میں نے نہیں دیکھا۔ میرا اپنا سنیما ہے۔ مگر میں فلمیں نہیں دیکھتا اوّل فرصت نہیں ملتی اور پھر......کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔''

''اچھا ہی کرتے ہیں آپ فلموں میں دھرا ہی کیا ہے۔ فلم بنانے سے جوتا بنانا کہیں زیادہ دلچسپ کام ہے۔'' اور پھر فوراً ہی بھائی سے مخاطب ہو کر کہا:''کہو سلیم اسکیٹنگ رنگ کو چلتے ہو؟

بھائی جان نے منہ بنا کر کہا: "نہیں۔ تم جاؤ۔ مجھے حنیف صاحب کے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"اچھا تو بائی بائی۔ آداب عرض، حنیف صاحب، آؤ سلمٰی ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور ان دونوں کو مبہوت چھوڑ کر مجھے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

باغ میں پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "بے فکر رہو۔ اب حنیف صاحب تم سے کبھی شادی نہ کریں گے۔ مگر اس کام کے انعام میں میرے ساتھ اس وقت اسکیٹنگ کو چلنا ہوگا۔"

اس شام کو ہم لوگ دو گھنٹے تک اسکیٹنگ کرتے رہے۔ سارے مجمع کی نظریں ہم پر تھیں۔ تمام لڑکیاں مجھے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ پانچ بجے کے قریب بھائی جان اور حنیف وہاں آئے۔ ہم لوگوں کو اسکیٹنگ کرتے ہوئے دیکھا اور واپس جانے لگے مگر رام نے (جو رولر اسکیٹوں پر بجلی کی رفتار سے چل سکتا ہے۔) انھیں دروازے کے قریب پکڑ لیا: "ارے بھائی سلیم، کہاں چلے؟ آیئے نا حنیف صاحب آپ کو اسکیٹنگ کرائیں۔"

"شکریہ۔ مگر ہم ہیک مینز جا رہے ہیں۔" حنیف صاحب نے کہا اور وہ دونوں چلے گئے۔

چند منٹ بعد رام نے کہا "اب اسکیٹنگ سے جی گھبرا گیا ہے۔" "چلو ہیک مینز میں ڈانس کریں گے تمھیں ڈانس کرنا آتا ہے نا؟"

"ہاں آتا تو ہے تھوڑا تھوڑا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی ڈانس کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"کسی زمانے میں سیکھا تھا۔ کوئی خاص پسند نہیں اس لیے مدت سے چھوڑ رکھا ہے مگر آج تو ڈانس کرنا ہی پڑے گا۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔"

سو ہم ہیک مینز پہنچے۔ پاپا اور ممی اب تک نہیں آئے تھے۔ حنیف اللہ صاحب اور بھائی جان ایک کونے میں بیٹھے وہسکی پی رہے تھے اور ان کے قریب سے ہم گزرے تو حنیف کو کہتے سنا کہ پاکستان میں تو شریعت والوں کے ڈر سے چھپ کر پینی پڑتی ہے۔ یہاں تو پی لیں۔" رام سیدھا مجھے ڈانس فلور پر لے گیا۔ بینڈ "بلیو ڈینیوب BLUE DENUB کا والٹز بجا رہا تھا۔ روشنیاں دھیمی ہوتی گئیں اور ہم ڈانس کرتے رہے اور موسیقی کی لہروں پر بہتے بہتے نہ جانے کہاں پہنچ گئے مگر اس نے ایک بار بھی دھیمی روشنیوں سے فائدہ اٹھا کر مجھے چومنے کی کوشش نہیں کی اور نہ غیر ضروری حد تک سینے سے چمٹایا۔ ایسا لگتا تھا اس نے اپنے اوپر بعض حدیں عائد کر لی ہیں اور

ان کے بارے میں بڑی احتیاط برت رہا ہے۔ ہاں جب بھائی جان اور حنیف صاحب کی میز کے قریب سے ہم ڈانس کرتے ہوئے گزرتے تو اس کا منہ میرے اور قریب آجاتا۔ یہاں تک کہ میں اس کا گرم سانس اپنے گال پر محسوس کرتی اور میرے لیے یہ یاد رکھنا مشکل ہو جاتا کہ ہم صرف ایک ناٹک رچا رہے ہیں۔ سچ مچ کا معاشقہ نہیں ہو رہا ہے۔

جب والٹز ختم ہوا اور روشنیاں ابھر آئیں تو ہم نے دیکھا کہ حنیف صاحب اور بھائی جان اپنی میز سے غائب ہیں مگر پاپا اور ممی ایک اور میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

'ہیلو کنور صاحب' رام پاپا سے بڑے تپاک سے ملا اور ممی کو بڑے ادب سے نمستے کہا: ''آپ کی لڑکی نے تھوڑی سی پریکٹس اور کی تو اچھا ڈانس کرنے لگے گی۔''

پاپا تم جانو سوشل اٹیکیٹ کے بڑے قائل ہیں۔ انھوں نے غصّے اور ناپسندیدگی کی جھلک بھی چہرے پر نہ آنے دی۔ رام سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب گھڑی نے سات بجائے تو پاپا نے کہا: ''چلو سلمیٰ گھر چلیں۔ حنیف صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

مگر رام نے فوراً بات کاٹ کر کہا: ''معاف کیجیے گا کنور صاحب، مگر سلمیٰ تو آج ہمارے ساتھ ماتھر صاحب کے ہاں کھانا کھا رہی ہے..... بات یہ ہے کہ آج میری سالگرہ ہے..... اس لیے آج تو اسے آنا ہی پڑے گا۔ ارادہ آپ سب کو بھی بلانے کا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

پاپا نے زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے اجازت دے دی۔

راستہ میں رکشا میں میں نے پوچھا: ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج آپ کی سالگرہ ہے ورنہ میں کوئی تحفہ لاتی۔''

''اوہ سالگرہ؟'' اس نے کہا جیسے اس کے بارے میں بالکل بھول گیا ہو۔ ''ہاں سالگرہ۔ ایکٹر کی سالگرہ کیا۔ وہ تو روز پیدا ہوتا ہے اور روز مر جاتا ہے۔'' اور ایک ٹھنڈی سانس ایک کھوکھلے قہقہے میں سو گئی۔

ماتھرز کے ہاں پہنچے تو ڈرائنگ روم کو خالی اور ویران پایا۔ صرف ماتھر صاحب اکیلے بیٹھے شطرنج کے مہروں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔

''ارے بھائی رام کوئی دوا دو۔'' انھوں نے پریشان نظروں سے ہمیں دیکھ کر کہا۔ ''روپ کو

آج پھر نیورلجیا کا دورہ پڑ رہا ہے۔"

رام نے کالا بکس کھولا ہی تھا کہ شمّو کے کمرے سے چیخوں کی آواز آئی، میں اور ماتھر صاحب ادھر ادھر دوڑے، کیا دیکھتے ہیں کہ شمّو اپنے پلنگ پر پڑی درد کے مارے کراہ رہی ہے۔ ماتھر صاحب نے بیٹی کو سنبھالتے ہوئے مجھ سے کہا: جانا' سلمٰی ذرا شمّو کے لیے بھی دوا لانا۔"

رام نے ایک شیشی نکال کر اس میں سے دوا کی دو پڑیاں بنائیں۔ شمّو کے کمرے میں جا کر ایک پڑیا اسے اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ تھوڑی دیر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر بڑے نرم لہجے میں کہا: "بس اب تمھیں آرام آ جائے گا۔" اور سچ مچ اسی دم شمّو کے کرب میں کمی ہوگئی اور چند منٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور کمزور سی آواز میں کہا "تھینک یو رام جی" پھر وہ روپ کے کمرے میں گیا۔ اور دوا کی دوسری پڑیا ان کو دی۔ ان کے سر کو ہلکے ہلکے دبایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے نیورلجیا کا دورہ بھی دھیما پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا: "دیکھیے مسز ماتھر، آدھے گھنٹے میں آپ کا دورہ دور ہو جانا چاہیے۔ آج میری سالگرہ ہے اس لیے کھانے کے بعد میں آپ سب کو سنیما لے چل رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر کمرے میں آ گیا۔

میں نے پوچھا "مگر مسز ماتھر کو نیورلجیا ہے اور شمّو کے پیٹ میں درد ہے۔ یہ کون سی دوا ہے جو آپ نے دونوں کو دے دی ہے؟"

اس نے کہا: IGNATIA اگنیشیا ہسٹریا کی ہر شکل میں فائدہ کرتی ہے۔

BELIEVE OR NOT آدھ گھنٹے میں روپ اور شمّو دونوں کو اتنا افاقہ ہو گیا کہ نہ صرف کھانے کی میز پر آئیں بلکہ سنیما بھی گئیں۔ جب رام نے مجھے سنیما چلنے کی دعوت دی تو میں نے کہا: "کیا آپ چاہتے ہیں کہ آج مجھے گھر سے بالکل ہی نکال دیا جائے؟" مگر اس کے جواب سے میں لاجواب ہو گئی۔ اس نے کہا: "شاید آپ کی مشکلات کا یہی حل ہے۔ آپ اپنے گھر کے دروازے تک آ گئی ہیں۔ اندر آپ واپس نہیں جانا چاہتیں۔ باہر آنے کی آپ میں ہمت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر آپ کے والدین آپ کو گھر سے نکال دیں تب ہی باہر کی دنیا میں آ سکتی ہیں۔ ورنہ ہمیشہ آپ دہلیز پر اسی طرح کھڑی رہیں گی۔ ایک قدم اندر اور ایک باہر۔"

سنیما کے بعد گھر پہنچی تو دیکھا بابا ڈرائنگ روم میں انگیٹھی کے پاس بیٹھے میرا انتظار

کررہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی گرج کر بولے''اب آئی ہو؟'' میں کچھ کہنے والی ہی تھی کہ حنیف صاحب ایک لبادہ نما ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میری طرف ایک نظر دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ پاپا کے قریب جاکر مجھے سنانے کے لیے کہنے لگے''پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو بے پردہ لڑکیوں کی چوٹیاں کاٹ دیتے ہیں۔'' یہ سن کر میں جل ہی تو گئی مگر میں نے خاموش رہنے ہی میں خیریت سمجھی۔ میں جانتی تھی کہ ایک مہمان کے سامنے پاپا کبھی مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس لیے غڑاپ سے میں اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ بند کرتے ہی سوئچ آف SWITCH OFF کیا اور اپنے بستر کے اندر۔

اگلے دن سے تو میں نے ڈھٹائی پر کمر باندھ لی کیونکہ حنیف سے چھٹکارا پانے کی یہی ایک صورت تھی کہ میں رام کمار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔ شام کو ہم لوگ اکٹھے ٹہلنے نکلتے۔ لائبریری کے سامنے سے گزرتے تو سارے مجمع کی نگاہیں ہم پر ہوتیں۔ لڑکیاں تو رشک اور حسد سے دیکھتی ہی تھیں۔ لڑکے بھی مجھے ایک نئے ڈھنگ سے دیکھنے لگے۔ گویا افسوس کررہے ہوں کہ انھوں نے میرا نوٹس لینے میں پہل کیوں نہ کی۔ اسکیٹنگ رنگ، ہیک مینز' بال روم، سنیما ہر جگہ ہم ساتھ نظر آتے۔ ایک مقامی اخبار نے تو ہماری منگنی کی خبر بھی شائع کردی اور کل جب 'اسکرین' کا پرچہ آیا تو اس کے پہلے صفحہ پر ہی ہماری تصویر جو ڈانس کرتے وقت کسی نے فلیش لائٹ سے لی تھی۔ (تم نے بھی یہ تصویر دیکھی ہوگی شاید) اس تصویر کا چھپنا تھا کہ حنیف صاحب نے مجھ سے فورمل بات چیت بھی بند کردی اور سامان باندھنا شروع کردیا...... پاپا خفا ہیں، ممی خفا ہیں۔ بھائی جان سے بات کرتی ہوں تو وہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ حنیف صاحب کے جاتے ہی مجھ پر وہ ڈانٹ پڑے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا مگر فی الحال تو صرف یہ اطمینان ہے کہ حنیف صاحب جارہے ہیں اور میری کھال کے جوتے نہیں بنیں گے۔ آگے جو ہوگا بھگت لیا جائے گا۔

تمہاری...... سلمٰی

P.S: میری جان! مہربانی کرکے ان سب باتوں کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔

مسوری، 20 ستمبر

اوشا' مائی ڈیر!

تمھارے دونوں خط ملے۔ تم نے اکنامکس پڑھنی شروع کر دی ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے پروفیسر صاحب کی طرفداری کرو۔ میں ان کو ہرگز خط نہ لکھوں گی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں کہ مجھے خط میں لکھتے ہیں: ''سنا ہے وہ الّو رام کمار آج کل مسوری آیا ہوا ہے اور رئیسوں کی بیٹیاں پروانوں کی طرح اس پر فدا ہو رہی ہیں''۔ ان سے کہنا ذرا شیشے میں اپنی صورت تو دیکھیں اور پھر رام کمار پر فقرے کسیں۔ اور وہ اسے مذاق سمجھتے ہیں تو مجھے ایسے مذاق پسند نہیں۔

لگتا ہے تم بھی فلم ایکٹروں کو تعصب کی عینک سے دیکھتی ہو۔ بھلا یہ تم کو کیسے خیال ہو گیا کہ رام کمار SHALLOW اور اوچھا ہے۔ تم اس کی باتیں سنو تو دُم ہو جاؤ۔ دنیا کے معاملات پر اس کی نظر تمھارے بہت سے پروفیسروں (خصوصاً اکنامکس کے بعض پروفیسروں) سے کہیں زیادہ گہری ہے۔

پرسوں ہم دور تک ٹہلنے گئے۔ راستے میں میں نے کہا: ''اتنے دن آپ کو یہاں آئے ہوئے ہو گئے مگر آپ نے فلمی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

رام نے کہا ''دیکھو بھئی۔ میں فلمی دنیا سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں اور تم اپنے سوالات سے مجھے پھر اسی دلدل میں ڈھکیلنا چاہتی ہو'' اور پھر تھوڑی سی دیر کی خاموشی کے بعد ''سوچتا ہوں کہ تمھیں فلمی دنیا کے کس پہلو کے بارے میں بتاؤں' ان فلم اسٹاروں کے بارے میں جو حسین ہیں مگر جن کو سچی محبت کبھی نصیب نہیں ہوئی؟ ان ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے فی پکچر لینے والی ہیروئنوں کے بارے میں جو دن اور رات شوٹنگ کے کولہو میں پستی ہیں تا کہ ان کے بھائی یا باپ یا ماموں یا نام نہاد گارڈین ان کی کمائی سے شرابیں پئیں، رنڈی بازی کریں، مٹکا اور سٹہ کھیلیں۔ شارک اسکن کے سوٹ پہن کر بیوک اور پیکارڈ کاروں میں گھومیں؟ یا ان کے بارے میں جن کے نام سے بینکوں میں کئی لاکھ روپے جمع ہیں مگر جن کو پانچ پانچ برس تک ایک ہفتے کی چھٹی نصیب نہیں ہوتی؟ ان کے بارے میں جو امریکن فلموں کی کہانیاں چرا کر بیس بیس ہزار میں بیچتے ہیں یا ان کے بارے میں جن کو چند سو روپے ان فلموں کی کہانیاں، مکالموں اور گانوں کے ملتے ہیں، جن کے ٹائٹلز پر کسی اور کا نام آتا ہے؟ ان اکسٹراز کے بارے میں جو برسوں تین چار روپے

روز پر CROWDSEEN میں کام کرتے ہیں، اس امید موہوم میں کہ کسی دن ان کی قسمت بھی چمکے گی اور وہ اشوک کمار اور موتی لال اور راجکپور کی جگہ لیں گے؟ یا ان قلیوں کے بارے میں جو ڈیڑھ روپے روز پر بندروں کی طرح رسیوں پر چڑھتے ہیں اور بھاری بھاری لائٹوں کو اسٹوڈیو کی چھت سے لٹکے ہوئے تختوں پر لگاتے ہیں اور ہر گھڑی اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں؟ ان شریف زادیوں کے بارے میں جن کا کردار کوٹھے والیوں سے بدتر ہے۔ یا ان طوائف زادیوں کے بارے میں جو سنجیدہ اور شریف ہیں؟ ان بیوقوفوں کے بارے میں جو اپنے آپ کو جینیس GENIUS سمجھتے ہیں یا ان GENIUSES کے بارے میں جن کو سب بیوقوف اور الو سمجھتے ہیں؟ فلمی دنیا بھی دنیا کی طرح سب رنگ ہے، سلمیٰ'

جو آدمی ایسا فلسفیانہ نظریہ رکھتا ہو۔ کیا اس کو چھچھورا کہا جا سکتا ہے؟

تمھارے اس فقرے کو پڑھ کر کہ 'رام کمار فلم ایکٹر ہے فلم ایکٹر۔ بچ کے رہنا''

مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ غصہ اس لیے کہ لگتا ہے تم بھی عام لوگوں کی طرح سے یہ سمجھتی ہو کہ ہر فلم ایکٹر آوارہ، بدمعاش بلکہ حسن کا ڈاکو اور بھولی بھالی لڑکیوں کی عصمت کا لٹیرا ہوتا ہے اور اس گروہ میں تم رام کمار کو بھی شامل کرتی ہو اور ہنسی اس لیے کہ تمھارا خدشہ کتنا غلط ہے۔ پچھلے تین چار ہفتے میں درجنوں بار ہم اکیلے ملے ہیں۔ اجالے میں بھی اور اندھیرے میں بھی۔ ساتھ ڈانس بھی کیا ہے اور دور تک واک کو بھی گئے ہیں مگر اب تک ایک بار بھی اس نے کوئی غیر شریفانہ اقدام نہیں کیا۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ بور ہونے کی حد تک شریف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مزا یہ ہے کہ دوسروں کی موجودگی میں وہ مجھ سے زیادہ بے تکلفی سے بات کرتا ہے FLIRATATIOUS انداز میں مذاق بھی کرتا ہے لیکن جب صرف ہم دونوں ہوتے ہیں' اور کوئی تیسرا نہیں ہوتا' تو وہ بڑی احتیاط سے اپنے اور میرے درمیان شریفانہ فاصلہ رکھتا ہے۔

بات یہ ہے اوشا کہ تم نے رام کمار دی ایکٹر، کو اسکرین پر دیکھا ہے اور مجھے ان دنوں میں 'رام کمار دی مین' کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے اور تم سے یہ کہنے میں مجھے کوئی پردہ نہیں کہ میں اسے بہت پسند کرنے لگی ہوں اور شاید وہ بھی...... پرسوں وہ مجھ سے کہنے لگا: ''جانتی ہو' سلمیٰ' میری زندگی میں تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں دل کھول کر دوستوں کی طرح بات کر سکتا ہوں۔''

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ باوجود اپنی تمام کامیابی اور شہرت کے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ شاید محبت کی، لگتا یہ عجیب ہے کہ وہ نوجوان جس پر ہزاروں لڑکیاں جان دیتی ہیں اور جو اسکرین کی ہر حسینہ کے ساتھ فلموں میں عشق کر چکا ہے اپنی پرائیویٹ زندگی میں محبت کی کمی محسوس کرے مگر واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے سلمٰی؛ ایک دن وہ کہنے لگا: '' کہ بغیر UNDERSTANDING کے محبت مکمل اور پائدار نہیں ہوسکتی اور ہم میں سے کتنے ہیں جو دوسروں کو تو کیا اپنے آپ کو سمجھنے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں'' اور پھر یکا یک میری نظروں سے اپنی نظریں بچا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا: '' کیوں سلمٰی تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ معمولی فلرٹیشن نہیں جو مسوری اور نینی تال کی رومانی فضا میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں بلکہ اصلی، سچی، گہری محبت جو انسان کی زندگی کو رنگینی اور موسیقی اور خوشی سے بھر دیتی ہے اور ساتھ ہی اس کو پہلی بار دکھ اور غم سے آشنا کرتی ہے، یہ محبت بھی عجیب بیماری ہے!''

اور نہ جانے کیوں......نہ جانے کیسے......میرے جی میں آیا کہ اسے سب کچھ بتا دوں۔ وہ بھی جو اس وقت تک میں اپنے آپ سے بھی چھپائے ہوئے تھی۔ شاید اس لیے کہ میرا خیال تھا اور ہے کہ وہ میرے (یا کسی اور کے) دل کا حال مجھ سے بہتر جان سکتا ہے اور میرے جذباتی PROBLEMS کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتا ہے......میں نے اس کو احمد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ کیسے ہماری پہلی ملاقات ہوئی اور کیسے آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ کون کون سی باتوں میں ہم ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور کن باتوں میں ہمارے اختلافات ہیں۔ پھر احمد کی نفسیاتی خصوصیات کے بارے میں، اس کی ضرورت سے زیادہ شدید خودداری کے احساس کے بارے میں کیونکہ میرے والد تعلقہ دار ہیں اور وہ ڈھائی سو روپے ماہوار پانے والا لکچرر ہے۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے نہیں کہتا۔ یہاں تک کہ اس نے محبت کا اقرار تک نہیں کیا۔......ایسے آدمی سے کب تک کوئی محبت کرسکتا ہے؟ کب تک کوئی انتظار کرسکتا ہے؟''

اور اس نے مسکرا کر کہا: ''محبت منطق کو نہیں مانتی سلمٰی۔ اور انتظار......اگر چیز انتظار کے قابل ہو تو آدمی عمر بھر انتظار کرسکتا ہے'' اور نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ہاں سلمٰی! عمر بھر انتظار کرسکتا ہے اور پھر جیسے اس نے دفعتاً اپنے جذبات کی عریانی پر مذاق کا پردہ

ڈالنا چاہا ہو' وہ ہنس کر بولا:

''مگر یہ خوش قسمت مگرٹ پونجیا پروفیسر ہے کون؟''

میں نے کہا'' آپ نہیں جانتے شاید'اس کا نام ہے......احمد!''

''احمد؟ اکنامکس والا احمد حسین تو نہیں؟''

میں نے کہا: ہاں وہی! کیوں کیا آپ احمد کو جانتے ہیں؟

''ہاں کسی قدر۔ میں بھی اکنامکس کا اسٹوڈنٹ تھا'' اور اس کے بعد نہ جانے کیوں اس نے گفتگو کا رخ ایک دم بدل دیا اور ہم ماتھر خاندان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

تو'اوشا جانی' یہ ہے میری جذباتی زندگی کا دوراہا' دنیا میں تم ہی تو ہو'جس سے میں یہ سب کچھ کہہ سکتی ہوں اور جس سے مشورہ کر سکتی ہوں خدا کے لیے ان باتوں کا ذکر نہ کرنا کسی سے۔مگر اپنی رائے ضرور لکھنا۔

تمھاری، سلمیٰ

مسوری،26 ستمبر

اوشا!

سوچتی ہوں یہ زندگی کامیڈی ہے یا ٹریجڈی؟ ایک کامک ٹریجڈی یا ایک ٹریجک کامیڈی...... یا کٹھ پتلیوں کا ایک بے معنی ناٹک جس میں بھگوان'یا خدا' یا کرم یا قسمت کے ہاتھوں میں وہ ڈوریاں ہیں جن سے ہم انسانوں کو اٹھایا بٹھایا' ہنسایا رلایا جاتا ہے۔ یا (جیسا ہم نے مارکسسٹ اکنامکس کی کتابوں میں پڑھا ہے) سماجی اور سیاسی اور معاشرتی حالات ہماری ذاتی زندگیوں' یہاں تک کہ ہمارے جذبات ومحسوسات کی بھی تشکیل کرتے ہیں۔

پچھلے چند دنوں میں میری اپنی زندگی نے جو پلٹے کھائے ہیں ان کے بارے میں سوچ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔

اپنی اور رام کمار کی جس بات کے بارے میں' میں نے تمھیں لکھا تھا' اس کے چار روز کے بعد ایک دن سویرے جو میں ماتھرز کے یہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ روپ کو صبح صبح ہی نیورلجیا کا سخت دورہ پڑا ہے اور شمّو کو پیٹ کے درد کا۔ مجھے دیکھتے ہی ماتھر صاحب بولے:''سلمیٰ بیٹی تمھیں

معلوم ہے رام کون سی دوائیں ان کو دیا کرتا تھا۔ ذرا دینا نکال کے'وہ تو اچھا ہوا کہ وہ جلدی میں اپنا یہ کالا دواؤں کا بکس بھول گیا ہے۔''

''بھول گیا ہے؟'' کیا مطلب؟ کیا رام صاحب چلے گئے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! کل رات کو ایک بجے بمبئی سے تار آیا کہ اسے فوراً واپس آجانا چاہیے' اس کی نئی فلم ''ادھورے سپنے'' کی مہورت ہے اس لیے وہ آج سویرے کی فلائٹ FLIGHT سے ہی چلا گیا...... ہاں ذرا جلدی کرنا۔ وہ دوا نکالنا۔''

میں بھونچکی سی رہ گئی۔ کونے میں رکھا ہوا دواؤں کا بکس کھولا تو دیکھا کہ اس کی ساری شیشیاں غائب ہیں صرف ایک دوا کی شیشی رکھی ہے۔ ''اگنیشیا'' اور اس پر نام کے نیچے رام کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ 'ہسٹیریا کی ہر شکل کے لیے اکسیر ہے۔ رام کا نام لے کر کھائی جائے تو ضرور فائدہ ہوگا۔''

''سنا تم نے؟'' میں نے شمّو کو دوا کھلاتے ہوئے کہا: ''رام لکھ گیا ہے رام کا نام لے کر یہ دوا کھائی جائے تو تمھیں ضرور فائدہ ہوگا۔''

اور یہ سن کو شمّو کو باوجود شدید درد کے ہنسی آ گئی' کہنے لگی 'رام بڑے مذاقیہ ہیں' دیکھا! میری آٹوگراف بک میں کیا لکھ گئے ہیں!'' تکیے کے نیچے سے کتاب نکال کر دکھائی' رام کے جناتی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا'' پیٹ کے درد میں ہنسی بہت فائدہ دیتی ہے۔ بشرطیکہ مریض اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت پیدا کرے۔''

''بڑا شریر ہے رام'' روپ دوا کی خوراک کھاتے ہوئے بولیں: ''مجھے ایک پرانے سنیما ٹکٹ پر آٹوگراف دے کر گیا ہے اور اس پر لکھا ہے'' آدھے سر کا درد پورے سر کے درد سے بہتر ہے کیونکہ آدھا سر تو سوچنے کے قابل رہتا ہے۔ اگر کوئی اپنے سے محسوس کرنے کے بجائے سوچنے کی تکلیف گوارا کر سکے'' اور یہ سنا کر وہ بھی ہنس پڑیں اور مجھے ایسا لگا کہ رام کی ہومیوپیتھی اس کی غیر حاضری میں بھی کام کر رہی ہے۔ میں نے ماتھر صاحب سے پوچھا'' کیا میرے لیے کوئی خط کوئی پیغام نہیں چھوڑ گئے؟

''اوں ہوں' کچھ نہیں۔'' اور پھر سوچ کر'' ہاں تمھاری آٹوگراف بک دے گیا ہے۔ یہ لو''

میں نے جلدی جلدی ورق الٹے' لکھا تھا: ''زندگی کی حقیقت سنیما کی پرچھائیوں سے کہیں

زیادہ دلچسپ ہے اور پورا انسان آدھے انسان سے بہتر ہوتا ہے۔"

"آدھا انسان!" اور میں رام کی زبانی ایکٹر کی تعریف یاد کر کے بے اختیار مسکرادی گو میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے" مگر پورے انسان سے اس کا کیا مطلب ہے ابھی یہ سوال میرے دماغ میں کوندا ہی تھا کہ ایک ہلکی سی آواز کان میں آئی "سلمیٰ!"

میں نے مڑکر دیکھا۔ دروازے میں وہی پرانا ٹوئیڈ کا کوٹ پہنے (جس کے مونڈھے پر میرے ہاتھ کا رفو کیا ہوا ہے) احمد کھڑا مسکرا رہا ہے۔

"احمد!" میں چلائی۔ "تم یہاں کیسے اور کب آئے؟"

"ابھی ابھی سیدھا چلا آرہا ہوں۔ کہو تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

"میری طبیعت؟ کیوں میری طبیعت کو کیا ہوا؟"

"مگر اس نے تو لکھا تھا ایک بڑے ہوشیار ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ تمھیں دل کی بیماری ہونے کا خدشہ ہے۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟ اور کس نامعقول نے تمھیں یہ سب بکواس لکھی ہے؟"

"اسی الو رام کمار نے اور کس نے اور وہ نالائق ہے کہاں؟"

"رام کمار نے؟" میرا دماغ اس عجیب وغریب گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "رام کمار سے تمھارا کیا تعلق؟ تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

احمد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:۔ "اس بدمعاش کو میں نہیں جانتا تو اور کون جانتا ہے۔ کم سے کم پندرہ برس تو اسکول اور کالج میں ہم نے ساتھ پڑھا ہے، چھ سال ہاسٹل میں اکٹھے ایک کمرے میں رہے ہیں۔ اسی کی وجہ سے میں نے ایم اے میں اکنامکس لیا۔ دونوں مل کر ریسرچ کرنے والے تھے اور تم کہتی ہو، میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ تمھارے لیے وہ توپ ایکٹر ہوگا، میں تو اسے اب بھی ویسا ہی الو سمجھتا ہوں۔ وہ ہے کہاں؟"

"وہ تو چلا گیا" ماتھر صاحب نے کہا:

"دیکھیے نا۔ یہ ہیں اس نالائق کی حرکت۔ مجھے اتنی دور سے بلایا۔ اور خود غائب۔" ماتھرز کے یہاں سے اپنے گھر آتے ہوئے راستے میں، میں نے احمد سے کہا "پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

''ارادہ کیا ہے؟'' ایک نئے لہجے میں اس نے میرے الفاظ دہرائے اور راہگیروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عین سڑک پر مجھے روک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: ''ارادہ یہ ہے سلمیٰ، کہ ابھی جا کر تمھارے پاپا کنور صاحب سے کہنے والا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کل شادی ہو جائے گی۔ اور......''

''اور......؟'' میں اتنی حیران تھی کہ غصہ کا اظہار کرنا بھی بھول گئی کہ اسے میری طرف سے بھی سب فیصلہ کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟

''اور پھر پرسوں، ہم ہنی مون کے لیے بمبئی روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں میں فیکٹری کے مزدوروں کی حالت پر ریسرچ کرنے والا ہوں۔ رام نے لکھا ہے کہ ہم اس کے ہاں ٹھہر سکتے ہیں۔''

''میں بمبئی ومبئی نہیں جاؤں گی۔'' میں غصّے سے چلائی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اور سب باتیں تمھیں منظور ہیں۔ اپنا کیا ہے۔ بمبئی نہ سہی کلکتے سہی، کانپور سہی، ہاں بمبئی میں اپنا دوست ہے۔''

''مجھے تمھارا دوست نہیں پسند۔''

''اوہ رام! اسے پسند کرنے کے لیے ذرا زیادہ عقل کی ضرورت ہے۔'' اور یہ کہہ کر احمد خوب ہنسا اور پھر نہایت بے شرمی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنا ہاتھ جھٹک کر اسے ماروں، اسے نوچوں، کھسوٹوں یا اس سے لپٹ کر خوب روؤں، خوب روؤں۔

اور پھر BELIEVE IT OR NOT احمد نے پاپا سے اس قطعی انداز میں بات کی کہ انھوں نے شادی کی اجازت دے دی ہے۔ مگر تیاریوں کے لیے دس دن کی مہلت مانگی ہے۔ سو اگلے ہفتے 24 اگست کو ہماری شادی ہے یہیں مسوری میں اور اس لیے تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں تمھاری موجودگی نہایت ضروری نہیں بلکہ لازمی ہے۔ تم نہ آئیں تو میں بہت بہت خفا ہوں گی سمجھیں! لہٰذا اس خط کو تار سمجھو اور فوراً سے پیشتر یہاں آ جاؤ۔ باقی ملاقات پر

تمھاری حیران پریشان مگر خوش
سلمیٰ
مسوری، 29 ستمبر

اوشا پیاری!

کل شام ہم آخری بار سیر کو نکلے۔ لائبریری پر وہی بے فکرے نوجوانوں اور رنگین تتلیوں کی بھیڑ تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس بار بے فکروں کی مسکراہٹیں کافی فکر مند نظر آئیں اور تتلیوں کے رنگ ایسے لگے، جیسے پھیکے پڑ گئے ہوں۔ احمد کی رفاقت مجھے ان بے ہودہ ایکس رے نگاہوں سے محفوظ کیے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے ہیک مینز بھی گئے اور اسکیٹنگ رنگ بھی مگر دونوں جگہ کوئی رونق نظر نہ آئی۔ ایک تو بھیڑ کم تھی دوسرے جو لوگ تھے وہ بھی تھکے ہوئے، مرجھائے ہوئے چہروں کو لیے وہسکی کے گھونٹ اس طرح پی رہے تھے، جیسے زہر پی رہے ہوں۔ بینڈ ایک نہایت روتی ہوئی بلکہ سسکتی ہوئی ٹیون بجا رہا تھا جس پر انسان تو نہیں موت ہی رقص کر سکتی ہے۔

لوٹے تو دیکھا کہ مسوری کی روشنیاں کہرے کی گہری چادر میں سے ٹمٹما رہی ہیں۔ کوئی رکشا چلتی بھی نظر نہ آئی (اس لیے کہ رکشا والوں نے دو دن سے ہڑتال کر رکھی ہے) راستہ چلتے سردی کے مارے اپنے کوٹ کے کالروں میں سر چھپائے جلدی جلدی قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ میں نے کہا ''ایسا لگتا ہے جیسے مسوری اس ٹھٹھری ہوئی سردی میں کمبل لپیٹ کر سو گیا ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''سو رہا ہے یا دم توڑ رہا ہے؟'' اس پر بھائی جان بولے ''اکتوبر کی آمد آمد ہے۔ سیزن بھی تو ختم ہو گیا ہے اور نہ جانے کیا سوچ کر احمد بولے ہاں مسوری کا سیزن ختم ہو گیا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔''

گھر پہنچے تو تمھارا خط ملا۔ مبارکباد کا شکریہ۔

تمھاری طبیعت کی خرابی کی خبر کافی پریشان کن ہے۔ افسوس ہے کہ تم کل یہاں پر نہ ہو گی۔ خیر۔ اپنا علاج باقاعدہ کراؤ۔ اگر اپنڈکس نکلے اور آپریشن کی صلاح ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا تاکہ میں بھی وہاں تمھاری تیمارداری کو آ سکوں۔ یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ اس وقت گھر کی کیا حالت اور میرا کیا موڈ ہے، وہ تم اندازہ لگا سکتی ہو۔

تمھاری

سلمٰی

P.S: اگر ایکس رے میں اپنڈکس نہ نکلے اور اس پیٹ کے درد کی اور کوئی وجہ نہ معلوم ہو سکے تو مجھے لکھنا۔ ''اگنیشیا'' کی ایک پڑیا بھیج دوں گی۔ رام کا نام لے کر کھانا ضرور فائدہ ہوگا۔

P.P.S: یہ تم نے کیا حماقت کی کہ ایک بار فلاسفی چھوڑ کر اکنامکس لی اور اب پھر اکنامکس چھوڑ کر انگلش لٹریچر لے رہی ہو۔

O

نوٹ: یہ افسانہ کبھی مسوری 1952 کبھی مسوری 1953 کبھی مسوری 1950 کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ جانے کیوں؟

☆ یہی افسانہ ہندی میں ''آدھا انسان'' کے نام سے کرشن چندر کے ایک مضمون کے ساتھ نیلابھ پرکاشن گرہ، الٰہ آباد نے 1953 میں شائع کیا تھا۔ یہ کتاب UNIVERSITY OF BOMBAY, PG. CENTRE LIBRARY, GOA میں ACC,NO1891-433/ABB/ADH کے تحت موجود ہے۔

خواجہ احمد عباس (7 جون 1914 - یکم جون 1987) اردو کے متنوع منفرد ادیب ودانشور تھے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے ومضامین بھی لکھے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے وسوانح بھی تحریر کیے اور اخبارات کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے اور تصنیف وتالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔ 8 جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا، ایک ساتھ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نہایت عرق ریزی سے خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکتہ الآرا فریضہ انجام دے دیا ہے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادب اردو کے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے ہمارے لیے خلق کیا ہے تاکہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ صرف اخذ واستفادہ کریں بلکہ اس کو اور بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے انھیں کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب ونایاب متون کی تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اردو دنیا موصوف کے جملہ مقالات وکتب سے بخوبی واقف ہے اور وہ داد وتحسین سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔

ISBN 978-93-87510-23-4

NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

قیمت ₹ 270/-
قیمت سیٹ ₹1935/-